

سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اپریل
2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
تیرے جانے کے بعد: ایک دوشیزہ کی عبرت بھری سرگزشت
مسلم دوست: ایک معروف کھلاڑی کی انسان دوستی کا تذکرہ
فرزندِ فرہنگ: برصغیر پر غلامی کی جکڑ مضبوط کرنے والے انتہائی جابر شخص کا زندگی نامہ
ان کے علاوہ سراب لہو کی گردش تیز کردینے والی روداد اور بہت سے سچے واقعات و دلچسپ قصے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 05 ❖ اپریل 2013ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی ناز ش 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئینِ کرام
السلام علیکم!

جاتی ہوئی حکومت نے ایک اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے کہ جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے جبکہ یہ منصوبہ 1990ء کا ہے اور امریکا بہادر کی پیشانی پر بل آنے کا خطرہ ہے اس لیے ملکی مفاد کو اتنے دنوں تک پسِ پشت رکھا گیا۔ ملک میں توانائی کا بحران کس قدر سنگین ہے اس کا اندازہ ہر بشر کو ہے۔ اسی بحران کی وجہ سے ہر سال تقریباً 5 ارب ڈالرز کا نقصان ہو رہا ہے۔ چھوٹے بڑے کارخانے بند ہوتے جا رہے ہیں، بیروزگاری بڑھ رہی ہے اور سرمایہ دار صنعتوں کو ملک سے باہر لے جا رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ گیس کی طلب ہے۔ ہماری طلب 8 ارب معکب فٹ ہے اور پیداوار صرف 4.2 معکب فٹ ہے۔ گیس کی کمیابی کے سبب بجلی کا بحران شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت 1990ء میں یہ منصوبہ بنا تھا لیکن عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے مسائل میں اضافہ ہوا، اب جا کر اس منصوبے پر توجہ دی گئی ہے، یہ 785 کلومیٹر طویل پائپ لائن منصوبہ جس کا تخمینہ ڈیڑھ ارب ڈالرز لگایا جا رہا ہے اور مکمل منصوبے کی مالیت 7 ارب ڈالرز ہے۔ ایران 50 کروڑ ڈالرز کا بلاسودی قرضہ بھی دے رہا ہے تاکہ منصوبہ جلد مکمل ہو جائے، اگر یہ منصوبہ تکمیل پا گیا جس کی امید امریکا بہادر کی وجہ سے کم ہے گیس کی اضافی خرید پاکستان کی مجبوری ہے۔ اس منصوبے کی وجہ سے 75 کروڑ معکب فٹ اضافی گیس ملے گی تو 4 ہزار میگاواٹ بجلی پیدا ہوگی اور سسکتی... معیشت کو سہارا ملے گا لیکن بات یہیں آ کر رکتی ہے کہ امریکا بہادر رکاوٹ بن جائے گا کیونکہ اس نے 22 سال سے ایران پر اقتصادی پابندی لگا رکھی ہے اور وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اسے اقتصادی راحت ملے پھر بھی جاتی ہوئی حکومت نے ایک عوامی مفاد کا کام کر دیا ہے۔ اب اسے آگے بڑھانا آنے والی حکومت کی اولین ذمّے داری ہوگی۔ بقول شوکت مہدی...

اب یہ تیری مرضی مولا کب تک جلتا ہے
رکھ آئے ہیں تیرگیوں میں دیا جلا کر ہم

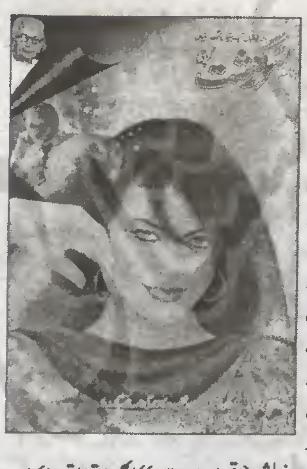
معراج رسول

زندگی کا زندانی

سرگزشت

زندگی ایک ایسی پہیلی ہے جو کبھی رلاتی ہے کبھی ہنساتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اس ننھی سی جان پر ایک افتاد کا پہاڑ تھا اور اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کتنی بڑی پریشانی کے گرداب میں آ گیا ہے۔ اس کے سر کا سایہ چھن گیا ہے۔ یتیمی کا داغ لگ گیا ہے۔ ان حالات میں بچے بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن وہ اس دور میں بھی جب تعلیم کی اہمیت سے لوگ انکاری تھے، جس کا دل ہو پڑھ لیتا ورنہ یہ کہہ کر دامن بچا لیتا کہ فرنگی تعلیم کا کیا فائدہ، یہ دین سے دوری پیدا کرتی ہے۔ مگر اس نے دین و مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے تعلیم کے زیور سے خود کو آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ خود سے اپنی زندگی بنانے میں لگ گیا۔ کیونکہ گھرانا تعلیم یافتہ تھا۔ نانا میر یاد علی اس دور کے معروف اخبار نویس تھے۔ آل انڈیا گزٹ کے نام سے اخبار نکالتے تھے۔ پھر والد تو تھے ہی اپنے دور کے نامور عالمِ دین۔ والد مرزا محمد عابد کا شمار اس دور کے معروف خطیب میں ہوتا تھا۔ وہ باشرع تو تھے ہی، حسِ مزاح سے بھی مالا مال تھے۔ اس کی تاریخ پیدائش پندرہ اگست انیس سو بائیس تھی اور وہ انیس سو انتیس میں یتیم ہو گیا تھا پھر بھی پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگے تھے۔ اسے سوائے پڑھنے پڑھانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے 1938 میں صرف اپنی محنت سے ”مولوی فاضل“ کا امتحان پاس کر لیا۔ گوکہ یہ سند بھی نوکری دلا سکتی تھی مگر اس نے انگریزی تعلیم کی اہمیت کو بھی سمجھ لیا تھا۔ اس نے حسین آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا اور 1943 میں میٹرک کے امتحان میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کر لی۔ اگر پشت پر مضبوط سہارا ہوتا تو شاید وہ تعلیمی میدان میں ہی رہتا مگر حالات کی سنگینی نے اسے نوکری کرنے پر مجبور کر دیا اور اس نے یوپی کے محکمہ زراعت میں نوکری کر لی تنخواہ معقول تھی گزر بسر ہو جاتی مگر علم کی پیاس نے چین نہ لینے دیا اور اس نے تعلیمی سلسلہ پھر سے شروع کر دیا مگر ایک ساتھ دو رخ پر۔ 1945 میں یوپی بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ساتھ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ نواب عسکری کے ساتھ مل کر مشہورِ زمانہ ”ڈیبٹنگ سوسائٹی“ کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح ادب کی خدمت بھی جاری رہی۔ اب وہ شہر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ اسی دوران 1947ء میں بی اے کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی مگر اس خوشی کو انسانیت کی تذلیل کے واقعات نے کم کر دیا تھا۔ ہر علاقے سے مسلمانوں کی نسل کشی کی خبریں آ رہی تھیں۔ بہت سے مسلمانوں کی طرح یہ بھی پاکستان منتقل ہو جانے پر غور کرنے لگے ..... بالآخر 1948 میں کراچی آ گئے۔ اس وقت یہ شہر مسائل کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ ایسے وقت میں اپنا سہارا خود بننے کی ٹھان لی اور نوکری تلاش کرنے لگے۔ صرف دو دن میں انہوں نے حبیب بینک میں نوکری تلاش کر لی۔ کہاں مزاج شاعرانہ اور کہاں پیسے پیسے کا حساب۔ صرف ایک ماہ میں اکتا گئے۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک کالم لکھ کر ”نوائے وقت“ کو بھیجا۔ نظامی صاحب کو وہ کالم اتنا پسند آیا کہ انہوں نے نوکری کی پیش کش کر دی اور وہ حبیب بینک سے جان چھڑا کر لاہور چلے گئے۔ ان کی تحریر اتنی مقبول ہو رہی تھی کہ روزنامہ امروز سے دعوت آ گئی کہ آپ ہمارے یہاں آ جائیں اور وہ اس اخبار میں چلے گئے۔ امروز کراچی سے نکلنے لگا تو وہ کراچی لوٹ آئے۔ صحافت میں آ کر واہ واہ تو خوب ہو رہی تھی لیکن جیب خالی کی خالی تھی۔ اسی دوران ان کی دوستی معروف فلمی کہانی کار اور پروڈیوسر دانش دیروی سے ہو گئی۔ دونوں ادب کے خدمت گزار تھے۔ ایک نیا پلان بنا لیا کہ اعلیٰ ذوق کی کتابیں ارزاں قیمت میں مہیا کی جائیں۔ بس دونوں اس کام میں لگ گئے۔ ابراہیم جلیس سے ایک کتاب لکھوائی ”ذرا ایک منٹ“ اسے مارکیٹ میں نہایت کم قیمت پر پیش کیا۔ کتب فروشوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا کیونکہ قیمت کم تھی۔ پھر ”تلخ و شیریں“ کے نام سے ایک اور مزاح پاروں کا مجموعہ لائے وہ بھی ہر اسٹال تک پہنچ گیا لیکن جب حساب کتاب کیا تو پتا چلا کہ آدھی رقم ڈوب گئی ہے۔ قیمت کی کمی نے یہ دن دکھایا تھا پھر بک اسٹالوں پر بھی پیسے رک گئے تھے۔ مجبوراً اس کام کو بند کرنا پڑا۔ ان دنوں وہ تابش دہلوی کے گھر میں مقیم تھے۔ انہوں نے ہی زور ڈال کر انہیں شادی پر راضی کیا۔ شادی ہوئی تو ذمے داری بڑھی اور وہ روسی ایمبیسی میں مترجم بن گئے۔ 1959 تک وہاں کام کیا پھر روزنامہ انجام میں آ گئے۔ لیکن جب انجام کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا نام تبدیل کیا اور وہ مشرق کے نام سے نکلا تو انہوں نے احتجاجاً نوکری سے استعفادے دیا اور ”انارکلی“ کے نام سے اپنا رسالہ شروع کر دیا لیکن کچھ ایسی پیچیدگی آئی کہ اس چلتے ہوئے رسالے کو بند کرنا پڑا۔ اسی دوران میں فیض احمد فیض اور سبط حسن نے ”لیل و نہار“ نکالا تو وہ اس میں چلے گئے لیکن کسی بات پر ان بن ہو گئی اور وہ لیل و نہار سے نکل کر ”بصیر“ میں آ گئے پھر روزنامہ اعلان میں چلے گئے۔ وہاں بھی نہ بنی تو انعام درانی کے روزنامہ انجام (نئے ڈیکلیریشن) میں آ گئے۔ پھر وہاں سے ابراہیم جلیس کے ”عوامی عدالت“ میں آ گئے۔ گویا ایک جہدِ مسلسل میں معروف رہے۔ 1970 میں مجموعہ کلام ”حرفِ حق“ 1972 میں ”مشعلِ حق“ شائع کیا۔ 1982 میں ”کشورِ قلم“ اور 1992 میں ”متاعِ لب“ پیش کیا۔ تمام کی تمام کتابوں نے قارئین سے پزیرائی حاصل کی لیکن جیب پھر بھی خالی ہی رہی۔ دکھ سہنے، پریشانیوں کا سامنا کرنے کی تو عادت سی تھی اس لیے ان مصائب کو بھی جھیلتے رہے۔ 75 سال کی عمر میں بھی ادارتی ذمے داریاں نبھاتے رہے۔ ”آخری عمر میں ”اسکول ڈائجسٹ“ اور ”جواں فکر“ کی ادارت کرتے رہے۔ بالآخر کام کی زیادتی 22 مارچ 1997 کو موت کی گود تک پہنچا گئی۔ اس بے لوث صحافی، ادیب، شاعر کو دنیا حسین اعظمی کے نام سے پہچانتی ہے۔

شہرِ خیال



☆ڈاکٹر آر ایم ای، سعودیہ کے شہر ریاض سے لکھتے ہیں ”اطاعت باللہ واتباعت الرسولؐ دین اسلام میں ایمانی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور ماشااللہ عمران صاحب اور شارق صاحب نے انکارا، میں بہت عمدہ اور قابلِ ستائش مثال پیش کی اور عمران صاحب نے جہاد بالنفس کا عملی مظاہرہ بھی کیا، حکیم الامت کی تفسیر حکمت کہ ”ذرا نم ہو یہ مٹی تو بڑی زرخیز ہے ساقی، کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ آپ نے ”انکارا“ کو منتخب التحاریر قرار دے کر باذوق فطین اداری صلاحیتوں کی سند کا مستحق ہونا ظاہر کر دیا۔ عمران صاحب نے اپنی فوجداری عملداری میں یہ نکتہ حکمت فراموش کر دیا کہ ”دین یسر (نرمی، آسانی) والا العسر (سختی، پریشانی) اللہ لطیف، مہربان، کریم اور رؤف رحیم بھی ہے اور اسلام میں بیاہ، شادی، فرح وشادمانی کا اعتدال پسند، لہو ولغو سے پاک مظاہرے کی تلقین وتاکید ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی مناسبت سے اپنی کریمانہ بخشش وعطا کا یوں انعام قرار دیا کہ حلال انداز میں بخوبی کھاؤ پیو البتہ اسراف سے اجتناب کرو۔ اور اعتدال سے تجاوز مت کرو، چنانچہ نبی کریمؐ نے شادی، ولیمہ کی وقعت اور اہمیت کو بخوبی واضح کر دیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ ولیمہ میں شرکت پوری شد ومد سے کرو گو وہ دعوت دشمن کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ فقراء اور مساکین کو اسلامی طرزِ حیات میں ممتاز اہمیت ہے لیکن اعزا واقرباء کی جائز حیثیت اور اہمیت بھی بخوبی ہے اور اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں۔ عیدالاضحیٰ پر قربانی سنتِ ابراہیمی کی مقدس پیروی ہے لیکن اس میں بھی اہلِ خانہ، خویش (اقرباء، اصدقاء) کا بھی استحقاق جائز امر قرار دیا گیا۔ عمران صاحب نے فوجداری قرار سے سائرہ اور خود اپنے اہل واقرباء کے لطیف جذبات کو مجروح کیا۔ اگر جہیز لینا مناسب نہیں سمجھتے تھے تو اپنے اور ان کے اہلِ خانہ کو اپنا موقف منطقی انداز میں بیان کر دیتے لیکن فوجداری قرار کی عملی تنقید مناسب نہیں تھی۔ اپنے موقف کی تشریح میں یہ معقول اور مناسب اسلوب میں ظاہر کر دیا جاتا کہ جہیز کا حصول نہ تو خواہش ہے اور نہ ہی ہدف۔ چنانچہ غیر ضروری عمل وجدوجہد اور غیر شرعی تکلفات سے اجتناب وگریز کیا جائے۔ خوش اسلوبی، باہمی افہام وتفہیم سے اعتدال پسندی کی فضاء میں فرح اور مسرت وشادمانی اسلامی عنایات اور مروجہ دستور کے مطابق مزید اضافہ ممکن تھا۔ اسی لیے تفسیر ومشاورت کی حکمت کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ سائرہ نے اپنے علم ودانش، حلم وصبر اور اعلیٰ ظرفی کی جو مثال پیش کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لاریب، اللہ یھدی من یشاء، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی اس میں رضا، تدبیر وتقدیر شامل تھی اور سائرہ نے تو گویا اک آگ کا دریا تھا اور ڈوب..... کر عبور کرنے کی عملی تفسیر پیش کی۔ ورنہ سائرہ کا آزمائش کی آگ کے دریا کو اپنی خواہشات وامنگوں کی سیلابی لہروں کے غلبے، اہل واقرباء کے جذباتی ناقدانہ تیز وتند، تبصروں کی بوچھاڑ، غیظ وغضب، طوفانی مزاحمت کے سبب اس آگ کے دریا کو عبور کرنا انسانی فطرت کے بس میں نظر نہیں آتا۔ ویلنٹینی دور کی اس پرنس نے ذاتی خاندانی معاشرتی اور سماجی مروجہ قوانین اور تقالید کا تن تنہا مقابلہ کیا۔ عمران صاحب نے اس انکارے کی حدت کس قدر محسوس کی لیکن انکارے کی تپش خود سائرہ، اس کے اہلِ خانہ اور اصدقاء وغیرہ اور خود عمران صاحب کے بھی اہلِ خانہ اقرباء اصدقاء وغیرہ نے بھی اپنے سینوں میں ضرور محسوس کی ہوگی جو فوجداری قرار کی عدم تنقید سے ختم ہو سکتی تھی۔ واللہ اعلم۔ ابن کبیر کی ہاشم آملہ سے ملاقات اور تفصیلی گفتگو موزوں اور بہترین انتخاب تھا۔ ہاشم کی صاف گوئی، دینی معلومات ہمت وعزم، عملی تفسیر، تعصب آمیز معاشرہ کے ماحول میں Survival اور کامیابیاں حاصل کرنا بے حد متاثر کن ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور مزید کامیابیاں اور نصرت عطا کرے، آمین! نامعلوم قاری، جن کو مجتہد البشر بھی کہا جا سکتا ہے، کا ایمان افروز تبصرہ متاثر کن تھا۔ یہ غیرت، ایمان، ضمیر، خلوص اور انسانی احساس مسئولیہ کی بہترین مثال تھی۔ اور اللہ نیکی وہمت عطا کرے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ

قارون الوقت رزقِ حرام کے سوداگر دین اور انسانیت کی بدترین رذیل ہیں۔ اللہ نے ان کی رسی کو ڈھیل دی ہوئی ہے اور ان کا زمین میں دھنسنا اللہ کے امر ”کن“ پر منحصر ہے۔ فلم نگری کے ابن بطوطہ یعنی جناب آفاقی صاحب یوں تو دلچسپ، معلوماتی اور بھرپور سیاحتی جائزہ پیش کرتے ہیں اور اس مرتبہ یوسف خان (دلیپ کمار) اور شاہ رخ کا انتخاب بھی خوب تھا۔ ان کا اپنے آبائی گھروں کا وزٹ چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ یوسف صاحب کے متعلق عام طور پر کہا گیا ہے کہ وہ ادب نواز باشعور صاحب دانش شخصیت ہیں۔ کیا ان کا آبائی گھر کا دورہ صرف لوگوں کو ملنے ملانے اور قہوہ پینے، خوش بیان گفتگو تک ہی محدود رہا؟ کیا ان کو اور ان کی صاحباں (سائرہ بانو) کو ان کے شکستہ مکان کی زبوں حالی نظر نہ آئی؟ کیا اعلیٰ تمغہ کا حصول ہی صرف ان کا ہدف اور منزل تھی؟ اگر وہ جنرل ضیاء الحق سے پشاور کے نئے اور نواحی علاقے میں ایک نئی کالونی کے لئے زمین اور دیگر سب سہولتوں کی رعایت طلب کرتے تو اپنے پڑوس کے مکینوں کے لئے ایک ماڈرن اور ماڈل کالونی مع اسکول، اسپتال اور مسجد وغیرہ بنوا دیتے اور اپنے نام سے منسوب کرا دیتے اگر اس میں ان کا کچھ ذاتی پیسہ بھی صرف ہو جاتا، جس کا یوں بھی کوئی وارث نہیں، پڑوس کے یہ مکین بھی نئی رہائشی سہولتوں سے مستفید ہوتے اور پرانے خالی مکانوں کے عوض اور اپنے شکستہ مکان کو منہدم کر کے ایک اچھا سا یتیم خانہ یا بیواؤں وغیرہ کے لیے کوئی فلاحی ادارہ یا انڈسٹریل ہوم بنوانے کے لیے مخیر اور مقتدر حضرات کی ایک کمیٹی بنا دیتے۔ یہ صدقہ جاریہ بھی ہوتا اور ان کے والد سرور خان اور والدہ کی ارواح کو سکون نصیب ہوتا۔ اگر حکومت ان کے گھر کو قومی ورثہ کی بھی حیثیت دے تو ان کو دنیا یا آخرت میں کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ لیکن صرف دین کا علم اور اتباعتِ دین ہی دانشمندانہ اور مفید فیصلے کرنے کا شعور اور آگہی دیتا ہے۔ کافی عرصہ قبل انڈیا وزٹ کے دوران ایک دعوت میں تعلیم یافتہ، متمول باحیثیت اصحاب شریک تھے۔ دلیپ کمار کا بھی ذکر موضوع بنا۔ بیشتر حضرات نے تعریف وستائش اور مدح سرائی کی۔ ایک صاحب نے استفسار کیا کہ دلیپ صاحب کو پاکستان میں کس قدر پذیرائی حاصل ہے؟ میں نے کہا کہ عوامی مقبولیت کے باعث گورنمنٹ نے ان کو اعلیٰ تمغہ دیا۔ میں تعلیم کے سب ادوار اور بعد میں بھی اس کی فنکارانہ اداکاری کا مداح رہا ہوں لیکن موجودہ صورت میں اس کی شخصی کارکردگی سے سخت مایوس ہوں۔ ردِعمل غیر معمولی اور تحیر آمیز تھا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اور بخصوص یوسف صاحب کی کمیونٹی میں مردانگی، عہد وفا، غیرت کی بے پناہ وقعت اور اہمیت ہے اور یوسف خان نے ان اصول اور اعلیٰ اوصاف کو بری طرح پامال کیا۔ شمع صدیقی (حیدرآباد دکن) سے الفت، محبت اور شادی کے عہد وپیمان اور حتیٰ کہ قرآن پہ حلفیہ اقرار کیا کہ شادی کے وعدے پر قائم رہیں گے۔ وہ اسی قسم کی ساکھ پر اپنے گھر حیدرآباد واپس گئی اور چونکہ شادی شدہ اور دو تین بچوں کی ماں تھی اس لیے۔ معاملہ بہت سنگینی اختیار کر گیا۔ آخر کار بچوں کو باپ کی حوالگی کے عوض طلاق لے کر جب بمبئی پہنچی تو یوسف خان نے معاملات کی درستگی تک اپنی بہن کے پاس چھوڑا۔ میڈیا کو اطلاع ہو چکی تھی چنانچہ خبریں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ شمع دہلی جو فلم میڈیا کا مشہور ومعروف رسالہ تھا اس نے پوری تفصیلات من وعین شائع کیں۔ حاضرین مجلس نے بھی تصدیق کی، سائرہ بانو، اس کی والدہ نسیم بانو وغیرہ نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا اور یوسف صاحب کے گھر والوں کو بھی ہمنوا بنا لیا۔ انہوں نے بھی وارث کے خدشہ کی بنا پر حمایت کی۔ سائرہ نے اعلان کر دیا کہ وہ صاحب (یوسف صاحب) سے کسی دوسرے کو شیئر نہیں کر سکتی حالانکہ یوسف صاحب اسلامی رُو سے پوری طرح مجاز تھے۔ پھر ان کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ قسم، وعدے کے بھی پابند تھے اور شمع کی بچوں کی قربانی اور طلاق وغیرہ کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بہر حال ایک باشعور اور باغیور پٹھان ہو کر انہوں نے شتر مرغ کی طرح اپنا سر بزدلی اور پسپائی کی ریت میں دبا لیا اور ذلت ورسوائی کو قبول کر لیا جبکہ اکثر غیر مسلم شادی شدہ اور اپنے مذہب کی سخت خلاف ورزی کے باوجود دوسری شادی کر چکے تھے۔ شاہ رخ خان نے بھی گوری کی خاطر دین ومذہب کی قربانی دے دی۔ غیر مسلم کا دین تبدیل کر لینا اتنا کٹھن اور مشکل نہیں ہوتا لیکن مسلمان تو جان ومال کی قربانی دے کر بھی دین ومذہب سے کبھی علیحدگی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر شاہ رخ نے مہاسبھائی پنڈتوں کے خوف واندیشوں سے ڈر کر اپنے بچوں کے نام بھی غیر اسلامی رکھے۔ اللہ کا نام پبلک میں نہیں لے سکتا بلکہ انگلی اٹھا کر اوپر والے کا ذکر کرتا ہے۔ خان (پٹھان) تو ایمان غیرت، حمیت اور مردانگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ شاہ رخ تو قارون الوقت ہے۔ اس نے کتنے اسلامی فلاحی اداروں کی سرپرستی کی ہے؟ کتنی مساجد بنوائی

قارئین کے لیے اہم اعلان

ملک بھر میں ادارے کے ماہنامے مندرجہ ذیل تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

* سسپنس ڈائجسٹ: 17 تاریخ
* ماہنامہ پاکیزہ: 24 تاریخ
* ماہنامہ سرگزشت: 28 تاریخ
* جاسوسی ڈائجسٹ: 03 تاریخ

مذکورہ بالا تاریخوں پر پرچے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں رابطہ کریں

ثمر عباس: 0301-2454188

ہیں؟ وہ خوف کی وجہ سے صدقہ یا اسلامی فلاحی ادارہ میں براہِ راست حصہ نہیں لے سکتا تو بالواسطہ تو اپنی کزن نور جہاں کے ذریعے بہت کچھ کرسکتا تھا حتیٰ کہ اپنے پرانے گھر کی حالت نہ بدلی۔''

☆فضل رؤف مروت نے لکی مروت سے لکھا ہے''میرے پہلے خط کو شمارے کی زینت بنانے کا شکریہ اور ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس دفعہ میں ٹیلی ویژن کے چند اداکاروں پر قلم آزمائی کر کے قارئین کی خدمات میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستان ٹیلی ویژن 1964ء سے آج تک اپنا معیار قائم کیے ہوئے ہے اور فلم کے برعکس یہ اپنے ڈگر سے اگر ہٹ نہیں سکا تو اس میں کمال ان تعلیم یافتہ فنکاروں، تکنیک کاروں کا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کی تاریخ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت فنکاروں سے بھری پڑی ہے۔ ٹیلی ویژن کے پہلے اداکار قوی خان نے گریجویشن کیا ہے۔ راحت کاظمی نے انگریزی ادب اور سیاسیات میں ماسٹر کیا ہے اور پھر 1968ء میں CSS کیا اور انفارمیشن گروپ میں خدمات سرانجام دی۔ اور پھر سرکار کی نوکری چھوڑ کر آج کل کراچی میں اپنا تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ فردوس جمال نے اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کی ہے۔ خیام سرحدی نے یونان سے فلم سینما گرافی میں ماسٹر کیا تھا۔ وارث کے چوہدری حشمت محبوب عالم نے اسلامک اسٹڈی میں ماسٹر کیا تھا۔ اداکار منور سعید نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی، طلعت حسین نے گریجویشن کے بعد لندن سے ایکٹنگ میں ڈپلوما کیا اور وہاں انگریزی اسٹیج ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ عثمان پیرزادہ نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹر کیا۔ توقیر ناصر نے جرنلزم میں ماسٹر کیا۔ اور کچھ عرصہ پنجاب کے سول سروس میں خدمات سرانجام دیں۔ اداکار جہانزیب گورچانی ایک بڑے کوریئر کمپنی کے ڈائریکٹر رہے ہیں۔ شفیع محمد شاہ مرحوم نے ایم اے اکنامکس کیا تھا۔ اور ایک بینک میں اعلیٰ عہدے پر کام کیا۔ اداکار نعمان اعجاز اور محمود اسلم نے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اداکار توقیر نثار نے ٹرپل ماسٹر کیا ہے۔ جبکہ حسام قاضی نے B.com کیا تھا۔ ہرفن مولا اداکار جمال شاہ نے فائن آرٹس میں ماسٹر کیا اور بلوچستان یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے بانی تھے۔ مزاحیہ اداکار ایاز خان انجینئر ہیں اور بلدیہ کراچی میں کنٹرولر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ماضی کے معروف اداکار خالد بن شاہین ایک بڑے قومی بینک کے چیف کے عہدے پر فائز ہیں۔ اسی طرح نیر اعجاز نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ماسٹر کیا۔ دلدار پرویز بھٹی مرحوم انگریزی ادب کے استاد تھے۔ ایک اور اداکار آصف سیماب نے بھی ایم اے انگلش کیا تھا اور کالج میں پڑھاتے تھے خواتین اداکاروں میں عظمیٰ گیلانی کالج میں لیکچرار تھیں۔ اور آج کل آسٹریلیا میں سیٹل ہیں۔ روحی بانو جو آج کل مختلف نفسیاتی امراض کا شکار ہیں۔ انہوں نے ایم نفسیات پنجاب یونیورسٹی سے کیا ہے۔ ثمینہ پیرزادہ نے B.com کیا ہے۔ ثمینہ احمد اور ثانیہ سعید NCA سے فارغ التحصیل ہیں۔ جبکہ لیلیٰ واسطی اور سویرا ندیم نے ایم اے انگلش کیا ہے۔ اداکارہ جگن کاظم نے کینیڈا سے گریجویشن کی ہے۔ پاپ گلوکاروں میں جنید جمشید نے انجینئرنگ کی ہے۔ جواد احمد میکینکل انجینئر ہیں۔ جنون گروپ کے سلمان احمد نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا ہے۔ اداکار گلوکار علی ظفر نے فائن آرٹس میں ماسٹر کیا ہے۔ سلمان علوی نے IBA سے MBA کیا ہے۔ اور کراچی کے سٹی گورنمنٹ میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور پاکستان میں پاپ گلوکاری کے بانی محمد علی شہکی نے انجینئرنگ کی ڈگری لی ہے۔ امید ہے کہ قارئین میری اس کاوش کو معلومات کا ایک جھونکا سمجھ کر حوصلہ افزائی کریں گے۔''

☆اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے رقمطراز ہیں''پرچہ پہلی تاریخ کو ملا تو ہم نے فوراً مطالعہ شروع کر دیا۔ کافی جاندار تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ روبینہ نفیس انصاری صاحبہ لکھتی ہیں کہ شہرِ خیال میں پہلے جیسی بات نہیں رہی تو عرض ہے کہ ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں بھلا آپ میرے پڑوسی ضلع میں رہتی ہیں پھر ڈاکٹر ہونے کے ناتے نرم دل رکھتی ہیں، کبھی ہمیں یاد کیا یا سراہا۔ اب بتاؤ کیسے پھنس گئیں لیکن اس سے پہلے میرا خلوص بھرا اسلام قبول کرو۔ فلمی الف لیلہ کی موجودہ قسط بھی دھماکا خیز ہے۔ ایک ہی نشست میں ڈھیروں معلومات مل گئی ہیں۔ اس شمارے میں کتنے نایاب فوٹو دیکھنے کو ملے ہر وقت زبان پر آفاقی بھائی کے لیے دعائیں رہتی ہیں وہ اس بزم کے سدابہار دولہا ہیں۔ صحت وتندرستی کے ساتھ طویل عمر پائیں اور ہماری دلبستگی کا سامان کرتے رہیں، آمین۔ سچ بیانیوں کے علاوہ سراب، بھی ہمارے پیارے سرگزشت کی بنیاد کا مضبوط سہارا ہے اور واقعات میں تسلسل اور دریا کی روانی جیسی اٹھان ہے جب سے شہباز سے یک طرفہ دوستی ہوئی ہے اپنا بلڈ پریشر بھی باغی ہوگیا ہے اس کے بڑھنے گھٹنے کا اختیار کھو بیٹھے ہیں۔ مجبوراً دواؤں پر گزارا ہے۔ اب حویلی کو پولیس نے گھیر لیا ہے وہ پکی مخبری پر ہی آئی ہوگی۔ اب دل کی حالت پتلی ہو رہی ہے دیکھیں کیسے اس معیبت سے نمٹا جاتا ہے۔ نیا شمارہ آنے تک دھڑکنیں بے ترتیب رہیں گی۔ اب دیکھتے ہیں کہ سچ بیانیوں میں کیسے کیسے محبتوں، قربانی، ایثار، خباثت، عیاری اور جنون کے قصے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ تلافی، میں امجد کو اس حد تک ورغلانے میں افشاں کا مکمل ارادہ اور ہاتھ شامل ہے وہ منصوبہ بندی سے آگے بڑھتے ہوئے حوصلہ افزائی کرتی رہی اور امجد فطری کمزوری کا شکار ہو کر اس کی خواہشات کا تابع بن گیا، ہاں یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ افشاں نے کسی موقع پر بھی منافقت نہیں کی۔ چالاکی دکھانے کی بجائے ہر کام بتا کر کیا پھر وہ خوش قسمت رہی کہ جو قدم اٹھایا، کامیابی نے قدم چومے اور منزلیں سمٹتی گئیں اور سارے کردار کسی ناخوش گوار واقعہ سے بچے رہے۔''ڈیوٹی'' واقعی حیران کر دینے والی حقیقت ہے۔ خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود محض جذباتی لگاؤ رکھتے ہوئے عدنان کی زندگی سنوار دی اور کسی صلہ یا سراہے جانے کی خواہش تک نہ کی اور نیک کام کر کے جنت کی راہ لی۔ ایسی ہستیاں مدتوں یاد رکھی جائیں گی۔ چور، میں تہنیت سرخرو ٹھہریں لیکن جو لمحے اذیت میں گزارے اور جلی کٹی سننے کو ملیں اس کے دل پر جو گزری ہوگی وہ خود ہی جانتی ہوگی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے باعزت مقام پاگئی ہے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے۔''ڈراما'' میں عجیب اور حیرت ناک واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ ابرار کتنے گھناؤنے کردار کا مالک تھا محض دولت کے بل بوتے پر لڑکیوں کو رجھاتا اور عزتوں

سے کھیلتا تھا یہ محض اس کے لیے شغل اور معمول تھا کبھی نیکی بدی کے فلسفہ پر غور نہ کیا تھا ایسے گناہ کبیرہ سے قطع نظر اللہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تو انہوں نے بھی لیت ولعل سے کام نہ لیا اور خود کو عبادت میں ڈبو لیا۔ ان سے ضرور کوئی بڑا نیک کام ہوا تھا وگرنہ وہ ایسی پکڑ میں آتے کہ محض بلبلا کر رہ جاتے۔''قصور'' میں زلیخا پر فتویٰ دینے سے پہلے کئی پہلوؤں پر سوچنا ہوگا۔ ہم نے جب ظالم، جابر اور طاقت ور کا ہاتھ نہیں روکا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ناانصافی کے کتنے مناظر آتے ہیں لیکن محض تماشائی بن کر گزر جاتے ہیں اور کسی بحث، تبصرے سے گریز کرتے ہیں۔ مظلوم نے ہمارے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی بجائے بے بسی اور لاچارگی میں اپنی بیٹی کا قتل کر کے ہمیں آزمائش سے بچالیا ہے۔ کم از کم ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ یہ مومن کی کمزوری کا تیسرا درجہ ہے لیکن ہم ایک کمزور لمحہ سے نکل آئے ہیں اور دیکھنے والی نظر کے سامنے سرخرو ٹھہرے ہیں۔ بیٹی، پڑھتے ہوئے آخر میں آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ اپنے اپنے مزاج اور سوچ کی بات ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت کی طرف سے بیٹا نعمت ہے اس سے انکار محض دل کی تسلی اور اپنے حالات سنبھالنے والی بات ہے۔ بیٹی رحمت ہے اس کا اپنا مقام ہے۔ لیکن دل پتھر کر لینا کفرانِ نعمت اور اللہ کے فیصلے سے انکار ہے یہاں امجد خود کہاں سکھی رہے۔ ذہن پر بوجھ کو سوار کیے رکھا۔ سکون تب ملا جب بیٹی کو سینے سے لگایا۔ اصل میں قدرت کے فیصلوں سے انکار اور فطرت سے پہلو تہی سکھ چھین لیتی ہے نارمل زندگی خوشیوں کی ضمانت ہے۔ جرم، اپنے موضوع کے اعتبار سے زبردست اور منفرد کہانی ہے۔ گاؤں کی روایات الگ اور وڈیروں کے مفاد، انا اور عزت کی تابع ہوتی ہیں۔ یہاں انہونیاں کئی خاندانوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ اور ایسے المیے جنم لیتے ہیں کہ کئی نسلوں تک بھگتنے پڑتے ہیں کبھی رسوائی اور جگ ہنسائی کی وجہ سے بڑے جرم کو بھی دبا دیا جاتا ہے۔ سہیل بھی اپنی عزت کی بربادی پر قربان ہوگیا لیکن اپنے خاندان کو رسوائی سے بچا گیا۔ ہمیں ایسے بااصول اور عزت مند جوانوں پر فخر کرنا چاہیے۔ قسمت، میں واقعی اس گھر کے ساتھ ایسی ٹریجڈی ہوئی کہ ہر فرد کے ہاتھ، پاؤں حتیٰ کہ زبان تک باندھ دی گئی ہے۔ وہ کچھ کہنے سننے اور احتجاج کے قابل نہیں رہے۔ ایک لغزش نے کتنی قربانیاں لے لیں ہیں اور شہباز معصوم بچوں کے ساتھ سہمی سہمی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بظاہر سب معصوم اور نیک فطرت تھے لیکن ایسی آزمائش میں پھنسے ہیں کہ کھل کر اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتے اور بے بسی میں موت کو گلے لگانے میں عافیت جانی، ایسے ان ہونے واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں کہ ہنستا بستا گھر سسکیوں۔ کے حصار میں آجاتا ہے بس یہ راز ذات باری تعالیٰ خود جانتی ہے۔ ہم گناہ گاروں کے ذہن کی پرواز محدود ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری پہلی تحریر کے ساتھ ہی ٹاپ پر رہیں۔ واقعات کی ترتیب اور بیان کرنے کا انداز لاجواب ہے، مبارک باد قبول کریں۔''

☆رانا محمد شاہد کی بورے والا سے تشریف آوری''مارچ کا شمارہ بلیک بلیک سا لگا۔ شاید ٹائٹل اسٹوری''کالی قسمت'' کی وجہ سے۔ جس دن سرگزشت کا شمارہ خریدا۔ اسی شام کراچی میں سانحہ عباس ٹاؤن پیش آیا تو معراج صاحب کے اداریے کا قطعہ یاد آگیا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی کلمہ گو مسلمان کا خون کر کے ہم یقیناً منزل کھو رہے ہیں، جب تک سیاسی جماعتیں اپنے اپنے سیاسی مفادات سے بالاتر ہو کر کراچی کے مسائل حل کرنے کی کوششیں نہیں کریں۔ اس وقت تک بے گناہ لوگ یونہی مارے جاتے رہیں گے۔ سرمایہ کار اپنا سرمایہ بیرون ملک منتقل کرتے رہیں گے۔ کاروباری سرگرمیاں تباہ ہوگئی ہیں۔ اس ساری صورتِ حال کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ کراچی جل رہا ہے جبکہ حکمران چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں معروف قلمکار مولوی محبوب عالم کے متعلق باتیں دلچسپی سے بھرپور تھیں۔ خصوصاً یہ کہ گھرانا اتنا غریب تھا کہ گھر کو روشن کرنے کے لیے چراغ کا تیل خریدنا بھی مشکل تھا لیکن علم سے محبت اتنی تھی کہ اخبارات ورسالے بھی شائع کیے اور کتابیں بھی لکھیں۔ مطالعہ وتحقیق ہمارے اسلاف ومشاہیر کی ترقی کی بنیاد تھی اور مطالعہ ان کا شوق نہیں جنون تھا۔ حکیم جالینوس سے کسی نے پوچھا۔ آپ اپنے ساتھیوں سے علم وحکمت میں کیسے نمایاں مقام پر پہنچ گئے؟ انہوں نے جواب دیا، میں نے کتابیں پڑھنے کے لیے چراغ کے تیل پر اس سے زیادہ خرچ کیا جتنا لوگ کھانے پینے پر خرچ کرتے ہیں۔ ایم اے خالق بھئی! جس قوم کی 75 فیصد آبادی تعلیم یافتہ نہ ہو، وہ ووٹ کی اہمیت سے کیا آگاہ ہوگی۔ اور اس کا انتخاب کیسا ہوگا...... برادری کو سپورٹ کرنے والے لوگوں کی کیا کمی ہے جو کرپٹ ترین شخص کو بھی اس لیے ووٹ دیتے ہیں کہ وہ امیدواران کی برادری کا ہے۔ ہاشم آملا کے کامل ایمان کے حوالے سے سبھی نے خوب لکھا۔ اسی حوالے سے سدرہ بانو نے بالکل ٹھیک لکھا کہ ہم نسلی مسلمان تو ہیں مگر شاید اصلی مسلمان، ہم میں سے کوئی نہیں

6 جولائی 1935ء کو کلکتہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہونے والے 1965ء کی جنگ کے ہیرو محمد محمود عالم (ایم ایم عالم) عرصے تک مرض میں مبتلا رہنے کے بعد 18 مارچ 2013ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈھاکا مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے پاکستان ائرفورس میں شمولیت 1952ء میں اختیار کی تھی۔ ستمبر کی جنگ میں انہوں نے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

آج ہی کے دن اردو ادب کے نامور مزاح نگار امیر الاسلام ہاشمی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور آج ہی کے دن رثائی ادب کا ایک بہت بڑا نام پروفیسر سبط جعفر دہشت گردی کا شکار ہوگئے۔ ہم تمام مرحومین کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ہے۔ طاہرہ گلزار مردذات کے حوالے سے آپ کے خیالات ٹھیک ہیں۔ یقیناً آج کا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ ڈاکٹر ایم اے ملک کے خط پہ آپ نے صحیح لکھا کہ ہر لکھنے والے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔ یہی انداز نہ صرف اسے منفرد بناتا ہے بلکہ پڑھنے والا بھی یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا یقیناً ایک اپنا اور الگ انداز ہے۔ مہوش رفیق! کراچی کے حالات کے حوالے سے مزید کیا لکھیں کہ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت نے کراچی کو لاوارث چھوڑ دیا ہے۔ یہاں قانون نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ سب حکومت کی نااہلی کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر روبینہ! آپ ہومیو ڈاکٹر ہیں یا ایم بی بی ایس؟ جی ہاں میاں عبدالعزیز جیسی شخصیات ہی تھیں جنہیں کوئی بڑا رتبہ و اعزاز تو نہ ملا مگر ان کی کوششوں و قربانیوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی قربانیوں کا ثمر ہی ہمیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ ابن کبیر نے ایک بہت دلچسپ و منفرد تحریر ''کالی قسمت'' کی صورت میں پیش کی۔ جی ہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ بھی جو ساری عمر دوسروں کو روشنی دیتے رہتے ہیں مگر اپنی قسمت نہیں بدل پاتے۔ شکیل صدیقی نے ایک بدنصیب مصنف کی محرومیوں اور ناول نگاری کے حوالے سے اس کی خوش نصیبی کا بڑے خوبصورت پیرائے میں ذکر کیا۔ مختار آزاد، منزہ قادری عطاری، امجد اوسلو اور طارق عزیز کی تحریریں بھی دلچسپ لگیں۔''

☆ بشیر احمد بھٹی نے فوجی بستی بہاول پور سے لکھا ہے ''2 مارچ 2013ء کو مارچ کا شمارہ لیا۔ گھر آکے بیت بازی کا کوپن جب شمارے سے پھاڑ لیا تو دورانِ مطالعہ معلوم ہوا کہ شمارے میں چند صفحات ایسے بھی شامل ہیں جن کی کئی سطریں پڑھنے کے قابل نہیں، سیاہ دھبے ہیں۔ بیت بازی کا صفحہ نہ نکالتا تو شمارہ جہاں سے خریدا گیا تھا وہاں سے تبدیل کر لیتا۔ کتابت یا پریس کی غلطی سے دھبوں نے الفاظ مٹا دیئے ہیں۔ ان صفحات کی نشاندہی کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خصوصی طور پر پریس والوں سے یا کتابت والوں سے کہہ کر ایسی غلطیوں کا ازالہ فرمائیں۔ شکریہ! (مشین میں انک اضافی پڑجانے سے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ وہ شمارہ تبدیل کرالیتے) بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ ڈائجسٹ کے کئی صفحات مدغم ہوتے ہیں۔ گہرے نہیں ہوتے اس طرف بھی پریس والوں کی توجہ مبذول فرمائیں۔''

☆ آمنہ کا ای میل ''میں سرگزشت کی 14 سال سے مستقل قاری ہوں کیونکہ مجھے اس سے لگاؤ ہے۔ میں سراب کے سلسلے میں ایک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں بہت جھول ہے۔ وسیم کی بہن سونیا اور رپورٹر ناصر جو غائب ہوئے تو آج تک واپس نہیں آئے۔ جب پانچ ہزار کے نوٹ نئے نئے آئے تھے تو اسکائپ نہیں تھا (اسکائپ کے قائم ہونے کی تاریخ ملاحظہ کریں) برائے مہربانی ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر توجہ دیں۔''

☆ اسرار الحق کا ای میل ''شمارہ 28 کو ملا۔ دو دن میں ختم کرلیا۔ کالی قسمت پڑھ کر بی بی قریشی کی قسمت پر رونا آ گیا۔ ہم مردہ پرست ہیں۔ جب تک کوئی دانشور زندہ ہوتا ہے تو اسے جوتوں میں رکھتے ہیں پھر اسے سر پر بٹھا لیتے ہیں۔ شاہد جہانگیر کی سپر اسٹار بھی غضب کی تحریر ہے۔ بس ثابت ہوا کہ ہمارا پشاور فنونِ لطیفہ میں سب سے آگے رہا۔ دلیپ کمار، راج کپور، شاہ رخ خان، پریم ناتھ، رنگیلا وغیرہ وغیرہ ایک طویل فہرست ہے ان اداکاروں کی جنہوں نے پاک وہند کی فلمی تاریخ رقم کی۔ تلافی زبردست سچ بیانی تھی۔ امجد کی تحریر بیٹی اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی قسمت بھی زبردست رہی۔ ڈاکٹر روبینہ کو مبارکباد اب تو وہ میرے خطوط پر تبصرہ ضرور کریں گی۔ ویسے غلط نہیں بہت زبردست کہانی بیان کی ہے۔''

☆ طاہر الدین بیگ ''مارچ کا سرگزشت زبردست مواد سے بھرپور رہا۔ چلتے ہیں پہلے الف لیلہ کی طرف، آفاقی صاحب دلیپ صاحب کے ساتھ اور بھی پشاور کے فنکاروں پر زبردست لکھ رہے ہیں۔ سدھیر صاحب پر بھی بہت خوب لکھا۔ دلیپ صاحب پر ایک خاص بات کا ذکر نہیں کرپائے۔ ثریا بہترین مغنی اور زبردست اداکارہ تھیں جہاں دوسری ہیروئن دلیپ صاحب کے ساتھ کام کرنے کے لیے بے چین وہاں ثریا نے دلیپ صاحب کو لفٹ نہیں کرائی۔ دلیپ صاحب کے دوست' کے آصف نے یوسف صاحب سے مل کر ثریا کو زیر کرنے کے لیے جانور نامی فلم کی ابتدا کی اور ایک سین کو جب کئی بار فلمایا گیا تو ثریا کی سمجھ میں بات آگئی اور انہوں نے جانور فلم سے علیحدگی اختیار کرلی پھر وہ کبھی دلیپ صاحب کے ساتھ کام کرنے کو راضی نہیں ہوئیں۔ سپر اسٹار، جہانگیر شاہد صاحب نے بہت اچھا لکھا۔ گل حمید صاحب کے بارے میں بڑی تفصیل سے خوبصورت لکھا۔ خوبصورت ہیرو کی خوبصورت تحریر۔ اسی طرح منزہ قادری عطاری کی لازوال محبتیں زبردست تحریر عمر ماروی عشق کی مختلف داستان جس میں عشق کا انداز واقعی مختلف تھا۔ ایک خاص بات کا ذکر نہیں ہوسکا جب بادشاہ عمر سومرو نے ماروی کو عزت اور احترام سے واپس کردیا تو اس کے قبیلے والوں نے ماروی کی پاکدامنی پر شک کیا۔ ماروی نے جلتی آگ پر چل کر اپنی پاکدامنی کا ثبوت دیا۔ اور نوری جام تماچی کی قبریں ٹھٹھہ میں کینجر جھیل کے اندر ہیں۔ افریقا او افریقا معلوماتی تحریر ہے۔ مختار آزاد تلاشِ مرقد میں قلوپطرہ کی داستان بڑی ہی شاندار تحریر کی ہے ایسی ہی تحریریں سرگزشت کی جان ہیں۔ شکیل صدیقی صاحب کا نصیب خفتہ پڑھ کر حالات کی ستم ظریفی پر سوچتے رہے، کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہونے والا۔ مصنف محبت کے لیے ترستا ہی رہا اور جب دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ اور دل دونوں خالی تھے بہت اچھی اور افسردہ کرنے والی تحریر کیا یہ مصنف واقعی بدنصیب تھا اگر سمجھ میں آجائے تو اپنے تبصرہ میں ضرور ذکر کردیں شکریہ۔ اب ذکر ہو جائے ایک ایسی باہمت اور دلیر خاتون کا جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہوگا۔ ابن کبیر کی تحریر کالی قسمت' خاتون بی بی قریشی کی عزم، استقلال کی داستان، فخر کرنے کے قابل بی بی قریشی رمضان شریف میں 14 اگست کو بی بی قریشی دنیا تو چھوڑ گئیں مگر ہم جیسے پڑھنے والوں کو صدا یاد رہیں گی' صدہا سلام ... ہمت اور استقلال کی اس بیٹی کو اور سلام سرگزشت والوں کو جو اپنے پڑھنے والوں کے لیے کیا خوب داستانیں شائع کرتے ہیں۔ امجد کی تلافی اور روبینہ نفیس انصاری کی قسمت زبردست رہی۔''

☆ عبدالقیوم نے سرگودھا سے لکھا ہے ''کسی رسالہ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ مارچ کے مہینے کا پورا سرگزشت میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ یقین کریں میری جو حالت یہ رسالہ پڑھ کر ہوئی ہے اور کوئی کہانی یا رسالہ پڑھ کر نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس رسالہ میں جھوٹی اور فرضی کہانیوں کی بجائے سچ پر مبنی کہانیاں اور دوسروں کے تجربات ہوتے ہیں جنہیں اگر کوئی سمجھنا اور سیکھنا چاہے تو اس کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مارچ کے مہینے کے رسالہ میں کہانی جرم پڑھی، یقین کریں کہ دل بہت رویا کہ قسمت بھی کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ اتنا بڑا سانحہ ہو ہی گیا تھا تو سہیل کی دلہن تک یہ بات پہنچائی جانی تھی کہ وہ اس حادثہ کا سہیل سے کوئی ذکر نہ کرے۔ خیر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے سبھی کہانیاں نہایت اچھی ہیں خاص طور پر سراب کا تو جواب ہی نہیں ہے۔''

☆ معراج الدین کا خط مردان سے ''اداریے میں مدیرِ اعلیٰ صاحب ملکی حالات پر دل گرفتہ نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ وطنِ عزیز پر اپنی رحمتیں نچھاور فرمائیں۔ وطن عزیز عجیب وغریب صورتِ حال سے دوچار ہے۔ شہریوں کی قتل وغارت اور شہادتیں رکنے کا نام نہیں لے رہی ہیں۔ مرنے والوں کو اپنا قصور معلوم نہیں اور مارنے والے اپنے مارنے کے جواز اور وجہ سے بے خبر ہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں خود سازی کے پیکر مولوی محبوب عالم سے متعارف ہوئے۔ شہرِ خیال حسبِ معمول بہت پُررونق تھی۔ اعجاز حسین انکل لاجواب تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ طاہرہ گلزار، تو لگتا ہے ہمیں بھول گئیں۔ پوچھتی تک نہیں لیکن میں مردوں کے بارے میں ان کے نظریے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ کچھ برے اور قصوروار مردوں کی وجہ سے پوری صنف کو برا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اگر سورہ نساء کی تیسری آیت میں دو تین اور چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے تو اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں کہ اگر تم کو ڈر ہے کہ انصاف نہیں کرپاؤ گے تو ایک ہی شادی کیا کرو۔'' سدرہ بانو باجی کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ شاہ رخ خان قیامِ پاکستان کے 18 سال بعد 1965ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ہیں۔ ابن مقبول اور شاہد جہانگیر پشاوری بھی مفصل اور خوبصورت تبصروں کے ساتھ حاضر ہوئے۔ مہوش باجی بھی غیر حاضری کے بعد بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئیں ان کے پرچے کے مس ہونے کا ہمیں بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر روبینہ صاحبہ کا تبصرہ بھی بہترین تھا لیکن مردوں کے بارے میں وہ بھی طاہرہ باجی کی ہم خیال ہوگئی۔ اب آتے ہیں تحریروں کی طرف، باب درخشاں، میں میاں عبدالعزیز جو کہ تحریک آزادی کا ایک قدآور نام ہے کہ بارے تفصیلاً پڑھا اور ان کی زندگی کے نشیب وفراز سے آشنا ہوئے۔ ''کالی قسمت'' میں بی بی قریشی سے متعارف ہوئے۔ تعلیمی میدان میں ان کی محنت لگن اور جذبہ اس دور کی نوجوان لڑکیوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ میں سپر اسٹار گل حمید سے متعارف ہوا ان کی کامیابیوں کے سفر کے بارے میں پڑھا۔ پیر پیائی تو ہمارے گاؤں بتی (آبائی) کے کافی قریب ہے۔ کبھی موقع ملا تو انشاء اللہ ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے ضرور جائیں گے۔ لازوال محبتیں میں محبت کی داستانوں سسی پنوں، سوہنی مہینوال، عمر ماروی کے بارے میں مختصراً پڑھا۔ افریقا او افریقا میں الطاف شیخ صاحب کا بہترین سفرنامہ پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ ہیں۔ سراب کی 71 ویں قسط بھی بہترین تھی۔ تلافی، اچھی تحریر تھی لیکن افشاں عجیب وغریب مزاج کی لڑکی تھی۔ جس کا دل ایک جگہ نہیں رکتا تھا۔ چور، میں چور بندر کافی ہوشیار تھا۔ لیکن چوری کی وجہ سے تایا ابوسدھر گئے یہ اچھا ہوا۔ ڈراما، کو میں ایک لاجواب سچ بیانی کہوں گا۔ ابرار واقعی خوش نصیب تھا کہ اس ڈرامے کے ذریعے اپنے خالقِ حقیقی رب کریم کے قریب ہوگئے۔ قصور، ہمارے معاشرے کے منفی پہلوؤں میں سے ایک کی عکاس تھی۔ زلیخا کو میں قاتل اور خونی نہیں بے بس اور لاچار لڑکی کہوں گا۔ جرم میں سہیل کو خودکشی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اور بھی شرعی طریقے ہوں گے اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے۔ قسمت، میں رعنا نے فضول میں خودکشی کی عجیب جذباتی لوگ ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔''

☆ محمد عمران جونانی کی کراچی سے خیال آرائی ''اس مرتبہ سرگزشت پڑھنا شروع کیا تو دل خوش ہوگیا آغاز ہی شاندار رہا...... آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے، ڈاکٹر ساجد امجد کا مضمون پڑھ کر میاں عبدالعزیز صاحب کے لیے یہ دعا دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے، پاکستان کا درجہ ایک مقدس سرزمین کا ہے جس کی بنیاد مخلص اور اللہ والے مشاہیر نے ڈالی، آج جو اس کا حال ہے وہ ہماری اپنی شامتِ اعمال ہے۔ اس کے بعد ذکر کرنا چاہوں گا ابن کبیر صاحب کی تحریر ''کالی قسمت'' کا، بڑا ہی گہرا تاثر چھوڑا اس مضمون نے، انسان کے پاس گھربار، روپیہ پیسا وغیرہ ہونا ہی اس کی عظمت کی دلیل نہیں، اصل عظمت تعلیم کی ہے۔ بی بی قریشی اگر شادی کرلیتیں تو ممکن ہے ان کا انجام مختلف ہوتا۔ معراج رسول صاحب نے امن وامان کی مخدوش صورتِ حال آگ اور حبیب جالب صاحب کا ذکر کیا۔ ابوالحسن اصفہانی روڈ امام بارگاہ کے نزدیک بم دھماکوں نے پرانے زخم تازہ کردیے، جانے کتنے گھرانے ایسے تھے جن سے ایک ہی وقت میں چار پانچ جنازے اٹھے۔ اللہ تعالیٰ خصوصی کرم کرے۔ یک صفحی سرگزشت میں عموی طور پر ایسے ہی افراد کا تذکرہ ہوتا ہے جنہوں نے انتھک محنت اور تعلیم کے زور پر معاشرہ میں نام پیدا کیا۔ مولوی محبوب عالم صاحب نے گھر سے دوری اور محدود وسائل کے باوجود اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ شہرِ خیال کی تو اس مرتبہ سج دھج ہی نرالی تھی، میرا پہلا خط جو اس میں تھا۔ اعجاز حسین صاحب کا تبصرہ پہلے نمبر پر نظر آیا، نہایت جامع لکھا آپ نے، الفاظ کا چناؤ اچھا ہے۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب نے سچ کہا ہمارے ہاں ایسے لوگوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل ہے جن کو اس امانت کی اہمیت کا ادراک نہیں، ان میں وہ بھی شامل ہیں جو صرف پارٹی کا نام دیکھ کر ووٹ دیتے ہیں۔ نینا قیصرانی کا خط مختصر ہے مگر جس باریک بینی سے آپ ''آپ بیتیوں'' کا مطالعہ کرتی ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ اعجاز حسین سنمار صاحب آپ نے اس مرتبہ ''سراب'' کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ جب میں نے سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا اس کی کافی قسطیں گزر چکی تھیں چنانچہ مجھے شدت سے کسی نئے سلسلے کے آغاز کا انتظار ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ، مردوں کے

متعلق آپ کے خیالات سے میں کسی حد تک متفق ہوں کیونکہ عام طور پر مرد اپنے آپ کو طاقتور سمجھتا ہے اور طاقت کا نشہ انسان کو ظلمت کی گہرائیوں تک لے جاتا ہے۔ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب! اللہ کی لاٹھی واقعی بے آواز ہے اللہ سب کو سمجھ دے۔ ڈاکٹر ایم اے ملک! سر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مضمون کی دلچسپی اپنی جگہ لیکن تواریخ کا حوالہ ضروری ہے اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ سچ کہا زیادہ تر لوگ نام کے مسلم ہیں۔ رانا محمد شاہد صاحب! حقیقت ہے اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں اگر 300 کی کتاب مہنگی لگے تو کیا کہہ سکتے ہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد نے آفاقی صاحب کو آخری مغل کا درجہ دیا اور فلم انڈسٹری کے زوال پر تفصیل سے قلم اٹھانے کو کہا، اس مطالبے میں بندہ آپ کے ساتھ ہے۔ مہوش رفیق صاحبہ آپ کا بے ساختہ انداز مجھے پسند آیا ٹھیک ہی کہا آپ نے، جو جس جگہ ہے وہیں پریشان ہے قربِ قیامت ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری صاحبہ کا خط سب سے آخر میں تھا مگر مجھے سب سے زیادہ پسند آیا، میں آپ سے متفق ہوں کہ اگر شہرِ خیال کا ایک خاندان جیسا امیج بحال ہو جائے تو کیا کہنے۔ شاہ رخ خان کے پاکستانی کزنز کی داستان مزہ دے گئی۔''

☆ رانا محمد سجاد کا تبصرہ مظفر گڑھ سے ''مارچ کا مہینا اس بار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس بار ارضِ پاک کی نیک نام حکومت ملک سے اپنا اقتدار سمیٹ رہی ہے۔ قوم کو کچھ دنوں تک سکون کا سانس لینا میسر ہوگا۔ کہنے کو تو بہت جی چاہتا ہے لیکن سانحہ عباس ٹاؤن کو یاد کر کے ہی انسان غمزدہ ہو جاتا ہے کہ آخر اتنا بڑا سانحہ، پچاس کے قریب افراد مارے گئے اور موجودہ حکومت پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے کارناموں کو دہراتی رہی۔ کسی کے کان پر جوں نہ رینگی خدا جانے کیسی بے حسی ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اہالیانِ کراچی کے لیے ہر دن اور ہر رات ایک خوفناک عذاب لیے ہوئے آتی ہے۔ شہرِ خیال کا رخ کرتے ہیں اعجاز حسین کی تشریف آوری، کافی عمدہ تبصرہ تھا۔ حکمرانوں سے آپ کسی قسم کی امید مت رکھیے۔ خالق بھٹی صاحب یہ قوم ہر عمدہ چیز کو غلط طریقے سے استعمال کرنے کی ماہر ہے۔ باقی رہا ووٹ کا معاملہ، کچھ لوگوں کے نزدیک الیکشن کا دن تو چھٹیوں کے مانند ہوتا ہے۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کا حسبِ معمول شاندار تبصرہ۔ طاہرہ گلزار صاحبہ ''مردنامہ'' پڑھتی نظر آئیں۔ کوشش کریں کہ رسالے پر تبصرہ ہو۔ ابنِ مقبول جاوید صدیقی کافی عرصہ بعد تشریف لائے۔ جناب مستقل مزاجی سے حاضری دیا کریں۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ایم اے ملک دیارِ غیر میں بھی سرگزشت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، بہت خوب آپ کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، تبصرہ مختصر تھا۔ ہمارے قریب سے رانا فیصل جاوید کا تبصرہ مختصر اور شاندار تھا۔ سراب سے متعلق آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ فہیم صدیقی کی تجویز پسند آئی۔ دیکھتے ہیں کب پوری ہوتی ہے۔ طاہر الدین بیگ کی باتیں کافی تلخ تھیں آفاقی صاحب ضرور جواب دیں۔ ڈاکٹر ایم، آر ڈی کا تبصرہ، پسند آیا۔ عمران جونانی نے کراچی سے لکھا امید ہے آپ مستقل حاضری دیں گے۔ رانا محمد شاہد کا تفصیلی تبصرہ پسند آیا۔ شاہد جہانگیر پشاور، جناب آپ جب چاہیں تشریف لائیں کون روک سکتا ہے۔ پشتو فلمیں تو اب ایک گالی بن کر رہ گئی ہیں، وہی پنجابی فلموں والی صورتِ حال ہے۔ مہوش رفیق صاحبہ خدا سے دعا صدقِ دل سے کریں کہ آپ لوگوں کی مشکلات کو ختم کرے۔ اخبارات میں نجی چینلز پر صورتِ حال دیکھ کر بس آپ لوگوں کی سلامتی کے لیے دعا ہی نکلتی ہے اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔ خدا کرے کراچی کی رونقیں بحال ہوں۔ وہاں بھی امن کا سورج طلوع ہو۔ آمین۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب آپ تو عید کا چاند بن گئیں ہیں۔ حاضری دیتی رہا کریں تبصرہ تو آپ کا اچھا ہی ہوتا ہے۔ یک صفحی سرگزشت میں محبوب عالم صاحب کا ذکر کافی پسند آیا۔ ماسٹرز میں صحافت کا اختیاری مضمون تھا۔ پڑھ کر ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ بابِ درخشاں، میں تحریک پاکستان کے ایک نامور کارکن کا تذکرہ پڑھنے کو ملا اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو اپنی رحمتوں کا مرکز بنائے آمین ''کالی قسمت'' ابن کبیر کی شاندار تحریروں میں سے ایک اور تحریر بی بی قریشی صاحبہ اتنی نامور ماہر تعلیم اتنی خاموشی سے چل بسیں اور ان کے جیتے جی کسی نے قدر نہ کی PHD کرنے والی پہلی خاتون پاکستان اسے پتا نہیں تھا کہ یہاں جعلی ڈگری والوں کو قوم سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اعلیٰ ترین عہدے بھی دیتی ہے کاش ان سے کوئی کام لیا جاتا۔ ان کی شایانِ شان قدر کی جاتی۔ بٹی، ایک ایسے شخص کی عبرت آمیز کہانی جو اس صدی میں بھی جاہلیت کی سوچ رکھتا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ جلد ہی عقل آ گئی ورنہ تمام عمر پچھتانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ جرم، ایک اور شمارے کی بہترین سچ بیانی ثابت ہوئی سہیل جو کہ دوسروں کی عزتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا بالآخر اسے عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ آخری سچ بیانی خاص تھی۔''

☆ سعید احمد چاند کا مکتوب کراچی سے ''تین چار مہینوں کی غیر حاضری کے بعد اس امید پر کہ شہرِ خیال میں داخلہ مل ہی جائے گا۔ روبینہ نفیس کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ یاد آوری کا شکریہ! میں بھی انہیں اپنے ہر خط میں یاد کرتا ہوں۔ آج کل میرا شہر کراچی خاک و خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ دس پندرہ لاشے گرنا تو ایک معمول کی بات ہو گئی ہے۔ کسی کی زندگی محفوظ نہیں ہے سوائے حکمرانوں کے لیکن اس دفعہ تو کراچی، کوئٹہ اور پشاور دہشت گردوں کی لسٹ پر سرِفہرست ہیں ابھی سانحہ بلدیہ ٹاؤن نہ بھولے تھے کہ عباس ٹاؤن کا وہ دلدوز واقعہ رونما ہوا جس میں سو افراد موت کی نیند سو گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب کیا ہو جائے۔ روشنیوں کا شہر اندھیروں میں ڈوب گیا۔ آنے والی حکومت کیا گل کھلاتی ہے، پتا نہیں۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ حالاتِ حاضرہ کے تحت بہت اچھا تھا۔ خودساز میں مولوی محبوب عالم کے متعلق تفصیل سے پڑھا۔ میں جب بھی لاہور جاتا تو سوچتا تھا کہ اس علاقے کا نام پیسہ اخبار کیوں پڑا۔ اب سمجھ میں آیا کہ مولوی محبوب عالم کے اخبار پیسہ اخبار کے نام پر اس علاقے کا نام پڑا ہے۔ طویل تبصروں میں اعجاز حسین لدھیانوی، اعجاز حسین سٹھار، ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی، شاہد جہانگیر شاہد، مہوش رفیق، ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری، رانا محمد شاہد بورے والا۔ طاہرہ گلزار کے تبصرے اچھے تھے۔''

☆ رانا فیصل جاوید کا تبصرہ علی پور سے ''اغیار کی سازشوں اور آستین کے سانپوں کی ڈسی ہوئی پاکستان کی عوام کٹ رہی ہے، مر رہی ہے، روزگار ختم، کاروبار ختم، چار سو دہشت گردی کا غلبہ ہے۔ نام نہاد حکمران جان بوجھ کر عوام کو روند رہے ہیں۔ ہمارے کراچی کو بالخصوص اور پورے پاکستان کو بالعموم تباہ کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں کراچی میں ایک اور خودکش بم حملہ ہوا۔ کئی ماؤں کے جگر گوشے، گھر کے سائبان، بہنوں کے بھائی، دلہنوں کے سہاگ اُجڑ گئے۔ ہم اغیار کی بوئی ہوئی فصل کاٹ رہے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا اس وقت تک جب تک ہم اغیار کی غلامی نہیں چھوڑتے اور آستین کے سانپوں کا منہ نہیں توڑتے۔ محبوب عالم کے ''پیسہ'' اخبار نے بھرپور مہم چلائی تھی اور انگریزوں کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی پاداش میں پریس ضبط بھی ہوا تھا۔ اعجاز حسین، ایم اے خالق، ابنِ مقبول، شاہد جہانگیر، رانا شاہد روبینہ نفیس، طاہرہ گلزار کے شاندار تبصرے تھے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ مردوں کو کوستی نظر آئیں۔ میں ان کی بات سے متفق ہوں۔ آج کے دور میں مرد بڑے ہرجائی ہیں۔ عورتیں بھی ان سے کم نہیں۔ معاشرہ ہی ہرجائی ہے۔ بابِ درخشاں کے میاں عبدالعزیز دل میں اتر گئے۔ افسوس کے ہم ایسی عظیم شخصیات کے بارے میں کم جانتے ہیں۔ سرگزشت کا شکریہ کہ تحریکِ پاکستان کے اس عظیم سپاہی سے نسلِ نو کو آشنا کیا۔ بی بی قریشی خوش قسمت تھی جو 14 اگست اور بابرکت مہینے رمضان میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔ ہمارے معاشرے میں یہی خامی ہے کہ ہم قوم کے لئے باعثِ فخر بننے والے افراد کو ان کا مقام نہیں دے پاتے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری، کراچی کا خط آخر وقت میں جب پرچہ پریس جا رہا ہے ''آج 3 مارچ ہے اور دل بہت اداس ہے ایک بار پھر دہشت گردوں نے شہر کراچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا عباس ٹاؤن میں ہونے والا دھماکا کتنے ہی گھروں کے چراغ گل کر گیا جہاں عورتوں کے سروں سے سائبان چھینا گیا وہیں جانے کتنی ماؤں کی گودیں سونی ہو گئیں۔ ایک قیامت ہی تو تھی جو شہر کراچی کے لوگوں پر ٹوٹ پڑی جو بے گناہ اور ہنستے مسکراتے چہروں کو پل بھر میں مٹی کے حوالے کر گئی اور محسن نقوی کا شعر بازگشت کی طرح چار سو گونجنے لگا کٹی پھٹی لاشوں کو دیکھ کر محسن، مجھے یقین ہے خود موت بھی رو پڑی ہوگی، یہ شاعر بھی کتنا حساس دل رکھتے ہیں مگر ہمارے حکمرانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی روشنیوں کے شہر کراچی کو تاریکی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے کوئی پرسانِ حال نہیں۔ دہشت گردی کا واقعہ ہوتے ہی شہر بھر میں ہڑتال اور سوگ کا اعلان کر دیا جاتا ہے مگر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ہڑتالیں اور سوگ ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہم اہلِ کراچی تو امن کے متلاشی ہیں دعا ہے کہ شہرِ کراچی میں بارود کے بجائے محبتوں کی فضا قائم ہو اور شہدا کے درجات بلند ہوں آمین۔''

☆ اختر صبا نے بنوں سے لکھا ہے ''اکتوبر کے بعد ہر بار اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی بزمِ شہرِ خیال میں دستک نہ دے سکا۔ کیونکہ وقتِ حالات نے ہمیں اپنی زلف کی زنجیروں میں قید کر رکھا ہے اب بھی زلف قید کی زنجیر میں لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ 10 اپریل سے میرا MS فرسٹ ٹرم کا ایگزام شروع ہو رہا ہے معراج رسول صاحب ہر بار اک ایسا موضوع لے آتے ہیں جس پر پورا دیوان لکھا جا سکتا ہے جیسے مسلم ممالک اور مغربی پالیسی، کفر اور اسلام کی جنگ تو ازل سے سے ابد تک جاری رہے گی۔ ہم روز پالیسیاں بناتے ہیں لیکن یہ پالیسیاں ہماری کس کام آئیں''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پشاور سے نامہ خلوص ''اس مرتبہ میرے پیارے سرگزشت میں میرا آرٹیکل سپر اسٹار، شائع ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہرِ خیال کے دوستوں نے خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے تحریک پاکستان کے ایک عظیم مجاہد میاں عبدالعزیز کا زندگی نامہ تحریر کر کے میاں صاحب کی یادوں کو دلوں میں تازہ کر دیا۔ بہت بہت شکریہ! ڈاکٹر صاحب۔ ابن کبیر صاحب نے بھی تحریک پاکستان کے حوالے سے کالی قسمت، تحریر کر کے اس تلخ حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں اہلِ علم کی قدر افزائی میں بتدریج کمی واقع ہوتی جا رہی ہے یہی وجہ ہے کہ وطنِ عزیز اہلِ کمال افراد سے خالی ہوتا جا رہا ہے کیونکہ یورپی ممالک ان کے قدردان ہیں اور منہ مانگے معاوضے اور ہر قسم کی سہولتیں انہیں دے کر لے اڑتے ہیں اور پاکستان میں تو اب تعلیم صرف ڈگریوں اور ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ ہی بن کر رہ گئی ہے۔ آخر میں میں اپنی تحریر سپر اسٹار، کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اپنے پیارے سرگزشت، کے لیے یہ میری پہلی کاوش تھی۔ اصلی تبصرہ تو قارئینِ سرگزشت ہی کر سکیں گے۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری بھکر سے لکھتی ہیں ''مارچ کے سرگزشت کا اتنی بے چینی سے انتظار تھا کہ بار بار ثاقب جی کو کال کر کے پوچھ رہی تھی۔ آخر کار میری بے چینی اس وقت خوشی میں بدل گئی جب میرا دیور عامر رسالہ لیے گھر میں داخل ہوا۔ میں نے جھٹ سے رسالہ عامر کے ہاتھ سے لیا اور جلدی جلدی اپنی کہانی دیکھ کر سکون کی سانس لی۔ مجھے انتظار ہے کہ میری تحریر آپ لوگوں کو کیسی لگی۔ شہرِ خیال میں سب کے تبصرے پسند آئے پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، کہانیوں میں ابھی تک صرف بٹی پڑھی' بہت لاجواب کہانی ہے۔''

☆ حافظ محمد شہزاد سرگودھا میڈیکل کالج نے فون پر سراب کے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس طویل داستان کا ہر لفظ کاشف زبیر ہی لکھ رہے ہیں۔''

تاخیر سے موصول خطوط

صوبی شاہ، ہری پور۔ طارہ گلزار، پشاور۔ ثمینہ کوثر لطیف، سرگودھا۔ غزالہ شاہ، لاہور۔ احمد ہمدم، شیخوپورہ۔ ناصر احمد وحشی، سکھر۔ نعمان صدیقی، باسط ارباب خان، کراچی۔



فرزندِ فرنگ

ڈاکٹر ساجد امجد

ہم ایک آزاد ملک کے ازاد شہری ہیں۔ غلامی کے عذاب کیا ہیں ہمیں کیا پتا۔ آزادی کی نعمت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں ماضی کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی وہ ظالم انسان تھا جس نے برصغیر کے لوگوں کو محکوم رکھنے کے لیے کیسی کیسی سازشیں کیں۔ کس کس طرح اس نے برطانوی سرکار کو بڑھایا یہ بھولنے والی باتیں نہیں ہیں۔

ہمارے ایامِ غلامی میں اضافہ کرنے والے ایک سرخیل کا زندگی نامہ

اسکاٹ لینڈ کا وہ علاقہ نہایت شاداب تھا۔ دریائے ایسک کے جنوبی کنارے پر بنی ہوئی عمارت ڈلہوزی کیسل نے اس علاقے کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ یہ مکان سرخی مائل پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ یہ اس مقام پر واقع تھا جہاں سے ریلیں کا کپن کی بستی سے گزرتی ہوئی ایڈنبرا میں داخل ہونے کے لیے رفتار ہلکی کرنے سے پیشتر ایک قریبی ڈھلوانی مقام سے نیچے کی طرف جاتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس مکان کو سلامی دیتی ہوئی گزر رہی ہیں۔

اس مکان کو اسکاٹ لینڈ کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہ قلعہ بہت خوب صورت تھا بلکہ اس لیے کہ اس خاندان کے ایک رکن نے اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز ششم کی جان بچائی تھی۔

وقت کی رفتار اب فاصلہ طے کرتے کرتے ریمزے ڈلہوزی تک آگئی تھی۔ یہ شخص خاص وضع کا سپاہی تھا اور... بہت بہادر تھا اور کئی جنگیں لڑ چکا تھا۔ اپنی بہادری اور اجداد کے کارناموں نے اس کے نام کے ساتھ لارڈ کا سابقہ تو لگایا ہی تھا لیکن تمام لارڈوں میں نمایاں مقام بھی حاصل تھا۔

کول سٹون ایک دیدہ زیب کرسی پر بیٹھی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔ اپنا اضطراب چھپانے کے لیے اٹھ کر وہ ٹہلنے لگتی تھی اور پھر بیٹھ جاتی تھی۔ اسے یہ اطمینان البتہ تھا کہ اس کا تین سالہ بیٹا جیمز گہری نیند سو گیا تھا اور بڑا بیٹا اپنے کھلونوں میں گم ہو کر شرارتیں کرنا بھول گیا تھا۔

وہ کچھ دیر کو اٹھی اور جیمز کو دیکھ کر واپس آئی تھی کہ اسے اس کا شوہر سرخ رنگ کے عربی النسل گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اس نے کھڑکی کا پٹ بند کیا اور اس دروازے کی طرف بڑھی جس طرف سے اس کے شوہر کو آنا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا شوہر اندر آیا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ آتے ہی کول سٹون سے لپٹ گیا۔

''جانتی ہو، میں اتنا خوش کیوں ہوں؟''

''آپ خوش ہیں، میرے لیے یہی بہت ہے۔ وجہ جاننے کی کیا ضرورت ہے۔''

''مجھے گورنر جنرل بنا کر کینیڈا بھیجا جا رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کیسل (قلعہ) سے جانا ہوگا۔'' وہ ایک دم سے اداس ہوگئی۔

''یہ جدائی عارضی ہوگی۔ اس کی یادیں ہمیشہ ہمارے

ساتھ رہیں گی۔ ہم جلد ہی دوبارہ آکر اسے آباد کریں گے۔''

''جب ہم واپس آئیں گے تو جیمز اتنا چھوٹا ہے کہ اسے یہ مکان یاد بھی نہیں ہوگا۔''

''ہم کینیڈا چل کر اس سے اچھے مکان میں رہیں گے۔''

انہیں بہت جلد یہ مکان چھوڑ دینا تھا۔ کول سٹون پر بھاری ذمے داری آگئی تھی۔ اسے بہت سا ضروری سامان ساتھ لے جانا تھا۔ جیمز اور اس کا بڑا بھائی والدین کے ساتھ کینیڈا آگئے۔

جیمز آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ اس کے والدین کو فکر تھی کہ وہ پستہ قد رہ جائے گا البتہ اس کا سر عام بچوں سے زیادہ بڑا تھا۔ اس لیے اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ اس کے سر میں دو دماغ ہیں۔ اس کا جواب وہ اپنی ذہین باتوں سے دیا بھی کرتا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں سے بھی ذہانت ٹپکتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک رعب سا طاری رہتا تھا۔ باتیں کرنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی کو حکم دے رہا ہے۔ ان خوبیوں اور خامیوں کے باوجود اس کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کا بڑا بھائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔ وہ گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ذہین ہونے کے باوجود اس کا بچپن، بچپن کی شرارتوں سے دور تھا۔ اسی لیے گھر میں اس کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔ جیمز کے باپ نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے بڑے بھائی کے پاس انگلستان بھیج دیا جائے۔ اسے بس یہ ڈر تھا کہ اس کی بیوی اسے خود سے جدا نہیں ہونے دے گی اور واقعی جب یہ مرحلہ آیا تو اس کی بیوی نے طوفان کھڑا کر دیا۔

''میرا ایک ہی تو بچہ رہ گیا ہے۔ یہ بھی چلا گیا تو میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔''

''اس کی بہتر تعلیم کا سوال ہے اور پھر تم سے ملنے آتا رہے گا۔''

''اس کی وہاں دیکھ بھال کون کرے گا۔ یہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

''میں نے اس کے لیے اتالیق کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس کا بڑا بھائی بھی وہاں موجود ہوگا۔ اسے بہترین رہائش اور بہترین ماحول ملے گا۔''

''میرا دل نہیں مانتا۔''

''والدین کو بچوں کے مستقبل کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔''

''میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو آپ کی بیوی ہوں آپ کا حکم تو ماننا ہی ہے۔''

''میں نے کبھی تمہیں حکم نہیں دیا۔ ہمیشہ درخواست کی ہے اور تم نے ہمیشہ میری درخواست منظور کی ہے۔'' کول سٹون نے سر جھکا لیا اور مسکراتے ہوئے جیمز کو انگلستان جانے کی اجازت دے دی۔

وہ دس برس کا تھا کہ اسے ایک چھوٹے جہاز میں انگلستان بھیج دیا گیا اور ''ہیرو'' کی قدیم درس گاہ میں اس کا داخلہ ہو گیا جہاں اس کا بھائی بھی زیر تعلیم تھا۔ ڈاکٹر جارج ٹیلر جو اسکول کا ہیڈ ماسٹر بھی تھا اس کا اتالیق مقرر ہوا۔

اسے اس اسکول میں پڑھتے ہوئے ایک سال ہوا تھا کہ درس گاہ کو دلہن کی طرح سجایا جانے لگا۔ کسی کی آمد پر استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

''بھائی، ہمارے اسکول میں کون آرہا ہے جو اتنی تیاریاں ہو رہی ہیں؟''

''ارے تمہیں نہیں معلوم۔''

''ہیڈ ماسٹر صاحب نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اس اسکول کا ایک سابق طالب علم آرہا ہے لیکن اس کے لیے اتنی تیاریاں؟''

''یہ سابق طالب علم کوئی معمولی آدمی نہیں۔ یہ مارکوئس آف ہسٹینگز ہے جو ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر گیا تھا اور اب واپس آگیا ہے۔ اس کی خدمات میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اس کا یہ تاریخی جملہ سن لو کہ ہمارا مقصد ہندوستان پر برطانوی حکومت کا غلبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہی نیک نیت اور محب وطن انسان درس گاہ ہیرو میں آرہا ہے کیونکہ وہ یہاں کا طالب علم رہ چکا ہے۔''

''بھائی ہمارے لیے کتنے فخر کی بات ہے کہ وارن ہیٹنگز بھی یہاں کا طالب علم رہ چکا ہے۔''

''جیمز، یہ درس گاہ کوئی معمولی اسکول نہیں۔ یہاں سے نکلنے والے طالب علموں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ میں تم سے بھی یہ امید کروں گا کہ دنیا میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دو گے۔'' بڑے بھائی نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن اس نے اسکول میں قدم رکھا تو درودیوار کی سج دھج دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر وارن ہیٹنگز کو آکر کھڑا ہونا تھا اور طلبہ سے خطاب کرنا تھا۔ وہ ان نشستوں پر بیٹھ گیا جو طلبہ کے لیے

مخصوص کی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد بینڈ والوں نے دھنیں بجانی شروع کر دیں پھر ہیڈ ماسٹر اور دوسرے اساتذہ کے ساتھ چلتا ہوا وارن ہیٹنگز پنڈال میں داخل ہوا۔ جیمز نے اسے رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ لمبا تڑنگا وارن ہیٹنگز چہرے پر رعب و جلال سجائے اسٹیج پر آیا۔ جیمز سوچ رہا تھا، یہ شخص بھی کبھی میری طرح چھوٹا ہوگا۔ اسی اسکول میں پڑھتا ہوگا اور آج اس مرتبے پہ پہنچ گیا ہے۔ اسے کتنا فخر ہو رہا ہوگا۔ اگر مجھے موقع ملا اور میں کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا تو اسی طرح اپنا پرانا اسکول دیکھنے آؤں گا۔ اس وقت کے بچے مجھے دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔

وہ اپنے خیالوں سے باہر آیا تو وارن ہیٹنگز طلبہ سے خطاب کر رہا تھا۔ وہ ہندوستان کی تاریخ بیان کر رہا تھا اور برطانوی حکومت کی کامیابیوں کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازِ تقریر ایسا جوشیلا تھا کہ جیمز کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ اسٹیج پر چڑھ جائے اور وارن ہیٹنگز سے ہاتھ ملائے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے خطاب سننے پر اکتفا کیا۔

جب خطاب ختم ہوا تو اعلان ہوا کہ وارن ہیٹنگز طلبہ میں انعامات تقسیم کریں گے۔ وارن ہیٹنگز کی طرف سے دو اشرفیاں فی لڑکا بطور تحفہ دی گئیں۔ ایسا شاہانہ تحفہ پا کر لڑکوں کے دل شکر گزاری کے جذبات سے بھر گئے۔ جیمز کے ہاتھوں میں دو اشرفیاں تھیں اور وہ مرہٹوں کے اس عظیم فاتح کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

کئی دن وہ اسی نشے میں رہا پھر یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ اس خواب سے اس وقت چونکا جب اس کے والد کو ہندوستان کا کمانڈر ان چیف مقرر کر کے بھیجا جانے لگا۔ وہ پچھلے سات برسوں سے ہندوستان کے خواب دیکھتا رہا تھا لیکن اب وہ باپ کے ساتھ ہندوستان نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی تعلیم ادھوری تھی۔ اسے کرائسٹ چرچ آکسفورڈ میں داخلہ لینا تھا۔ یہ قدیم علمی سوسائٹی ان دنوں نہایت ذہین نوعمروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یہی وہ درس گاہ تھی جس کے فارغ التحصیل طلبہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔

اس کا بڑا بھائی باپ کے ساتھ ہند چلا گیا اور اس نے کرائسٹ چرچ آکسفورڈ کا رخ کیا۔

اس ادارے میں اسے کئی ذہین ترین دوستوں کی ہمراہی نصیب ہوئی۔ وہ دل و جان سے حصولِ علم میں مشغول ہو گیا۔ وہ تعلیم کے دوسرے سال میں تھا کہ اس کی ملاقات سوسن سے ہوئی۔ سوسن اس کی ہمسائی تھی۔ یہ گھرانا جیمز کا خاندانی دوست تھا۔ اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سوسن سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا لیکن اتنے دن بعد مل رہا تھا کہ وہ اسے پہلی ملاقات ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ مارکوئس ٹوڈیل کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ تعلیم کے سلسلے میں گھر سے باہر رہی تھی۔ اس لیے جیمز نے اسے بچپن میں دیکھا تھا یا اب دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے کے بعد وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک طویل القامت اور نہایت خوب صورت لڑکی کو دیکھ رہا ہے۔ یہ خوبیاں تو اس پر بعد میں کھلیں کہ وہ فرانسیسی زبان کی ماہر ہے۔ موسیقی میں کمال رکھتی ہے۔ کتوں اور گھوڑوں کی شوقین ہے۔ صرف شوق نہیں رکھتی بلکہ ماہر گھڑ سوار بھی تھی۔

سوسن کی یہ ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تھی۔ یہ مرحلہ اس وقت آیا تھا جب مارکوئس ٹوڈیل نے اسے یہ سوچ کر کھانے پر مدعو کیا تھا کہ اس کے والدین ہندوستان جا چکے ہیں اور وہ ان دنوں اکیلا رہ رہا ہے۔ جیمز پچھلے تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے ٹوڈیل کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے پابندی وقت کا ایسا خیال رکھا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کھانے کی ٹیبل پر پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ ایک پُرتکلف میز تھی جس پر موم بتی شمعیں روشن تھیں۔ اِدھر اُدھر ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ کھانا چن دیا گیا تھا۔ مسٹر ٹوڈیل اور مسز ٹوڈیل تشریف لا چکے تھے۔ تیسرا جیمز تھا لیکن ماحول سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی کسی اور کا بھی انتظار ہے۔ یہ اندازہ اسے اس لیے ہوا کہ اس کے بیٹھنے کے بعد کھانا شروع کرنے کے بجائے مسٹر ٹوڈیل نے اسے باتوں میں الجھا لیا۔ یہ باتیں زیادہ تر اس کی تعلیم کے بارے میں تھیں۔

باتیں کرتے کرتے وہ اچانک رک گئے۔ شاید کسی کے آنے کا اشارہ مل چکا تھا۔ جیمز نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس طرف دیکھا۔ ایک برق سی تھی جو کوند گئی تھی۔ اس کے ذہن میں اچانک ایک نام گونجا، سوسن! وہ چلتی پھرتی بجلی ٹیبل کے قریب آکر ٹھہر گئی اور اس کے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جیمز، تم نے اسے پہچانا؟''

''جی ہاں، اگر میں صحیح پہچان رہا ہوں تو یہ سوسن ہیں۔''

''تم نے تو نہیں پہچانا ہوگا۔ تم بہت چھوٹی تھیں جب یہ کینیڈا چلا گیا تھا۔''

''نہیں ڈیڈی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ میرے حافظے کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔''

''اس کے تو ہم قائل ہیں۔'' مسز ٹوڈیل نے دخل دیا۔ ''جیمز کے خاندان سے ہمارے بہت قریبی روابط رہے ہیں۔ اب میں ان سے کہہ رہی ہوں کہ اپنے ڈیڈی ممی کے ہندوستان چلے جانے کے بعد بھی کبھی ہمیں میزبانی کا موقع دیتے رہیں۔''

اس گفتگو کے دوران سوسن برابر خاموش رہی۔ اس کے والدین اس کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے گنوا رہے تھے اور وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ جیمز البتہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب تو اس گھر میں بار بار آنا ہی پڑے گا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور شروع ہوا تو سوسن کچھ بے تکلف ہوئی اور ایک دوسرے کے مشاغل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ سوسن اس سے اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور جیمز اس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ سوسن نے اس کم عمری میں فرانسیسی زبان پر اتنا عبور کیسے حاصل کرلیا اور موسیقی پر ایسی قدرت کیسے حاصل کرلی۔

''مجھے تو گھڑ سواری پر بھی اتنی ہی مہارت ہے۔ سرکش سے سرکش گھوڑے کو سیدھا کر سکتی ہوں۔''

''کبھی وقت آیا تو اس کا مظاہرہ بھی دیکھ لیں گے۔''

''میں یہ موقع تمہیں جلد ہی دوں گی۔''

وہ وہاں سے رخصت ہوا تو سوسن اس سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے چکی تھی۔

وہ گھر پہنچا تو سوسن اس کے بہت قریب آچکی تھی۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ سوسن کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے پیغام چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوگیا جب سوسن نے اس سے رابطہ کیا اور اسے چائے پر مدعو کیا اور یہ نوید بھی سنائی کہ وہ اس کے سامنے پیانو پر اپنی بنائی ہوئی دھنیں سنائے گی۔ جیمز نے اپنے سوٹوں میں سے سب سے زیادہ شاندار سوٹ زیب تن کیا اور سوسن سے ملنے پہنچ گیا۔ سوسن اس کے انتظار میں گھر کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے جیمز کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔''

''کیسے نہ آتا، اس مرتبہ تو تم نے مجھے مدعو کیا تھا اور وہ بھی موسیقی کی دھنیں سنوانے کے لیے۔''

''ارے اندر تو آؤ۔ میرا پیانو تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' وہ اسے اندر لے آئی۔ گھر کے اندر لگے ہوئے باغ سے گزرتے ہوئے جیمز کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھ میں لیے رہی اور اسی حال میں وہ اسے اس کمرے تک لے آئی جہاں پیانو رکھا ہوا تھا۔

''کیا پیو گے؟''

''پینا بعد میں ہوگا، پہلے تم اپنے پیانو کو آواز دو۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

سوسن نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کیں اور پھر اس کی انگلیاں حرکت میں آگئیں۔ مدھر سُروں نے کمرے میں پھول بکھیر دیے۔ جیمز کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سُروں نے اپنے سفر کی تکمیل کی۔ جیمز کو محسوس ہوا جیسے وہ کہیں چلا گیا تھا اب واپس آگیا ہے۔

''تم کمال کا پیانو بجاتی ہو۔''

''میرا دل رکھ رہے ہو یا واقعی؟''

''مجھ میں یہی ایک اچھی بات ہے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔''

''ایک سچ اور بولو گے؟''

''پوچھ کر دیکھ لو۔''

''میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ یہ سچ تو میری آنکھوں سے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ میں نے آج تک کسی کو اتنا نہیں چاہا جتنا تمہیں چاہنے لگا ہوں۔''

''کیا میں امید کرسکتی ہوں کہ ہم یونہی ملتے رہیں گے؟''

''میں تمہاری امید سے بھی زیادہ تمہیں چاہوں گا۔''

دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور وہ کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً روزانہ ملنے لگے تھے۔ جب موقع ملتا وہ ایک ساتھ گھومنے کے لیے نکل جاتے۔

☆☆☆

جیمز اپنی تعلیم کے آخری سال میں تھا کہ اس کے بڑے بھائی لارڈ ریمزے کا انتقال ہوگیا۔ یہ اس کے لیے معمولی حادثہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے ساتھ بہت سا وقت گزارا تھا اور بھائی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی موت نے جیمز کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ان صدماتی لمحوں میں سوسن نے اسے بڑا حوصلہ دیا۔ سوسن نہ ہوتی تو شاید وہ بالکل ہی بکھر کر رہ جاتا۔

جیمز کو اب سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اعزازی خطاب ملا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آپ کو بہت سے خاندانی فرائض میں گھرا ہوا پایا۔

ان مصروفیات نے اس کی تعلیم پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ آکسفورڈ میں واپس آکر اس نے معمولی سند حاصل کی لیکن اس کے ممتحنوں نے اس کو معمولی پاس سے زیادہ بہتر درجے کا مستحق دیکھ کر اور اس کے مخصوص واقعات پر نظر رکھ کر اس کو اعزازی فورتھ کی سند عطا کردی جو درجہ دوم کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے فرصت ہی فرصت تھی۔ فرصت کے ان دنوں میں سوسن اس کے بہت قریب آگئی۔ اب وہ مختلف جگہوں پر ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ کبھی کسی موزک کنسرٹ میں، کبھی گھڑ دوڑ کے میدان میں۔ پھر ان دنوں سیر و تفریح کے لیے اٹلی بھی گئے۔ اسی سفر کے دوران ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

''ہم دونوں دوست تو بہت اچھے ہیں کیا شادی کے بعد بھی اتنے ہی اچھے رہیں گے۔'' جیمز نے سوسن سے پوچھا۔

''مجھے تمہاری طرف سے دھڑکا رہتا ہے کہ تم کچھ لاابالی سے ہو۔''

''ہر لڑکا ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن میں ہر معاملے میں لاابالی نہیں ہوں۔ مجھے اپنی ذمّے داریوں کا احساس رہتا ہے۔''

''میں تمہارا ساتھ پوری زندگی دوں گی۔''

''ہم واپس جاتے ہی شادی کرلیں گے۔'' اس نے واپس آنے کے بعد سوسن سے شادی کرلی۔

شادی کے بعد اسے سوسن پر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ لاابالی نہیں ہے۔ ایڈنبرا میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ ان انتخاب میں حصہ لے گا اور پارلیمنٹ کا ممبر بن کر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرے گا۔ اس کی اس خواہش پر سوسن بہت ہنسی تھی۔

''اتنے گھاگ سیاست دانوں کے سامنے امیر زادہ کامیاب ہو سکے گا؟''

''ہر کھیل صرف کامیابی کے لیے تو نہیں کھیلا جاتا۔ کھیل کی اپنی بھی تو کوئی حیثیت ہوتی ہے۔''

''کیا تم سیاست کو کھیل سمجھتے ہو؟''

''مشکل کام کھیل سمجھ کر کھیلے جائیں تو آسان لگتے ہیں۔''

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔''

''مجھے یقین ہے تمہاری دعاؤں میں ضرور اثر ہوگا۔''

وہ ان انتخابات میں حصہ لینے کے لیے دو نہایت آزمودہ کار سیاست دانوں کے مقابلے پر آگیا۔ لوگوں کو ایک

سوانحی خاکہ

نام.........جیمز اینڈریو بروِن ریمزے
خاندان.........ڈلہوزی
پیدائش.........181ء
گورنر جنرل (ہندوستان).........1848ء 185ء
وفات.........1860ء

ایسے شخص کی کامیابی پر شروع ہی سے ناامیدی تھی جس کے پر پُرزے بھی ابھی نہ نکلے ہوں لیکن اس کی پرجوش تقریریں اور اس کے استدلال کو سن کر یہ پیش گوئی ضرور کی جاسکتی تھی کہ وہ اب نہیں تو آئندہ کسی اعلیٰ منصب پر ضرور فائز ہوگا۔

اس کی قوتِ ارادی اس کے ساتھ تھی۔ وہ سیاسی جوڑ توڑ سے واقف نہ تھا۔ اسے شکست ہوگئی لیکن اس کے اعتماد نے اسے شکستہ نہیں ہونے دیا بلکہ وہ یہ کہنے مجبور ہوا۔

''میں اب اپنے مشاغل میں مصروف ہونے کے لیے واپس جاتے وقت جو کچھ احساسات اپنے ساتھ .... لیے جا رہا ہوں وہ وہی ہیں جو ہر ایسے شخص کے ہونے چاہئیں جو یہ سمجھ رہا ہو کہ میری محنت رائگاں نہیں جاسکتی۔''

اس سے بھی زیادہ سخت جملہ اس نے یہ کہا۔

''تم لوگ بے وقوف ہو کہ تم نے کاکپن کے لیرڈ (سردار) کی مخالف کی۔''

صرف دو سال کا عرصہ گزرا تھا کہ وہ ہیڈنگٹن شائر کے لیے جہاں اس کی ماں کا بہت اثر تھا پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوگیا۔ ایک نوعمر آدمی کا دارالعلوم کا رکن منتخب ہونا ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس نے رکن منتخب ہونے کے بعد اپنی جائز اہلیت کا ثبوت بھی دیا۔ اس نے ہر وہ کام کیا جو اس کے اختیار میں تھا۔

وہ اس عہدے پر تین سال رہ سکا تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کی زندگی میں یہ ایک اور بہت بڑی تبدیلی تھی کہ وہ اپنے باپ کا جانشین ''ارل'' بن گیا اور دارالعلوم میں اس کے زمانے کا خاتمہ ہوگیا۔

''ارل'' بننے کے بعد اس نے ہر اس مقامی کام کی طرف جو اس کے ہاتھ لگا اپنی پوری توجہ مبذول رکھی۔ 1839ء میں اسکاٹ لینڈ کے کلیسا میں قدامت پرستوں کا نمائندہ بن کر داخل ہوا۔ وہ قدامت پسند تھا لیکن طبعاً روشن خیال اور غیر جانب دار تھا لہٰذا دین کے معاملے

میں اصلاح پسندوں کا ساتھ دینے لگا اور قدامت پسندوں کی مخالفت مول لے لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان کارروائیوں میں شمولیت سے انکار کردیا جو بالکل نئی بدعات کا باعث تھیں اور جن کا نتیجہ اس کے نزدیک نفاق کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ اس طرح اصلاح پسند بھی اس کے خلاف ہوگئے۔ ان مخالفتوں کے تناظر میں اس نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا۔

''میں اسکاٹ لینڈ کے قائم شدہ کلیسا کو ہلاک ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔'' اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

اس کی والدہ نہایت بااثر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی موجودگی سے اسے بڑا سہارا تھا لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو قریبی اعزہ اور احباب نے منہ موڑ لیا۔ اب اسے زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا تھا۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن تھی۔ ایک سوسن تھی جو اس کے شانہ بشانہ تھی۔

ان حالات نے اسے اچھا خاصا تلخ کردیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اس کی ماں کی تعزیت کے لیے ملکہ وکٹوریہ ڈلہوزی کیسل میں آئی۔ وہ اس وقت بھی بے پناہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ملکہ کمرۂ ملاقات کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ باہر نظر آنے والے منظر کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''مسٹر جیمز، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جنگلوں میں گھری دور افتادہ پہاڑیاں کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں۔''

''خوب صورت تو لگ رہی ہیں لیکن آپ ایک اور بات بھی جانتی ہیں؟''

''وہ کیا بات ہے؟''

''انگلستان کا وہ آخری بادشاہ جو اس قلعے کے قریب پہنچا تھا، ہنری چہارم تھا اور وہ اگرچہ ہفتوں قلعے کے باہر پڑا رہا مگر آپ جانتی ہیں کیا ہوا تھا۔ اسے ہفتوں داخلہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ آپ تو خوش قسمت ہیں کہ میرے ساتھ اس کمرۂ ملاقات میں کھڑی ہوئی ہیں۔'' یہ نہایت متکبرانہ طنز تھا لیکن ملکہ نے اسے نظر انداز کردینا ہی مناسب سمجھا۔

وہ ملکہ کو رخصت کرکے ڈلہوزی کیسل میں واپس آیا ہی تھا کہ اسے سر رابرٹ پیل کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ سر رابرٹ پیل مجلسِ تجارت (بورڈ آف ٹریڈ) کا نائب صدر تھا۔

جیمز یہی سمجھ رہا تھا کہ رابرٹ پیل بھی دوسروں کی طرح تعزیت کے لیے آیا ہوگا لیکن اس نے کوئی اور ہی بات چھیڑ دی۔

''مسٹر گلیڈ اسٹون نے استعفیٰ دے دیا ہے۔''

''اچھا، مگر یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ یہ تو آپ کے لیے خوش خبری ہے آپ نائب صدر سے صدر بن جائیں گے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ اس عہدے پر کوئی نوجوان اور پُرعزم شخص فائز ہوجائے۔''

''کس کا انتخاب کیا ہے؟''

''اس لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟''

''میں آپ سے مشورہ کرنے نہیں بلکہ یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ صدارت کا عہدہ آپ قبول کرلیں۔''

''آپ کی موجودگی میں؟''

''میں آپ کا نائب ہونے میں خوشی محسوس کروں گا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صدر کو نوجوان ہونا چاہیے۔'' سر رابرٹ پیل نے بالآخر نوجوان جیمز کو اس عہدے کے لیے قائل کرلیا۔

جیمز لارڈ ڈلہوزی نے عہدے پر متمکن ہوتے ہی اپنے پُرعزم ہونے کا ثبوت دے دیا۔ اس نے حالات کا بہ غور جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر آمدورفت کے نئے وسیلے یعنی ریلوے کے نظام کو قومی مسئلہ قرار دے دیا جائے اور اسے عوام کے ہاتھوں سے چھین کر سلطنت کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو انگریزی تجارت کے لیے بے حد آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو محدود ریلوں کے باعث یہ تجارت ہمہ گیر بربادی سے ہمکنار ہوجائے گی لیکن اتنے بڑے کام کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری تھی۔

اس نے اپنی تجویز کا ذکر رابرٹ پیل سے کیا۔ رابرٹ پیل نے اس تجویز سے اتفاق کیا لیکن یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ پارلیمنٹ اس تجویز کو کبھی منظور نہیں کرے گی۔

اپنی اس تجویز پر اس نے رابرٹ پیل سے سخت بحث کی۔ اس کا خیال یہ بھی تھا کہ اس کی تجویز پارلیمنٹ میں منظور ہوجائے گی کیونکہ یہ انگلستان کی بھلائی میں ہے۔

رابرٹ پیل کا اندیشہ درست نکلا۔ جیمز کی تجویز کاغذ تک محدود رہ گئی۔ اس نے مجبور ہوکر انہی ذرائع سے جو اس کے ہاتھ میں تھے، فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ چند ہی ماہ میں ریلوے لائنوں کی تعداد 332 تک پہنچ گئی۔ درخواستیں لے جانے کے لیے جب سال کا آخری دن آیا تو 600 سے

زائد تجاویز اس کی میز پر رکھی گئی تھیں۔ وہ سخت جانفشانی سے ان درخواستوں کو نمٹانے کے لیے برسرِ پیکار ہوگیا۔ صبح ہوتے ہی اپنی کرسی پر آکر بیٹھ جاتا۔ دوپہر کا کھانا بھی اسی میز پر کھاتا اور پھر کام کرنے بیٹھ جاتا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کی اس محنت پر نہ صرف حیران تھا بلکہ تھک بھی گیا تھا۔

وہ شاید کبھی نہ تھکتا لیکن سر رابرٹ پیل نے استعفیٰ دے دیا اور لارڈ ڈلہوزی کو اسکاٹ لینڈ میں لارڈ کلرک رجسٹرار کے عہدے پر مقرر کردیا۔

یہاں اس کی ملاقات لارڈ جان رسل سے ہوئی۔ لارڈ موصوف اس کی قابلیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسے کسی نئی وزارت میں کسی عہدے کے قبول کرنے کے لیے مجبور کرنا چاہا تو لارڈ ڈلہوزی نے انکار کردیا مگر لارڈ جان رسل جانتا تھا کہ یہ شخص ہر وزارت کے لیے قابلِ قدر ہے۔ اس نے اسے ہندوستان کے گورنر جنرل کی پیشکش کردی۔ پہلے تو اس نے اسے مذاق سمجھا اور پھر سنجیدہ ہوگیا۔

''آپ جانتے ہیں، پارلیمنٹ کی شاندار زندگی کا راستہ مجھ پر کھل گیا ہے۔ یہ راستہ مجھے انگلستان کا وزیراعظم بھی بنا سکتا ہے اور آپ مجھے گورنر جنرل پر ٹرخا رہے ہیں۔''

''آپ جہاں ہوں گے وزیراعظم ہوں گے۔''

ڈلہوزی نے اس عزت کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک کہ اس کے سابق قدامت پسند سردار نے گرم جوشی کے ساتھ اس پر اپنی رضامندی کا اظہار نہ کردیا اور فراخ دلی کے ساتھ یقین نہ دلایا کہ اس کے ایسا کرنے سے نہ تو وطن میں اس کی سیاسی آرا پر کوئی اثر پڑے گا اور نہ اس کے سابق دوستوں کے ساتھ باہمی تعلقات پر۔

لارڈ ڈلہوزی مع لیڈی ڈلہوزی اور ایک شاندار اسٹاف کے جس میں اس کا قابل پرائیوٹ سیکریٹری کورٹنی بھی شامل تھا۔

اس وقت تک اس کی دو بیٹیاں سوس اور ایڈتھ پیدا ہوچکی تھیں جنہیں ناگزیر وجوہات کی بنا پر انگلستان ہی میں چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ یہ صدمہ اپنی جگہ لیکن برٹش انڈیا کی خدمت اور برطانوی مفادات کا تحفظ اس کے پیشِ نظر.... تھا۔

اس نے جب کلکتہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا تجربہ صرف یہ تھا کہ اس نے انگریزی ایوانِ تجارت میں چند سال خدمات انجام دی تھیں۔ ہرگز نظر نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی کم عمری اور کم تجربے کے پیشِ نظر مسائل میں گھرے ہندوستان سے نمٹ سکتا ہے۔

وہ جب آیا تو اس نے ملک ہند کو ٹکڑوں میں منقسم پایا۔ شمال مغرب میں ایک جنگجو قوم یعنی سکھ تھے، دوسری جانب شمال مشرق اور جنوب مشرق میں خود مختار ریاستیں تھیں جن کے الحاق کی ضرورت تھی۔ اس الحاق کے بغیر برطانوی سلطنت میں وسعت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے علاقہ تجارت کے لیے نئے وسائل اور تعلیمی منصوبوں کی بے حد ضرورت تھی۔

ڈلہوزی کے پیش رو لارڈ ہارڈنگ نے اسے یقین دلایا تھا کہ جہاں تک انسانی پیش بینی پیش گوئی کرسکتی ہے آئندہ سات سال تک ہندوستان میں ایک توپ چلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

ڈلہوزی خوش قسمت تھا لیکن دفتر سنبھالتے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے ملنے والا یہ عرصہ جدوجہد کا عرصہ ہوگا۔ اسے ہر لمحہ جنگ کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے نہایت پُرسوز تقریر کی۔

''میرا پیش رو معاملات کو تہ تک دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ حملہ کرنے میں تو چست رہتا تھا اور جس شکل میں معاملات اس کے سامنے رونما ہوئے تھے ان کے اسباب پر گہری نگاہ ڈالنے کی پروا کیے بغیر وہ ان کو اسی حالت میں طے بھی کرتا تھا۔ اگر وہ غور کرتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ وہ ایک بوسیدہ نظامِ حکومت میں سفر کر رہا ہے۔

عہد و پیمان اور معاہدوں نے والیانِ ریاست کو برطانوی حکومت کے ماتحت تو کردیا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ مشرقی حکمران کے اپنی رعایا پر خود مختارانہ حکمرانی کے افسوس ناک نتائج کو بلا مداخلت دیکھنے پر مجبور ہیں۔'' اس نے پنجاب کی فتح کی تکمیل کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس نے اعلان کیا۔

''لڑائی کو اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کہ وہ تمام جتھے جنہوں نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں کامل طور پر شکست کھا کر منتشر نہ ہوجائیں خواہ وہ سکھ ہوں یا افغان۔''

اس نے جنرل گلبرٹ کو بارہ ہزار سپاہیوں اور توپ خانے کے ساتھ روانہ کیا۔ سردار شیر سنگھ سامنے آیا اور دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ اس لڑائی میں افغانی فوج بھی شامل تھی۔ سردار شیر سنگھ زیادہ دیر مقابلہ نہ کرسکا اور ہتھیار ڈال دیے۔

برطانوی مفادات میں لارڈ ڈلہوزی کا یہ کارنامہ تھا

کہ اس نے سکھوں کی فوجی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

لاہور کونسل کا اجلاس بلایا گیا جس میں اعلان کیا گیا کہ پنجاب کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر کے دلیپ سنگھ کے لیے پانچ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی جائے۔ پنجاب کا خزانہ اگرچہ خالی ہو چکا تھا پھر بھی ''کوہ نور'' ہیرا انگریزوں کے ہاتھ آگیا۔

اب سوال یہ باقی بچا تھا کہ پنجاب کے ساتھ کیا کیا جائے یعنی اس کے نظم و نسق کے لیے کیا قدم اٹھائے جائیں۔ اس نے پنجاب کا انتظام تین ممبروں پر مشتمل ایک انتظامی مجلس کے سپرد کر دیا۔

اس نے صوبے کو فوراً موزوں اور مناسب اضلاع میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لیے ایک انگریز افسر مع یورپین اور ہندوستانی ماتحتوں کے انتخاب کے بعد مقرر کر دیا گیا اور اس طرح 56 اعلیٰ افسروں کی منتظم جماعت ترتیب دی گئی جن میں کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کو شامل کیا گیا جن میں 29 فوجی افسر اور 27 سول سروس کے افسر تھے۔

''میں پنجاب کو ایک نہایت محفوظ برطانوی صوبہ بنا دوں گا اور اس کی پُرخطر حالت بدل کر اپنی سلطنت کے لیے باعث تقویت بنا دوں گا۔''

اس کے تنظیمی عمل سے سرحد پر قلعوں اور چھاؤنیوں کی ایک قطار بن گئی اور دریائے سندھ کے تمام مغربی حصے کی زبردست محافظت ایک دوسرے سے ملحق فوجی سڑکوں کے ذریعے سے کی گئی۔ اس طرح اس نے وہ راستہ ہی بند کر دیا جو برطانوی ممالک اور افغانستان کے درمیان ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی صوبے کے اندرونی امن کی ضمانت سوار اور پیدل فوجی پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ماتحتی میں علیحدہ سراغ رسانی پولیس کے ذریعے کی گئی۔ اس کے علاوہ چوکیداروں کا پرانا دستور بھی قائم رکھا گیا۔ وادی پشاور اور سرحدی اضلاع میں لوگوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی گئی۔ باقی پنجاب کے لوگوں سے سختی کے ساتھ ہتھیار رکھوا لیے گئے۔

سکھوں کی فوج سے ہتھیار لینے کے بعد اس کو منتشر کر دیا گیا۔ ان میں سے بہت سے سکھ فوجی برطانوی فوج کے پرچم تلے آگئے۔ سکھ قوم کی مرکزی حکمرانی جماعت قطعاً توڑ دی گئی اور اس کے سرداروں اور جاگیرداروں سے ان کی ارضیات چھین لی گئیں۔ ڈلہوزی کی کوششوں سے تین سال کے اندر اندر پنجاب کا بورڈ سچائی کے ساتھ یہ رپورٹ کرنے کے قابل ہو گیا۔

''ہندوستان کے کسی حصے میں اس قدر کامل امن و امان نہ تھا جس قدر ان نئے الحاق کیے ہوئے علاقوں میں۔''

اس عظیم فتح نے اسے یہ سبق سکھایا کہ جب تک آمد و رفت کا نیا طریقہ جاری نہیں کیا جاتا اس وقت تک ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ ہندوستان کا خام مال انگلستان تک بہ آسانی نہیں بھیجا جا سکتا۔

وہ جب انگلستان کی مجلسِ تجارت میں تھا تو اس نے اپنی حکومت کو ریلوں کی ترقی کے لیے تجاویز دی تھیں جو منظور نہ ہو سکی تھیں۔ ہندوستان آ کر اسے ان تجاویز پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنے نو مفتوحہ علاقوں کو ریلوں کے ذریعے مستحکم اور سلطنت کے ہر حصے میں اپنی فوجوں کی جارحانہ قوت کو خوب اچھی طرح بڑھائے بلکہ ہندوستان میں برطانوی سرمائے اور غیر سرکاری انگریزی قوم کے لوگوں کی جانفشانیوں کو فراہم کرنے کے لیے ایسا لالچ دلائے جو کسی سابقہ گورنر جنرل کے خیال میں بھی نہ گزرا ہو۔

اس کی کوششوں سے ایک خطیر سرمایہ شخصی سرمایہ داروں کے ذریعے ریلوں کی تعمیر کے لیے حکومت کی ذمّے داری کی بِنا پر کھنچ کر آ گیا۔ پورے ملک میں ریلوں کا جال بچھ گیا۔

اس نے اپنی حکومت کو لکھا۔

''ہندوستان کو جو تجارتی اور معاشرتی فوائد ان کے قائم ہونے سے حاصل ہوں گے' مجھے کامل یقین ہے کہ وہ تمام موجودہ توقعات سے بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔ یہاں نہایت وسیع قطعات ایسی پیداوار سے معمور ہیں جن کو وہ فروخت نہیں کر سکتے اور ایسے بھی علاقے ہیں جن کی پیداوار قلت کے ساتھ نکلتی ہے۔ تاہم جہاں اس کی ضرورت ہے اگر وہاں پہنچانے کا انتظام ہو جائے تو وہ افراط کے ساتھ لے جائی جا سکتی ہیں۔ انگلستان میں روئی کے لیے چیخ و پکار ہو رہی ہے جو ہندوستان میں خاصی مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس روئی کو بندرگاہوں تک لے جانے کے لیے مناسب ذرائع فراہم ہو جائیں تو اس روئی کی پیداوار کثرت سے ہونے لگے گی۔ یورپ کے مال و اسباب تجارت کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ مال اسی وقت ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا جا سکتا ہے جب ریلوے کا نظام درست ہو۔''

وہ ریلوے کے نظام کو پھیلانے کے لیے دل و جان سے مشغول ہو گیا۔ ان دنوں اس کا عالم یہ تھا کہ سوائے سخت ترین بیماری کے کوئی چیز اس کی جانفشانی کو نہیں روک سکتی تھی۔ تمام دن میز پر کام کرتا تھا اور رات کو اکیلا بیٹھ کر کاغذات کی چھان بین کرتا رہتا تھا۔

لارڈ ڈلہوزی نے اپنی تجارتی اصلاحات کو تمام مشرقی برطانوی ممالک تک وسعت دے دی۔ اس نے ہندوستان کے ساحلوں کو نہ صرف تمام دنیا کے لیے کھول دیا بلکہ روشنی کے میناروں، سمندری پیمائش اور بندرگاہوں میں قیام کے بہتر مقامات تعمیر کر کے ان ساحلوں تک آنے کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔

وہ اپنی کامیابیوں کی دھن میں یہیں تک پہنچا تھا کہ اسے تسخیرِ پنجاب کے بعد برطانوی مفاد میں برما کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔

تقریباً 1824ء سے برما میں انگریزی سفیر رہتا چلا آ رہا تھا۔ یہ شرط ایک جنگ کی صورت میں طے ہوئی تھی۔ اس وقت تو برما کے حکمرانوں نے اس شرط کو قبول کر لیا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انہیں یہ شرط اپنی ہتک محسوس ہونے لگی کہ انگریز سفیر ان کے ملک میں رہے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرے۔ جیسے تیسے اس شرط پر عمل ہوتا رہا لیکن جب برما کا وہ شاہی خاندان تبدیل ہو گیا جس نے معاہدہ کیا تھا۔ جب دوسرا شاہی خاندان برسرِاقتدار آیا تو اس نے انگریز ریذیڈنٹ کے ساتھ ایسا ہتک آمیز سلوک شروع کر دیا کہ وہ تنگ آ کر دارالحکومت چھوڑ کر ''رنگون'' جانے پر مجبور ہو گیا۔

سرکار برطانیہ نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اپنے نمائندے کو واپس بلا لیا۔ اس کے بعد انگریز سوداگروں کے ساتھ برما کی زیادتیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کچھ دنوں تک تو یہ سوداگر برطانوی ساحلی علاقے کے کمشنر کے توسط سے اپنی حکومت تک اپنی شکایات پہنچاتے رہے لیکن جب کوئی حل نہ نکلا تو سوداگروں کا ایک وفد کلکتہ پہنچا اور ڈلہوزی کے دربار تک پہنچ گیا۔ ایک پستہ قد آدمی ... اپنے بڑے سر اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی صحت کسی طرح بھی قابلِ رشک نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کا لہجہ ایسا فیصلہ کن اور متاثر کن تھا کہ وفد کے ارکان جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ان کے مسائل کے حل کے لیے یہ شخص نہایت موزوں ہے۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں اپنے مسائل اس کے سامنے رکھ دیے۔

''سر، ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں معاہدے کی دانستہ خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ اب معاملات اس حد پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر آپ نے حمایت نہیں کی تو آپ کے وفادار ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ نہ صرف ہمارے مال و متاع کا نقصان ہوگا بلکہ برطانیہ کی تجارت پر بھی بے حد برا اثر پڑے گا۔''

وفد کے ایک دوسرے رکن نے اس میں اضافہ کیا۔ ''جنابِ والا، نقصان صرف مال و دولت کا نہیں ہے بلکہ ہماری جانیں بھی خطرے میں ہیں۔ رنگون کے گورنر نے اپنے ماتحت ملازموں سے برملا کہہ دیا ہے کہ برطانوی باشندوں سے لوٹ مار کریں اور جس طرح بن پڑے اپنی ضروریات کے لیے دولت حاصل کر لیں۔ کیا ہماری حکومت اب بھی خاموش رہے گی۔ کیا برطانیہ کی شہنشاہیت اس ذلت کو قبول کرے گی۔''

لارڈ ڈلہوزی نے یہ سنتے ہی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ وہ وفد کے ارکان کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے سوچنے کا انداز یہی تھا۔ وہ خلا میں جھانکتا تھا جیسے کسی گوشے میں مستقبل تلاش کر رہا ہو۔ وہ کچھ دیر کھڑکی میں کھڑے رہنے کے بعد ایک جھٹکے سے مڑا اور ارکان سے مخاطب ہوا۔

''کیا میں تمہیں ایسا آدمی لگتا ہوں جو ایسے مطالبے کی طرف سے روگردانی کروں گا؟''

''ہمیں قطعی ایسی امید نہیں ہے۔''

''میرے عظیم شہریو! میں کیا کوئی گورنر جنرل بھی اس درخواست کے جواب میں خاموشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ میں بہت جلد ایک سفارت برما بھیجوں گا۔''

اس قلیل القامت آدمی سے ملتے ہی پہلے تو ہر شخص مرعوب ہو جاتا تھا بعد ازاں اس پر اعتماد کرنے لگتا تھا اور آخر کار اس کا ایسا پُرجوش مداح بن جاتا تھا جس میں اس کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔

وفد کے رخصت ہوتے ہی اس کا نحیف بدن متحرک ہو گیا۔ اس نے ایک بحری افسر مع تین جہازوں کے ان شکایات کی تحقیق کے لیے رنگون روانہ کیا۔ انہیں یہ ہدایت کی کہ وہ وہاں جا کر نہ صرف اس معاملے کی تحقیق کریں بلکہ یہ بھی کریں کہ اگر تحقیق سے ثابت ہو جائے تو مقامی برمی گورنر

کی موقوفی کا مطالبہ کریں اور اس رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کریں جو سوداگروں سے لوٹی گئی ہے۔

یہ جہاز روانہ ہوئے۔ تحقیق سے یہ ثابت بھی ہو گیا کہ سوداگروں کی شکایات درست ہیں۔ اس کے بعد یہ افسر گورنر سے ملاقات کے لیے گئے۔ گورنر نے ایسی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ کسی مہذب آدمی سے نہیں کیا جا سکتا۔

''گورنر صاحب سو رہے ہیں۔''

اگر وہ سو بھی رہے تھے تو بھی مہمان نوازی کا تقاضا یہ تھا کہ برطانوی بحری سفیر کو مہمان خانے میں انتظار کے لیے کہا جاتا۔ اس کے برعکس وہ جلتی ہوئی دھوپ میں انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا۔ یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا اور بالآخر بحری سفیر مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

دوسری بار بھی ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ کبھی ایک بہانہ کبھی دوسرا بہانہ۔ ان کارروائیوں سے یہ ظاہر ہونے لگا کہ انگریز اسلحہ کے استعمال کے بغیر نہ تو زرتلافی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اپنا کوئی مطالبہ منوا سکتے ہیں۔

اس بحری سفیر نے واپس آ کر لارڈ ڈلہوزی کے سامنے تمام صورتِ حال رکھ دی۔ اب لارڈ ڈلہوزی کے سامنے جنگ کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن اس کی ذہانت اسے اندھادھند جنگ میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔ وہ کئی برس پہلے ہونے والی برما کی جنگ کے بارے میں سن چکا تھا۔ اس جنگ میں ہونے والے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہی اس وقت کی ضرورت تھی۔ برما کی پہلی لڑائی میں ہزاروں اموات تلواروں سے نہیں موسم کی شدت سے ہوئی تھیں، اسے اپنے لوگوں سے گفتگو کر کے ان تجربات کو ان تک پہنچانا تھا۔ فوجیں روانہ کرنے سے پہلے اسے سوچنا تھا۔ یہی اس کا اپنا تجربہ بتاتا تھا۔ اس نے معلوم کیا کہ برما کی کسی مہم میں دشمن کی جنگی قوت اس قدر نقصانات کا باعث نہیں ہے جس قدر اس ملک کے ملیریا اور دھوپ اور بارش کی سختیاں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی نہایت اچھی طرح سمجھ لیا کہ جب تک شہنشاہ برما پر یہ ثابت نہ کیا جائے کہ انگریزوں میں اپنا حق لینے کی قوت موجود ہے۔

اس نے فوج بھیجنے سے پہلے اپنی فوج کے لیے ایسا سامان فراہم کیا جو موسم کا مقابلہ کر سکے۔ اس نے جنرل گڈون کو لکھا۔

''جو احتیاط اور خوراک کے انتظام ہمیں موسم کے مقابلے کے قابل بنانے کے لیے کیے گئے ہیں ان میں والدین کی سی محبت اور نگہبانی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے مکانات ہیں۔ طبی امداد کے لیے ایمرسٹ میں شفاخانے موجود ہیں اور بیماروں کو وہاں تک لے جانے کے لیے انتظامات تک کیے گئے ہیں۔ سمندر کے کنارے لکڑی کی جھونپڑیوں کے ڈھانچے کھڑے کر دیے گئے ہیں اور بہت سے بڑھئی روانہ کر دیے گئے ہیں۔''

سیاسی صورتِ حال کو بھی وہ خوب سمجھ گیا تھا۔ اس نے تاڑ لیا کہ شہنشاہ برما کو چند شکستیں دینے سے فائدہ نہیں ہو گا بلکہ مکمل شکست کی ضرورت ہے۔

اس نے لکھا ''مجھے خوف ہے کہ یہ جنگی کارروائیاں اس وقت تک ختم نہیں کی جا سکتیں جب تک کہ ہم برما کے دارالسلطنت کے دروازے تک نہ پہنچ جائیں۔''

اس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ ''کسی قسم کی مراجعت یا عارضی پسپائی کو ہماری کمزوری سمجھا جائے گا اس لیے میں یہ نصیحت کروں گا کہ جو علاقے فتح ہوں ان کا الحاق ضروری ہے۔'' ان نصیحتوں کے بعد اس نے مدراس اور بمبئی کی مشترکہ افواج کو برما روانہ کر دیا۔

رنگون کا بت کدہ لارڈ ڈلہوزی کی دیگر فتوحات کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ اس بت کدے کے اندر داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی افواج برما کے ہر گلی کوچے میں داخل ہو گئیں۔

برما کی فوج کے آٹھ ہزار آدمی شہر اور رنگون کے بت کدے کی محافظت کر رہے تھے۔ انگریزوں کی تعداد صرف پانچ ہزار تھی۔ برمی فوج کے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کیونکہ بادشاہ نے شادی شدہ سپاہیوں کے بیوی بچوں کو یرغمال بنا کر رکھ لیا تھا۔

حملہ آور افواج تیز دھوپ اور مندر کی بھاری توپوں کی مہلک گولہ باری کے باوجود آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ افواج تقاضا کر رہی تھیں کہ ہلہ بولنے کا حکم دیا جائے لیکن جنرل گڈون اس سے اختلاف کر رہا تھا۔ برطانوی فوجیں چیونٹی کی طرح آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود سخت نقصان اٹھا رہی تھیں۔

پسپائی کی یہ خبریں ڈلہوزی تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ کلکتہ سے جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا تاکہ اپنی فوج کی حوصلہ افزائی کرے۔ موسمی ہوائیں ہرگز اس سفر کے حق میں نہیں تھیں لیکن ڈلہوزی اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود ان ہواؤں سے لڑنے کے لیے سمندر کے سینے پر چلنے لگا۔ وہ دائمی بخار

میں مبتلا رہتا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت ضرور تھی کہ اپنی افواج کے لباس، جائے قیام اور خوراک وغیرہ کا بہ چشم خود ملاحظہ کر سکے۔

وہ رنگون پہنچا تو اس کی افواج مندر کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے آدمیوں کے نقصان کا حساب لگایا تو وہ سخت متفکر ہو گیا۔

''جنرل! جس رفتار سے آپ چل رہے ہیں اس سے تو لگتا ہے منزل تک پہنچتے پہنچتے ہمارا ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کیونکہ سخت گولہ باری کی جا رہی ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے چلنا پڑ رہا ہے۔''

''اس کے باوجود آپ لوگوں کو بچا نہیں پا رہے۔''

''کوشش تو بہت کر رہے ہیں۔''

''آپ ایک دم یورش کیوں نہیں کر دیتے۔ اگر اس وقت ہمارے دس آدمی مر رہے ہیں تو یکدم حملہ آور ہونے سے ایک آدمی مرے گا یا اگر دس آدمی بھی مریں گے تو ہم زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہوں گے۔''

جنرل گڈون اس ناتواں شخص کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اختلاف کیا لیکن زیادہ دیر جما نہ رہ سکا۔ بالآخر اس نے یورش کا حکم دے دیا۔ سپاہی گولہ باری کی بارش میں تنگ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ اتنا شور مچا کہ برمی افواج خوف زدہ ہو گئیں۔ انگریزی سپاہ ایک طرف کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہوئی۔ برما کی فوج دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ان کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ ان عورتوں کو بھی زنجیروں سے آزاد نہ کر سکے جنہیں ضمانت کے طور پر توپوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

اس یورش اور بھگدڑ کو دیکھ کر گورنر نے رنگون چھوڑ دیا لیکن عقل پھر بھی نہیں آئی۔ اس نے کسی نامعلوم مقام سے جنرل گڈون کو یہ تحریر لکھ کر بھیجی۔

''اب بھی وقت ہے کہ تم واپس چلے جاؤ ورنہ میرے سپاہی تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں جانے دیں گے۔ تم نے ہماری سرزمین کو ناپاک کر دیا ہے۔ اب ہم زیادہ دیر تمہارا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔''

اب لارڈ ڈلہوزی کو یقین ہو گیا کہ تمام ساحل پر قبضہ کر لینے سے بھی شہنشاہ برما کا دماغ درست نہ ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جنگ کی کارروائیوں کو ملک کے اندر تک بڑھا دیا جائے۔

اس نے شہنشاہ برما کو کہلا بھیجا کہ اگر تم ہمیں واپس بھیجنا چاہتے ہو تو پندرہ لاکھ روپے اور ساحل بحر پر مرتبائی کا ضلع ہمارے حوالے کر دو۔ اگر یہ شرط قبول نہ کی گئی تو ہم جنگ کا دائرہ بڑھا دیں گے۔ جہاں جہاں برما کی افواج ہیں ان کو شکست دے کر برطانوی فوج مستقر تک پہنچ جائے گی۔

لارڈ ڈلہوزی یہ شرائط بادشاہ تک پہنچانے کے بعد کلکتہ واپس آ گیا اور اس توقع پر آیا کہ بادشاہ ان شرائط پر ضرور غور کرے گا۔

شہنشاہ برما نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جنگ کو اندرون ملک تک پھیلانے کا مرتکب ہو گیا۔ انگریزی افواج فتح پر فتح حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ دارالسلطنت تک پہنچنے کا دریائی راستہ کھل گیا۔ اب یہ فوجیں بہ آسانی دارالسلطنت پہنچ سکتی تھیں۔

لندن میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے فیصلہ دے دیا تھا کہ اگر شرائط قبول نہ کی گئیں تو انتہائی کارروائی کا فیصلہ کیا جائے لیکن ڈلہوزی نے اس سے اختلاف کیا کہ وہ اس کو اعتدال کی حد تک رکھا جائے۔ اس نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کو خط لکھا۔

''دارالسلطنت پر چڑھائی کرنے سے بھی امن و امان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ فوج کو وہاں نہ رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم تمام سلطنت برما پر قبضہ کر لیں۔ کبھی نہ کبھی اس کی ضرورت پڑ بھی سکتی ہے لیکن بہت جلد نہیں۔''

شہنشاہ برما نے شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے لارڈ ڈلہوزی نے پیگو پر آخری قبضہ کرنے کے بعد ایک اعلان کے ذریعے لوئر برما ممالک برطانیہ میں شامل کر کے لڑائی کو بند کر دیا۔

جب شہنشاہ برما نے ان نقصانات اور اہانتوں کی تلافی سے انکار کر دیا تو ہندوستان کے گورنر جنرل کو بذریعہ کونسل بزور شمشیر تاوان وصول کرنے کا ارادہ کرنا پڑا۔

ساحل کے کنارے پر جس قدر قلعے اور شہر تھے ان پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا گیا اور پیگو کے صوبے پر اب برطانوی افواج قابض ہیں۔

اب اس اعلان کی رُو سے مطلع کیا جاتا ہے اب پیگو کا صوبہ مشرقی برطانوی مقبوضات کا ایک حصہ ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

برما کی جو افواج اب تک صوبے میں باقی ہوں گی ان کو نکال دیا جائے گا۔ حکومت دیوانی فوراً قائم کی جائے گی اور مختلف اضلاع کے امور کی انجام دہی کے لیے افسر مقرر کردیے جائیں گے۔

اب کونسل اس بات پر رضامند ہے کہ حریفانہ کارروائیاں روک دی جائیں۔

جس صوبے کو بذریعہ اعلان حکومت برطانیہ نے اپنی ملکیت قرار دیا ہے، اس پر قبضہ کرنے کی خاطر اس نے کوئی جھگڑا کھڑا کیا تو گورنر جنرل کونسل ان اختیارات سے جو اسے حاصل ہیں پھر کام لے کر مظالم جاری رہنے کی صورت میں ان کا پورا پورا انتقام لے گا اور اس کا لازمی نتیجہ سلطنتِ برما کی مکمل بربادی اور بادشاہ کی جلا وطنی کی صورت میں نمودار ہوگا۔

لارڈ ڈلہوزی ایک مرتبہ پھر برما گیا تاکہ وہ اچھی طرح اطمینان کرلے کہ اس کی پالیسی اور طرزِ حکومت پر اچھی طرح عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔

لوئر برما پر قبضہ کرکے اس نے مشرق میں چاول اور ساگوان کی لکڑی کی تجارت کو اہلِ برطانیہ کے ہاتھوں میں سونپ کر اس وسیع اور اجڑے ہوئے ملک کو ایشیا کے نہایت خوش حال اور ترقی پذیر صوبوں میں شمار کروادیا۔

☆☆☆

لارڈ ڈلہوزی کی آمد سے قبل لارڈ ویلزلی کے زمانے میں انگریزی حکومت کے ماتحت دیسی والیانِ ریاست کی حکومت کو برقرار رکھنے کے پردے میں ہندوستان پر برطانوی افواج کے ذریعے حکومت کی پالیسی خوب ترقی کررہی تھی۔ ان ریاستوں میں انگریز کا نمائندہ اور تھوڑی سی فوج ہر وقت موجود رہتی تھی۔

ریاستوں کے حکمرانوں کو خوب موقع مل گیا تھا کہ وہ بیرونی خطروں سے بے پروا ہوکر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔

حکمران وہ تھے لیکن دراصل حکومت برطانیہ کی تھی اور لطف کی بات یہ تھی کہ حکمرانوں کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ ان میں سے اکثر برطانوی اسلحہ کی آڑ میں عیاشی پر کمربستہ تھے۔ جو دانش مند تھے، عیاشیوں سے دور تھے لیکن اسی اصول کا حصہ بننے پر مجبور تھے۔

یہ تو ابتدا کی بات تھی لیکن برطانوی حکومت جیسے جیسے طاقتور ہوتی گئی ویسے ویسے یہ احساس بھی فزوں تر ہونے لگا کہ یہ ریاستیں برائے نام ہی سہی دیسی حکمرانوں کے قبضے میں کیوں ہیں۔

اخبار ٹائمز اداریہ لکھ رہا تھا۔

''اگرچہ ہم تمام ساحل بحر پر حکمران ہیں لیکن ہم نے ابھی تک بہت سے اندرونی زرخیز صوبوں کو دیسی حکمرانوں کی برائے نام حکومت کے سپرد کررکھا ہے۔ اپنے مقبوضہ ممالک پر ان کا حق ہمارے حقوق سے کسی صورت میں بہتر نہیں ہے۔ ہم نے ان کمزور اور نکمے اور برائے نام حکمرانوں کو برے انجاموں سے مطمئن کررکھا ہے۔ ان والیانِ ملک کو ہم نے ایسی قوت عطا کی ہے جو ذمے داری کے بوجھ سے آزاد ہے۔ باوجود ان کی کمزوری، ان کے عیوب اور ان کے جرائم کے ہمارا آہنی پنجہ ان کو تخت پر تھامے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنی رعایا کو ان کی رعایا بنایا ہوا ہے۔''

انگریزوں کی ٹپکتی ہوئی رال کوئی ایسا قانون بنادینا چاہتی تھی کہ یہ ریاستیں پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی گود میں آگریں۔

لارڈ ڈلہوزی نہایت کامیابی سے برطانوی حدود کی توسیع کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ برما کے الحاق کے بعد تو اس کی ہوس کی کوئی انتہا ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے ان ہندو ریاستوں کے الحاق پر غور کرنا شروع کردیا اور کسی ایسے قانون کی تیاری کی بابت سوچنے لگا جس کے تحت وہ ان ریاستوں کو ہڑپ سکے۔ انہی دنوں ہندوستان کی ایک دیسی ریاست ''ستارہ'' کا معاملہ سامنے آیا۔

گورنر بمبئی جارج کلارک کلکتہ آیا ہوا تھا اور اس وقت گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی سے ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا کہ ریاست ستارہ کا ذکر نکل آیا۔ جارج کلارک اس کی توسیع پسندی سے واقف تھا۔ اس نے توجہ دلائی۔

''جناب، ہندوستان میں بہت سی ریاستیں ایسی ہیں جن کے حکمران، حکومتِ برطانیہ کی مدد اور مہربانی سے حق حکمرانی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس احسان کے بدلے میں وہ حکومتِ برطانیہ کے بہت سے قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ اگر ایک قانون یہ بنادیا جائے کہ ان کی حکومت صرف ان کی اولاد کو منتقل ہوگی اور اگر اس راجا کے کوئی اولاد نہیں تو وہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کا حصہ بن جائے گی۔''

''گورنر، تمہاری تجویز تو اچھی ہے لیکن اس پر عمل شاید اتنا آسان نہ ہو کیونکہ ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ صلبی اولادِ نرینہ کی عدم موجودگی میں کسی کو متبنیٰ

بنایا جاسکتا ہے۔ جائداد اس کی طرف منتقل ہوسکتی ہے۔''

''معمولی جائداد اور تاجِ سلطنت میں فرق ہے۔ سلطنت، معمولی مکان یا دکان نہیں کہ کسی لے پالک کو تحفے میں دے دی جائے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ لے پالک اس سلطنت کا اہل بھی ہو۔''

''یہ ہندوؤں کا مذہبی معاملہ ہے۔''

''یہ سلطنتِ برطانیہ کے مفاد کا معاملہ بھی تو ہے۔''

''کوئی ایسا قانون بنا تو مزاحمت ہوگی۔''

''طاقت سے دبایا بھی تو جاسکتا ہے۔ اس وقت ہم انہیں قانون شکنی کی سزا دے رہے ہوں گے۔''

''قانون ایسا بنایا جائے جس کی گرفت میں سب لوگ نہ آتے ہوں تاکہ وہ متحد نہ ہوسکیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً ابھی صرف ان ریاستوں کو اس قانون میں شامل کیا جائے جو ہماری ماتحت سمجھی جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ دوسری ریاستیں بھی اس کی زد میں آجائیں گی۔''

یہ تمام بحث محض اس لیے ہورہی تھی کہ ریاست ستارہ کا راجا لاولد تھا اور اس نے اپنے خاندان کے ایک لڑکے کو متبنیٰ بنالیا تھا۔ اب یہ ظاہر تھا کہ اس کے بعد تاج و تخت اس متبنیٰ کو ملنا تھا۔

لارڈ ڈلہوزی نے فوراً ایک قانون رائج کیا۔

''جب کوئی ہندو کسی ایسی ریاست کا حکمران ہو جو کسی بالاتر سلطنت کے ماتحت ہو یا اس سلطنت نے بطور انعام عطا کی ہو تو ایسی ریاست کی جانشینی کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ متبنیٰ بناتے وقت اس بالاتر حکومت کی منظوری حاصل کرلی جائے مگر ذاتی جائداد اس متبنیٰ لڑکے ہی کو ملے گی خواہ اس بالاتر حکومت نے اس کو متبنیٰ بنانے کی اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ اجازت کی عدم موجودگی میں وہ ریاست بالاتر حکومت کو مل جائے گی۔''

اس قانون کے مشتہر ہوتے ہی ہندو ریاستوں میں کھلبلی مچ گئی تھی لیکن ہوا یہی کہ اس قانون سے صرف وہ ریاستیں متاثر ہورہی تھیں جن کے راجا لاولد تھے اس لیے کوئی خاص آواز نہ اٹھ سکی۔ اس کے علاوہ یہ قانون ان ریاستوں کے لیے تھا جن کے راجا برطانیہ کی مدد سے راجا بنے تھے۔ اس لیے باقی ریاستیں خاموش رہیں کہ ہم اس قانون کی زد میں نہیں آتے۔

ریاست ستارہ اس قانون کی زد میں آتی تھی کیونکہ مرہٹوں کے عام زوال پر سلطنتِ برطانیہ نے اس مرہٹہ ریاست کو قائم کیا تھا۔

اس ریاست کے راجا کا آخری وقت تھا اور وہ اپنے لے پالک کو تخت نشیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اجازت مانگی۔ سلطنتِ برطانیہ نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔ راجا نے اس انکار کے باوجود اپنے لے پالک کو حکومت دینی چاہی۔ اسے راجا کی سرکشی قرار دیا گیا اور ریاست کو برطانیہ کا حصہ بنانے پر غور ہونے لگا۔

لارڈ ڈلہوزی اور اس کے مشیروں نے راجا کے خزانوں اور ذاتی جائداد کے متعلق تو لے پالک لڑکے کا حق تسلیم کرلیا لیکن اس قانون کی رُو سے اس بات کو قبول نہیں کرسکتے تھے کہ ستارہ کی حکومت پر بھی اسے جائز حق حاصل ہوگیا۔

اس نے اپنی حکومت کو لکھا۔

''مجھے صدقِ دل سے یقین ہے کہ ہمارا فرض یہی ہے کہ ریاست کے باشندوں کی بہبودی کے لیے ہم ایک انصاف پرور اور نرم حکومت کا حق محفوظ کردیں لیکن اب اگر ہم راج کو قائم رکھنے کے ارادے سے اسے ایسے لڑکے کے سپرد کردیں جو تاریکی کی حالت میں پلا اور بڑھا ہے جو اتفاقیہ طور پر متبنیٰ کرلیا گیا ہے اور جس کے چال چلن اور اوصاف کا حال نہ اس راجا کو معلوم تھا اور نہ ہم ہی کچھ اس کی بابت جانتے ہیں تو بلاشبہ ایک ادنیٰ اور ایسی حکومت سے سابقہ ہوگا جس کے نتائج مشتبہ ہیں۔''

لارڈ ڈلہوزی دوسرے اور طریقوں سے بھی اپنے دلائل کو اپنی حکومت تک پہنچاتا رہا۔ بظاہر یہ ایک ریاست کا معاملہ تھا لیکن ڈلہوزی جانتا تھا کہ اس ریاست کے بعد فتوحات کے مزید دروازے بھی کھل جائیں گے۔ اس لیے اس نے اس کوشش میں دن رات ایک کردیے۔

ان دنوں ایک اور مصروفیت بھی اس کے اعصاب کو شکستہ کیے دے رہی تھی۔ اس کی چہیتی بیوی سوسن کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں انگلستان میں تھیں۔ سوسن کی دیکھ بھال کے لیے وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دفتری مصروفیات نے خود اسے بھی نڈھال کردیا تھا۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر سوسن کے لیے سوچنے لگا۔ کئی ہفتے ہوگئے تھے۔ سوسن پیانو پر نہیں بیٹھی تھی۔ کلکتہ کے گھڑ دوڑ کے میدان میں ہر شخص اسے پہچانتا تھا جہاں وہ نہایت سرکش گھوڑوں کی ایک جوڑی کو بڑے ٹھاٹ سے ہانکتی ہوئی لے

جاتی تھی مگر اب میدان میں خاک اُڑ رہی تھی۔ وہ بستر پر تھی۔ اس کی فطری شوخی اب بھی نمایاں تھی۔ تکلیف کے باوجود وہ مسکرا رہی تھی لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ زبردستی ہنس رہی ہے۔

ایک جہاز سری لنکا جارہا تھا۔ اس نے سوسن کو تبدیلیٔ آب وہوا کے لیے اس جہاز کے ساتھ سری لنکا بھیج دیا۔ اسے ابھی اپنی وفاداری کے بہت سے امتحانوں سے گزرنا تھا۔

وہ اس روز بھی معمول کے مطابق چھ بجے صبح اٹھ گیا۔ کام کی ابتدا سے قبل انجیل کا ایک باب پڑھا۔ آٹھ بجے ناشتے کی میز پر آگیا۔ ہندوستانی اخبار اس کی میز پر رکھ دیے گئے تھے۔ وہ ناشتا بھی کرتا جارہا تھا اخبارات پر بھی نظر ڈالتا جارہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دفتر کی میز پر سرکاری کاموں کی انجام دہی میں مشغول ہوگیا۔

دوپہر کا کھانا اس نے اسی میز پر کھایا اور پھر کام میں جٹ گیا۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے اسے دفتر سے اٹھنا تھا لیکن چار بجے لندن سے ڈاک آگئی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ایک خط اسے موصول ہوا۔ اس نے ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں جو خط لکھا تھا یہ اس خط کا جواب تھا اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا۔

''ہمارے غور وخوض کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ متفق اور بالکل مطمئن ہیں کہ ہندوستان کے عام قانون اور رواج کے مطابق ستارہ جیسی کوئی ماتحت ریاست حکومت بالاتر کی رضامندی کے بغیر کسی متبنّیٰ وارث تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہم کسی صریح عہد و پیمان کی رُو سے اس قسم کی اجازت دینے کے پابند نہیں ہیں اور عوام کی بہبودی جس کے ہم ذمّے دار ہیں، وہ اسی کے متقاضی ہے کہ اس کی اجازت نہ دی جائے۔ سابق راجا کے متبنّیٰ لڑکے کے جو حقوق لکھائے گئے ہیں وہ ناقابلِ سماعت ہیں اور تمام مدعیوں کے دعوے اس لیے باطل ہیں کہ وہ سابق راجا پرتاپ سنگھ کی اولاد نہیں ہیں جس کے واسطے یہ ریاست بنائی گئی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جانشینوں کی عدم موجودگی کے باعث ستارے کا ملک اسی حکومت کی طرف منتقل ہوجانا چاہیے جس کا وہ عطیہ تھا اور ہماری مرضی یہ ہے کہ اس ملک کا برطانوی ممالک کے ساتھ الحاق کرلیا جائے۔

لارڈ ڈلہوزی کے لیے یہ حکم نامہ بہت تھا۔ اس نے راجا کے درباری متعین ریذیڈنٹ کو لکھ دیا کہ وہ متبنّیٰ کرنے کی کسی ایسی کارروائی کو ہرگز تسلیم نہ کرے جس کی رُو سے لاولد راجا کا حکومت کو دوامی بنانے کا خواب پورا ہو۔

بمبئی کی کونسل نے بھی اس رائے کے حق میں فیصلہ دیا کہ متبنّیٰ کے حق میں ستارہ کی حکومت کو منتقل نہ کیا جائے۔

کلکتہ میں گورنر جنرل کی سپریم کونسل نے بھی یہی فیصلہ برقرار رکھا۔ جیتی جاگتی ریاست ستارہ انگریزوں کے قبضۂ اقتدار میں چلی گئی۔

لارڈ ڈلہوزی نے درست کہا تھا۔ ریاست ستارہ کے الحاق کے بعد اس نے اپنے لیے دروازہ کھول لیا تھا۔ اس دروازے سے داخل ہوکر اور اس قانون کا سہارا لے کر وہ ہر ایسی ریاست پر قبضہ کرسکتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد شمالی ہندوستان کی ریاست ''جھانسی'' میں بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ یہاں کے راجا کے مرنے کے بعد حکومت انگریزی کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وارث نرینہ کی عدم موجودگی میں ریاست کی حکومت متبنّیٰ لڑکے کو ملنی چاہیے یا نہیں۔

راجا کو مرے ہوئے چالیس دن گزرے۔ سوگ کے دن ٹلے۔ آہوں اور سسکیوں سے نجات ملی تو رانی لکشمی بائی (یہی رانی تاریخ میں جھانسی کی رانی کے نام سے مشہور ہوئی جو مدتوں انگریزوں سے جنگ لڑتی رہی) نے دربار کے انعقاد کا اعلان کیا اور پہلی کارروائی کے طور پر متبنّیٰ لڑکے کے حقِ حکمرانی کے لیے لارڈ ڈلہوزی کے نام خط لکھا اور ریاست میں موجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے میجر ایلس کے حوالے کیا۔ اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔

لے پالک لڑکا کم سن تھا اس لیے ریاستی امور رانی نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ گاہے گاہے لارڈ ڈلہوزی کو عاجزانہ خطوط بھی لکھتی رہی۔ تقریباً تین ماہ گزرنے کے بعد لارڈ ڈلہوزی کے احکامات موصول ہوگئے۔ یہ احکامات بھی میجر ایلس لے کر آیا تھا۔

''یہ خط یقیناً انگریزی میں ہوگا۔'' رانی نے میجر سے کہا۔ ''تم اسے ترجمہ کرکے ہمیں سناؤ۔'' میجر نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی، آنجہانی مہاراجا کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ وہ اپنے حقیقی بیٹے کے علاوہ کسی اور لڑکے کو اپنا وارث بناسکے۔ اس لیے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جھانسی کو برطانوی صوبوں کے ساتھ ضم کردیا جائے۔

ہر ہائی نس کو حکم دیا جاتا ہے کہ جھانسی کا قلعہ خالی

کردیں اور شہر میں واقع رانی محل منتقل ہوجائیں۔ انہیں پانچ ہزار بطور پنشن ادا کیے جائیں گے۔''

رانی نے نہایت اطمینان سے یہ خط سنا حالانکہ اطمینان کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس کی دوراندیشی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔

''ہم ان احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہمیں معذور سمجھا جائے۔''

''آپ کے اس فعل کو بغاوت سے تعبیر کیا جائے گا۔''

''ہم حکومتِ برطانیہ کی وفاداری سے انکار نہیں کررہے ہیں۔''

''اس سلسلے میں جو قانون بن چکا ہے آپ اسے ماننے سے انکار کررہی ہیں۔ اگر آپ نے اسے تسلیم نہیں کیا تو قانون اپنا راستہ خود بنائے گا۔ ریاست ستارہ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔''

''زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔''

''جھانسی کو دشمن ریاست قرار دے کر اس پر حملہ کردیا جائے گا۔''

''آپ ہمیں ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی پوری سکت رکھتے ہیں۔''

''میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا لیکن آپ کا ہمدرد ہوں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ آپ کی بربادی کا راستہ ہوگا۔ آپ مقابلہ ضرور کریں گی لیکن فتح یاب ہونا مشکل ہوگا۔ اس وقت ہماری طاقت کا عالم یہ ہے کہ مرہٹوں کا پیشوا ہمارے سامنے سر جھکاتا ہے اور دہلی کے بادشاہ ہماری تعظیم بجالاتے ہیں۔ ہم سے قرض لے کر کاروبارِ سلطنت چلاتے ہیں۔''

''ہمیں قلعہ خالی کرنے کے لیے کتنی مہلت دی گئی ہے۔'' رانی نے استفسار کیا۔

میجر کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ آگئی۔ شاید رانی نے مقابلے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ اسی لیے وہ مہلت کی بات کررہی ہے۔

''خط میں مدت کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بس یہ لکھا گیا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو البتہ یہ لکھا ہے کہ جھانسی کا انتظام و انصرام اب آپ کے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ آپ کے انتظامی اختیارات آج سے سلب کیے جارہے ہیں۔''

رانی خاموش تھی لیکن انگریز نمائندے کو ابھی کچھ اور بھی کہنا تھا۔ ''جھانسی میں موجود سپاہ کے علاوہ دس ہزار سپاہ کی مزید پیش قدمی شروع ہوچکی ہے۔ اگر آپ نے مزاحمت کی تو جھانسی پر حملے میں دیر نہیں کی جائے گی۔'' رانی نے یہ دھمکی بھی اطمینان سے سنی۔ شاید وہ کوئی ارادہ کرچکی تھی۔

دوسرے دن اس نے انگریز نمائندے سے ملاقات کی اور قلعے کی چابیاں اس کے حوالے کرکے شہر میں موجود رانی محل میں منتقل ہوگئی۔

یہ ایک لمبی کہانی ہے کہ وہ جھانسی کو تو نہ بچاسکی لیکن آگے چل کر اس نے باغی بن کر زندگی گزاری اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوادیے۔

☆☆☆

وارثوں کی عدم موجودگی میں ریاستوں کو منتقل کرنے کے اس اصول کو لارڈ ڈلہوزی نے کئی اور ماتحت ریاستوں پر

آصف خاں

2000-1929ء۔ پنجابی ادیب اور شاعر۔ وہ بستی دانشمنداں میں محمد عبداللہ خاں کے ہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کو وطن ثانی بنایا۔ بی اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ 1953ء میں اردو نثر لکھ کر ادبی میدان میں قدم رکھا۔ پھر ایم اے پنجابی کیا۔ 1956ء میں پنجابی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ پنجابی مجلس کے قیام پر اس کے سیکریٹری بنے۔ جنوری 1960ء میں ''پنجابی ادب'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ یہ رسالہ 1970ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے ذریعے انہوں نے پنجابی زبان وادب کی موثر طور پر خدمت کی، مگر مالی مشکلات کے باعث انہیں یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ انگریزی، اردو، فارسی، سندھی، گورمکھی اور ہندی زبانیں جانتے تھے۔ ''اردو دائرۃ المعارف الاسلام'' میں انہوں نے پنجابی زبان کے بارے میں مدلل آرٹیکل لکھا۔ سرکاری مصروفیات کے دوران شاہ حسین کالج اور اورینٹل کالج میں بھی درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ اجو کی کہانی، چونویں کویتا، جنگِ ہند، پنجابی اور پشتو ادب ان کی معروف کتابیں ہیں۔

مرسلہ: شاہد ملک، لاہور

بھی عائد کیا۔
اس قانون پر عمل کرتے ہوئے بندھیل کھنڈ میں واقع جیت پور کی چھوٹی سی پہاڑی ریاست۔ اودے پور، لوئر بنگال کی مغربی سرحد پر اور خاندیش میں پڑاول برطانوی عمل داری میں داخل کر لیے گئے۔ یہی حال تنجور کی ریاست اور قلعوں کا ہوا۔
سندھ کے امرائیں سے ایک کی جاگیر ایک ایسی جعلی دستاویز کے باعث ضبط کی گئی جس کے ذریعے سے اس نے فریب دے کر چند انگریزی اصلاح پر قبضہ کر لیا تھا۔ ملک کے دو ٹکڑے ایک کچھار میں اور دوسرا اڑیسہ میں وہاں کے حکمران کی بدچلنی اور باوجود فہمائش انسانی قربانیوں کو جاری رکھنے کی وجوہات پر ضبط کیے گئے۔
لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کے حکمرانوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اندھا دھند کمپنی کے مقبوضات بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سکم کے ایک حصے پر اس بہانے سے قبضہ کر لیا کہ وہاں دو انگریز افسروں سے بدسلوکی کی گئی تھی۔ ڈلہوزی نے لاولد مرنے والے دیسی حکمرانوں کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کا اصول وضع کیا اور ستارہ، جھانسی، جیت پور اور سنبھل پور پر قبضہ جما لیا تھا۔
اب اس کی نگاہیں ناگپور جیسے وسط ہند کے وسیع ملک پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں پہاڑوں، جنگلات اور میدانوں میں قدیمی باشندوں کے نہایت زبردست خاندان حکمران رہے تھے جنہیں گزشتہ صدی میں مرہٹوں نے پامال کر دیا تھا۔
ناگپور کے راجا رگھوجی بھونسلہ کی وفات کے بعد جانشینی کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا چونکہ وہ لاولد تھا اس لیے اس کی دادی نے اس کے بھائی کے بیٹے کو اس ریاست کا وارث تسلیم کر لیا لیکن ڈلہوزی نے یشونت رائے کو ناگپور کا راجا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لاولدیت کا بہانہ پیش کرتے ہوئے ڈلہوزی ناگپور پر قابض ہو گیا۔
یہی کھیل کرناٹک میں بھی کھیلا گیا۔ اس نے برطانوی قانون کا سہارا لے رکھا تھا۔
”میں حکومتِ ہند کے اس قانون سے پوری طرح متفق ہوں کہ جانشینی موروثی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا تعلق محض ایک شخص کی ذات سے ہے۔ معاہدے میں کسی جگہ وارثوں یا جانشینوں کا ذکر نہیں آیا۔ علاوہ ازیں نواب نے کوئی وارثِ نرینہ بھی اپنے بعد نہیں چھوڑا اور چونکہ اس نے اور اس کے خاندان نے اپنے ذاتی وقار پر بدنامیوں کے داغ لگائے اور خزانہ عامرہ میں سے جو معقول رقم ان کو ملتی تھی اس کو بدکاریوں میں صرف کرتے رہے۔ اس لیے مجلس نظما کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نوابی کے خطاب کو منسوخ کر کے خاندان کرناٹک کے متعدد اراکین کے لیے وظائف مقرر کر دے۔“
اتنی کامیابیوں کے بعد ڈلہوزی نے اپنی نگاہِ حرص مملکتِ آصفیہ پر جمائی۔ ڈلہوزی نے نظام کو توہین آمیز خط لکھا۔ ڈلہوزی نے امدادی فوج کے اخراجات کے لیے نظام سے برار کا علاقہ چھین لیا۔ وہ مملکت آصفیہ پر بھی قابض ہو جاتا اگر سالار جنگ اس کے عزائم کو شکست نہ دیتا۔
لارڈ ڈلہوزی کی یہ ظالمانہ پالیسیاں ہندوستان کو 1857 کے ہنگامۂ غدر سے قریب تر لاتی چلی جا رہی تھیں۔ الحاق اودھ نے اس منزل کو اور بھی قریب کر دیا۔
☆☆☆
لیڈی ڈلہوزی کی صحت پر تبدیلی آب و ہوا نے نہایت اچھا اثر کیا تھا۔ لنکا سے واپس آنے کے بعد وہ بہت بہتر نظر آ رہی تھی۔ رخساروں کی زردی دور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کی چمک بحال ہو گئی تھی۔ عرصہ دراز کے بعد وہ پیانوے پر بیٹھ کر وہی نغمہ چھیڑ رہی تھی جو شادی سے پہلے اس نے ڈلہوزی کو سامنے بٹھا کر چھیڑا تھا۔ ڈلہوزی کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ نغمے نے دم توڑا تو سوسن اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔
”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ہم اس نغمے کے ذریعے ماضی میں پہنچ گئے تھے۔“
”سفر تکلیف دہ ہو تو سانس پھول ہی جاتی ہے سوسن۔“
”کیا تم ترقی کی معراج پر نہیں پہنچ گئے؟“
”سوسن، میں نے تو یہ سوچا تھا کہ زندگی بھر تمہارے نغموں سے لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔ گھڑ دوڑ کے میدانوں میں سرکش گھوڑوں کو تمہارے حکم پر چلتے ہوئے دیکھتا رہوں گا لیکن کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔ سرکاری کاموں میں ایسا گھرا کہ تمہیں بالکل ہی بھول گیا۔ صرف دس سال کے عرصے میں تم اس حال کو پہنچ گئیں کہ پیانو پر تمہاری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔“
”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہوں پھر وہی زمانہ لوٹ آئے گا۔“
”سوچتا ہوں میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا۔ اپنی قوم کو اتنا کچھ دے دیا۔ برطانوی عمل داری کہاں سے کہاں پہنچا دی اور تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا۔“

”میں ہندوستان کے گورنر جنرل کی لیڈی کہلاتی ہوں۔ میرے لیے یہ کیا کم اعزاز ہے۔“

”کاش! میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا۔“ ڈلہوزی نے ایک مرتبہ پھر یہ فقرہ دہرایا اور اسے ایک مرتبہ پھر ماضی کی طرف لے گیا۔

”یاد ہے، تم نے یہ نغمہ جب مجھے پہلی بار سنایا تھا تو کافی بھی پلائی تھی۔ بس یہی فرق آگیا ہے پہلے میں اور اب میں۔“

”ارے ہاں، کافی تو میں بھول ہی گئی۔“

وہ کافی بنا کر لائی اور دونوں کافی پینے لگے۔ سوسن نے اچانک اس سے کہا۔ ”آپ میری ایک بات مانیں گے؟“

”آج تو تم جو کہو گی میں مان لوں گا۔“

”ایڈتھ اور سوس (بیٹیاں) کو دیکھے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔ آپ کہیں تو انگلستان جا کر کچھ دن ان کے پاس گزار لوں۔ میری صحت پر اس سے بھی بہت اچھا اثر پڑے گا۔“

ڈلہوزی نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ ”تم میری مفارقت کے لیے آمادہ ہو۔“

”چند مہینوں میں واپس آجاؤں گی۔“

”میں تمہیں منع نہیں کروں گا لیکن میں بھی اب تھک چکا ہوں۔ میں استعفیٰ دے کر تمہارے ساتھ ہی چلا جاتا لیکن اودھ کا مسئلہ الجھا ہوا ہے۔ اس کے الحاق کے بعد ہمارا نقشہ مکمل ہو جائے گا۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ پھر ہم ساتھ ہی چلیں گے۔“

”نہ جانے آپ کو کتنا وقت اور لگ جائے۔ میں پہلے چلی جاتی ہوں۔ اگر اودھ کا مسئلہ حل ہو جائے تو تم بھی چلے آنا ورنہ میں لوٹ آؤں گی۔“

”تمہیں بھیجتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا دل دھڑک رہا ہے۔“

”کیا تم نہیں چاہتے کہ جب میں واپس آؤں تو پہلے کی طرح شاداب نظر آؤں؟ اور پوچھوں کہ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں اور تم پہلے کی طرح جھوٹ بول کر میرا دل رکھ لو۔“

اس فقرے نے ڈلہوزی کا دل رکھ لیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسنے پر مجبور ہوگیا۔

وہ اس امید پر انگلستان روانہ ہوگئی کہ طویل بحری سفر اور سردی کے شروع میں تندرست ہو کر کلکتہ واپس آجائے گی مگر مادری محبت کی تمنا اس دنیا میں پوری ہونے والی نہیں تھی اور نہ خاوند کی امیدیں پوری ہونے کے لیے تھیں۔ وہ وطن واپس جاتے ہوئے راستے میں مرگئی۔

یہ خبر کلکتہ پہنچی تو کسی میں ہمت نہیں تھی کہ یہ جانکاہ اطلاع ڈلہوزی تک پہنچائے۔ نگاہِ انتخاب اس کے ایک رشتے دار فوجی سیکریٹری میجر ریمزے پر پڑی۔

”یہ سرکاری نہیں خاندانی سانحہ ہے اور آپ اس خاندان کے ایک فرد ہیں۔ یہ خبر آپ ہی اس تک پہنچا سکتے ہیں اور اس ٹوٹے ہوئے آدمی کو سمیٹ سکتے ہیں۔“ میجر ریمزے نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔

لارڈ ڈلہوزی معمول کی سیر کے لیے نکلا تھا۔ واپس آیا تو میجر ریمزے کو اپنا منتظر پایا۔

”میجر تم...... اس وقت یہاں اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟“

”جنرل، خبر اچھی نہیں ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے میں معمولی اعصاب کا آدمی نہیں ہوں۔ جو خبر ہے بلاتردد سنا ڈالو۔ اگر یہ خبر میری قوم کے مستقبل سے متعلق نہیں تو تمہیں ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔“

میجر ریمزے کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا تھا پھر اس نے ڈرتے ڈرتے خبر پہنچانے کی کوشش کی۔

”لیڈی سوسن انگلستان تک نہیں پہنچ سکیں۔“

”مجھے معلوم تھا وہ مجھ سے دور نہیں جاسکے گی۔ راستے ہی سے لوٹ آئی ہوگی۔“

”نہیں جنرل، وہ آپ سے بہت دور چلی گئی ہیں۔ ابھی میرے پاس خبر آئی ہے کہ انگلستان جاتے ہوئے راستے میں ان کا انتقال ہوگیا۔“

ڈلہوزی اس خبر کو سنتے ہی زمین پر گر گیا اور بے ہوش ہوگیا۔ میجر تو تھوڑی دیر کے لیے یہ سمجھا تھا کہ ڈلہوزی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔

اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا اور اس کی بے ہوشی کو شدید صدمے کا سبب بتایا۔

دو دن تک وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑا رہا۔ کسی کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دو دن بعد اس کا پرائیوٹ سیکریٹری اندر گیا۔ اس سے کیا باتیں ہوئیں کسی کو معلوم نہیں۔

اس کی یہ حالت کئی مہینے تک برقرار رہی۔ سیر و تفریح کے لیے نکلنا موقوف ہوگیا تھا۔ نہایت ضروری کام کے سوا وہ ان دو مہینوں میں کسی سے نہیں ملا۔

اس اچانک صدمے نے اس کا اعتبار ہر چیز سے اٹھا دیا تھا۔ کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ ایسے مواقع پر لوگ عام طور پر ہمدردی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ

اس طرف سے بھی بے نیاز ہوگیا تھا۔ ہر ڈاک سے لاتعداد ہمدردی آمیز خطوط اس کے پاس آرہے تھے۔ اس نے کسی خط پر نظرِ التفات نہیں ڈالی۔

”میں جانتا ہوں ان خطوط میں کیا لکھا ہوگا۔ میں انہیں پڑھ کر اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ انہیں کیا معلوم مجھ سے میری زندگی چھن گئی ہے۔“

وہ زندگی سے بہت دور چلا گیا تھا کہ زخم کے مرہم کی طرح اس کی بیٹی سوس کا خط آیا۔ اس خط کو پڑھ کر پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہوا کہ زندگی ختم نہیں ہوئی۔ محبت کے لیے ابھی کچھ باقی ہے۔

وہ اب بھی ہر چیز کو ٹھکرا دیتا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی سوس انگلستان سے ہندوستان آگئی۔ باپ کے گلے مل کر اتنا روئی کہ باپ اپنا صدمہ بھول گیا۔

”ڈیڈی، میری ماں مجھ سے چھن گئی۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ میں نے اپنے باپ کو بھی کھو دیا۔ اب آپ کو میرے لیے زندہ رہنا ہوگا۔ میں آپ کی خدمت کروں گی۔ میں آپ کی دلجوئی کروں گی۔“

سوس کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی۔ اس کے سامنے اپنا مستقبل تھا لیکن وہ سب کچھ بھول کر باپ کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔

لارڈ ڈلہوزی نے اب تک نہایت کامیاب زندگی گزاری تھی۔ ہندوستان کے لیے ریلوں اور تار برقی کے متعلق اپنی تجاویز کو مکمل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے محکمہ وضع و قوانین کے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھ کر اسے تکمیل کی منزل تک پہنچایا جو اس ملک کی آئندہ تاریخ میں نہایت گراں قدر چیز ثابت ہونے والی تھی۔ کتنی ہی ریاستوں کو حلقہ برطانیہ میں شامل کیا۔ اس کی اس کامیابی سے ہمیں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن وہ جس قوم کا نمائندہ تھا اس کے لیے یہ بڑی کامیابی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی یہی کامیابی 1857ء کے ہنگامۂ غدر کا باعث بنی۔

اس وقت وہ بڑی آسانی سے اپنے عہدے سے مستعفی ہوسکتا تھا۔ اس کے دور کی شاندار فتوحات مکمل ہوچکی تھیں لیکن اس کے سامنے ایک سوال اب بھی تھا جس کا جواب اسے تلاش کرنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اودھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ اس کا تصفیہ کرنا نہایت ضروری تھا۔ انگلستان کی حکومت لارڈ ڈلہوزی پر نہ صرف اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنے کے لیے بھروسا کررہی تھی بلکہ جو پالیسی وہ اختیار کرنا چاہتی تھی اس پر عمل درآمد کرنے کا انحصار بھی اسی کی ذات پر رکھا گیا تھا۔ وہ اپنی حکومت کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کا معالج اسے بار بار تاکید کررہا تھا کہ اس کی صحت اب مزید بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں۔ وہ استعفیٰ دے کر انگلستان واپس چلا جائے۔ بالآخر اس نے بہت کچھ سوچنے کے بعد اپنے معالج کو تحریری جواب دے دیا۔

”اپنے اقرار کو پورا کرنے کی خاطر اس سال ہندوستان میں رہنا میرا فرض ہے اور ان خطرات سے خود کو بچانے کے لیے جن کی بابت آپ نے مجھے اس قدر واضح طور پر خبردار کیا ہے میں خداوند تعالیٰ کی کارسازی پر بھروسا کرتا ہوں اور میں نے یہاں رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔“

لارڈ ویلزلی کے معاہدے کی رُو سے اودھ کا وسیع صوبہ جو دریائے گنگا کے بالائی وسطی میدان میں واقع ہے نواب وزیر کے لیے منظور ہوا تھا۔ نواب وزیر نے اس معاہدے کے بعد شاہ اودھ کا خطاب اختیار کیا۔ وزارت سے شاہی زیادہ غلامانہ ثابت ہوئی۔ شاہان اودھ کمپنی کے زیرِ اثر آگئے۔ کمپنی نے حسبِ منشا شاہانِ اودھ کی طاقت کو کم کرنا شروع کردیا۔ معاہدے کی رو سے کمپنی کو مملکت اودھ کا محافظ بنا دیا گیا۔ ڈلہوزی معاملاتِ اودھ میں مداخلت چاہتا تھا۔ ڈلہوزی کی مداخلت کا مقصد اودھ کا خاتمہ کرنا تھا۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہدِ حکومت میں اودھ کے سیاسی حالات نے وہ صورت اختیار کرلی تھی جس سے کمپنی کی یہ خواہش کہ وہ اودھ پر قبضہ کرلے پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اودھ کی سیاسی پوزیشن سے کمپنی بہت فائدہ اٹھا چکی تھی۔ اب یہ بات اس کے مفاد کے خلاف تھی کہ اودھ کی بادشاہت کو قائم رکھا جائے۔ کمپنی کو کسی بڑی طاقت سے خطرہ بھی نہیں تھا۔ کمپنی نے شاہانِ اودھ کے خلاف منظم پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔

واجد علی شاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی امین الدولہ نے وزارت سے الگ ہونا چاہا لیکن ریذیڈنٹ نے اسے اپنا عہدہ نہ چھوڑنے دیا۔ اودھ کی حالت خراب تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ امین الدولہ اور واجد علی کے تعلقات خراب ہوتے دیر نہ لگی۔

ریذیڈنٹ کرنل سلیمن نے اودھ کے مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے بعد اپنی طویل رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی۔

اس رپورٹ میں ایسے من گھڑت واقعات جمع

کردیے گئے جن کی بنا پر گورنر جنرل کو اودھ پر قبضہ کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

دوسری رپورٹ اس کے جانشین جنرل آؤٹ رم کی آگئی۔ اس رپورٹ کا مقصد بھی اودھ کی بدنظمی کے بارے میں شور مچانا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ دونوں رپورٹیں قصداً لکھوائی گئی تھیں۔

لارڈ ڈلہوزی نے کرنل سلیمن اور آؤٹ رم کی رپورٹوں کی آڑ لے کر 1856ء میں واجد علی شاہ کو معزول کرکے اودھ کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کرلیا۔

ڈلہوزی کا مشن پورا ہوگیا تھا۔ اس نے ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ اب اس کا یہاں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے عہدے سے دستبردار ہوگیا۔

رخصت ہونے سے قبل گورنمنٹ ہاؤس کی وسیع سیڑھیوں میں سب سے اوپر کی سیڑھی پر اپنے جانشین لارڈ کیننگ کے استقبال کی رسم ادا کی۔

سول اور فوجی حکام کشادہ سیڑھیوں پر ہر دو جانب اس رسم میں شرکت کے لیے کھڑے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی لنگڑاتا ہوا آیا۔ بیماری اور صدموں کے بوجھ نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا مگر چہرے پر رعب شاہانہ اب بھی تھا۔

نئے گورنر جنرل کی رسم حلف برداری ادا کی جارہی تھی۔ جان لارنس ڈلہوزی کے قریب آیا اور اس کے قریب جھک گیا۔

’’اس وقت آپ کا جی کس بات کو چاہتا ہے۔‘‘

’’میں چاہتا ہوں میں کیننگ کی جگہ ہوتا اور وہ میری جگہ اور پھر کیا میں ابھی تک ہندوستان پر حکومت نہ کررہا ہوتا لیکن نہیں، میں اپنے سخت ترین دشمن کے لیے بھی یہ نہ چاہوں گا کہ وہ میری طرح قریب الموت ہو۔‘‘

اس کے بعد وہ مزید ایک ہفتہ ہندوستان میں ٹھہرا رہا۔ اپنے بڑے بڑے نائبوں سے ہندوستان کے متعلق ضروری تجاویز پر گفتگو کرتا رہا۔ ہر فرقے اور طبقے کے نمائندے اس کے پاس آتے رہے۔ یہاں تک کہ اتوار کا دن آگیا۔ یہ ہندوستان میں اس کا آخری اتوار تھا۔ وہ پابندی سے گرجا گھر جاتا رہا تھا۔ اس اتوار کو بھی گیا مگر وہ اب ایسا کمزور ہوگیا تھا کہ لوگ سیڑھیوں پر سے برآمدے میں آئے۔ اس کو کرسی پر اٹھا کر لے گئے جہاں اس نے اسکاٹ لینڈ کے سنجیدہ طریقے سے عبادت کی۔

ہگلی کے کنارے کا وہ منظر عجیب دل سوز تھا۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا دریا کی طرف آرہا تھا جہاں اسے جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس سے پہلے لوگ نعرے بلند کررہے تھے لیکن اس کی حالت دیکھتے ہی نعروں کا شور خاموشی میں بدل گیا۔ وہ عبرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔

اس کی کامیابیاں سب کو یاد تھیں لیکن اس وقت کوئی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کے رخصت ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد انگریزوں کے خلاف ہونے والی بغاوت کا ذمے دار لوگ اسے بنائیں گے۔ وہ ایک ایسی آگ لگا کر جارہا ہے جو کبھی نہ کبھی بھڑکے گی ضرور۔

اس نے لوگوں سے خطاب کیا۔

’’میں اپنے مستقبل کے انکشاف کا طالب نہیں ہوں۔ عرصے سے میری صرف یہی دلی تمنا تھی کہ جو کام یہاں میرے سامنے ہے اس کو تکمیل تک پہنچادوں اور وہ عزت و کامیابی کے ساتھ ختم کردوں۔ اس آرزو کو پورا کرنے کا موقع عطا کردیا گیا۔ میں اپنا کام کرچکا اب جبکہ میں یہ محسوس کررہا ہوں کہ میری زندگی کے ڈرامے کا بڑا ایکٹ اختتام کو پہنچ گیا ہے میں نہایت مطمئن ہوں گا کہ میری خدمات کی تماشا گاہ پر اسی وقت پردہ پڑ جائے۔

اب میں تھک گیا ہوں۔ مجھے اب اس کے سوا کوئی خیال نہیں کہ اس کنج عزلت کو تلاش کروں جس کی مجھے ضرورت ہے اور جس کا میں مستحق ہوں۔‘‘

وطن کے راستے میں اس نے اپنی یادداشتیں مرتب کرنے کا تھکا دینے والا کام ہاتھ میں لیا۔ کبھی بیٹھ کر کبھی لیٹ کر یہ صفحات مکمل کیے۔

وہ اتنا تھک گیا تھا کہ سویز میں اہلِ جہاز کو اسے اٹھا کر کنارے پر اتارنا پڑا کیونکہ مسلسل سمندری سفر نے اسے ’’سی سکنس‘‘ کا شکار بنادیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زمینی سفر سے یہ مرض جاتا رہے گا مگر صحرا سے گزرتے وقت سواری کے ہچکولوں نے اس کی رہی سہی طاقت بھی سلب کرلی۔ اس ناتوانی نے اسے مالٹا میں دس روز تک قیام کرنے پر مجبور کردیا۔ جب وہ سفر کرنے کے قابل ہوا تو جہاز میں سوار ہوا اور 13 مئی 1856ء کو انگلستان پہنچ گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے لیے پانچ ہزار پاؤنڈ سالانہ کا وظیفہ مقرر کرایا۔ ملکہ کی جانب سے خیر مقدمی کلمات نے اس پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب کیے۔

وہ ڈلہوزی کیسل میں بستر پر لیٹا تھا اور باپ دادا کے اس قلعے میں اپنی یادوں کو آواز دے رہا تھا۔ سوس اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ اپنی نحیف آواز میں اسے اس وقت کے قصے سنا رہا تھا جب اس قلعے میں زندگی رقص کرتی تھی۔

اسے اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹر گرانٹ تشریف لائے ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہندوستان سے اس کے ساتھ آیا تھا اور اب واپس جارہا تھا۔ متمنی تھا کہ لارڈ ڈلہوزی اس کے نام تعریفی تحریر لکھ دے تاکہ سند رہے۔ ڈلہوزی نے اپنی بیٹی سوس سے کہا کہ وہ جو کچھ بولتا جائے وہ اسے کاغذ پر منتقل کردے۔

’’اتنی صعوبت بہرحال برداشت کرلوں گا کہ اپنے دستخط کردوں۔‘‘ سوس نے لکھنا شروع کیا۔

’’آپ سے جدا ہونے کے بعد میں عرصے تک حیران اور پریشان رہوں گا۔ آپ کی سرگرم نگہبانی کا خیال مجھ کو پریشان رکھے گا جس کا میں عادی ہوگیا ہوں۔ میں آپ کی ان تمام باتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کی قابلیت اور آپ کی رائے پر شروع سے آخر تک مجھے پورا اطمینان رہا ہے اور جو توجہات آپ کی مجھ پر اور میری جدا ہونے والی عزیز شریکِ زندگی کے حال پر مبذول رہیں وہ اس وقت تک میرے حافظے سے محو نہیں ہوں گی جب تک میرا حافظہ باقی ہے۔

الوداع! آپ پر خدا کی جانب سے برکات نازل ہوں۔ مجھے اکثر خط لکھتے رہنا اور ہمیشہ یقین رکھنا کہ میں آپ کا خالص دوست ہوں۔‘‘

ڈاکٹر گرانٹ رخصت ہوگیا۔ ڈلہوزی کیسل کی خاموشی میں ایک خاموشی کا اور اضافہ ہوگیا۔

☆☆☆

اسکاٹ لینڈ کے ڈلہوزی کیسل میں سردیوں کی آمد آمد تھی۔ سردیوں کا یہ موسم ڈلہوزی کی صحت کے لیے سخت خطرناک تھا۔ وہ تقریباً صاحبِ فراش تھا۔ سوس اس کی خدمت میں دن رات ایک کررہی تھی۔ ڈلہوزی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ آتش دان کی گرمی بھی اس کی کمزور ہڈیوں کو سہارا نہیں دے پارہی تھی۔ اس عالمِ مایوسی میں اس نے اپنے سابقہ معالج ڈاکٹر گرانٹ کو خط لکھا۔

’’میں نہایت کمزور ہوگیا ہوں اور کسی جنبش یا ارادے کے قابل نہیں رہا۔ ناک اور گلے کے عوارض سخت اذیت دے رہے ہیں۔ بھوک بالکل نہیں لگتی۔ اب تو جیسے وقت تمام ہوچکا۔

سوس کا خیال ہے کہ مجھے سردی کا موسم کسی گرم آب و ہوا کے علاقے میں گزارنا چاہیے۔ سوس پر مجھے بے حساب اعتبار ہے۔ میں نے اپنی دوسری بیٹی سے بھی مشورہ کیا۔ دونوں کا خیال یہ ہے کہ مالٹا جا کر رہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم وہاں ہی موسم سرما کو گزارنے کا فیصلہ کریں گے۔‘‘

☆☆☆

اودھ کے الحاق سے بنگال آرمی کے دیسی سپاہی بگڑ چکے تھے۔ یہ بے چینی لارڈ ڈلہوزی کے زمانے ہی میں بڑھنے لگی تھی۔ یہ بے چینی بڑھتی گئی۔ دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کا حکم ماننا ترک کردیا۔ کلکتہ کے بازاروں میں عجیب قسم کا خوف طاری تھا۔ یہاں کی آبادی ہر لحہ کسی بڑے حادثے کی منتظر تھی۔ حکومت کو آنے والے طوفان سے آگاہ کیا گیا لیکن سول اور ملٹری حکام نے طاقت کے زعم میں اس طرف توجہ نہ دی یا یہ خیال کیا کہ جب چاہیں گے ان اندیشوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب اس طوفان نے درختوں کو جڑ سے اکھاڑنا شروع کردیا۔

طوفان کا یہ شور سب سے پہلے ’’دم دم‘‘ کی چھاؤنی میں بلند ہوا۔ دیسی سپاہیوں نے انگریز افسروں سے شکایت کی کہ جو کارتوس انہیں دیے گئے ہیں ان میں گائے اور سؤر کی چربی ہے۔

افسروں نے اس وقت انہیں تسلی دے کر خاموش کروادیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس شکایت سے حکومتِ ہند کو آگاہ کردیں گے۔

حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلایا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں لیکن افواہوں کی چنگاریاں بارود کے ڈھیر کو آگ لگا چکی تھیں۔ بیرک پور کے فوجیوں نے بہرام پور کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بودیا۔ فروری 1857ء کی ایک سرد رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کردیا۔

یہ آندھی چلی تو حکومت اس کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ حیرانی کے سوا وہ کچھ بھی نہ کرسکی۔ جب بہرام پور کی رجمنٹ مظاہرہ کرنے لگی تو کرنل مچل گھبرا کر باہر نکلا۔

’’آخر تم لوگ کیوں مظاہرہ کررہے ہو؟‘‘

’’حکومت ہمارے دین میں دخل دے رہی ہے۔‘‘

فوجیوں نے کہا۔

''یہ صرف افواہ ہے۔ کارتوسوں میں کوئی ممنوعہ چیز شامل نہیں کی گئی۔'' کرنل نے اپنی تقریر سے فوجیوں کا مطمئن کردیا۔ بظاہر انہیں تسلی بھی ہوگئی۔

لارڈ کیننگ کو پتا چلا تو اس نے ایک رجمنٹ کو بیرک پور پہنچنے کا حکم دیا۔ بہرام پور کی 19 ویں رجمنٹ کو بھی حکم ملا کہ وہ بیرک پور پہنچ جائے۔

ابھی یہ انتظامات ہورہے تھے کہ بیرک پور کی رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت ''دین دین'' کا نعرہ بلند کیا اور چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اکسانے لگا۔

''یہ انگریز ہمارا دین خراب کررہے ہیں۔ ان کے خلاف ہتھیار اٹھالو۔ اس وقت یہی دین کا تقاضا ہے۔''

سرجنٹ میجر نے شور سنا تو موقع پر پہنچ گیا اور فوجیوں کو سمجھانے لگا۔ اسی وقت ایک فوجی منگل پانڈے نے اس پر گولی چلادی۔ سرجنٹ میجر بچ گیا۔ جنرل ہرسی بھی موقع پر پہنچ گیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا۔ منگل پانڈے کو گرفتار کرلیا گیا۔

اگلے دن بہرام پور کی 19 ویں رجمنٹ بیرک پور پہنچ گئی۔ پریڈ ہوئی تو گورنر جنرل کا ایک فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں 19 ویں رجمنٹ کو توڑ دیے جانے کا حکم تھا۔ اسی فرمان میں منگل پانڈے کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ منگل پانڈے جس رجمنٹ میں تھا اس کے ہتھیار چھین لیے گئے۔ کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ حکومت مطمئن ہوگئی کہ بغاوت ختم ہوگئی۔

بیرک پور میں حالات پر قابو پالیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ شور یہیں دب جاتا لیکن یہاں کی خبریں مبالغہ آمیزی کے ساتھ شمالی ہند تک جا پہنچیں۔ شمالی ہند میں صرف یہ خبر پہنچی کہ بیرک پور میں بغاوت ہوگئی ہے۔ یہ نہیں کہ حالات قابو میں ہیں۔

میرٹھ چھاؤنی میں بھی بہرام پور کی طرح حکومت کے غلط اندازوں نے نقصان بڑھادیا۔ یہاں چونکہ دیسی سپاہیوں کے مقابلے میں انگریز سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے یہاں کے فوجی مطمئن تھے کہ دیسی افواج کو بغاوت کی ہمت نہیں ہوگی اور اگر ہوگی تو اسے بہ آسانی دبالیا جائے گا۔

23 اپریل 1857ء کو دیسی سپاہیوں کو مطمئن کرنے کے لیے کارتوس چلانے کا مظاہرہ کیا گیا۔ پریڈ ہورہی تھی کہ حوالدار میجر اور اس کے اردلی نے ان کارتوسوں کو چلایا جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ انہیں چلانے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔

دیسی سپاہی اپنی اپنی بارکوں میں چلے گئے۔ اسی رات اردلی کے خیمے کو آگ لگادی گئی۔ اگلے دن دیسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کردیا۔ ان سب کو ڈپٹی جج کے سامنے پیش کیا گیا۔ جج نے انہیں یقین دلایا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں لیکن جب پریڈ ہوئی تو 85 سواروں نے کارتوس لینے سے انکار کردیا۔ جنرل نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ بغاوت کے جرم میں ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے ان میں سے بعض کو چھ سال اور بعض کو دس سال قید کی سزا سنادی۔ ان کے ساتھی اس قید کو بھی برداشت کرلیتے لیکن ان کی تذلیل کی گئی۔ ان کے ساتھیوں کے سامنے ان کی وردیاں اتاری گئیں اور انہیں بیڑیاں پہنائی گئیں۔ مزید غلطی یہ کی گئی کہ انہیں جیل تک پیدل لے جایا گیا۔

بازار کی طرف جاتے ہوئے ان قیدی سپاہیوں نے رنج وحسرت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہزاروں طنز چھپے ہوئے تھے جیسے کہہ رہے ہوں، شرم کرو' ہماری یہ حالت دیکھ کر بھی تم خاموش ہو۔ ساتھیوں کے جذبات بھی اس سے مختلف نہیں تھے لیکن بھری ہوئی بندوقوں اور توپوں کی موجودگی میں ہاتھ ملتے رہ گئے۔

بازار سے گزرتے ہوئے ان فوجیوں کو دیکھ کر اہلِ شہر کے جذبات بھی بھڑکنے لگے۔ یہ باتیں عام ہونے لگیں کہ جن سپاہیوں نے برطانیہ کے لیے اپنی جانیں دیں انہی کے ساتھ آج یہ سلوک کیا جارہا ہے۔ ان کا یہ غصہ آیندہ شعلۂ جوالہ بننے والا تھا۔

غصے اور نفرت سے بھرے ہوئے دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں لوٹے تو گویا بغاوت کا مکمل ارادہ کرچکے تھے۔ وہ رات سرگوشیوں اور منصوبہ بندی میں گزاردی اور اگلے ہی دن 10 مئی 1857ء کو اپنی بارکوں میں آگ لگا کر بغاوت کا اعلان کردیا۔

''وفادار سپاہیو... یہ تم کیا کرنے لگے۔ اپنے فرائضِ منصبی کا کچھ تو خیال کرو۔'' کرنل فینی نے حالات کا غلط اندازہ لگایا اور انہیں سمجھاتا ہوا آگے بڑھا۔ اسی وقت ایک سنسناتی ہوئی گولی کہیں سے آئی اور کرنل کی چوڑی چھاتی میں پیوست ہوگئی۔ چند دوسرے انگریز آگے بڑھے، ان کا بھی یہی حشر ہوا۔

اب یہ باغی چھاؤنی سے باہر نکلے اور ان انگریز

عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کردیا جو گرجا سے واپس آرہے تھے۔ چھاؤنی کو آگ لگانے کے بعد یہ فوجی میرٹھ جیل پہنچے۔ جیل کے دروازے توڑ کر اپنے ساتھیوں کو باہر نکالا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جیل میں بارہ سو قیدی اور بھی تھے جو اُن کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اہلِ شہر کے جذبات بھی بھڑکے ہوئے تھے۔ وہ ایک دن پہلے ہی دیسی سپاہیوں کی تذلیل دیکھ چکے تھے۔ ان کی بھی ایک بڑی تعداد باغیوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ یہ سب دلی کی طرف چل دیے۔

یہ خبر لاہور پہنچی تو وہاں مقیم دیسی فوج میں بھی بے چینی پھیل گئی۔ ان فوجیوں سے ہتھیار چھین لیے گئے اور ان کی نقل وحرکت کی نگرانی ہونے لگی۔

ایک سپاہی پرکاش سنگھ اپنی تلوار لے کر نکلا اور اپنے ساتھیوں کو اکسایا کہ انگریزوں کا قتلِ عام شروع کردیں۔ ایک میجر اس کی تلوار کی زد میں آکر قتل ہوگیا۔ اس سے پہلے کے دوسرے سپاہی کوئی قدم اٹھاتے ایسی زبردست آندھی آئی کہ دن میں اندھیرا ہوگیا۔ اس آندھی کا فائدہ اٹھا کر باغی سپاہی میاں میر چھاؤنی سے بھاگ نکلے۔

یہ باغی نہتے تھے۔ انہوں نے راوی پار کرکے ایک چھوٹے سے ٹاپو پر پناہ لے لی۔ انگریزی سپاہ تعاقب کرتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی۔ باغیوں نے ہاتھ اٹھادیے۔ ان کے پاس ہتھیار تو تھے نہیں جو مقابلہ کرتے۔ انہیں کناروں پر لایا گیا اور پھر اجنالہ تھانے پہنچادیا گیا۔

اس کے بعد وہ خونین کھیل کھیلا گیا جو کسی طرح بھی فوجی قوانین کے مطابق نہیں تھا۔ انہیں دس دس کی ٹولیوں میں تھانے سے باہر لایا جاتا رہا اور گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ یہ ایسا بھیانک منظر تھا کہ ایک جلاد غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

یہ کل 285 سپاہی تھے جنہیں موت کے گھاٹ اتار کر گڑھوں میں دفن کردیا گیا۔

ادھر میرٹھ سے دلی جانے والے باغی چودہ گھنٹے کی مسافت کے بعد دلی پہنچ گئے۔ دروازے کھل گئے۔ باغی شہر میں داخل ہوگئے۔ دلی میں بھی دیسی سپاہی موجود تھے۔ وہ لاہور اور میرٹھ کے واقعات سن چکے تھے۔ کئی ایک پلٹنوں نے اپنے انگریز افسروں کو قتل کردیا۔

باغی نعرے لگاتے ہوئے لال قلعہ پہنچے۔ قلعے میں داخل ہوکر انگریز افسروں کو قتل کیا اور بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔

اس کے بعد عام فساد شروع ہوگیا۔ جو تھا لُٹ گیا۔ ایک ایک انگریز چن چن کر قتل کردیا گیا۔ شام تک دلی پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا۔

ڈلہوزی کی حالت اتنی خراب تھی کہ تقریباً صاحبِ فراش تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں اس نے ہندوستان سے آنے والی ہولناک خبروں کو سنا۔ اس بغاوت پر غور کرنے کے لیے پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ اپنی بیماری کے سبب وہ ان مباحثوں میں بھی شریک نہ ہوسکا۔ ایک معذور آدمی یہی کرسکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر گرانٹ کو خط لکھا۔ گرانٹ اس وقت ہندوستان میں تھا۔

''تم خوب اچھی طرح قیاس کرسکتے ہو کہ ان خبروں کو جو گزشتہ ڈاک سے آئی ہیں میں نے کیسے رنج وتعجب سے سنا ہوگا۔ سوائے اس بغاوت کے خیال کے کوئی دوسرا خیال میرے دل میں نہیں آتا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں فضول گھبرانے والوں میں سے نہیں ہوں تاہم میں ان خبروں کا جو آیندہ ڈاک سے یا اس کے بعد کی مسلسل ڈاکوں کے ذریعے پہنچیں گی نہایت تشویش کے ساتھ منتظر رہوں گا۔ میں بیمار ہوں، چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ پارلیمنٹ کے مباحثوں تک میں شریک نہ ہوسکا حالانکہ میرا وہاں ہونا ضروری تھا کیونکہ میں سن رہا ہوں اور اخبارات بھی لکھ رہے ہیں کہ بعض لوگ اس بغاوت کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ میں ہوتا تو اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا۔ کتنی تکلیف کی بات ہے کہ کوئی شخص خود کو الزامات سے بری الذمہ ثابت کرنے کے قابل نہ رہے حالانکہ وہ اپنے بے قصور ہونے کی بابت بھی یقین رکھتا ہو۔

میں نے اپنے عہدِ حکومت میں جس فوجی حفظِ ماتقدم کی اپنی حکومت کو تاکید کی تھی اس پر اگر عمل درآمد کرلیا جاتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ اب تو میں یہ سوچتا ہوں میں نے جن امور کو اس قدر ضروری سمجھا تھا ان پر انگلستان کے وزیروں کو اعتماد میں لینے کے بجائے خود ہی عمل کیوں نہ کرلیا۔''

ہندوستان کے حالات جیسے جیسے خراب ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے اس کی پالیسوں پر تنقید بڑھتی جارہی تھی۔ صاف لفظوں میں کہا جانے لگا تھا کہ اس کی جابرانہ پالیسوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ روشن کردی ہے۔ اسی لیے اس کے آتے ہی یہ شعلے بھڑک اٹھے۔

ہندوستان میں سخت اور فوری کارروائیوں کی عدم موجودگی کے باعث جن کے ذریعے وہ خود اس بدامنی کو

ابتدا ہی میں جڑ سے اکھاڑ ڈالتا' وہ نہایت ناراض تھا۔ اس نے لکھا۔

''جنرل لائڈ نے سپاہیوں پر بے جا اعتبار کیا لیکن ایسا معاملہ جو بظاہر سلامتی کے لیے اس قدر ضروری تھا جنرل لائڈ یا کسی دوسرے جنرل پر چھوڑا ہی کیوں گیا۔ جو کچھ میں سن رہا ہوں اس سے میرا دل پک گیا ہے اور میری گزشتہ خدمات کے مقامات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے جو کچھ دماغی تفکر اور بے چینی پیدا ہوگئی ہے وہ میری صحت کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔''

موسم گرما میں کچھ عرصہ مالورن میں قیام کرنے کے باعث اس کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی لیکن ہندوستان کا غم اور اپنوں کے طعنے اسے کھائے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں بغاوت کا ذمے دار اسے ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اس میں کچھ حقیقت بھی تھی کیونکہ لارڈ ڈلہوزی نے فتوحات کے ذریعے ہندوستان کی برطانوی سلطنت کی حدود کو بہت وسیع کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں نے شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بہت زیادہ نفرت اور حقارت پیدا کر دی تھی۔ اسی نفرت اور حقارت کا اظہار تھا جو وہ انگلستان میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس ملک کی مصیبتیں جس کی خاطر اس نے مشقت اٹھائی تھی آہستہ آہستہ اس کا کام تمام کر رہی تھیں۔

وہ اتنا مایوس تھا کہ وہ اس عام دعا میں شریک ہونے کے لیے بھی نہیں گیا جو انگریزوں کو ہندوستان میں مصیبت سے رہائی دلانے کے لیے مانگی گئی تھی۔

وہ بستر پر لیٹا گرجا میں بجتے ہوئے گھنٹے کی آواز سنتا رہا پھر اپنے معالج ڈاکٹر گرانٹ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

''میرے پیارے گرانٹ! میں دعا میں شریک نہ ہوسکا لیکن میں دل و جان سے اس دعا کی قبولیت کا خواستگار ہوں جس کے بغیر ہماری وہ بہترین کوششیں رائگاں چلی جاتیں جو ہماری ہستی کو قائم رکھنے کے لیے ان لوگوں نے کیں جو ہندوستان میں لڑے۔''

اس نے موسم سرما مالٹا میں گزارہ۔ اب وہ قطعی طور پر اپنی ٹانگوں کے ذریعے چلنے سے معذور ہوگیا تھا۔ بیساکھیوں کے سہارے ہی اِدھر اُدھر حرکت کر سکتا تھا۔

1858ء کے موسم بہار میں اس نے تحریر کیا۔

''پورے دو برس ہوئے جب میں گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہوا تھا۔ اگرچہ میں اس زمانے میں بہت بیمار تھا مگر میں حلفیہ کہتا ہوں کہ جو کچھ حالت میں اپنی اب دیکھ رہا ہوں اس سے وہ حالت بہتر تھی۔

ہندوستان کی طرف سے اب اچھی خبریں آنے لگی تھیں۔ انگریز فوجوں نے بغاوت پر قابو پا لیا تھا لیکن وہ اب ہر اچھی بری خبر سے دور جا چکا تھا۔ اس عالم مایوسی میں وہ جان چکا تھا کہ اب اس کے مصائب کا ایک ہی انجام ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ڈاکٹر گرانٹ کی علالت کا سن کر اسے خبردار کیا اور اپنی مثال پیش کی۔

''میرے عزیز دوست! خبردار تم میری احمقانہ مثال کی پیروی نہ کرنا۔ اگر تمہاری صحت تم کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرے تو تم وہاں ہرگز نہ رہنا۔ میں نے ایسا کرنے کا سخت خمیازہ بھگتا ہے اور اسی قسم کے نتائج سے تم کو خبردار کر کے میں خوش ہو رہا ہوں۔''

اس دو سال کے عرصے میں اسے کوئی خوشی مل سکی تو یہ کہ اس کی چھوٹی بیٹی ایڈتھ کی شادی ہوگئی۔ اس خوشی نے اسے کچھ سہارا دیا لیکن اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ وہ ہندوستان سے ایسا روگ لگا لایا تھا کہ اس کے معالج بے بس نظر آ رہے تھے۔

وہ اپنی بڑی بیٹی سوس کا شکر گزار تھا کہ وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھی لیکن اب وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ سوس شادی کر لے اور اسے اکیلا مرنے دے۔

''تم اب شادی کر لو۔ میرا کیا ہے میں اب بچنے والا نہیں بلکہ مر چکا ہوں۔ ایک مُردے کی خدمت پر کیوں بضد ہو۔''

وہ شادی پر تیار نہیں ہوئی تو اس نے یہ وعدہ اس سے لے لیا کہ وہ اس کی موت کے بعد شادی ضرور کرے گی۔ شاید اسی لیے اس نے جلد مر جانے کو ترجیح دی۔

مرنے سے کچھ دیر قبل اس نے اپنے ایک رشتے دار سے کہا۔ ''بریگیڈیئر میرے مرجانے کے بعد تم یہاں ٹھہرنا اور میری غریب سوس کی خبر گیری کرنا اور اسے مجبور کرنا کہ وہ شادی کر لے۔''

1860ء کے موسم سرما میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وہ ابھی پورا 49 برس کا بھی نہیں تھا۔ اسے خاندان ڈلہوزی کے قدیم قبرستان واقع ''کاکپن'' میں دفن کر دیا گیا۔

ماخذات

لارڈ ڈلہوزی مترجم ابنِ حسن
کمپنی کی حکومت
باری علیگ

مسلم دوست

ابن کبیر



دنیا بھر میں اس کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔ فٹ بال کی دنیا میں اسے جادوگر کہا جاتا ہے۔ ایسا پھرتیلا، ایسا تیز کھلاڑی کوئی اور نہیں۔ اسے جو شہرت و کامیابی ملی ہے وہ اسے ماضی سے الگ نہ کرسکی۔ اس کا بچپن عسرت و تنگدستی میں گزرا ہے اس لیے وہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرسکتا ہے۔ اس نے غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی انڈونیشیا کے سیلاب سے متاثرہ مسلمان بچوں کی بھرپور امداد کی، آج مغرب کے لوگ فلسطینی مظلومین سے ہمدردی پر انگلیاں اٹھارہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ایسے وقت میں اس نے اسرائیلی جارحیت کا شکار غزہ کے بچوں کی امداد کا بیڑا اٹھایا ہے۔

ایک نامور کھلاڑی کا احوالِ زیست

میڈرڈ کے ساحل پر دھوپ چمک رہی تھی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ ہواؤں میں مسرت ہمکتی تھی۔ اُن میں نغمگی تھی۔ کئی خاندان موسم سے لطف اندوز ہونے کے ارادے سے ساحل کی سمت چلے آئے تھے اور اب فرحت بخش ہواؤں کو روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔

حوزے ایوریو بھی اُن میں شامل تھا۔ وہ اپنی بیوی ڈولورس اور چار بچوں کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ ڈولورس کے ہاتھ میں ایک باسکٹ تھی جسے بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں انتظار کرنے کی نصیحت کر رہی تھی۔

ڈولورس ایک خوش مزاج عورت تھی۔ جسم فربہی کی

جانب مائل تھا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں باورچن تھی، جبکہ اُس کا شوہر حوزے شہری ادارے میں مالی تھا۔ وہ چھریرے بدن کا ایک عام سا آدمی تھا جس کے شب وروز زندگی کی گاڑی دھکیلنے میں گزرتے۔ بس ایک ہی شے تھی جو حوزے کی یکسانیت سے بھرپور زندگی میں کچھ رنگ بھرتی... اور وہ تھی فٹبال!

حوزے اِس کھیل کا دلدادہ تھا۔ اُس کا خواب تھا کہ پروفیشنل فٹبالر بنے، مگر زندگی نے اسے یہ موقع نہیں دیا۔ شادی کے بعد بچوں کی ذمّے داری آن پڑی۔ شوق کی تکمیل تو اب ممکن نہیں تھی، وہ بچوں کے ایک کلب سے منسلک ہوگیا جہاں وہ منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔ اِس کام کا معاوضہ تو تھوڑا ہی تھا لیکن اس سرگرمی کے طفیل اسے کچھ پُرجوش لمحات ضرور میسر آتے جو اسے مسرت سے بھر دیتے۔

اور اُس روز ساحل پر بھی ایسے ہی چند لمحات اس کے منتظر تھے۔ اس کی نظریں سامنے ٹکی تھیں جہاں چند بچے فٹبال کھیل رہے تھے۔ ریت پر ننگے پیر دوڑنے والے اُن بچوں میں حوزے کو اپنا بچپن نظر آرہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں اسے اپنے سپنے دکھائی دے رہے تھے، ان کی آوازوں میں اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اچانک ایک بچے نے گیند کو زوردار ٹھوکر لگائی اور وہ لڑھکتی ہوئی حوزے کی طرف چلی آئی۔

لڑکے نے ہاتھ ہلا کر گیند طلب کی۔ حوزے مسکراتے ہوئے اٹھا اور گیند کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اس کی نظر اپنے ڈھائی سالہ بیٹے پر پڑی، جو ڈگمگاتے قدموں سے گیند کی سمت جا رہا تھا۔

حوزے ششدر رہ گیا۔ اس نے پلٹ کر بیوی کی جانب دیکھا جو اس منظر سے لاعلم باقی بچوں میں سینڈوچ تقسیم کر رہی تھی۔

وہ پلٹا۔ بچہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا گیند کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ننھے سے پیر سے گیند کو ٹھوکر لگائی۔ وہ لڑھکتی ہوئی کچھ دور گئی اور ٹھہر گئی۔

ریت پر دھوپ چمک رہی تھی اور حوزے.... سحرزدہ سا اپنے بیٹے کو تک رہا تھا۔

''انکل ہماری گیند!'' جونہی یہ الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے، چھن سے سحر ٹوٹا۔

اُس نے سامنے دیکھا۔ دور کھڑے بچے ہاتھ ہلا ہلا کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا رہے تھے۔ حوزے دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ زوردار ٹھوکر لگائی۔ گیند ہوا میں تیرتی ہوئی لڑکوں تک پہنچ گئی، جو اگلے ہی پل کھیل میں مصروف ہوگئے۔

حوزے مڑا۔ اُس کا ڈھائی سالہ بچہ اب بھی وہیں کھڑا تھا اور اس کی معصوم نظریں گیند کا تعاقب کر رہی تھیں۔

وہ ایک قیمتی لمحہ تھا۔ ہواؤں میں مسرت ہمکتی تھی۔ لہروں میں نغمگی تھی۔ اور باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے ایک خواہش پنپ اٹھی تھی،... ایسی خواہش جو پرتگالی فٹبال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدلنے والی تھی۔

☆☆☆

سرسبز پہاڑوں میں گھرے سینٹو اینٹونیو میں ظہرانے کا وقت ہو چلا تھا۔ قصبے کی عورتیں باورچی خانوں میں کھڑی تھیں اور مسالوں کی خوشبو سڑک سے گزرنے والوں کی اشتہا بڑھا رہی تھی۔

ڈولورس بھی چولھے کے پاس کھڑی ہانڈی میں کفگیر گھما رہی تھی۔ کچن میں دھواں بھر گیا تو اس نے کھڑکی کھول دی۔ سامنے کچی سڑک تھی۔ ایک جانب مکانات کی قطار تھی، دوسری جانب ہرے بھرے درخت، جن کا گھنا سایہ موسم گرما میں سڑک کو ٹھنڈا رکھتا۔

یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کے در و دیوار یہاں بسنے والوں کی سادگی پسند طبیعت کے غماز تھے۔

سڑک اس لمحے خاصی خاموش تھی مگر ڈولورس جانتی تھی کہ یہ سکون بس چند پلوں کا ہے۔ محلے کے بچے اسکول سے لوٹتے ہی اِسے کھیل کا میدان بنا دیں گے۔

ہانڈی لگ بھگ تیار ہو چکی تھی۔ ایسے میں سڑک کے پرلے کونے پر کچھ ہلچل ہوئی۔

''بچے آگئے۔'' ڈولورس نے دھیرے سے کہا۔ لہجے میں ممتا ہمکتی تھی۔ خدا نے اسے دو بیٹیوں، دو بیٹوں سے نوازا تھا جن سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتی تھی۔ ہر ماں کی طرح وہ آرزومند تھی کہ اُس کی اولاد ترقی کے میدان میں خود کو فاتح ثابت کرے، تاہم اسے یہ فکر بھی لاحق رہتی تھی کہ تنگی کے اس دور میں انہیں تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولیات کیسے فراہم کی جائیں۔ اسی فکر نے اسے ملازمت کرنے پر مجبور کیا۔ وہ دیہی پس منظر کی حامل ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ صرف ایک فن جانتی تھی، کھانا پکانا۔ پورا خاندان اس کے ہاتھ کے کھانوں کا رسیا تھا۔ بس اس نے اِسی فن کو اپنا

پیشہ بنالیا۔

مگر اسے ایک بات کا قلق تھا۔ ملازمت کے جھمیلوں کے باعث وہ بچوں کو زیادہ وقت نہیں دے پاتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ ان کے لیے اچھے اچھے، ذائقے دار کھانے پکاتی، جنہیں اس کا بڑا بیٹا تو بہت شوق سے کھاتا تھا، مگر چھوٹا بیٹا...

دھڑ سے دروازہ کھلا۔ ڈولورس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''کیسی ہیں مما؟'' یہ اُس کے چھوٹے بیٹے کی آواز تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے مڑی، تاکہ اس سے بغل گیر ہو سکے، مگر اس وقت تک وہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا جہاں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔

''کرسٹیانو ذرا دم لو!'' اس نے اونچی آواز میں کہا جو یقیناً کمرے تک گئی ہوگی، مگر بچے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ بھی ناں، بالکل باپ پر گیا ہے۔'' اس نے جھلا کر کہا۔ اور اگلے ہی لمحے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے وہ دن یاد تھا جب اس کی حوزے سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ڈولورس کی مانند ایک پُرجوش انسان تھا۔ اس کے قہقہے زندگی سے بھرپور ہوتے۔ یہی توانائی ان کی دوستی کی بنیاد بنی جس میں جلد محبت در آئی۔ چند ماہ بعد، موسم سرما میں اُن کی شادی ہوگئی۔ ٹھیک ایک برس بعد وہ ماں بن گئی اور تب... زندگی کی حقیقت اس پر عیاں ہوئی، تلخیوں کا اندازہ ہوا۔ مگر اس نے ہمت ہارنے کی بجائے اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا۔ سینٹو اینٹونیو چھوٹا سا قصبہ تھا، لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اسے ملازمت کی تلاش میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

5 فروری 1985 کو جب خدا نے اسے ایک اور بیٹے سے نوازا، اُس نے اعلان کر دیا کہ اُس کا خاندان مکمل ہوگیا ہے۔ ''دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ بس اب مجھے خدا سے کچھ نہیں چاہیے۔'' آنکھوں میں مسرت تھی۔

بیٹے کا نام کرسٹیانو رکھا گیا۔ باپ کی خواہش پر نام میں رونالڈو کا لاحقہ لگا دیا گیا کہ وہ معروف امریکی شخصیت رونالڈ ریگن کا مداح تھا۔ ''یہ نام اس کے لیے خوش قسمتی لائے گا۔'' نام رکھنے کی تقریب والے روز حوزے نے کہا تھا۔

''بچو کھانا تیار ہے۔'' ڈولورس نے آواز لگائی۔

آواز سنتے ہی اس کا بڑا بیٹا ہیوگو اور دونوں بیٹیاں ایلما اور لیلینا کچن میں چلے آئے۔

''کرسٹیانو کہاں ہے؟'' لہجہ سوالیہ تھا۔

''آپ کو پتا ہونا چاہیے۔'' بڑی بیٹی ایلما مسکرائی۔

''وہ تو کھیلنے چلا گیا۔'' ہیوگو نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔ ''ابھی ابھی نکلا ہے۔''

''یہ بچہ بھی ناں۔'' ڈولورس کھڑکی کی جانب دوڑی۔ اس نے دیکھا، ننھا کرسٹیانو گیند بغل میں دابے اُن لڑکوں کے اس گروہ کی جانب بڑھ رہا تھا جو کچھ ہی دیر میں سڑک کو فٹبال گراؤنڈ کی شکل دینے والے تھے۔

''کرسٹیانو۔'' وہ چلّائی۔ ''کھانا تو کھا لیتے۔''

بچہ پلٹا۔ اس کے نین نقش تیکھے اور بال گھنگریالے تھے۔ اپنے باپ کی مانند وہ چھریرے بدن کا تھا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں لہرایا اس میں ایک سیب تھا۔ ''آپ فکر نہ ' میں نے انتظام کرلیا ہے۔''

''اور تمہارا ہوم ورک؟'' وہ چلّائی۔

''آج مجھے ہوم ورک نہیں ملا۔'' لڑکے نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

''اسے کبھی ہوم ورک نہیں ملتا۔'' ہیوگو کے چہرے پر شرارت تھی۔ ''خوش نصیب ہے بھئی۔''

دونوں لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ڈولورس بھی مسکرا دی۔

اس دوپہر، جب سینٹو اینٹونیو کے باسی ظہرانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، انہیں اس بات کا قطعی علم نہیں تھا کہ اس چھوٹے سے قصبے کی سڑکوں پر فٹبال کھیلنے والے بچوں میں ایک ایسا بچہ بھی ہے، جو مستقبل قریب میں عظمت کے تخت پر براجمان ہونے والا ہے۔

☆☆☆

جن فضاؤں میں کرسٹیانو پروان چڑھا، ان میں فٹبال کا جنون تیرتا تھا۔ ہر دوسرا شخص فٹبال کا شائق تھا۔ گو پرتگالی ٹیم کبھی کوئی بڑا ٹورنامنٹ اپنے نام نہیں کر سکی تھی مگر شکست کبھی شائقین کے دل نہیں توڑ سکی۔ اُنہیں اِس کھیل سے عشق تھا۔

اور یہی عشق اس جزیرے کی نئی نسل کو ورثے میں ملا۔ انہیں فقط دو چیزوں کی ضرورت تھی، ایک گیند، دوسری سڑک۔ اور جوں ہی دونوں میسر آتیں، مقابلہ شروع ہو جاتا جس کا حصہ بنتے ہی کرسٹیانو کے جسم میں بجلیاں سی دوڑنے لگتیں۔

فٹبال اُس کی پہلی محبت تھی۔ اُس کے باپ

حوزے کو اس کا ادراک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بیٹا پیدائشی فٹبالر ہے۔ وہ سرسبز میدانوں میں دوڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس نے کبھی کرسٹیانو کے شوق پر روک نہیں لگائی، الٹا قدم قدم اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

ڈولورس کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے شوق کے خلاف تو نہیں لیکن بے جا چھوٹ کی قائل بھی نہیں تھی.

''اتنی آزادی ٹھیک نہیں ڈیئر۔'' وہ کبھی کبھار کہتی۔ ''مانا وہ لاڈلا ہے۔ مگر پڑھائی کے معاملے میں تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ ضروری ہے۔''

حوزے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ بس خاموش رہتا۔ وہ اپنی بیوی کو بتاتا بھی کیا، یہ کہ وہ ایک خواب کی پرورش کر رہا ہے، جس کی تکمیل دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی؟ نہیں، قطعی نہیں۔ اگر وہ یہ کہتا بھی، تو لوگ اس کی ہنسی اڑاتے۔ کہتے، ''ٹھیک ہے حوزے، تمہارا بیٹا ایک پھرتیلا اور ہوشیار کھلاڑی تھا، بس!۔ قومی ٹیم تک رسائی... نہیں بھئی اس کا تو امکان نہیں!''

اس ردِعمل سے بچنے کے لیے حوزے اپنے جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتا۔

جہاں تک کرسٹیانو کا تعلق ہے، اُس کی دیوانگی فقط فٹبال تک محدود نہیں تھی۔ بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور اسنوکر کے مقابلوں میں بھی اسے دلچسپی تھی۔ اور خاص بات یہ تھی کہ وہ جس میدان میں اترتا، فاتح کی حیثیت سے لوٹتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیت اس کی عادت بن گئی ہے۔

یہ عادت پختہ کیسے ہوئی، حوزے کے لیے سمجھ پانا مشکل تھا۔ لیکن پھر... کرسمس والے روز اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا۔

☆☆☆

گلیوں میں ٹھنڈی ہوائیں رقصاں تھیں جس میں خوشی کی خوشبو تھی کہ آج کرسمس کا تہوار تھا۔ ہر چہرہ دمک رہا تھا۔

کرسٹیانو خاصا پُرجوش تھا۔ آج اُس کے اسکول کا فٹبال میچ تھا اور وہ اپنی ٹیم کا کم عمر ترین کھلاڑی تھا۔

وہ علی الصباح ہی اسکول چلا گیا، تاکہ میچ سے قبل تھوڑی پریکٹس کر سکے۔ جب حوزے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اسٹیڈیم پہنچا، میچ شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔

ریفری کے سیٹی بجاتے ہی کرسٹیانو متحرک ہوگیا۔ اس کی رفتار تیز تھی۔ وہ سرد ہواؤں کو کاٹتے ہوئے، مخالفین کو چکمہ دیتے ہوئے گول پوسٹ پر مسلسل حملے کر رہا تھا، اور پھر... اس کی زوردار ٹھوکر نے گیند نیٹ میں پہنچادی۔

وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ شائقین کا جوش بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، مگر... اگلے ہی لمحے منظر بدل دیا۔ ریفری نے گول کو آف سائیڈ قرار دیتے ہوئے رد کر دیا تھا۔ میچ تاحال صفر۔صفر سے برابر تھا۔

کرسٹیانو کی ٹیم کے کھلاڑیوں نے ریفری کو گھیر لیا۔ وہ احتجاج کر رہے تھے۔ اور تب حوزے نے وہ منظر دیکھا، جو کرسٹیانو کے رگ وپے میں دوڑتی توانائی کے راز سے پردہ اٹھاتا تھا۔

گول رد کیے جانے پر ننھا کرسٹیانو گہرے صدمے میں چلا گیا۔ زاروقطار رونے لگا۔ ساتھی کھلاڑی ریفری کو بھول کر اس کی دل جوئی کرنے لگے مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''وہ تو بچے کی طرح رو رہا ہے!'' ہیوگو نے کہا۔

''وہ بچہ ہی تو ہے۔'' ڈولورس کے لہجے میں ممتا تھی۔

حوزے خاموش رہا۔ وہ لمحے کے احترام میں چپ تھا کیونکہ وہ ایک پُراسرار قوت کو دمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''کامیابی کی سلگتی ہوئی خواہش...'' اُس کے کانوں میں اُس بوڑھے دست شناس کے الفاظ گونجے جس نے ڈھائی سالہ کرسٹیانو کا ہاتھ دیکھا تھا۔ ''جو ناممکن کو ممکن کر دکھائے، قدرت کا انمول تحفہ ہے اور تمہارے بیٹے کو خدا نے یہ تحفہ عطا کیا ہے۔''

میچ تاحال برابر تھا اور حوزے کی نظریں اپنے بیٹے پر ٹکی تھیں۔

سیٹی بجی۔ مقابلہ پھر شروع ہوا! اِس بار کرسٹیانو غصیل شیر کی دہاڑا۔ اس نے جست لگائی اور مخالفین پر پل پڑا۔

''یہ تو دیوانہ ہوگیا ہے۔'' ایلما نے دھیرے سے کہا۔

تماشائیوں کا شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ کرسٹیانو کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور وہ آگے بڑھ رہا تھا، دیوانہ وار!

زوردار ہٹ۔ گیند نیٹ میں۔ کرسٹیانو نے گول داغ دیا۔ اور اب... وہ سیکڑوں تماشائیوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔

تب حوزے نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ''یہ دیوانگی ہی اس کی رہبر ہے!''

☆☆☆

نام: کرسٹیانو رونالڈو، عمر: سات برس، کلب: انڈورینہا!

انڈورینہا کم سن کھلاڑیوں کا سب سے بڑا کلب تھا۔ ہر بچے کی خواہش ہوتی کہ وہ اُس کی نمائندگی کرے۔

حوزے اِسی کلب سے منسلک تھا مگر اِسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے سپوت کو کلب انتظامیہ نے منتخب کر لیا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ کرسٹیانو کا کزن اس کلب سے کھیلا کرتا تھا۔ اسی نے مشورہ دیا کہ وہ انڈورینہا کے ٹرائل میں حصہ لے۔ کرسٹیانو نے ڈرتے ڈرتے ہامی بھر لی۔

ٹرائل والے روز اس کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس کی پشت پر پہاڑی تھی۔ ہاں، وہ تھوڑا خوف زدہ تھا لیکن گیند کو ٹھوکر لگاتے ہی خوف ہوا ہوگیا۔ وہ پرواز کرنے لگا۔

''مبارک ہو، تمہیں منتخب کر لیا گیا۔'' ٹرائل کے بعد جب اس نے اپنے کزن کے الفاظ سنے، اس کا وجود مسرت سے بھر گیا کہ کل تک وہ کچی سڑک پر کھیلا کرتا تھا اور اب پریکٹس کے لیے سرسبز میدان میسر تھا۔

کلب کی ہلکے نیلے رنگ کی جرسی اس پر خوب جچتی، جسے پہن کر وہ گھنٹوں میدان میں دوڑتا رہتا۔ جلد ہی اُس نے اپنے کوچ کا دل جیت لیا۔ ساتھیوں کا بھی وہ چہیتا تھا۔ گو ابتدائی دنوں میں کارکردگی زیادہ اچھی نہیں تھی مگر جلد ہی اس کا اعتماد بحال ہوگیا۔ پرفارمنس میں نکھار آگیا۔

کلب مقابلوں میں لگاتار کئی گول داغ کرکے اس نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ اس زمانے میں میرے ڈوانا کا طوطی بول رہا تھا، لوگ اُسے ننھا میرے ڈوانا کہہ کر پکارنے لگے۔

جب پہلی بار ڈولورس نے یہ سنا کہ اس کے بیٹے کا میرے ڈوانا سے موازنہ کیا جا رہا ہے، وہ ہنس پڑی۔ ''میرے ڈوانا عظیم کھلاڑی ہے۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ وہ انڈورینہا کے لیے کھیل رہا ہے۔''

حوزے اس تبصرے پر خاموش رہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں بولتا، کیونکہ اس کے لیے انڈورینہا ناکافی تھا۔ اُس کا خواب بہت بڑا تھا۔

ان ہی دنوں کرسٹیانو کو انگلش پریمیر لیگ کے مقابلوں کا چسکا لگا اور چند ہی روز میں وہ اس لیگ کا دیوانہ ہوگیا۔ انگلش کلب مانچسٹر یونائیٹڈ اُس کی پسندیدہ ٹیم تھی جس کی سرخ جرسی میں ملبوس کھلاڑی اُس کے ہیرو تھے۔

اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چند برس بعد وہ خود سرخ جرسی زیب تن کرنے والا ہے۔

☆☆☆

''ہم کہاں جا رہے ہیں ڈیڈ؟'' اس نے سوال کیا۔

''اسپتال۔'' حوزے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

''اسپتال؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

وہ موسم سرما کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ ناشتے کے بعد حوزے نے اُسے تیار ہونے کی ہدایت کی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔

کرسٹیانو کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پہلے تو وہ چپ چاپ باپ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا مگر جب حوزے نے پھولوں کے چند گل دستے اور پھل خریدے تو اُس سے رہا نہیں گیا۔ اُس نے سوال داغ دیا، جس کے جواب نے اُسے حیرت میں ڈال دیا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' حوزے چلتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ میڈرڈ کے مرکزی اسپتال میں تھے۔ اُن کے قدم بچوں کے وارڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں مزید حیرتیں کرسٹیانو کی منتظر تھیں۔

''ہیلو روبینیو۔'' حوزے نے وارڈ کے انچارج کو مخاطب کیا۔

''کیسے ہو حوزے؟'' روبینیو کھل اٹھا۔ ''ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔ دیکھو دوستو، کون آیا ہے۔''

کچھ ہی دیر میں وارڈ کے بچے حوزے کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ ان کے بیمار چہرے دمک رہے تھے۔ اور کرسٹیانو آنکھوں میں تذبذب لیے انہیں تک رہا تھا۔ وہ بچے طرح طرح کے امراض میں مبتلا تھے۔ کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کوئی اپنے پیر سے محروم تھا۔

''کیا تم لوگ تیار ہو!'' حوزے نے بلند آواز میں کہا۔

''ہم تیار ہیں۔'' گو بچے بیمار تھے، مگر ان کی آواز میں بلا کا جوش تھا۔

''حیران ہو رہے ہو لڑکے۔'' کسی نے کاندھا تھپکا۔ وہ چونکا۔ سامنے روبینیو کھڑا تھا۔ اُسے خاموش دیکھ کر اُس شخص نے بات آگے بڑھائی۔

''لڑکے، تمہارا باپ عظیم آدمی ہے، جب بھی یہاں آتا ہے، بچوں میں مسرت دوڑ جاتی ہے۔ وہ اُنہیں فٹبال کی دنیا کی کہانیاں سناتا ہے۔ اور اب تو وہ ان کے لیے ایک کمال کا پروگرام لے کر آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں جوش تھا۔ ''وہ معذور بچوں کے لیے ایک فٹبال میچ کا انعقاد کرنے والا ہے۔''

''کیا واقعی...!'' حیرت کے زیرِ اثر کرسٹیانو نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ''شان دار آئیڈیا ہے ناں؟''

''ہاں، شاندار۔'' کرسٹیانو نے اپنے باپ کی جانب دیکھا، جو بیمار بچوں میں خوشیوں بانٹ رہا تھا۔

''تمہارا باپ ایک قابلِ تقلید انسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کے نقشِ قدم پر چلو گے۔''

''یقیناً!'' کرسٹیانو کے لہجے میں عزم تھا۔

☆☆☆

گرم موسم، دھوپ میں چمکتی گھاس، مقابلے کا سخت ماحول اور کرسٹیانو!

اب وہ ناسیونال نامی کلب کا حصہ تھا جو جزیرے کے دو پروفیشنل کلبس میں سے ایک تھا۔ دس برس کی عمر میں اس کلب تک رسائی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ حوزے نے تو گھر میں دعوت کا اہتمام کیا۔

باصلاحیت کھلاڑیوں کے درمیان خود کو منوانا کرسٹیانو کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ چند ہی مقابلوں کے بعد وہ ٹیم کا مستقل رکن بن گیا۔

حوزے نے واضح محسوس کیا کہ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا ہے، اُس کے جذبات میں شدت آتی جارہی ہے۔ اگر کبھی وہ گول نہیں کرپاتا، تو صدمے سے نڈھال ہوجاتا۔ شکست پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ دوسری جانب جیت اسے خوشی سے لبریز کردیتی۔

ناسیونال کے کھلاڑی اُسے ''تیز مکھی'' کہہ کر پکارتے، کیونکہ جب وہ دوڑتا، مخالفین اُس تک پہنچنے میں ناکام رہتے۔

چند ہی ماہ بعد اسے ایک بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ میڈرڈ چیمپیئن شپ کا آغاز ہونے کو تھا جس میں سخت مقابلے کی توقع تھی۔

ناسیونال کے کوچ کو اپنے دس سالہ کھلاڑی پر پورا بھروسا تھا، البتہ انتظامیہ کے دیگر ارکان اُسے ٹورنامنٹ میں اتارنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ اُنہیں سمجھانے میں اتنا وقت صرف ہوا کہ کرسٹیانو مقابلے میں حصہ لینے کی امید کھو بیٹھا۔ لیکن ایک صبح... گھر کے دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی مایوسی کو مسرت میں بدل دیا۔

کوچ نے انتظامیہ کو راضی کرلیا تھا۔ اور اس نے ثابت کیا کہ اُس کا انتخاب درست تھا۔ ناسیونال نے وہ ٹورنامنٹ جیت لیا۔ جن کھلاڑیوں نے فتح میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، اُن میں کرسٹیانو سرفہرست تھا۔

اُس روز سینٹو اینٹونیو میں جشن منایا گیا۔ محلے کا ہر شخص حوزے کے ہاں مدعو تھا جہاں پرتگالی مسالوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

☆☆☆

فون کی گھنٹی کافی دیر سے حوزے کو پریشان کررہی تھی۔

وہ واش بیسن ٹھیک کرنے میں لگا تھا، مگر بیسن تھا کہ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پانی مسلسل بہہ رہا تھا اور ایسے میں فون بجنے لگا۔

ریسیور اٹھاتے ہوئے جھنجلاہٹ عروج پر تھی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' دوسری جانب سے ایک پُراعتماد آواز سنائی دی۔ ''میں ڈیکو فولن بات کررہا ہے، سپورٹنگ لزبن کلب کا مینجر۔ کیا میں کرسٹیانو رونالڈو کے والد سے بات کرسکتا ہوں، ان کا نام غالباً حوزے ہے...''

وہ سکتے میں تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں، ایک عام سے دن پرتگال کے دارالحکومت سے ایک فون کال موصول ہوگی، فون کرنے والا سپورٹنگ جیسے بڑے کلب کا مینجر ہوگا، اور وہ اس کے بیٹے کے نام سے واقف ہوگا۔

''ہیلو... کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں؟'' ڈیکو کی آواز اُسے لمحۂ حال میں لے آئی۔

''جی... جی ہاں... بالکل... میں ہی کرسٹیانو کا والد ہوں۔ حوزے ایوریو۔''

''کیسے ہیں جناب؟'' ڈیکو نے اس کی بوکھلاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''آپ سے چند اہم امور پر بات کرنی ہے۔ دراصل ہمارا کلب آپ کے صاحب زادے...''

آگے جو کچھ کہا گیا، اُس نے حوزے کے وجود پر لرزا طاری کردیا۔

ڈلورس نے جب بیسن کا پانی بہتے دیکھا، تو اُسے اپنے شوہر پر غصہ آنے لگا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ حوزے ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''اف یہ حوزے بھی ناں۔'' وہ اس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ ''یہاں کیا کر...'' جوں ہی اس کی نظر اپنے شوہر کے چہرے پر پڑی، اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئی۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ پھر سر اٹھا کر اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ ''تمہارے لاڈلے کو یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔''

''ک.. کیا مطلب...؟'' ماں کے لہجے میں اندیشے تھے۔

اور تب حوزے تھوڑا سا مسکرایا، آنکھوں میں خوشی دمکی۔ ''سپورٹنگ لزبن سے بلاوا آیا۔''

''سپورٹنگ لزبن؟'' ڈلورس کی آواز میں غیریقینی تھی۔ ''میں سمجھ نہیں سکی... وہ...''

''ہاں ڈیئر، سپورٹنگ لزبن۔ ان کے ٹرائلز ہورہے۔ وہ کرسٹیانو کو آزمانا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ خود کو ثابت کردے گا۔''

''کیا واقعی۔'' ڈلورس چہکی، مگر اگلے ہی پل چہرے پر اداسی پھیل گئی۔ ''تو اسے میڈرڈ چھوڑنا پڑے گا؟''

حوزے کو اس میں ایک دُکھی ماں نظر آئی۔ اس نے اپنی بیوی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہاں، اُسے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا، اپنے اچھے مستقبل کے لیے... اپنے خاندان کے لیے۔''

ڈلورس نے سر اٹھایا۔ ''اگر قدرت کو یہی منظور ہے، تو یہی سہی۔''

☆☆☆

96ء میں ملک کے سب سے بڑے فٹبال کلب کا حصہ بننے کے لیے گیارہ سالہ کرسٹیانو نے اپنا آبائی وطن چھوڑ دیا۔

یہ سب بہت ہی پُرتجسس تھا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔ ہوائی سفر بھی انوکھا ثابت ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ننھا کرسٹیانو ہوائی جہاز میں سوار ہوا، جس کی کھڑکی سے نیچے جھانکنے پر فقط بادل دکھائی دیتے، یا بادلوں کے درمیان بنے چھید سے سمندر!

اب وہ لزبن میں تھا۔ ملک کے سبب سے بڑے اور ترقی یافتہ شہر میں، جس کی سڑکوں پر رات ہوتے ہی روشنیاں بہنے لگتیں۔

حوزے نے تو اپنی خوشی چھپانے کے لیے خاموشی کا سہارا لے رکھا تھا، مگر کرسٹیانو کو اپنی حیرت چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کشادہ سڑکیں، چوک پر لگے فوارے، بلند عمارتیں، بڑے بڑے مکانات... ایک چھوٹے سے قصبے میں پروان چڑھنے والے بچے کو حیران کرنے کے لیے یہ کافی تھا۔ اور یہ حیرت ڈیکو فولن کے دفتر میں داخل ہونے تک قائم رہی۔

ڈیکو باپ بیٹے سے بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اُس نے کرسٹیانو کو ننھا جادوگر کہہ کر مخاطب کیا اور حوزے کو اس کے بیٹے کی حیران کن صلاحیتوں کے لیے مبارک باد پیش کی۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ خود بھی فٹبال میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور کرسٹیانو کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔''

''اوہ... ہاں... دراصل۔'' حوزے نے جھینپتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ ''مگر مسٹر ڈیکو، آپ کو کرسٹیانو کے بارے میں پتا کیسے چلا، میرا مطلب ہے کہ میڈرڈ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور...''

بے شک میڈرڈ چھوٹا شہر ہے، مگر وہاں صلاحیت کی کوئی کمی نہیں۔'' ڈیکو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''دراصل ہمارے اکاؤنٹنٹ مسٹر جیزے کا تعلق میڈرڈ ہی سے ہے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ ناسیونال کا ایک نوعمر، مگر باصلاحیت کھلاڑی آج کل خبروں میں ہے۔ تو میں نے کہا، ہمیں اس کی صلاحیتیں پرکھنا چاہئیں۔'' پھر وہ تیزی سے کرسٹیانو کی طرف مڑا۔ ''تو خود کو ثابت کرنے کے لیے تیار ہو ننھے جادوگر؟''

''جی میں...'' کرسٹیانو تھوڑا گھبرا گیا، لیکن جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ ''میں ایک اچھا کھلاڑی ہوں، اور یہ ثابت کرسکتا ہوں۔''

ڈیکو نے قہقہہ لگایا۔ ''تو چلو۔''

ٹرائلز کے نتائج کی بابت غور کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ''تیز مکھی'' کو میدان میں کوئی پکڑ نہیں پایا۔ اس نے خود کو ثابت کردیا۔

کچھ دیر بعد حوزے اور کرسٹیانو پھر ڈیکو کے دفتر میں تھے، جس کی میز پر معاہدے کے کاغذات پڑے تھے۔

☆☆☆

بے شک وہ پھرتیلا تھا، مگر مکمل نہیں تھا، اُسے ابھی تربیت کی ضرورت تھی۔

آنے والے برس اکلوچیٹی کے علاقے میں قائم سپورٹنگ کلب کی اکیڈمی میں گزرنے والے تھے۔ جو کسی طور آسان ثابت نہیں ہوئے۔ گھنگریالے بالوں والا لڑکا بہ آسانی اوروں کی تفریح کا سامان بن گیا۔ اس کے لہجے اور طرزِ گفتگو کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ اس کی نقل اتاری جانے لگی۔

دورانِ تربیت اس کی متاثر کن کارکردگی بھی حاسدین کی تعداد میں اضافے کا سبب بنی۔ ہر کھلاڑی اسے اپنا دشمن تصور کرنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اکیڈمی میں اس کا

کوئی دوست نہیں تھا۔

وہ اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا، مگر جھگڑا ہو ہی جاتا۔ موسم گرما میں تو حالات اتنے بگڑ گئے کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر میڈرڈ چلا آیا جہاں اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی کہانی سنائی۔

ماں تو ماں ہوتی ہے۔ ڈولورس نے اسے گلے لگالیا۔

''اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں رہو۔''

حوزے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وقت سمجھانے بجھانے کا نہیں، انتظار کرنے کا ہے۔ جب ایک دن گزر گیا، تب وہ کرسٹیانو کو لے کر صبح کی سیر کے لیے نکلا۔ اس روز باپ بیٹے میں طویل مکالمہ ہوا۔

جب وہ لوٹے، کرسٹیانو واپسی کا فیصلہ کرچکا تھا۔

''کیا تم واقعی واپس جا رہے ہو؟'' بڑے بھائی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں۔'' اس نے سیب پر دانت گاڑتے ہوئے کہا۔

''کب؟'' اب کی بار بہن نے سوال کیا۔

''کل صبح۔'' حوزے نے درمیان میں کہا۔

''مگر...'' ڈولورس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''یہی بہتر ہے ڈولورس۔'' حوزے نے دھیرے سے کہا۔ ''میڈرڈ کا آسمان اس کی پرواز کے لیے ناکافی ہے۔''

''ہاں۔'' کرسٹیانو نے سیب چباتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے پرواز کے لیے بڑا آسمان درکار ہے۔''

☆☆☆

اکیڈمی چھوڑنے والا کرسٹیانو جب میڈرڈ سے لوٹا، تو وہ یکسر بدل چکا تھا۔

آسان الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی کھال خاصی موٹی ہوچکی تھی۔ اب اسے تنقید کی پروا نہیں تھی۔

دوسری جانب اعلیٰ انتظامیہ کو بھی اِس مسئلے کا ادراک ہوچکا تھا۔ ڈیکو جانتا تھا کہ کرسٹیانو نے سہولیات سے محروم ایک مشکل بچپن گزارہ ہے۔

''وہ فقط گیارہ برس کا ہے۔ ہمیں ہی معاملات سنبھالنے ہوں گے۔'' اُس نے فون پر اکیڈمی کے ہیڈ کوچ نیسکوز سے کہا۔ ''وہ ہمارا سرمایہ ہے۔''

''مجھے اس بات کا اندازہ ہے سر۔'' نیسکوز نے جواب دیا۔

معاملات جلد ہی سنبھل گئے۔ اس کے ساتھیوں کی سرزنش کی گئی۔ ساتھ ہی کرسٹیانو کو بھی حالات کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کی گئی۔

''صرف اپنے مقصد پر نظر رکھو۔'' نیسکوز نے اس نے کہا۔ ''بتاؤ، تمہیں پرتگال کا کون سے کھلاڑی پسند ہے؟''

''لیوس فیگو۔'' کرسٹیانو نے پٹ سے کہا۔ ''وہ میرا ہیرو ہے۔''

''شاندار۔'' نیسکوز چہکا۔ ''وہ واقعی ایک عظیم کھلاڑی ہے۔ یوں کرو، اپنے کمرے میں اس کا پوسٹر چسپاں کرلو۔ اب اس کی عظمت تک رسائی ہی تمہارا اکلوتا مقصد ہے۔ فیگو کی طرح رکاوٹوں سے الجھنے کے بجائے انہیں عبور کرنا سیکھو۔''

نصیحت کام آئی۔ دھیرے دھیرے وہ رکاوٹیں عبور کرتا گیا۔ پریکٹس میچز میں اس کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ آزمانے کے لیے اسے ان کھلاڑیوں کے خلاف اتارنے کا فیصلہ کیا گیا، جو گزشتہ دو برس سے اکیڈمی میں زیرِ تربیت تھے۔

یہ ایک بڑا موقع تھا۔ وہ خاصا پُرجوش تھا۔ میدان میں قدم رکھتے ہی اس کا جذبہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اس نے چالاکی سے مخالف کھلاڑیوں کو دھوکا دیا اور سب ہی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ گول پوسٹ پر پے در پے حملے کیے۔

چونکہ میچ نوجوان کھلاڑیوں کو آزمانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اس لیے آدھے مقابلے کے بعد کوچ نے اسے میدان سے باہر بلوالیا۔

جوش سے بھرے کرسٹیانو کو اس بات سے شدید صدمہ پہنچا۔ وہ چپ چاپ ڈریسنگ روم میں چلا گیا، جہاں اکیلے میں وہ رو پڑا۔

اس کی ٹیم میچ جیت گئی، مگر وہ جشن منانے والوں میں شامل نہیں تھا۔ وہ فیگو کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔

☆☆☆

اب وہ باقاعدگی سے جم جانے لگا۔ جب دیگر کھلاڑی خوش گپیوں میں مصروف ہوتے، وہ کسرت کررہا ہوتا۔

اُسے سخت ورزشیں کرتا دیکھ کر ساتھی حیرت سے سوال کرتے۔ ''دوست، اتنی محنت۔ خیریت تو ہے؟''

''میں بڑے مقابلوں کے لیے خود کو تیار کر رہا ہوں۔'' وہ جواب دیتا۔

''اور یہ مقابلے کب شروع ہوں گے؟'' استہزائیہ انداز میں پوچھا جاتا۔

''بہت جلد۔'' لہجے میں اعتماد ہوتا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ انڈر 16 سی ٹیم کا

حصہ بن گیا۔ متاثر کن کارکردگی نے بی ٹیم میں شمولیت کی راہ ہموار کی۔ سفر یہیں اختتام پذیر نہیں ہوا، فقط ایک ماہ بعد وہ انڈر 16 کی اے ٹیم کے لیے کھیل رہا تھا۔

وہ سپورٹنگ کلب کی تاریخ کا پہلا کم عمر کھلاڑی تھا، جس نے اس تیزی سے ترقی کا زینہ عبور کیا۔

اُن ہی دنوں، ایک گرم دوپہر سپورٹنگ انڈر 16 کا سپورٹنگ انڈر 17 سے مقابلہ ہوا۔ مقابلہ دو۔ دو سے برابر رہا۔ گو کرسٹیانو میچ میں گول اسکور نہیں کرسکا، لیکن انڈر 17 کے کوچ کارلوس ڈیاز کی تجربہ کار آنکھوں نے اس نوجوان میں چھپے عظیم کھلاڑی کو پہچان لیا۔

''ذرا اس کی رفتار تو دیکھو۔'' کالورس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''گینداس کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔ پیروں سے چپک جاتی ہے۔ یہ صلاحیت حیران کن ہے۔''

میچ کے اختتام پر کارلوس نے سپورٹنگ کے ڈائریکٹر کو فون کیا۔ ''ہمیں اسے بڑے مقابلوں کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں وہ انڈر 17 کے لیے بھی کھیل سکتا ہے۔''

''کیا یہ قبل از وقت نہیں ہوگا؟'' اس سے سوال کیا گیا۔

''نہیں۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''اور یہ میرا دعویٰ ہے۔''

اور اس نے اپنے دعویٰ ثابت بھی کیا۔ کارلوس کی آشیرباد نے کرسٹیانو کو خاصا اعتماد دیا، جس کی جھلک اس کے کھیل میں نظر آئی۔ چند ہی ماہ میں وہ سپورٹنگ کی انڈر 17 ٹیم کا حصہ بن گیا۔ اور یہاں بھی اس نے لوگوں کو حیران کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اُن ہی دنوں لزبن شہر میں ہونے والے ایک مقابلے میں معروف کوچ پائیلو کورڈس کو اُس کی صلاحیتیں پرکھنے کا موقع ملا۔

پائیلو وی آئی پی انکلوژر میں، کرسٹیانو کے موجودہ کوچ کارلوس کے پہلو میں بیٹھا تھا جو اپنے چہیتے کھلاڑی کی خاصی تعریف کرچکا تھا۔

اُس روز کرسٹیانو کی صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ جونہی گیند اس کے پیروں میں آئی وہ شیر کی طرح دہاڑا۔ پھرتی سے مخالف کھلاڑیوں کو ڈاج دیا اور گیند نیٹ میں پہنچادی۔

تماشائیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور ایسے میں کالورس کو پائیلو کی جوش سے بھری آواز سنائی دی۔

''واہ، تمہارا لڑکا تو وین بیسٹین کی نسل سے ہے۔''

کالورس حیران رہ گیا۔ یہ انتہائی حوصلہ افزا تبصرہ تھا۔ معروف ڈچ کھلاڑی وین کو فٹبال کی دنیا میں دیوتا کا درجہ حاصل تھا۔

''کیا آپ واقعی ایسا سمجھتے ہیں؟'' اس نے اپنے سینئر سے سوال کیا۔

''بالکل۔'' پائیلو کی نظریں میدان پر ٹکی تھیں۔ ''اُس کی تکنیک متاثر کن ہے۔ یہ تو پیدائشی اسٹرائیکر ہے!''

جس وقت پائیلو انکلوژر میں بیٹھا اُس نوجوان کی تعریف کررہا تھا، کرسٹیانو میدان میں جشن منا رہا تھا۔

کارلوس کی تربیت اور کرسٹیانو کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ جلد وہ انڈر 18 ٹیم کا حصہ بن گیا۔

وہ سپورٹنگ کی طویل اور سنہری تاریخ کا اکلوتا کھلاڑی تھا، جس نے ایک ہی برس میں انڈر 16، انڈر 17 اور انڈر 18... تینوں ہی ٹیموں کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا اور ہر ٹیم کی جانب سے کھیلتے ہوئے اپنا انتخاب درست ثابت کیا۔

اور پھر 7 اکتوبر 2002 کا سورج طلوع ہو۔ وہ ایک سنہری دن تھا، اس نے سپورٹنگ کی مرکزی ٹیم کی جانب سے اپنا پہلا میچ کھیلا اور دو جادوئی گول داغ کر ٹیم کی فتح میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اس رات اسے مبارک باد کے ڈھیروں پیغامات موصول ہوئے!

☆☆☆

کسی دانشور کا قول ہے کہ زندگی نشیب و فراز کا نام ہے ... یہ بات کرسٹیانو کی زندگی پر بھی صادق آتی ہے۔

سپورٹنگ لزبن کا حصہ بننے کے بعد بہ ظاہر تو محرومیوں کے دن ختم ہوگئے تھے، شہرت اور دولت اس کی سمت بڑھنے لگی تھی، مگر پھر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔

وہ روٹین چیک اپ کے لیے اسپتال گیا تھا، جو ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل ہوجاتا ہے، مگر اس روز وہ پانچ گھنٹے اسپتال کے اداس ماحول میں قید رہا۔ رپورٹس سے انکشاف ہوا کہ وہ Tachycardia نامی ایک مرض میں مبتلا ہے، جس میں مریض کا دل، ایک صحت مند انسان کے دل کے مقابلے میں تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر ایسے مریضوں کو بھاگ دوڑ سے اجتناب برتنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مگر المیہ یہ تھا کہ دوڑنا ہی پندرہ سالہ کرسٹیانو کی خاصیت تھی۔

معالجین نے فوراً اس کے کلب سے رابطہ کیا۔ اس خبر نے کھلبلی مچادی۔ اُس کے اہلِ خانہ کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

لزبن سے موصول ہونے والی فون کال نے حوزے کے گھر میں کہرام بپا کر دیا۔ ڈولورس سکتے میں تھی۔

''کیا اسے فٹبال کو خیر باد کہنا پڑے گا؟'' ہیوگو نے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

حوزے نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ''وہ آپریشن کے لیے اجازت مانگ رہے ہیں۔''

''میرا بچہ۔'' ڈولورس نے ہچکی لی۔

''خود کو سنبھالو۔'' حوزے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کھلاڑی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں... فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک معمولی آپریشن سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہمت رکھو۔''

سپورٹنگ کلب کی انتظامیہ کو اجازت دے دی گئی۔

''ہم کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔'' سپورٹنگ کے منیجر رومار یو نے حوزے کو یقین دلایا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ آپریشن میں جدید ترین لیزر تکنیک استعمال کی گئی جس نے مسئلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

شام تک اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ چند روز بعد وہ میدان میں پریکٹس کر رہا تھا۔

چند روز بعد وہ اپنے آبائی قصبے آیا، تو ماں اُسے دیکھ کر کِھل اُٹھی۔ ''تم تو بڑے ہو گئے ہو!'' اس نے بیٹے کا ماتھا چوما۔

''ہاں۔'' اُس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ پھر وہ باپ کی طرف مڑا۔ ''ڈیڈ، اس اتوار جب آپ اپنے ننھے دوستوں سے ملنے اسپتال جائیں، تو مجھے ساتھ لے جانا مت بھولیے گا۔ میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ ضرور۔'' حوزے... مسکرایا۔ ''تم... واقعی بڑے ہو گئے ہو۔''

☆☆☆

2002 کے اواخر میں لندن سے ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔

فون کی دوسری طرف معروف انگلش کلب آرسنل کا منیجر آرسن ونگر تھا۔ ''نوجوان، ہمارا پریکٹس سیشن شروع ہونے والا ہے۔ کچھ وقت نکال کر چکر لگاؤ۔''

''ضرور کیوں نہیں!'' حیرت کے زیرِ اثر کرسٹیانو اتنا ہی کہہ سکا۔ ریسیور رکھنے کے بعد اس نے اپنے باپ سے رابطہ کیا۔ ''ڈیڈ، کل تک میں آرسنل کے میچز ٹی وی پر دیکھا کرتا تھا اور آج ان کی جانب سے مجھے انگلینڈ کے دورے کی دعوت ملی ہے۔''

''وقت کی رفتار واقعی تیز ہے۔'' حوزے کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔ ''میرے خیال میں تمہیں انگلینڈ کا سفر کرنا چاہیے۔''

سپورٹنگ کی انتظامیہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' ٹیم کے منیجر نے کرسٹیانو کا مدعا سننے کے بعد کہا۔ ''لیکن یاد رکھنا، تم پر پہلا حق ہمارا ہے۔''

چند روز بعد وہ لندن میں تھا، جس کی گلیوں میں جدید اور قدیم تہذیب کا حسین امتزاج اپنے جلوے بکھیرتا تھا۔

آرسن سے ہونے والی ملاقات انتہائی خوشگوار رہی۔ ''مسٹر رونالڈو، آرسنل انتظامیہ آپ کی صلاحیتوں کی قدر کرتی ہے اور ان سے استفادہ کرنے کی خواہش مند ہے۔''

''یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔'' کرسٹیانو نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب اسے رونالڈو کہہ کر مخاطب کیا گیا۔

پریکٹس سیشن میں جلوے دکھانے کے بعد جب وہ لزبن لوٹا، اعتماد آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی شہرت سرحدیں عبور کر چکی تھی۔

بدقسمتی سے آرسنل انتظامیہ کو حتمی فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لگا۔ شاید وہ تذبذب کا شکار تھے، مگر اس کا نقصان آرسنل ہی کو اٹھانا پڑا، کیونکہ اسی عرصے میں ایک حقیقی جوہری کی نظر اِس ہیرے پر پڑی، جس کا نام ایلکس فیرگوسن تھا۔

''سر'' کے خطاب سے نوازے جانے والے ایلکس فیرگوسن کو کوچنگ کے میدان میں اساطیری شہرت حاصل تھی۔ اِسی شخص کے طفیل انگلش کلب مانچسٹر یونائیٹڈ نے عظمت کا زینہ عبور کیا۔

2003 میں مانچسٹر یونائیٹڈ نے پرتگال کا سفر کیا۔ لزبن کے میدان میں سپورٹنگ اور ایلکس کی ٹیم کے درمیان مقابلہ ہوا۔

اپنے من پسند کلب کے خلاف کھیلنا جہاں کرسٹیانو کے لیے باعثِ مسرت تھا، وہیں وہ تھوڑا مضطرب بھی تھا، مگر میدان میں اترتے ہی صورتِ حال یکسر بدل گئی۔

اُس روز وہ اپنے عروج پر تھا۔ ہر خوف سے آزاد، ہر خطرے سے بے پروا۔ چوکس اور پھرتیلا۔ اس کی رفتار اور مہارت نے مخالف ٹیم کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ یونائیٹڈ کو تین ایک سے شکست ہوئی۔

میچ کے بعد جب یونائیٹڈ انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی تو سب کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔ ''کرسٹیانو رونالڈو!''

''وہ مانچسٹر یونائیٹڈ کا حصہ بننے کا حق دار ہے۔'' کوچنگ اسٹاف کے سینئر رکن جیمز کین نے ایلکس کو مخاطب کیا۔

''میں اِسی بارے میں سوچ رہا تھا۔'' ایلکس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''میں نے سُنا ہے کہ اسپینش کلب بارسلونا بھی اُسے سائن کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔'' ایک رکن نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

''جانتا ہوں۔'' ایلکس نے گہرا سانس لیا۔ ''لیکن بارسلونا انتظامیہ پہلے ہی کئی انٹرنیشنل کھلاڑیوں کو سائن کر چکی ہے، میرے خیال میں اُنہیں سرمائے کی کمی کا سامنا ہوگا۔''

''تو پھر اُسے ایک شان دار پیشکش کریں گے۔'' جیمز کین نے کہا۔

''لگ بھگ کتنی؟'' ایلکس اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''15 ملین یورو!'' جیمز نے پہلے ہی اِس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، تو تیاریاں شروع کرو!''

☆☆☆

آخر مانچسٹر یونائیٹڈ جیسا چوٹی کا کلب ایک پرتگالی کھلاڑی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا؟ کیا اس کا اکلوتا سبب کرسٹیانو کی قابلیت تھی؟

نہیں! اِس کا ایک سبب اور بھی تھا۔

طلسماتی شخصیت کا مالک انگلش فٹبالر ڈیوڈ بیکھم ایک طویل عرصے سے یونائیٹڈ کا حصہ تھا۔ جہاں ماضی میں وہ اپنے کلب کو کئی حیران کن فتوحات دلوا چکا تھا، وہیں 03-2002 کی پریمیئر لیگ کی ٹرافی مانچسٹر کے نام کرنے میں بھی اس نے کلیدی کردار ادا کیا، مگر... گزشتہ کچھ عرصے سے اس کے اور ٹیم منیجر ایلکس کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے، جس کے پیشِ نظر یہ کہا جانے لگا تھا کہ اب ان میں سے کوئی ایک ہی کلب کا حصہ رہ سکتا ہے۔ اسپینش کلب ریال میڈرڈ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ڈیوڈ بیکھم سے رابطہ کیا۔ ''مسٹر بیکھم، ریال میڈرڈ جیسا کلب ہی آپ کی صلاحیتوں کا اصل حق دار ہے!''

اُسے شان دار پیشکش کی گئی۔ ڈیوڈ نے یہی بہتر جانا کہ ایلکس سے الجھنے کی بجائے اب نئے میدانوں کا رخ کیا جائے۔

جب یونائیٹڈ کے کھلاڑی پریمیئر لیگ کی ٹرافی ہاتھ میں تھامے جشن منا رہے تھے، بیکھم اسپین جانے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

اِس خبر نے تہلکہ مچا دیا۔ یہ بحث چل نکلی کہ کیا کبھی عظیم بیکھم کی کمی پوری ہو سکے گی۔

اس سوال نے ایلکس کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کر لی۔ اُسے فوری طور پر ایک باصلاحیت مڈفیلڈر تلاش کرنا تھا۔ کوئی ایسا کھلاڑی جو بیکھم کی طلسماتی شخصیت کی جگہ لے سکے۔ اور اس کی نظرِ انتخاب کرسٹیانو رونالڈو پر آ کر ٹھہری۔

جس شام پرتگال میں بیٹھے کرسٹیانو کو ایلکس فیرگوسن کی فون کال موصول ہوئی، لزبن کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، جس کی اوٹ سے جھانکتے سورج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

سپورٹنگ کلب کا شہزادہ اب عالمی افق پر چمکنے والا تھا!

☆☆☆

''تم کس نمبر کی جرسی پہننا چاہو گے رونالڈو؟'' ایلکس نے اسے کرسٹیانو کی بجائے رونالڈو کہہ کر پکارا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ اُس وقت وہ مانچسٹر یونائیٹڈ کے مرکزی دفتر میں بیٹھا تھا۔ چند ہی لمحوں قبل اُس نے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ اور ابھی اس بات پر پوری طرح یقین نہیں کر پایا تھا کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے فٹبال کلب کا حصہ بن چکا ہے کہ ایک مشکل سوال داغ دیا گیا۔

اسے خاموش دیکھ کر ایلکس نے کہا۔ ''نمبر سات کیسا رہے گا؟ ہمارے کلب کے کئی مایۂ ناز کھلاڑیوں نے اِس نمبر کی جرسی پہنی۔ جیسے جارج بیسٹ، بریان روبنسن اور... جس کھلاڑی کی تم جگہ لے رہے ہو، یعنی ڈیوڈ بیکھم... وہ بھی سات نمبر ہی کی جرسی پہنا کرتا تھا۔''

اس نے دل ہی دل میں یہ نام دہرائے... عظیم جارج بیسٹ... جادوگر بریان روبنسن اور اساطیری شہرت کا حامل ڈیوڈ بیکھم!

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''نمبر سات نہیں۔ فی الحال نہیں!''

ایلکس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے بات جاری رکھی۔ ''میں سپورٹنگ کے لیے 28 نمبر کی جرسی پہنا کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہی ٹھیک رہے گی۔''

''نہیں۔'' ایلکس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''تم نمبر سات کی جرسی ہی پہنو گے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے مسٹر رونالڈو۔''

''یہ میرے لیے... اعزاز کی بات ہوگی۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''تم اس کے حق دار ہو۔ اور سنو... جرسی پر تمہارا نام رونالڈو لکھا جائے گا۔ اب تم اسی نام سے جانے جاؤ گے۔ کوئی اعتراض؟'' ایلکس مسکرایا۔

''نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ میرے والد کو یہ سن کر خوشی ہوگی۔'' وہ بھی جواباً مسکرایا۔

''زبردست!'' ایلکس نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ پہلا موقع ہے، جب مانچسٹر یونائیٹڈ نے کسی پرتگالی کھلاڑی پر بھروسا کیا۔ تمہیں ہمارے بھروسے پر پورا اترنا ہوگا۔''

''مجھ پر یقین رکھیں۔'' رونالڈو کے لہجے میں عزم تھا۔ ''میں فٹبال کھیلنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہوں۔''

☆☆☆

انگلش پریمیئر لیگ۔ بولٹن بہ مقابلہ مانچسٹر یونائیٹڈ۔ اسٹیڈیم نعروں سے گونج رہا تھا اس کے بدن میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ میدان میں اترتے ہی وہ دہاڑا۔ دشمن خوف سے لرز اٹھے۔ اس کی پھرتیوں نے ان کی آنکھیں خیرہ کردیں۔ وہ میچ اس کے کلب نے چار۔صفر سے جیت لیا۔

میدان سے لوٹتے وقت اس نے پُرجوش مداحوں سے ہاتھ ملایا۔ ڈریسنگ روم میں ایلکس اس کا منتظر تھا۔ ''تمہاری رفتار نے دشمنوں کی صفیں توڑ دیں۔''

''سن کر خوشی ہوئی۔'' وہ مسکرایا۔

''لیکن تمہیں احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہوگا۔ مخالفین تم پر حملہ کریں گے، تمہیں اکسائیں گے۔ ہرصورت خود پر قابو رکھنا۔''

اگلا میچ پروٹس ماؤتھ کلب کے ساتھ تھا۔

مقابلے کے ایک خاص لمحے، جب کرسٹیانو کا وجود حدت سے تپ رہا تھا، اس کے پیر کی ٹھوکر نے وہ جادوئی منظر تخلیق کیا، جس نے شائقین کو مبہوت کر دیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں گیند نیٹ میں پہنچ گئی۔ وہ اپنا پہلا گول داغ چکا تھا اور اب اپنے مخصوص انداز میں جشن منا رہا تھا۔ مانچسٹر نے وہ مقابلہ تین۔صفر سے جیت لیا۔

اس سیزن کے آخری میچ میں بھی اس نے گول داغا اور ٹیم کی فتح میں کلیدی کردار ادا کیا۔

2003-04 کے انگلش سیزن نے اس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دی۔ اب وہ ایک سپر اسٹار تھا، جس کے میدان میں داخل ہوتے ہی مداحوں کا شور بلند ہوتا۔ البتہ مداحوں کے برعکس ریفری اسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کئی مقابلوں میں اسے تنبیہ کی گئی۔ یلو کارڈ بھی دکھایا گیا۔ چند روایت پسند ناقدین نے اس کی تکنیک پر تنقید بھی کی، مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اُسے تو بس میڈرڈ کی فکر تھی جہاں اس کا گھرانا مقیم تھا۔ اب وہ کماؤ پوت تھا۔ خاندان کی ذمے داری کاندھوں پر تھی اور وہ ان کی زندگیوں میں بہتری لانا چاہتا تھا۔

سیزن ختم ہوتے ہی وہ پرتگال جانے کی تیاریوں میں جٹ گیا۔

''کیا گھر والے یاد آرہے ہیں؟'' روم میٹ نے سوال کیا۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''اتنی جلدی کیا ہے دوست۔ ذرا گھومو، پھرو۔ شہرت کا مزہ لو۔''

رونالڈو نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ پھر دھیرے سے کہا۔ ''شہرت ہمیشہ نہیں رہے گی، یہ عارضی شے ہے۔ مگر جذبۂ محبت، آپ کا خاندان ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔''

چند روز بعد وہ اپنے آبائی قصبے میں تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں جہاں اس نے آنکھ کھولی، جہاں پرتگالی مسالوں کی خوشبوئیں پھیلی رہتی۔ اس کے پاس کئی منصوبے تھے۔ وہ اس گھر میں تزئین و آرائش کے ساتھ توسیع کا خواہش مند تھا۔ ایک سوئمنگ پول بھی بنانا چاہتا تھا۔

''اس فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے؟'' ڈلورس کے لہجے سے ممتا جھلکتی تھی۔

''ہاں بیٹا، ہم یہاں مطمئن ہیں۔'' حوزے نے بھی سمجھایا۔

''مگر سوئمنگ پول اور چند کمروں کے اضافے سے آپ کا اطمینان کسی طور کم نہیں ہوگا۔'' رونالڈو مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ ''میں نے ٹھیکے دار سے بات کر لی ہے۔ وہ جلد کام شروع کردے گا۔''

''یہ شان دار آئیڈیا ہے۔'' ہیوگو بیچ میں کود پڑا۔ ''میرے خیال میں ہمیں اوپری منزل پر کچھ کمرے بنا لینے چاہئیں۔''

''بالکل۔'' رونالڈو نے گردن ہلائی۔ ''اور ہاں، چند

پارٹیوں کا ابھی انتظام کیا جائے، آخر ایک سپر اسٹار گھر لوٹا ہے۔''

اس جملے کے ساتھ ہی گھر میں قہقہے بلند ہوئے۔

☆☆☆

انٹرنیشنل کلب کی جرسی پہننا بے شک اعزاز کی بات ہے مگر بین الاقوامی مقابلوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنا... اس سے پُرمسرت لمحہ تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

اُن دنوں پرتگال پوری طرح فٹبال کے سحر میں تھا جس کا بنیادی سبب یورو 2004 کا ٹورنامنٹ تھا، جس کی میزبانی اس بار رونالڈو کا ملک کر رہا تھا۔

پرتگال کا شمار مضبوط ٹیموں میں ہوتا تھا، مگر بدقسمتی سے پرتگالی ٹیم کبھی کوئی بڑا ٹورنامنٹ اپنے نام نہیں کرسکی۔ اس نقطۂ نگاہ سے یورو کپ ایک سنہری موقع تھا، اپنا گراؤنڈ، اپنے لوگ، اپنا پریس... اس سے اچھا موقع ملنا مشکل تھا۔

رونالڈو ملک کی نمائندگی کرنے کی آرزو میں سلگ رہا تھا۔ جس روز یہ اطلاع آئی کہ اسے قومی ٹیم کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے، خوشی سے اس کے آنسو چھلک پڑے۔

جب وہ کیمپ میں پہنچا، تو خاصا نروس تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے، آج وہ اپنے ہیرو اور پرتگالی کپتان فیگو سے ملنے والا تھا۔

مگر فیگو سے ملاقات بعد میں ہوئی، پہلے سامنا پرتگالی ٹیم کے کوچ، لیوز فلپ سے ہوا جس کا تعلق برازیل سے تھا۔

''لڑکے، میں پہلے بھی رونالڈو نامی دو برازیلی کھلاڑیوں کا کوچ رہا ہوں۔'' اُس کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''امید ہے، تم بھی اتنے ہی باصلاحیت ہوگے۔''

لیوز سے ملنے کے بعد فیگو سے ملاقات ہوئی، جسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ بات کرتے ہوئے وہ ہکلا رہا تھا۔ فیگو نے بھانپ لیا کہ نوجوان گھبرایا ہوا ہے۔ اس نے رونالڈو کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''کھلاڑی کا اعتماد ہی اس کی اصل قوت ہے۔ مقابلے کے لیے تیار رہو۔''

وہ تیار تھا۔ پوری طرح... مگر شاید قسمت کو کچھ اور منظور تھا!

یورو کپ میں ان کا پہلا مقابلہ یونان سے تھا۔ رونالڈو نصف میچ کے بعد، تماشائیوں کے نعروں میں میدان میں اترا۔ اس وقت یونان کو ایک۔صفر کی برتری حاصل تھی۔ وہ آتے ہی میچ پر چھا گیا۔ مگر وہ ایک غلطی کر بیٹھا۔

یونانی ٹیم مسلسل حملے کر رہی تھی۔ اُن کے کھلاڑی بھرپور فارم میں تھے۔ ایسے میں رونالڈو نے جذبات سے مغلوب ہوکر ایک یونانی کھلاڑی پر حملہ کیا۔ ریفری نے اُس کی پھرتی کو فاؤل قرار دیا۔ یونان کو پینالٹی کک مل گی۔ چند پلوں بعد اسکور دو۔صفر تھا۔ اور نوجوان رونالڈو کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔

''اپنا سر بلند رکھو۔ مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' یہ فیگو کے الفاظ تھے، جنہوں نے اسے نیا حوصلہ دیا۔

پرتگال نے جوابی حملے شروع کیے۔ رونالڈو سب سے آگے تھا۔ ایسے میں پرتگال کو ''کارنر'' مل گیا۔ فیگو گیند لیے میدان کے کونے میں پہنچا۔ اُس کی شاطر نظروں نے جائزہ لیا، پھر ماہرانہ انداز میں گیند کو ٹھوکر لگائی، جو سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے ٹھیک اس مقام پر پہنچ گئی، جہاں رونالڈو کھڑا تھا، جس نے سر کی بھرپور ٹکر سے گیند کو نیٹ میں پہنچا دیا... وہ انٹرنیشنل کیریئر میں اپنا پہلا گول کر چکا تھا۔

وہ خوشی کا لمحہ تھا، جو چند ہی منٹ بعد ماند پڑ گئی۔ ریفری نے اختتامی سیٹی بجادی۔ پرتگال میچ ہار چکا تھا۔

ڈریسنگ روم لوٹتے وقت وہ خاصا مضمحل تھا۔ کوچ اور کپتان کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ انہیں ایک بڑا فیصلہ کرنا تھا۔

پرتگال کا اگلا میچ روس کے خلاف تھا، جس میں مہمان ٹیم نے فتح حاصل کی، مگر یہ فتح رونالڈو کا دُکھ کم نہیں کرسکی، کیونکہ اسے میچ میں اتارنے سے اجتناب برتا گیا تھا۔

اخبارات نے اِس فیصلے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ سابق کھلاڑی بھی اُس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ صورتِ حال ٹیم مینجمنٹ کے لیے پریشان کن تھی، مگر پہاڑ سا عزم رکھنے والا فیگو معاملات سنبھالنا جانتا تھا۔

اگلا مقابلہ اسپین سے تھا۔ میچ سے ایک رات قبل ناامیدی میں گھرے رونالڈو کو فلپ کا بلاوا ملا۔ وہ اپنے کوچ کے کمرے میں پہنچا، تو فیگو بھی وہاں موجود تھا۔

''تم کل کھیل رہے ہو۔'' یہ فیگو کا جملہ تھا، جس نے اسے چونکا دیا۔

''مگر...'' فیگو نے اپنی جاری رکھی۔ ''میں تمہیں اس کے لیے نہیں کھلا رہا کہ پریس تمہاری حمایت کر رہا ہے۔ اس کا سبب تمہاری صلاحیت ہے۔ یاد رکھو، اگر تم دباؤ برداشت نہیں کرسکے، تو کبھی عظمت کی بلندی پر نہیں پہنچ سکو گے۔''

اسپین کے خلاف اس نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ گول تو اسکور نہیں کرسکا، لیکن اس کی پھرتیوں نے مخالفین کو خاصا پریشان رکھا۔

میچ کے بعد ہر ایک نے اُس کی تعریف کی، مگر فیگو تھوڑا خاموش تھا۔ رونالڈو کو محسوس ہوا کہ کپتان اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اگلے روز ٹریننگ سیشن میں اُن کے درمیان مکالمہ ہوا۔

''کیا آپ مجھ سے مطمئن نہیں؟'' یہ جملہ ادا کرتے ہوئے وہ ہکلا رہا تھا۔

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' فیگو کے لہجے میں حیرت تھی۔

رونالڈو خاموش رہا۔ فیگو نے اس کا چہرہ پڑھ لیا۔ وہ گویا ہوا۔ ''تم میچ کے دوران بہت زیادہ زور مارتے ہو۔ کیا میں دُرست کہہ رہا ہوں؟''

''جی... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''ایسا ہی ہے۔ میں نے فلپ سے بھی بات کی ہے۔'' فیگو کہیں دور، خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ ''سنو، میں تمھیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اِس عادت کو برقرار رکھنا۔ زور مارو، خود کو ثابت کرنے کے لیے پوری قوت صرف کردو۔ کام یابی ضرور تمہارے قدم چومے گی۔''

''شکریہ! میں یہ نصیحت یاد رکھوں گا۔'' اس کے لہجے میں تشکر تھا۔

کوارٹر فائنل میں پرتگال کا مقابلہ انگلینڈ سے تھا، جس کے بیش تر کھلاڑیوں سے وہ واقف تھا، مگر وہ ان کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔

بے شک وہ فارم میں تھا، مگر انگلینڈ کا دفاعی کھلاڑی ایشلے کول اس دن اپنے عروج پر تھا۔ رونالڈو اسے چکمہ دینے میں ناکام رہا۔ میچ صفر۔صفر سے برابر رہا، فیصلے کے لیے پینالٹی کک پر انحصار کرنا پڑا، جہاں انگلینڈ کے اعصاب جواب دے گئے۔ پرتگال نے مقابلہ جیت لیا۔

سیمی فائنل میں اُنہیں ہالینڈ کی مضبوط ٹیم سے بھڑنا تھا جس کے دفاعی کھلاڑی ایشلے کول جتنے قابل نہیں تھے، وہ اس گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ اُس نے شان دار گول داغا اور میچ کا بہترین کھلاڑی قرار پایا۔ مگر یہ اکلوتی خوشی نہیں تھی اصل سبب کچھ اور تھا... پرتگال پہلی بار کسی بڑے ٹورنامنٹ کے فائنل میں پہنچ گیا تھا.. ملک میں جشن برپا تھا. وہ جیت سے ایک قدم دور تھے۔

فائنل والے روز پرتگال پر دیوانگی طاری تھی۔ ہر شخص جذبات سے لرزاں تھا۔ رونالڈو کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔

ان کا مقابلہ یونان سے تھا، جو گروپ میچ میں انہیں شکست دے چکا تھا۔ پرتگالی بدلا لینے کے لیے اتاولے ہورہے تھے، مگر... وہ دن، جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینے کا تھا۔

پہلے ہی ہاف میں یونان نے گول داغ دیا۔ یہ پرتگالیوں کے لیے بھاری صدمہ تھا۔ مگر بلند حوصلہ فیگو شکست قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنی گیارہ رکنی ٹیم کو اکٹھا کیا اور حملے کا حکم جاری کردیا۔

آگے جو کچھ ہوا، وہ حیران کن تھا۔ پرتگالی کھلاڑیوں نے یونان کے گول پوسٹ پر تابڑتوڑ حملے کیے۔ انہوں نے اپنی کل توانائی صرف کردی۔ لیکن وہ یونان کا دن تھا۔ جب میچ ختم ہوا، یونان یورو کپ کا فاتح بن چکا تھا۔

پورا ملک صدمے میں تھا۔ سوگ کی راکھ ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ کھلاڑی بھی دکھی تھے.... ایسے میں مایوس مداحوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

رونالڈو... پرتگالی ٹیم کا نوجوان ترین کھلاڑی، جسے مستقبل کا معمار کہا جارہا تھا، زاروقطار رو رہا تھا۔ کرب اس کے چہرے پر منجمد ہوچکا تھا۔ صدمہ اُس کا وجود کھا رہا تھا۔

مداحوں کا دکھ حیرت میں تبدیل ہوگیا۔ آج سے قبل انہوں نے کسی کھلاڑی کو یوں شکست کا گریہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنا ماتم بھول گئے اور اس نوجوان کو تکنے لگے، جس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

کوچ نے فیگو سے کہا۔ ''لڑکے کو سنبھالو۔ وہ خود کو ہلکان کررہا ہے!''

''اسے رونے دو۔'' فیگو نے گہرا سانس لیا۔ ''پرتگال چند روز میں شکست کا غم بھول جائے گا، مگر اس کے آنسو کبھی نہیں بھولے گا!''

☆☆☆

سمندر اضطراب سے بھر گیا۔ لرز اٹھا۔ اتھاہ گہرائیوں سے قاتل لہروں نے جنم لیا، جو جھاگ چھوڑتی ہوئی انڈونیشیا کی جانب بڑھنے لگیں، جہاں مارطینونس نامی ایک سات سالہ بچہ مقیم تھا، جس کی زندگی عجیب ڈھنگ سے کرسٹیانو رونالڈو سے جڑی ہوئی تھی۔

یہ 2004 کا ذکر ہے، جب بحرِ ہند میں جنم لینے والے ایک ہولناک طوفان نے لاکھوں انسانوں کو موت کی کھائی میں دھکیل دیا۔

مارطینونس بھی سونامی کہلانے والی اس آفاتِ ناگہانی کے متاثرین میں شامل تھا۔ سیلابی لہریں چنگھاڑتے ہوئے اُس کے گھر میں داخل ہوئیں اور اس معصوم کو بہا کر میلوں دور ایک ایسے جنگل میں لے گئیں، جہاں تنہائی اور وحشت کا راج تھا۔

مارطینونس کو کئی تلخ دن اس ویرانے میں گزارنے پڑے، جہاں ہر لمحہ موت کے لیے سازگار تھا۔ زندہ رہنے کے لیے اسے جنگلی بیروں اور بارش کے پانی پر گزارہ کرنا پڑا۔ تین ہفتوں بعد جب امدادی کارکن اس مقام تک پہنچے، بچے کی حالت انتہائی خراب تھی، مچھروں اور جنگلی کیڑوں نے اس پر یلغار کررکھی تھی، مگر حیرت انگیز طور پر ان کٹھن حالات میں بھی وہ زندہ تھا۔

معالجین نے بہ مشکل اُس کی جان بچائی۔ اُس باہمت بچے کی کہانی پر ایک ڈاکومینٹری بنائی گئی، جسے دیکھنے والے بیک وقت دو کیفیات سے گزرے۔ ایک جانب جہاں ان کی آنکھوں میں نمی تھی، وہیں حیرت بھی تھی... دراصل جب امدادی کارکنان جنگل کے ماحول سے مقابلہ کرتے اُس بچے تک پہنچے تھے، اس نے سات نمبر کی جرسی پہن رکھی تھی، جس کی پشت پر رونالڈو کا نام درج تھا۔

شاید یہ چھوٹی سی خبر کبھی بین الاقوامی توجہ حاصل نہ کرتی، اگر پرتگالی کوچ لیوز فلپ وہ ڈاکومینٹری نہ دیکھ لیتا۔

ڈاکومینٹری دیکھتے ہی فلپ نے رونالڈو کو فون کیا۔ ''انڈونیشیا کے ایک دورافتادہ قصبے سے تعلق رکھنے والا تمہارا سات سالہ مداح ایک آفت کی زد میں ہے۔''

واقعے کی تفصیلات سن کر رونالڈو کا دل پسیج گیا۔ وہ کئی گھنٹے تک صدمے میں رہا۔ اسے رہ رہ کر کینسر میں مبتلا وہ بچے یاد آرہے تھے، جن سے اس کی ملاقات میڈرڈ کے مرکزی اسپتال میں ہوئی تھی، جہاں وہ اکثر اپنے باپ کے ساتھ جایا کرتا تھا۔

غم کی اتھاہ گہرائیوں میں یک دم ایلکس فیرگوسن کے مانوس الفاظ گونجے۔ ''یہی سات نمبر کی جرسی تمہاری پہچان بنے گی!''

دھیرے دھیرے منظر صاف ہونے لگا۔ مایوسی کی جگہ امید پنپنے لگی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ ''قدرت نے مجھے جو خوشیاں عطا کیں، اب اُنہیں اوروں میں بانٹنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے اس لڑکے سے ملنا ہوگا۔''

چند روز بعد جب وہ ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے مشرق بعید کی طرف روانہ ہوا، تو راستے میں انڈونیشیا بھی رکا، جہاں اُس نے اپنے سات سالہ مداح سے ملاقات کی، جو ٹھیک اُس کی مانند دھان پان سا تھا۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کب کس کا انتخاب کرلے، کوئی اِس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ البتہ صفِ اول کے فٹبالر کرسٹیانو رونالڈو کی کہانی قدرت کی اس عادت کی چند تفصیلات ضرور فراہم کرتی ہے۔

رونالڈو تفکرات سے آزاد شہرت کے آسمان میں محو پرواز تھا، جب قدرت نے اُس کے دل میں ایک نیک خواہش جگائی، جو اسے پُرآرائش زندگی سے میلوں دور انڈونیشیا کے مسلم اکثریتی علاقے آچے لے گئی، جہاں اُس نے سونامی سے متاثر ہونے والے لاکھوں مسلمانوں کی بحالی اور فلاح و بہبود کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے کا سلسلہ شروع کرکے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک کھلنڈرا نوجوان اتنے حساس دل کا مالک ہوگا۔

قدرت کا منصوبہ یہیں تمام نہیں ہوا۔ ایک ایسے زمانے میں جب پورے مغرب نے اسرائیلی مظالم پر چپ سادھ رکھی تھی، اس پرتگالی کھلاڑی نے فلسطینی کاز کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کھلبلی مچا دی۔ 2011 جب اسرائیل فلسطینیوں پر مظالم ڈھا رہا تھا، رونالڈو نے غزہ کے معصوم بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اپنے اسپورٹس شوز نیلامی کے لیے پیش کردیے، جس سے حاصل ہونے والے 2400 یورو اُس نے غزہ میں اسکولوں کی تعمیر کے لیے عطیہ کرنے کا اعلان کردیا۔ اس اقدام نے فٹبال کے کروڑوں شائقین کو اس گمبھیر مسئلے کی جانب متوجہ کیا۔ سوشل میڈیا میں مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں نے پہلی بار کھل کر اسرائیلی مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔

اُس کی عملی جدوجہد یہیں تمام نہیں ہوئی۔ 2011 میں اُسے ''گولڈ بوٹ ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔ اس نے سونے میں ڈھلا یہ جوتا ایک فاؤنڈیشن کے حوالے کردیا۔ یہ جوتا لگ بھگ پندرہ لاکھ یورو میں فروخت ہوا۔ یہ بھاری بھرکم رقم رونالڈو نے غزہ کے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردی۔

اُسے دکھاوے کا شوق نہیں، اسی لیے اس پورے عمل کے دوران وہ پسِ پردہ رہا۔ اتفاقاً یہ خبر ایک عرب ویب سائٹ کے ہاتھ لگ گئی۔ البتہ اِس خبر کے میڈیا میں آنے کے بعد اُس نے اِس پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ یہ خبریں بھی گردش میں ہیں کہ وہ پسِ پردہ رہتے ہوئے آج بھی فلسطینی بچوں کے لیے مصروفِ عمل ہے۔

وہ لڑکا خاصا شرمیلا تھا۔ گفتگو کے دوران ایک آدھ لفظ ہی بول سکا۔ رونالڈو اس کے لیے کئی تحائف لے کر گیا، جنہیں دیکھ کر لڑکے کی آنکھوں میں مسرت دمکنے لگی۔

جس طرح مارطینس کے لیے وہ لمحہ یادگار تھا، ٹھیک ویسے ہی رونالڈو بھی مسرت کے انوکھے تجربے سے گزرا۔

اُس کا منصوبہ فقط اپنے مداح سے ملاقات تک محدود نہیں تھا۔ وہ متاثرینِ سیلاب کی بحالی کے لیے کام کرنے کا عزم کر چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا، جنہوں نے اِس نیک کام میں اس کی بھرپور معاونت کی یقین دہانی کروائی۔ پرتگال فٹ بال فیڈریشن نے اس منصوبے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ نئے گھروں کی تعمیر کے لیے 70 ہزار یورو کی خطیر رقم اکٹھی کی گئی۔

جب وہ انڈونیشیا سے روانہ ہو رہا تھا، اُس کی روح میں لطافت کا پاکیزہ احساس دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

مارطینس سے ملاقات نے اس کی زندگی ہی بدل دی!

شہرت کی چمک دمک، دولت کی ریل پیل نے اسے اپنی جڑوں سے لاتعلق کر دیا تھا، مگر انڈونیشیا کے تجربے نے اسے اپنے اندر چھپے حقیقی انسان کو دریافت کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اُس کے پاس بے پناہ دولت تھی، شہرت تھی، لاکھوں مداحوں کی محبت تھی، اِن نعمتوں کے لیے وہ قدرت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اور دکھی انسانیت کی خدمت بہترین راستہ تھا۔

وہ دکھاوا نہیں کرنا چاہتا تھا، اِس لیے بڑی خاموشی سے اس نے سینٹو اینٹونیو میں چند فلاحی منصوبے شروع کیے۔ اسپتالوں اور یتیم خانوں کو فنڈز دیے۔

سیاست اس کا موضوع نہیں تھا، مگر اس بات کا رونالڈو کو شدید قلق تھا کہ اسرائیل کے جارحانہ رویّے کے خلاف آواز بلند کرنے اور فلسطین کی حمایت کے معاملے میں یورپ تذبذب کا شکار ہے۔

جب اُس نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ فلسطین میں کئی بچے انتہائی اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔ تعلیمی سہولیات تو درکنار، ان کے پاس رہنے کے لیے گھر تک نہیں۔

"مجھے ان بچوں کے لیے کچھ کرنا ہے۔" دل سے آواز آئی۔ اِس ضمن میں جہاں اس نے فلسطینی بچوں کے لیے کام کرنے والی تنظیموں سے رابطہ کیا، وہیں وہ فٹبال میچز کے دوران فلسطینی کاز کی اخلاقی حمایت کے لیے فلسطینی جھنڈے کی پٹی پہننے لگا۔ ان کی حمایت میں چند انٹرویوز بھی دیے، جنہوں نے روایت پسندوں کو ناراض کر دیا، مگر رونالڈو کو پروا نہیں تھی۔

وہ قدرت کے عظیم منصوبے کا حصہ بن چکا تھا!

☆☆☆

لندن کے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ درجہ حرارت معتدل تھا۔ الغرض وہ فٹبال مقابلے کے لیے بہترین وقت تھا۔ مگر رونالڈو تھوڑا مضطرب تھا، کچھ بے رنگ خواب اُس کے تعاقب میں تھے، جو اندیشوں کو بڑھاوا دیتے۔ اس سانحے کی جانب اشارہ کرتے، جو وقوع پذیر ہونے کو تھا۔

اُس نے ان خوابوں کے حوالے سے اپنے باپ سے بھی ٹیلی فون پر بات کی، جس نے اس کے اندیشوں کو ہنس کر ٹال دیا۔

"خوابوں کو نظر انداز کر دو۔ بس، حقیقت پر نظریں مرکوز رکھو۔" 52 سالہ حوزے کا لہجہ دوستانہ تھا۔ "میں روز اپنے دوستوں کو تمہارے قصے سناتا ہوں۔ اب تم یہ تو نہیں چاہتے کہ میں انہیں بتاؤں، میرا بیٹا ڈراؤنے خوابوں سے پریشان ہے۔"

"ہاں، انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔" رونالڈو مسکرایا۔

"اس کے لیے ضروری ہے کہ تم جم کر کھیلو۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھانسنے لگا۔ اور بہت دیر تک کھانستا رہا۔

"آپ دوا وقت پر لے رہے ہیں ناں؟" رونالڈو کے لہجے میں اندیشے تھے۔ دراصل حوزے کافی عرصے سے بیمار تھا۔ رونالڈو نے اس کے علاج کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔

"میں تم سے زیادہ فٹ ہوں۔" حوزے نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "چلو پھر بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

انگلش پریمیئر لیگ کا نیا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ مانچسٹر ٹیم پوری تیاری سے میدان میں اتری۔ ایک جانب جہاں رونالڈو جیسا مہلک ہتھیار ان کے پاس تھا، وہیں ان کے اسلحہ خانے میں وین رونی نامی نوجوان کا اضافہ ہو چکا تھا، جو چند برس بعد لیجنڈ کا درجہ حاصل کرنے والا تھا۔ ایلکس منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ ناقدین بھی مانچسٹر کو مضبوط ٹیم قرار دے رہے تھے۔ مگر تمام اندازے دھرے کے دھرے رہ

گئے۔

سیزن کے آغاز ہی نے بدبختی کا اشارہ دے دیا۔ پہلے مقابلے میں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شکست... جس نے سیزن کے اختتام تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ اگرچہ رونالڈو نے سیزن میں اچھی پرفارمنس دی۔ گول بھی اسکور کیے، لیکن شکست کے طوفان نے اُس کی محنت کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

سیزن کے اختتام پر مانچسٹر کے کھلاڑیوں کے حصے میں فقط بدقسمتی آئی، جس نے ہر شے کا ذائقہ بدل دیا۔

☆☆☆

2005 کے موسم گرما میں وہ سانحہ وقوع پذیر ہوا، جو خوابوں کی صورت گزشتہ ایک برس سے اس کے تعاقب تھا۔ اُس کا باپ، اُس کا ہیرو... بیماری کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا۔

رونالڈو گہرے صدمے میں تھا۔ باپ سے وہ بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اُس کے علاج معالجے کے لیے اس نے بھرپور کوششیں کیں، مگر وہ موت کو شکست نہیں دے سکا۔

جس وقت یہ حادثہ پیش آیا، رونالڈو قومی ٹیم کے ساتھ روس میں تھا۔ ٹیم انتظامیہ نے لیوز فلپ کو ذمّے داری سونپی کہ اُسے اِس سانحے سے آگاہ کرے۔ اور لیوز کے لیے یہ کسی طور آسان ثابت نہیں ہوا۔

باپ کے انتقال کی خبر سنتے ہی رونالڈو یاسیت کی گہری کھائی میں اتر گیا، جہاں مایوسی کا کہرا چھایا تھا۔ اس کا دل بے سکونی سے بھر گیا، آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

لیوز ایک معاملہ فہم انسان تھا۔ اس نے خاموشی سے نوجوان کے آنسو بہنے دیے۔ پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے تسلی دی۔ حوصلہ بڑھایا۔

بالآخر رونالڈو شانت ہو گیا۔

"کل میچ ہے۔" لیوز نے دھیرے سے کہا۔ "تم گھر لوٹنا چاہو، تو جا سکتے ہو، لیکن تمہارے والد کی خواہش تھی کہ تم فٹبالر بنو۔ وہ تمہیں کھیلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے؟"

رونالڈو.... سنبھل چکا تھا۔ "میں کھیلوں گا۔ یہی میرے ڈیڈ کی خواہش تھی۔"

لیوز نے گہرا سانس لیا۔ "یہی بہتر ہے۔ فٹبال کا کھیل ہی تمہارا زخم مندمل کر سکتا ہے۔"

☆☆☆

2006 کا انگلش سیزن بھیانک خواب ثابت ہوا۔

ایلکس فیرگوسن کی منصوبہ بندی، کھلاڑیوں کا ولولہ، رونالڈو کی صلاحیتیں، سب ناکام گئیں۔

مانچسٹر یونائیٹڈ چیمپینز لیگ کے گروپ اسٹیج ہی سے باہر ہو گیا۔ یہ دس برس میں پہلا موقع تھا، جب ایلکس کے کلب کو اس ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، مگر رونالڈو نے خود کو سنبھالے رکھا۔ اس کی نظریں ایک عظیم مقابلہ پر مرکوز تھیں۔ جرمنی میں ورلڈ کپ کا عظیم الشان میلہ سجنے والا تھا، جس نے شائقینِ فٹبال کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔

پرتگال پُرجوش تھا۔ اُنہیں وہ منیجر میسر تھا، جس کی مہارت نے چار برس قبل برازیل کو ورلڈ چیمپین بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ کھلاڑی بھی اس پُرتجسس مقابلے کے لیے تیار تھے۔

جرمنی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی رونالڈو کو احساس ہو گیا کہ اُس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدلنے والی ہے۔

آغاز شاندار ہوا۔ پرتگالی ٹیم تینوں گروپ مقابلوں کی فاتح ٹھہری۔ اُس کے شاطر کھلاڑیوں نے مخالفین کی ناک میں دم کر دیا۔ خصوصاً رونالڈو تو اپنے عروج پر تھا۔ اُس کے وجود میں جیسے شرارے بھرے ہوئے تھے۔

گروپ اسٹیج کے اختتام پر پرتگال کو ورلڈ کپ ٹرافی کے ایک طاقتور امیدوار کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

پرتگالی عوام کی امیدیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ وہ عظیم فتح کا یقین کر بیٹھے تھے۔ ملک سے آنے والی اطلاعات نے فیکو کو تھوڑا پریشان کر دیا۔ "ہم سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لی گئی ہیں۔" اس نے لیوز سے کہا۔ "دباؤ بڑھ رہا ہے۔"

"سیکنڈ راؤنڈ میں ہمارا مقابلہ ہالینڈ سے ہے۔ وہ سخت حریف ہے۔" لیوز کے چہرے پر تفکر تھا۔

"ہمیں نئی حکمتِ عملی ترتیب دینی ہوگی۔ کھلاڑیوں کی میٹنگ بلواؤ۔"

چالاک فیکو کی حکمتِ عملی نے میچ والے روز ایک ایسی صورتِ حال کو جنم دیا، جسے فٹبال کے چاہنے والے شاید ہی کبھی بھول پائیں۔

پرتگال اور ہالینڈ کے درمیان ہونے والے میچ کو آج فٹبال کی تاریخ کا بدترین مقابلہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس روز پرتگالی کھلاڑیوں نے انتہائی جارحانہ رویّہ اپنایا۔ خوب دھکم پیل کی۔ کہنیوں کا بے دریغ استعمال کیا۔ مخالفین کو زخمی کرنے کی بھی کوشش کی۔ ہالینڈ کی ٹیم نے یہ

صورتِ حال دیکھی، تو انہوں نے جوابی حملہ کر دیا۔ یوں فٹبال اسٹیڈیم میدانِ جنگ بن گیا۔

میچ کتنا تناؤ بھرا تھا، اِس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس روز ریفری نے چار بار ریڈ کارڈ اپنی جیب سے نکالا۔ سولہ بار اسے یلو کارڈ بلند کرنا پڑا۔

دورانِ مقابلہ رونالڈو پر بھی ایک خطرناک حملہ ہوا۔ وہ شدید زخمی ہوگیا۔ اُسے میدان سے باہر آنا پڑا۔

میدان چھوڑتے وقت وہ رو رہا تھا، مگر کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی انجری کو بھول کر جشن منا رہا تھا۔ پرتگال میچ جیت چکا تھا۔

فیکو کی حکمتِ عملی پر خاصی تنقید ہوئی۔ فیفا کی انتظامیہ کی جانب سے دبے الفاظ میں اس کی مذمت کی گئی مگر پرتگالیوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو فقط فتح کے خواہش مند تھے۔

کوارٹر فائنل میں پرتگال کو انگلینڈ کا سامنا کرنا تھا۔

فیکو جانتا تھا کہ انگلینڈ کے کھلاڑی، خصوصاً رونی شان دار فارم میں ہے، جسے قابو کیے بغیر فتح اپنے نام کرنا ممکن نہیں تھا۔ رونالڈو فٹ ہوچکا تھا اور وہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھا۔

میچ شروع ہونے سے قبل فیکو، لیوز اور رونالڈو کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی، جس کا موضوع رونی تھا۔

"مگر وہ میرا دوست ہے۔" رونالڈو نے دھیرے سے کہا۔

"یہ جنگ ہے رونالڈو۔" فیکو نے کہا۔ "حب الوطنی پہلے، دوستی بعد میں۔"

لیوز نے نوجوان کو متذبذب دیکھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ ایک تکنیک ہے، جس کا برسوں سے استعمال ہوتا آرہا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "میں تیار ہوں۔"

اور وہ واقعی تیار تھا۔

دونوں ٹیمیں میدان میں اتر چکی تھیں۔ رونی ایک پرتگالی کھلاڑی سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ایسے میں رونالڈو اُس کے قریب گیا، اپنے ماتھے سے اس کے سر پر ہلکی سے چوٹ کی، ایک کاٹ دار جملہ اچھالا اور اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔

رونی نے اِسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ یہی سمجھا کہ رونالڈو مذاق کر رہا ہے، مگر کچھ ہی دیر بعد اس کے خیالات بدل گئے۔

آغاز ہی سے پرتگالی جارحانہ موڈ میں نظر آئے۔ ان کے کاٹ دار جملوں نے انگلش کھلاڑیوں کو مشتعل کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں پورا اسٹیڈیم تناؤ سے بھر چکا تھا۔

جذباتی نوجوان کی شہرت رکھنے والا رونی پرتگالی کھلاڑیوں کا خاص نشانہ تھا۔ اسے دھکے دیے گئے، کہنیاں ماری گئیں۔ بڑے ہی منظم انداز میں بھڑکایا گیا۔ اور یہ کوششیں کامیاب رہیں۔

ایک خاص لمحے رونی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اُس نے اپنی راہ میں رکاوٹ بننے والے پرتگالی کھلاڑی ریکارڈو کو زوردار دھکا دیا۔

ریکارڈو جہاں ایک شاطر کھلاڑی تھا، وہیں اداکار بھی کمال کا تھا۔ وہ سینہ پکڑ کر زمین پر لیٹ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اسے شدید چوٹ آئی ہے۔

جونہی ارجنٹینا سے تعلق رکھنے والے ریفری ہوریکیو کی نظر ریکارڈو پر پڑی، میچ روک دیا گیا۔

یہی موقع تھا۔ اِس سے قبل کہ ریفری اپنا فیصلہ سناتا، رونالڈو بھاگتا ہوا آیا، اور ریفری کے سامنے رونی کے درشت رویّے کے خلاف احتجاج کرنے لگا۔ "آپ نے دیکھا... یہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ رونی یہ برداشت نہیں کرسکا کہ اِس نے رونالڈو کو سینے پر ہاتھ رکھ کر پرے دھکیلا۔ "تم تو اپنی بکواس بند کرو!"

بس، یہی وہ لمحہ تھا، جس کی پرتگالی کھلاڑیوں نے تیاری کی تھی۔ وہ بلند آہنگ میں احتجاج کرنے لگے۔ انگلش کھلاڑیوں کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ دھکم پیل شروع ہو گئی۔

ریفری فیکو کے جال میں پھنس چکا تھا۔ اس نے رونی کو ریڈ کارڈ دکھا دیا۔

رونی اس فیصلے پر آگ بگولا ہوگیا۔ میدان چھوڑتے ہوئے اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہے تھے۔ "ریفری جانب دار ہے!" وہ چلّایا۔

برطانوی شائقین بھی گہرے غم میں تھے۔ اور پھر... کچھ ایسا ہوا، جس نے اُن کے غم کو دوچند کر دیا۔

رونی کے جانے کے بعد کیمرے رونالڈو پر ٹکے تھے، جنہوں نے ایک حیرت انگیز منظر محفوظ کیا۔ رونالڈو نے بینچ پر بیٹھے اپنے کوچ کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری۔

"اوہو... تو یہ سب ڈراما تھا... جان بوجھ کر یہ صورتِ حال تخلیق کی گئی!" انگلش ٹیم کے مداح غصے سے بھر گئے۔

ریفری نے سیٹی بجائی۔ میچ شروع ہوگیا۔ مقررہ وقت تک تناؤ برقرار رہا۔ فیصلے کے لیے پینالٹی کک کا سہارا لیا گیا۔

اور تب انگلش ٹیم کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ لڑکھڑانے لگی۔ پرتگال نے کوارٹر فائنل جیت لیا۔

میچ کے بعد مغربی پریس کی جانب سے رونالڈو کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انگلش ٹیم کی انتظامیہ نے بھی رونی کے حق میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ برطانیہ میں رونالڈو کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے۔ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے ارجنٹینین ریفری سے اپنی مادری زبان میں رونی کو ریڈ کارڈ دینے کا تقاضا کیا تھا۔

سیمی فائنل میں پرتگال کو فرانس کا سامنا کرنا تھا۔ مایوس انگلش شائقین نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ وہ سیکڑوں کی تعداد میں اسٹیڈیم پہنچ گئے اور پورے میچ کے دوران پرتگال کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ خاص کر جب گیند رونالڈو کے قدموں میں آتی، تو اسٹیڈیم ناپسندیدہ نعروں سے گونج اٹھتا۔

وہ ایک سخت مقابلہ تھا، مگر فرانس کو زیڈان جیسے لیجنڈ کا ساتھ حاصل تھا، جس کی مہارت نے پرتگال کو ٹورنامنٹ سے باہر کر دیا۔

جب اختتامی سیٹی بجی۔ ہزاروں برطانوی شائقین نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

رونالڈو نے اپنے خلاف لگنے والے نعرے تو برداشت کر لیے تھے... مگر وہ شکست کا گھاؤ برداشت نہیں کرسکا۔ صدمے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

یہی تو برطانوی دیکھنا چاہتے تھے۔ اگلے روز اخبارات میں اس کی خوب ہنسی اڑائی گئی۔

☆☆☆

"رونالڈو مردہ باد!"... "جس تھالی میں کھاتا ہے، اُسی میں چھید کرتا ہے"... "بدمعاش کو مانچسٹر سے نکال باہر کرو!"

انگلش شائقین اپنا فیصلہ صادر کرچکے تھے اور یہ صورتِ حال ایلکس فیرگوسن کے لیے پریشان کن تھی۔

وہ رونالڈو کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری جانب اطلاعات مل رہی تھیں کہ اسپینش کلب ریال میڈرڈ اُسے اچکنے کی تیاریاں مکمل کرچکا ہے۔

ایلکس کو فوری فیصلہ کرنا تھا۔ اُس نے پرتگال میں بیٹھے رونالڈو سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو بے ثمر رہی۔ ای میل کے ذریعے پیغامات بھجوائے گئے، مگر اس بار بھی دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تب ایلکس پر یہ عقدہ کھلا کہ جس نمبر پر وہ رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ رونالڈو کے نہیں، کسی اور شخص کے استعمال میں ہے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اُس نے پرتگال میں مقیم ایک دوست سے رابطہ کیا، جس کی وسیلے سے رونالڈو تک رسائی ہو ہی گئی۔

"تم اگلے سیزن کے لیے تیار ہو؟" ایلکس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

چند ساعت رونالڈو خاموش رہا۔ "سر... ان حالات میں... میرا مطلب ہے کہ وہاں میرے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ پُتلے جلائے جا رہے ہیں، مردہ باد کے نعرے لگ رہے ہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" ایلکس نے فوراً کہا۔ "میں انگلش شائقین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ غصے میں ہیں، مگر جلد ہی اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ مانچسٹر کو تمہاری صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔"

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دیں۔" رونالڈو نے جواب دیا۔

اگلے چند روز قریبی ساتھیوں، رشتے داروں سے مشورہ کرنے میں گزرے۔ اس دوران ایلکس سے بھی رابطہ رہا۔

بالآخر رونالڈو نے ایک پریس کانفرنس کی۔

"میں نے دوستوں سے مشورہ کیا ہے، چند قابلِ بھروسا برطانوی شخصیات سے میری بات ہوئی ہے..." رونالڈو سانس لینے کے لیے رکا۔ "اور سب کا یہی کہنا ہے کہ مجھے مانچسٹر ہی کی نمائندگی کرنی چاہیے!"

"مگر رونی کی موجودگی میں کیا آپ مانچسٹر کے لیے کھیل سکتے ہیں؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"دیکھیں، رونی اور میرے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔" رونالڈو نے کہا۔ "اور میچ کے بعد ہمارا رابطہ بھی ہوا تھا۔ رونی نے پرتگال کی کامیابی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔"

"مسٹر رونالڈو، کیا آج آپ کو اپنے رویّے پر افسوس ہوتا ہے؟" یہ سوال ایک برطانوی رپورٹر کی جانب سے کیا گیا۔

"نہیں، قطعی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا۔ "دیکھیں، وہ ایک مقابلہ تھا۔ اور اب ہمیں پرانی باتوں کو نہیں دہرانا چاہیے۔ اس میچ کے ریفری مسٹر ہوریکیو بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے میرے کہنے پر رونی کو ریڈ کارڈ نہیں دیا تھا۔"

"تو کیا آپ اگلے سیزن میں اپنے جلوے دکھانے

کے لیے تیار ہیں؟'' ایک خوبرو صحافی نے سوال کیا۔

''سو فیصد! جس ٹیم کے منیجر سر ایلکس ہوں، جس میں رونی جیسے دوست ہوں، اِس کے لیے کھیلنا فخر کی بات ہے۔'' وہ مسکرایا۔

☆☆☆

جب وہ لندن ائرپورٹ پر اترا، آسمان پر بادل چھائے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ ایلکس کے سامنے تھا، جس کے ہاتھ میں ایک موقر روزنامے کی کاپی تھی۔

''آخر کار رونالڈو لوٹ آیا۔'' ایلکس نے اخبار تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب اس کی تجربہ کار آنکھیں پرتگالی نوجوان پر ٹکی تھیں۔ ''گھبرائے ہوئے ہو نوجوان؟''

''شاید۔'' وہ تھوڑا سا مسکرایا۔

''سب بھول جاؤ۔ مانچسٹر کے مداح فقط ایک شے کے متقاضی ہیں، فتح۔ اُنہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ سمجھے؟''

''سمجھ گیا!'' اُس کا اعتماد کچھ بحال ہوا۔

''اور سنو۔'' ایلکس نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''اپریل 2007 میں ہم تمہارے معاہدے میں توسیع کرنے والے ہیں۔ معاوضے میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اگلے پانچ برس کے لیے تم ہمارے ہو۔ میں تمہیں کہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔''

سیزن کے آغاز میں اُسے چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شائقین نے اس کے خلاف نعرے بازی بھی کی، مگر جلد ہی اس کے جادو نے اُنہیں دوبارہ اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

مانچسٹر یونائیٹڈ نے شان دار آغاز کیا۔ خصوصاً رونی اور رونالڈو کے درمیان تال میل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

پہلے راؤنڈ کے بعد ایلکس نے رونالڈو سے سوال کیا۔ ''اِس بار کتنے گول داغنے کا ارادہ ہے لڑکے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں!'' وہ مسکرایا۔

''لیکن میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' منیجر کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''تم اس بار پندرہ گول کرو گے۔''

تجربہ کار ایلکس غلط ثابت ہوا۔ رونالڈو نے اُس سیزن میں 23 گول اسکور کیے۔ سیزن مانچسٹر یونائیٹڈ کے نام رہا۔

☆☆☆

آنے والے دن مسرت سے بھرپور تھے۔

تجربے کے طور پر برازیل کے خلاف کھیلے جانے والے دوستانہ میچ میں اُسے پرتگالی ٹیم کی کپتانی سونپ دی گئی۔ آہ... بائیس سالہ رونالڈو کے لیے وہ ایک یادگار پل تھا۔ وہ اُس سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

جب یورو 2008ء کا کوالیفائی راؤنڈ شروع ہوا، تو اُس کی صلاحیتوں نے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دیں، مگر بدقسمتی سے اس کی ٹیم ٹورنامنٹ کے کوارٹر فائنل تک ہی رسائی حاصل کر سکی، جہاں پرتگال کو جرمنی کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اُسی برس لیوز فلپ کا بہ طور پرتگالی کوچ معاہدہ اختتام کو پہنچا۔ رونالڈو کے لیے وہ ایک کرب ناک لمحہ تھا۔ لیوز ایک حلیم شخص تھا۔ رونالڈو کو اُس میں اپنے باپ کا عکس نظر آتا تھا۔

لیوز کی جگہ کارلوس کیروش نے لی، جسے لیوز کی مانند رونالڈو کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ اُسی کے کہنے پر پرتگال فٹبال فیڈریشن نے قومی ٹیم کی کپتانی کا تاج رونالڈو کے سر پر رکھ دیا۔

اُس عرصے میں اُس پر اعزازت کی بھی بارش ہوتی رہی۔ البتہ فیفا کی جانب سے دیے جانے والے چند بڑے اعزازات سے وہ محروم رہا، جس کا اُسے دکھ نہیں تھا۔ جن کھلاڑیوں کو اس پر ترجیح دی گئی تھی، وہ واقعی فسوں گر تھے۔ رونالڈو ان کا احترام کرتا تھا۔

2007–08 کے انگلش سیزن کا آغاز زیادہ خوش کن نہیں رہا۔ دوسرے ہی میچ میں اسے ریڈ کارڈ دکھا دیا گیا۔ تین مقابلوں میں اسے باہر بیٹھنا پڑا۔

اُس نے اِس زخم کو اپنی قوت بنانے کا فیصلہ کیا اور قسم کھائی کہ آیندہ وہ فیلڈ میں اپنے جذبات پر قابو رکھے گا۔ اُسی سیزن میں نیو کاسل کے خلاف اُس نے اپنی پہلی ہیٹ ٹرک اسکور کی۔

مارچ 2008 میں اُسے پہلی بار مانچسٹر یونائیٹڈ کی کپتانی کرنے کا موقع ملا۔ اس کا کلب مقابلے کا فاتح ٹھہرا۔ دونوں گول اُسی نے اسکور کیے۔

2007–08 کی چیمپینز لیگ کا فائنل ایک تناؤ بھرا مقابلہ تھا۔ ٹکراؤ روایتی حریف چیلسی سے تھا۔ میچ کے 26 ویں منٹ میں رونالڈو نے گول داغ کر اپنی ٹیم کو برتری دلا دی۔ 45 ویں منٹ میں مخالف ٹیم نے گول کر دیا۔ مقابلہ ایک ایک سے برابر ہو گیا۔ میچ کا فیصلہ پینالٹی کک سے ہونا قرار پایا۔ اور تب... اُسے ایک اذیت ناک تجربے سے گزرنا پڑا۔

اُس نے اپنی شاٹ ضائع کر دی... چیلسی کی فتح کے

امکانات روشن نظر آنے لگے۔

صدمے سے رونالڈو کی آنکھوں میں کرب اُمڈ آیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ لبوں پر دعاؤں نے بسیرا کر لیا۔ مانچسٹر کے کھلاڑیوں نے اپنے ساتھی کو اس حال میں دیکھا تو ان کے جوش نے زور مارا۔ انہوں نے بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

رونالڈو کی دعائیں سن لی گئیں۔ مانچسٹر نے شاندار کم بیک کرتے ہوئے ٹورنامنٹ جیت لیا۔

اب میدان میں جشن کا سماں تھا اور رونالڈو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

جون 2008 میں پھر یہ خبریں آنے لگیں کہ ریال میڈرڈ مانچسٹر کے اِس شہزادے کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ برطانوی کلب کی انتظامیہ نے اِس پر شدید ردِعمل ظاہر کیا، مگر رونالڈو نے ان خبروں کی تردید کر دی۔ ''بھئی، میں اگلے ایک برس تک تو کہیں نہیں جا رہا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

بے شک وہ اگلے ایک برس مانچسٹر کا حصہ رہا، مگر اس دوران زخموں نے اُسے گھیرے رکھا۔ کئی بار انجریز اُسے میدان سے باہر لے گئیں۔ الغرض وہ سیزن خاصا پھیکا ثابت ہوا۔

☆☆☆

گاڑی اچانک بے قابو ہو گئی۔ ہر منظر دھندلا گیا۔

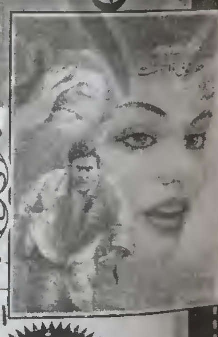
اس نے اسٹیئرنگ سنبھالنے کی کوشش کی، مگر یہ کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔ اگلے ہی پل بریک چرچرائے۔ گاڑی سڑک سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اس کا اگلا حصہ تباہ ہو گیا۔

خوش قسمتی سے اس خوفناک حادثے میں رونالڈو کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ یہ واقعہ مانچسٹر ائرپورٹ کے نزدیک پیش آیا تھا۔

زخم جلد ہی مندمل ہو گئے۔ چند روز بعد وہ پریکٹس کر رہا تھا۔ اس واقعے کے فقط چار روز بعد اسے ایک خوش خبری ملی۔

فیفا کی جانب سے اسے ورلڈ پلیئر آف دی ائر کے اعزاز کا حق دار ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ پریمیئر لیگ کا پہلا کھلاڑی تھا، جسے اِس ایوارڈ کے لیے چنا گیا۔ اور یہ دوسرا موقع تھا، جب کسی پرتگالی نے یہ اعزاز اپنے نام کیا۔ اس سے قبل فیگو کو اس خطاب سے نوازا گیا تھا۔

چیمپینز لیگ میں اس کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ اس

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
اپریل 2013ء کے شمارے کی رنگا رنگ جھلک

سرورق کی کہانیاں
واپسی کا سفر ہر شخص کی قسمت میں نہیں ہوتا مگر بعض لوگوں کے لیے واپسی میں ہی زندگی مضمر ہوتی ہے۔ سہانے سپنوں اور خوابوں کا سفر...... احمد اقبال کے تیکھے انداز بیان میں
جرم...... دوستی اور فریب کی گہرائیوں سے شناسائی کا سفر، سرورق کا دوسرا رنگ
اولین صفحات ● سچ اور جھوٹ کے مابین بہت فرق ہوتا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ بعض سچ وقت گزرنے کے بعد جھوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ کاشف زبیر کے قلم سے زندگی کی تلخ حقیقتیں
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
للکار ● محبت کی جلتی بجھتی شمعیں اور انتقام کے بھڑکتے شعلے طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز تحریر
چٹکی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں
مغرب کے نرالے انداز
مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی پرورده ناقابل فراموش کہانیاں

کی ٹیم نے فائنل تک رسائی حاصل کی، البتہ ٹرافی اپنے نام کرنے میں ناکام رہی۔ انہیں بارسلونا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا، جسے میرے ڈوانا کا جانشین تصور کیے جانے والے باصلاحت لیونل میسی کی خدمات حاصل تھیں۔

نیا سال شروع ہوتے ہی فٹبال کی دنیا میں افواہوں کا طوفان آگیا۔

یہ خبر پھر گردش میں تھی کہ رونالڈو اور ریال میڈرڈ کے درمیان بات چیت جاری ہے۔ بالآخر جون 2009 میں اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔

اُس کے اور اسپینش کلب کے درمیان 93.9 ملین یورو جیسی خطیر رقم کے عوض چھ برس کا معاہدہ طے پایا تھا۔

یہ ایک اور کامیابی تھی۔ وہ دنیا کا مہنگا ترین کھلاڑی بن چکا تھا۔

مانچسٹر سے علیحدگی ایک جذباتی لمحہ تھا۔ اس نے الوداعی تقریب میں جو تقریر کی، اس میں کلب انتظامیہ اور اپنے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا۔ خصوصاً ایلکس کے کردار کو سراہتے ہوا کہا۔ ”کھیلوں کی دنیا میں آپ میرے لیے باپ کی مانند ہیں۔ اگر آپ نہیں ہوتے، تو شاید میں یہاں نہیں پہنچ پاتا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

وہ ایک حیران کن منظر تھا۔

تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ سر ہی سر تھے۔ انسانی سمندر تھا۔

میڈرڈ کا سانتیا گو اسٹیڈیم اُس روز کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لگ بھگ 80 ہزار افراد وہاں موجود تھے، جو فقط رونالڈو کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ اسپینش اور پرتگالی میڈیا اس تقریب کو براہِ راست نشر کررہا تھا۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔

رونالڈو کے لیے وہ ایک جذباتی لمحہ تھا۔ آج سے قبل فقط عظیم میرے ڈوانا کا اٹلی میں اِس سطح پر استقبال کیا گیا تھا۔

ریال میڈرڈ نے اس کے لیے 9 نمبر کی جرسی منتخب کی اور اس کا آغاز دھماکے دار رہا۔ اسے کھل کر کھیلنے کا موقع ملا۔ کئی جادوئی گول داغے۔

2010–11 کے سیزن سے قبل اسپین کا مایۂ ناز کھلاڑی راؤل ریال میڈرڈ چھوڑ گیا۔ اُس کی سات نمبر کی جرسی کے لیے رونالڈو ہی موزوں ترین کھلاڑی ٹھہرا۔

☆☆☆

کلب مقابلوں میں تو وہ کامیابیوں کی نئی داستان رقم کررہا تھا، مگر انٹرنیشنل فٹبال میں بہ طور کپتان وہ اپنے پیش رو فیگو کی کارکردگی دہرانے میں ناکام رہا۔

ورلڈ کپ 2010 میں پرتگالی ٹیم فقط دوسرے مرحلے تک ہی رسائی حاصل کرسکی۔ انہیں اسپین کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اب وہ نفسیاتی طور پر خاصا مضبوط ہوچکا تھا، سو اس نے شکست پر گریہ کرنے کی بجائے اپنی نظریں یورو 2012 پر مرکوز رکھیں۔ اور یورو کے کوالیفائنگ راؤنڈ میں سات گول داغ کر ثابت کیا کہ وہ پرتگال کو عروج پر لے جانے کے لیے تیار ہے۔

ٹورنامنٹ میں جو گروپ انہیں ملا، اسے ”موت کا گروپ“ کہا جارہا تھا، کیونکہ اس میں جرمنی، ہالینڈ اور ڈنمارک جیسی ٹیمیں شامل تھیں، جن کی موجودگی میں اگلے مرحلے میں رسائی کسی طور سہل نہیں تھی۔

پہلے ہی میچ میں انہیں جرمنی کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور رونالڈو ناقدین کے نشانے پر آگیا۔ اُسے غیر ذمّے دار اور جذباتی شخص کے طور پر پیش کیا گیا۔ رونالڈو نے تنقید کا جواب دینے سے اجتناب برتا۔ البتہ اُس وقت اسے شدید دکھ ہوا، جب اس کے ہیرو لیوس فیگو نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔

ڈنمارک سے ہونے والے میچ میں ایک اور مشکل آن پڑی۔

ڈنمارک کے مداح جانتے تھے کہ پرتگال ایک مضبوط ٹیم ہے، اُسے شکست دینے کے لیے نفسیاتی حربے استعمال کرنے پڑیں گے۔ رونالڈو پہلے ہی تنقید کی زد میں تھا، اُنہوں نے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اُن دنوں لیونل میسی اور رونالڈو کا موازنہ فٹبال شائقین کا من پسند موضوع تھا۔ اکثریت کا ووٹ میسی کے حق میں تھا۔ بیش تر ایوارڈ بھی وہی بٹور لیتا۔ یہ بات رونالڈو کو گراں گزرتی، لیکن وہ خاموش رہتا، البتہ... ڈنمارک کے مداح اس کی خاموشی توڑنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔

میچ میں جب بھی گیند رونالڈو کے پاس آتی، تماشائی ”لیونل میسی، لیونل میسی“ پکارنے لگتے۔ اس عمل نے رونالڈو کو مضطرب کردیا۔ میچ تو وہ جیت گئے، مگر پریس کانفرنس میں جب اس سے میسی کے بارے میں سوال کیا گیا، تو اس کی برداشت جواب دے گئی اور ارجنٹینین کھلاڑی سے متعلق چند

سخت جملے اس کی زبان سے ادا ہوگئے۔ میڈیا نے بات کا بتنگڑ بنادیا۔ خوب مرچ مسالے لگا کر اس کے الفاظ کو اچھالا گیا۔

رونالڈو سخت غصے میں تھا۔ اسس نے اپنا غصہ ہالینڈ پر نکالا، جس کے خلاف اس نے دو شاندار گول اسکور کیے۔ اگلا میچ چیک ری پبلک کے خلاف تھا۔ میچ کا اکلوتا گول رونالڈو ہی نے داغا۔ یوں اس کی ٹیم سیمی فائنل تک پہنچ گئی، جہاں انہیں اسپین کا مقابلہ کرنا تھا۔

وہ میچ تناؤ سے بھرپور تھا، جس کا فیصلہ پینالٹی شاٹس پر ہوا۔ پرتگال کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور رونالڈو کو ناقدین کے درشت رویے کا... جو اس کی طرز کپتانی سے نالاں نظر آتے تھے۔

ہر کوئی اس پر تنقید کررہا تھا، مگر ایک شخص تھا، جس نے ٹورنامنٹ کے دوران اُسے سراہنے کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ تھا، عظیم ڈیگو میرے ڈوانا۔

میرے ڈوانا نے پرتگال کے ٹورنامنٹ سے باہر ہونے کے بعد اپنے ایک بیان میں کہا۔ ”رونالڈو بلاشبہ موجودہ عہد کا عظیم ترین کھلاڑی ہے۔ ہاں پرتگال کو شکست ہوئی، مگر یورو میں اس کی ذاتی کارکردگی متاثر کن رہی!“

میرے ڈوانا کے یہ الفاظ رونالڈو کے زخم مندمل کرنے کے لیے کافی تھے۔

☆☆☆

”میری خواہش ہے کہ ایک عظیم کھلاڑی کی بجائے ایک رول ماڈل کے طور پر یاد رکھا جاؤں!“

رونالڈو کے الفاظ میں آہنی عزم چھپا تھا، جو اس انسان دوست اور امن پسند شخص کی جانب اشارہ کرتا تھا، جو مصائب کے شکار بچوں میں اپنا بچپن دیکھتا تھا۔

وہ مسلمان نہیں تھا پھر بھی وہ فلسطینیوں کے درد کو محسوس کررہا تھا اور ایک عرصے سے پسِ پردہ رہتے ہوئے فلسطینی بچوں کے لیے کام کر رہا تھا، مگر نومبر 2011 اس نے ایک اور جرأت مندانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

رونالڈو نے اپنے اسپورٹس شوز نیلامی کے لیے پیش کردیے، اس نے ان مسلمانوں کو آئینہ دکھایا جو اپنے ان برادران ایمانی کو بھلا امریکا اور پیرس جاکر عیاشی پر پیٹرول کی دولت لٹاتے ہیں۔ اس نے اپنا جوتا انہی لوگوں کے درمیان نیلامی کے لیے رکھ دیا۔ وہ شوز 2050 پاؤنڈز میں بکے۔ اس نے یہ تمام رقم غزہ کے طالب علموں کے لیے بھجوادی۔

اس عمل کا اصل مقصد اس گمبھیر مسئلے کی جانب بین الاقوامی میڈیا کی توجہ مبذول کروانا تھا۔ اور وہ اِس میں کامیاب رہا۔ دنیا بھر کے میڈیا نے ان مظلوم بچوں پر ڈاکومینٹری فلمز بنانا شروع کردیں۔

اُس نے اپنی ذاتی دولت سے بھی لاکھوں یورو غزہ میں کام کرنے والی تنظیموں کو عطیہ کیے۔ ساتھ ہی میڈرڈ کے مرکزی اسپتال میں کینسر وارڈ قائم کرنے کے منصوبے میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ اپنے آبائی وطن میں آنے والے بدترین سیلاب کے متاثرین کی بحالی کے لیے اس نے چیریٹی میچ کروایا۔ کینسر میں مبتلا ایک نو سالہ بچے کی بھی مالی معاونت کی۔

جب ایک انٹرویو میں ان فلاحی سرگرمیوں کا محرک دریافت کیا گیا، تو اس نے کہا۔ ”اس جذبے کی جڑیں میرے بچپن میں پیوست ہیں۔ آج میں ایک امیر شخص ہوں، مگر بچپن میں مجھے کئی معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ گو ہم خود غریب تھے، مگر اُن حالات میں بھی میرے والد نے مجھے دوسروں کی مدد کرنے کی نصیحت کی۔ اور آج میں اُسی نصیحت پر عمل پیرا ہوں۔“

☆☆☆

اِس وقت رونالڈو پرتگالی ٹیم کا کپتان ہے۔ اسپینش کلب ریال میڈرڈ کی نمائندگی کررہا ہے۔ اپنی حیران کن پرفارمنس کی بدولت کئی ورلڈ ریکارڈ قائم کرچکا ہے۔

اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے، تو مانچسٹر یونائیٹڈ کی جانب سے اس نے 292 میچز میں 118 گول اسکور کیے، مگر اسپین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ یکسر بدل گیا۔ اس کی کارکردگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ریال میڈرڈ کی جانب سے 181 مقابلوں میں وہ 183 گول داغ چکا ہے۔ 101 انٹرنیشنل مقابلوں میں اس نے اپنے ملک کی نمائندگی کی اور 38 بار گیند نیٹ میں پہنچائی۔

اعزازات کی فہرست بھی طویل ہے۔ 2007 میں اس نے PFA اور FWA کے چار بڑے ایوارڈز اپنے نام کیے۔ 2008 میں بھی مذکورہ تنظیموں کے ایوارڈز بٹورے۔ 2008 اور 2011 میں اسے یورپین گولڈن شو سے نوازا گیا۔ اکتوبر 2012 میں وہ دنیا کا پہلا کھلاڑی بن گیا، فیس بک پر جس کے فالوورز کی تعداد 5 کروڑ ہے اور اِس تعداد میں مزید اضافہ متوقع ہے۔

الغرض وہ اپنے کیریئر کے عروج پر ہے، مگر اُسے شہرت اور دولت کی پروا نہیں، اعزازات کو بھی وہ کسی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا نیک دل تو بس فلسطین کے معصوم بچوں کے ساتھ دھڑکتا ہے، جن میں اُسے اپنا بچپن نظر آتا ہے۔





جسٹس سسٹرمین

بوعلی سینا

نامور شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف

عظیم لوگ

نوربانو

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو دنیا کے لیے مشعل ثابت ہوتی ہیں اور خود کو تاریخ کا مکمل باب ثابت کرتی ہیں

سائنس دانوں کو دنیا کے محسنوں میں گردانا جاتا ہے۔آج جو کچھ سہولتیں ہمیں حاصل ہیں وہ انہی کی محنتِ شاقّہ کا نتیجہ ہیں۔ان کی جدو جہد جہاں سبق آموز ہے وہاں دلچسپ بھی۔انہی حیرت انگیزیوں کا کچھ تذکرہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

سر آئیزک نیوٹن کا شماراُن سائنس دانوں میں کیا جاتا ہے جو اپنے کارناموں کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے ہی کششِ ثقل کے نظریے سے روشناس کرایا،انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے دوسال گزارے اور اس تمام عرصے میں انہوں نے صرف ایک بارلب کشائی کی؛وہ بھی صرف اس لیے کہ گرمی زیادہ تھی اوروہ کھڑکی کھلوانا چاہتے تھے۔

ان کا ایک دانت 3556 ڈالر میں فروخت ہوا۔

انہیں ایک ہم عصر سائنس دان سے بے حد نفرت تھی اس کا نام تھا رابرٹ ہک۔اس کی وجہ سے نیوٹن اس کی موت تک رائل سوسائٹی کی صدارت ٹھکراتے رہے کیونکہ ہک اس سوسائٹی کا سیکریٹری تھا۔

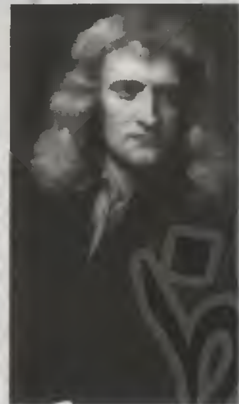
نیوٹن کی پیدائش قبل از وقت ہوئی تھی۔عام خیال کے مطابق ایسے بچے جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں مگر نیوٹن نے اس خیال کو جھٹلا دیا۔

گلیلیو گلیلی کا شمار بھی صفِ اول کے سائنس دانوں میں ہوتاہے۔وہ اٹلی کا رہائشی تھا اسی نے دنیا کو بتایا کہ دنیا گول ہے۔اور اس حقیقت کے انکشاف پر اسے کلیسا کے زیرِعتاب آنا پڑا۔اسے جیل بھیج دیا گیا اور سزائے موت کی دھمکی دے کر اسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی سائنسی حقیقت کو جھٹلادے اور معافی مانگے۔

گلیلیو کا انتقال 1642 میں ہوا۔اس کے جنازے میں عوام کو سرکاری طور پر شرکت سے منع کر دیا گیا تھا۔



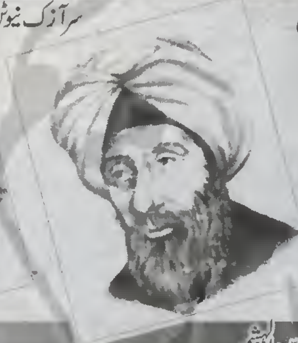
ارشمیدس



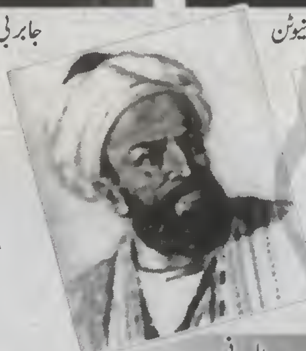
سرآزک نیوٹن



جابربن حیان



ابن الہیثم



البرونی

گلیلیو اپنی عمر کے آخری پانچ برس میں نابینا ہوگیا تھا۔

آئن اسٹائن اس پائے کا سائنسداں تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

نظریۂ اضافت کی وجہ سے مشہور ہونے والے اس سائنس داں کو 1952ء میں اسرائیل کی صدارت کی آفر کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ سیاست سے آگاہ نہیں اس لیے وہ یہ عہدہ قبول نہیں کرسکتا۔

آئن اسٹائن کو بچپن میں نہایت کند ذہن سمجھا جاتا تھا۔اس نے ٹھیک سے بولنا بھی بہت دیر میں سیکھا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے دماغ کو محفوظ کرلیا گیا ہے اور وہ اسپرٹ بھرے جار میں آج بھی موجود ہے۔ حالانکہ ڈاکٹرز پہچاننے میں ناکام رہے ہیں کہ اس دماغ اور عام سے دماغ میں کون سا فرق تھا۔

نکولس کوپرنیکس کا پولینڈ کے عظیم سائنس دانوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کی مشہور کتاب The Reuteation and Beam System (اجرام فلکی کی گردش) طبع ہوکر جب 1543ء میں دکانوں پر آئی۔اس کی پہلی کاپی کوپرنیکس کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس وقت وہ بسترِ مرگ پر تھا۔اس کی عمر 70 سال تھی۔اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور یادداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی۔کتاب کو دیکھ کر وہ یہ بھی نہیں جان سکا تھا کہ اس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

آساگرے ہریکا کا ماہر نباتات تھا۔اس نے اپنی تمام زندگی پودوں اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں صرف کی تھی۔یہ ایک کمال کی بات تھی کہ اسے 25 ہزار کے قریب پودوں کے نام زبانی یاد تھے اور وہ آنکھ بند کر کے صرف خوشبو سونگھ کر بتادیا کرتا تھا کہ یہ کون سا پودا ہے۔

جرمنی کے ریاضی داں جان کیلر کی زندگی کا یہ ایک

حیرت ناک رخ ہے کہ اس نے سیاروں سے متعلق تین قوانین مرتب کیے تھے۔ان سے نیوٹن کو بھی بہت مدد ملی۔ یہ ریاضی داں آخری عمر میں جوتشی بن گیا تھا اور سڑک کنارے بیٹھ کر لوگوں کو نیک و بدشگون سے آگاہ کیا کرتا تھا۔

مسلم دنیا.... جابر بن حیان کو بابائے کیمیا کے نام سے یاد کرتی ہے۔جابر 721 میں کوفہ میں پیدا ہوا۔اس کی پوری تجربہ گاہ زلزلے کے سبب زمین میں دھنس گئی تھی۔ تقریباً دوسو اسی سال بعد متعدد قلمی نسخے ایک گلی کی کھدائی کے دوران زمین سے ملے۔ان نسخوں سے ثابت ہوا ہے کہ جابر نے کئی لاکھ تجربے کیے تھے۔

کاؤنٹ استواں کو ہنگری کا مشہور سائنس داں مانا جاتا ہے۔ جب یہ مکمل طور پر مرضِ جنون کا شکار ہوگیا تو ڈاکٹروں نے بطور علاج تجویز کیا کہ اسے شطرنج کھلائی جائے۔ اس کے لیے ایک نوجوان شاطر کو کرائے پر حاصل کیا گیا۔ وہ چھ سال تک سائنس داں استواں کے ساتھ شطرنج کھیلتا رہا۔ ان چھ برسوں کے اختتام پر سائنس داں تو بالکل ٹھیک ہوگیا لیکن وہ نوجوان ایسا پاگل ہوا کہ پھر اس کا علاج نہ ہوسکا۔

ہنری کے ونڈش کا شمار انگلینڈ کے مشہور سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔اس نے مرنے کے بعد اپنے پیچھے کوئی دس لاکھ پاؤنڈ کی جائیداد چھوڑی۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس نے پوری زندگی بوسیدہ کپڑوں میں گزاری۔

اسے عورتوں سے بے زاری تھی۔ وہ اپنی خادماؤں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور جو بھی کام اسے لینا ہوتا تھا وہ تحریر کے ذریعے کراتا تھا۔

ارشمیدس کا شمار یونان کے عظیم سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے شہر پر جب رومی لشکر نے قبضہ کیا تو یہ جیومیٹری کا ایک مسئلہ حل کر رہا تھا۔ ایک سپاہی اس کے سر پر جا پہنچا وہ اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ارشمیدس نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''اے، تم میرے کام میں خلل نہ ڈالو۔'' یہ اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے۔ بعد میں اسے رومیوں نے بڑے اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔

لیونارڈو ڈاونچی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ ..... ایک عظیم آرٹسٹ تھا۔ ''مونا لیزا'' اسی کی بنائی ہوئی پینٹنگ تھی۔ لیکن وہ ایک سائنس داں بھی تھا۔

اپنی سائنسی تحقیقات کو دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے ایک منفرد تحریر ایجاد کی تھی۔ وہ اپنی تحقیقات کو اسی تحریر میں لکھا کرتا تھا۔

راجر بیکن ایک سائنس داں سے زیادہ ایک مفکر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس نے ہوائی جہاز، بحری جہاز، موٹر کار اور ریلوں وغیرہ کی ایجاد سے قبل ہی اپنی کتاب میں ان کی نشاندہی کر دی تھی۔

ٹائیکو براہے ڈنمارک کا ماہرِ فلکیات تھا۔ ایک مرتبہ ایک ڈوئل (جنگ) لڑتے ہوئے اپنی ناک کٹا بیٹھا تھا۔

اس نے اپنی ناک کی جگہ ایک سونے کی ناک لگالی تھی۔

جان کیپلر کسی زمانے میں ایک نان بائی کے ہاں آٹا گوندھنے کی ملازمت کیا کرتا تھا۔ بعد میں یہ ٹائیکو براہے کا اسسٹنٹ بن گیا۔ اور پھر اس نے سائنس میں بڑا نام کمایا۔

ریڈیم کی دریافت کے لیے مشہور مادام کیوری نے ابتدائی زندگی بے حد غربت میں گزاری تھی۔ تعلیم کے دوران وہ اکثر بھوک سے غشی میں چلی جاتی تھی' وہ دنیا کی پہلی پروفیسر خاتون ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ اسے نوبل پرائز بھی دیا گیا تھا۔

مشور سائنس داں سیلٹس کے ضمن میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے دو ممالک ... جرمنی اور پولینڈ اس بات پر مُصر ہیں کہ اس کا تعلق ان سے تھا۔ دونوں ملک اسے اپنا ہم وطن ثابت کرنے کے لیے ثبوت دیتے رہے ہیں۔

طب کی دنیا کی حیرت ناک شخصیت بوعلی سینا قولنج کے درد کے علاج کے لیے مشہور تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کا انتقال اسی مرض سے ہوا۔

امریکی سائنس داں ڈالٹن نے ہائیڈروجن کے ذرّے کو اکائی قرار دے کر جوہری اوزان قائم کیے تھے۔ یہ شخص کلر بلائنڈ تھا۔ (Color Blind) آج کل کلر بلائنڈ لیس کو اسی لیے ''ڈالٹینٹ'' کہا جاتا ہے۔

مسلمان سائنس داں البیرونی بڑے رتبے کے عالم تھے' بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ ہندوستان میں انہیں ''وِدّیا ساگر'' (علم کا سمندر) کہا جاتا ہے۔ جس وقت ان کی موت واقع ہوئی وہ غزنی کے ایک فقیہہ کے ساتھ ایک علمی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔

سائنس داں ابن الہیثم نے مصر کے حاکم کی خواہش پر اسوان کے قریب دریائے نیل پر ایک بند تعمیر کرایا مگر اس کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے حاکم شہر کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنے اوپر مصنوعی دیوانگی طاری کرلی تھی جو اس نے حاکم کے مرنے کے بعد 1021ء میں ختم کی۔

امریکا کے اس صدر کے حالات زندگی جس کی زندگی غیرمعمولی واقعات کا مجموعہ ہے۔ جب زندہ تھا تو اس پر الزام تھا کہ وہ کالا جادو کرتا ہے، جب قتل ہوگیا تو اس کا بھوت ملک بھر میں جگہ جگہ نظر آتا تھا۔ وائٹ ہاؤس میں تو اب بھی کسی کسی کو نظر آتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کی لاش کو چرانے کی کئی بار کوشش ہوئی۔ پہلی بار جب لاش چرانے کی کوشش ہوئی اسی کی روداد۔

لنکن کی لاش

صائمہ اقبال



قتل کے ٹھیک نو برس بعد، جب الونائی کے قصبے اسپرنگ فیلڈ میں برف گر رہی تھی، اوک ریج قبرستان میں اُس مقبرے کی تعمیر مکمل ہوئی جسے سابق امریکی صدر ابراہام لنکن کی آخری آرام گاہ ٹھہرایا گیا تھا۔

یہ جنگل کے کنارے واقع ایک خاموش قبرستان تھا۔ اس مقام کا انتخاب لنکن نے اپنی زندگی ہی میں کرلیا تھا۔

1874 کے موسمِ سرما میں جب وہ چوبی تابوت جس میں لنکن کا جسدِ خاکی ابدی نیند سو رہا تھا، مقبرے میں منتقل کیا گیا، قبرستان میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ بیش تر افراد کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی کہ دکھ تا حال تازہ تھا، لنکن آج بھی امریکیوں کے دلوں میں زندہ تھا۔

تابوت کو روایتی طریقے کے مطابق قبر میں منتقل کر کے اُس پر سنگِ مرمر کا بھاری تختہ رکھ دیا گیا۔ قبر والے کمرے کا داخلی دروازہ اسٹیل کا تھا، جس پر قفل لگا دیا گیا۔

اس سرد شام چاہنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں لنکن کو خراجِ تحسین پیش کیا اور گھروں کو چل دیے۔

بہ ظاہر لنکن کی لاش محفوظ تھی۔ مقبرے پر کوئی چوکیدار تعینات نہیں کیا گیا۔ اسپرنگ فیلڈ کے حکام نے یہی سوچا ہوگا کہ یہاں، اس قبرستان میں چرانے لائق ہے ہی کیا!

وہ غلط تھے۔ وہاں، ان خاموش قبروں کے درمیان کچھ ایسا تھا، جو بیش قیمت تھا۔

☆☆☆

1876 کا سال شکاگو پولیس کے لیے عذاب ناک ثابت ہوا۔

سال شروع ہوتے ہی ڈالر کی قدر گرنے لگی جس سے کاروباری حلقوں میں بے چینی پھیل گی اور وہ عدم تحفظ کا شکار ہوگئے۔

اس صورتِ حال کا سبب جعلی کرنسی اور نقلی سرٹیفکیٹ کی بھرمار تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جعل سازوں کے ایک منظم گروہ نے پولیس کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

یوں تو الونائی کے تمام شہروں سے جعلی کرنسی کی شکایات موصول ہو رہی تھیں مگر شکاگو میں صورتِ حال زیادہ گمبھیر تھی جہاں اصلی اور نقلی کرنسی میں پہچان کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کی ناکامی کے بعد گورنر کی ہدایت پر شکاگو سیکریٹ سروس کو یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔

اس زمانے میں بگ جم نامی ایک بدمعاش نے شہر پر ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ اس کا تعلق امریکا میں مقیم آئرش کمیونٹی سے تھا۔ بلا کا شاطر آدمی تھا۔ کبھی خود سامنے نہیں آتا، ہمیشہ پردے کے پیچھے رہتے ہوئے کام کرتا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بگ جم جرائم پیشہ گروہوں کا سرغنہ ہے، پولیس کبھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ ثبوت اکٹھا کرنا لگ بھگ ناممکن تھا، وہ کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ جعلی کرنسی کا کاروبار بھی اُسی کی سرپرستی میں پھل پھول رہا تھا۔ دھوکا بازوں کے اس منظم نیٹ ورک میں دو شاطر آدمیوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، اُن میں ایک کا نام ٹیرنس مولن تھا اور دوسرے کا بن بائڈ!

بن بائڈ جعلی کرنسی اور سرٹیفکیٹ بنانے کا ماہر تھا۔ اس کا تیار کردہ نوٹ حقیقی کرنسی کے انتہائی قریب تر معلوم ہوتا۔ دوسری جانب مولن اپنے وسیع تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے چند گھنٹوں میں بائڈ کے تیار کردہ نوٹ اور سرٹیفکیٹ شہر میں پھیلا دیتا۔ ہائی وے پر واقع ریسٹورنٹس ان کا خاص نشانہ تھے، جن کے وسیلے کچھ ہی دنوں میں یہ جعلی نوٹ شہر سے باہر چلے جاتے اور پورے الونائی میں پھیل جاتے۔

ان کی تباہ کن کارروائیوں کی وجہ سے بینکوں نے صارفین کی جانب سے دیے جانے والے سرٹیفکیٹ اور نوٹوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ انہیں قبول کرنے میں تامل سے کام لیا جانے لگا۔ یوں ڈالر بے اعتباری کے شکنجے میں آگیا۔ اس کی ساکھ گرنے لگی۔ بینک دیوالیا ہونے کے قریب آگئے۔

اس جتھے کا تعاقب کرنے والے خفیہ پولیس کے اہل کار جانتے تھے کہ بگ جم کے خلاف ثبوت حاصل کرنا دشوار ہوگا، اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے' سو انہوں نے اپنی توجہ بن بائڈ اور مولن پر مرکوز کر لی۔

دولت کے نشے سے سرشار بن بائڈ قطعی اندازہ نہیں لگا پایا کہ اس کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اس نے بے احتیاطی کی اپنی روش برقرار رکھی۔ یوں وہ ایک بڑی غلطی کر بیٹھا۔ خفیہ پولیس کے ہاتھ چند ثبوت لگ گئے اور اس جعل ساز کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ عدالت نے بائڈ کو دس برس قید کی سزا سنائی۔

مقدمے کا فیصلہ آنے کے بعد خفیہ پولیس شکاگو کے سربراہ پیٹرک ٹیرل کی جانب سے دعویٰ کیا گیا کہ اس گروہ میں شامل تمام مجرم جلد سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔

''ہم چین سے نہیں بیٹھنے والے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' پیٹرک کی آواز میں عزم تھا۔

☆☆☆

شکاگو کی میڈیسن اسٹریٹ پر... ہب نامی ایک درمیانے درجے کا بار تھا۔

عام دنوں کی نسبت آج بار میں خاصا سناٹا تھا۔ برف باری شروع ہوتے ہی گاہک ایک ایک کے رخصت ہوگئے مگر کونے والی میز پر بیٹھا شخص شاید اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ کسی کا منتظر تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور برفیلی ہوائیں بار کے گرم ماحول میں داخل ہوئیں۔

آنے والا شخص شکل ہی سے جرائم پیشہ لگتا تھا مگر اس وقت وہ شکستگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ پتلون استری سے عاری تھی۔ جیکٹ بھی کئی روز سے نہیں دھلی تھی۔

وہ سیدھا اس میز کی جانب گیا جہاں ایک شخص ماحول سے لاتعلق، سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ہیلو مولن۔'' آنے والے نے دھیرے سے کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

مولن نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر پژمردگی چھائی تھی۔ بن بائڈ کی گرفتاری نے کاروبار کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جعل سازوں کا یہ گروہ ایک بڑی مشکل میں پھنس چکا تھا۔

''ہیلو جیک۔'' مولن نے آہستگی سے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔ ''خالی ہاتھ آئے ہو یا...''

کچھ کہنے کے بجائے جیک نے جیب سے چند نوٹ نکالے اور مولن کے حوالے کر دیے۔

مولن خاموشی سے ان کا جائزہ لینے لگا مگر جلد ہی وہ اکتا گیا۔ ''یہ نوٹ تو...''

''پہلی نظر ہی میں جعلی لگتے ہیں۔ ہاں میں جانتا ہوں۔'' جیک نے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''مولن، بن بائڈ کی گرفتاری ہمارے لیے مہلک ثابت ہو رہی ہے.... گزشتہ تین ماہ میں ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ جعلی کرنسی تیار کرنے والا اس جیسا ماہر شخص تلاش کرنا انتہائی مشکل ہے۔ میں نے چند لوگوں سے رابطہ کیا تھا، مگر.. ان کے تیار کردہ نمونے تمہارے سامنے ہیں...'' اس کا اشارہ مولن کے ہاتھ میں موجود نوٹوں کی جانب تھا۔ ''یہ ناقص ہیں۔ ان سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پہلی ہی نظر میں انہیں شناخت کر لیا جائے گا۔''

مولن نے گہرا سانس لیا۔ چند لمحے خاموش رہا' پھر آگے کی طرف جھکا۔ ''ہمیں بن کو جیل سے باہر لانا ہوگا۔''

''مگر... یہ کس طرح ممکن ہے؟ جولیٹ پر تو کڑا پہرا ہے۔'' جیک کے لہجے میں حیرت تھی۔

''چلو میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جیک نے اُس کا ساتھ دیا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''بگ جم سے ملنے۔'' آواز میں کاٹ تھی۔

چند پلوں بعد وہ سڑک پر تھے جسے برف نے ڈھانپ رکھا تھا۔

☆☆☆

اس رات، جب شکاگو میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، تین شاطر ذہنوں نے ایک عجیب و غریب، سنسنی خیز منصوبہ ترتیب دیا۔

آصف نواز جنجوعہ

(1937-1993ء)

پاکستان کی بری فوج کے سابق چیف آف اسٹاف۔ چکری راجگاں، ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ سینٹ میری اسکول راولپنڈی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر سینڈھرسٹ (برطانیہ) میں رائل ملٹری اکیڈمی سے بنیادی فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد مارچ 1957ء میں پاکستان آرمی میں بطور کمیشنڈ آفیسر بھرتی ہوئے، وہ سولجرز کی چوتھی جنریشن سے تعلق رکھتے تھے۔ کمیشن ملنے کے بعد پنجاب رجمنٹ کی شیر دل بٹالین میں شامل ہوئے۔ 1972ء میں اپنی پیرنٹ بٹالین کی کمان کی۔ 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج کوئٹہ اور نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی سے بھی گریجویشن کی۔ 1978ء میں بریگیڈیئر اور 1982ء میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی ملی۔ ساڑھے 3 سال تک ایک انفنٹری ڈویژن کی کمان کی۔ بعد ازاں کاکول ملٹری اکیڈمی کے کمانڈنٹ بنا دیے گئے۔ 1988ء میں انہیں لیفٹیننٹ جنرل اور مارچ 1991ء میں جنرل بنا دیا گیا۔ 11 جون 1991ء کو انہیں پاکستان آرمی کا چیف آف اسٹاف بنا دیا گیا۔ انہوں نے 16 اگست 1991ء کو یہ عہدہ سنبھالا، ہلالِ امتیاز، ستارۂ بسالت اور بار کے اعزازات حاصل کیے۔ ان کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی، تاہم ان کی بیوی کے اس انکشاف پر کہ انہیں ہلاک کیا گیا ہے حکومت نے کمیشن مقرر کیا اور امریکا میں ان کے سیل بند نمونوں کی تحقیق کی گئی لیکن یہ الزام ثابت نہ ہوا۔

مرسلہ: فوزیہ اطہر، کامونکی

جس کمرے میں مولن اور جیک کی بدمعاشوں کے بادشاہ بگ جم سے ملاقات ہوئی، وہ نسبتاً تاریک تھا۔ کمرے کی فضا میں سگار کا دھواں بھرا تھا۔

اُن کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ اس دوران کئی جام خالی ہوئے۔ تین گھنٹے سوچ بچار کے بعد بالآخر اُنہوں نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دے دی۔

''مجھے یقین ہے کہ اس سے پورا امریکا ہل جائے گا۔'' مولن کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

''اور تمہارے تمام مطالبات بلاچون وچرا تسلیم کر لیے جائیں گے۔'' جم نے سگار کا کش لیا۔ ''میرے خیال میں بن کی رہائی کے ساتھ ہمیں تاوان کے طور پر بھاری رقم کا مطالبہ کرنا چاہیے۔''

''بالکل۔'' جیک چہکا۔ ''گزشتہ تین ماہ میں ہم نے جو نقصان اٹھایا ہے، اس کی تلافی ضروری ہے۔ اور ویسے بھی تاوان کا مطالبہ، اغواکار کا حق ہے!''

''اغواکار!'' کمرے میں ایک مکروہ قہقہہ بلند ہوا۔

''بھائیو، جو جرم تم کرنے جا رہے ہو... مزے کی بات یہ ہے کہ امریکی قانون کی رُو سے وہ جرم ہے ہی نہیں!'' جم نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اس لنگڑے قانون کے نام ایک جام ہو جائے۔ امریکا زندہ باد!''

شکاگو سے کئی میل دور، اسپرنگ فیلڈ میں واقع لنکن کے مقبرے میں مکمل خاموشی تھی۔ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا، فقط اسٹیل کا ایک دروازہ تھا جس پر تالا پڑا تھا۔

☆☆☆

دوسرے روز جب جیک اور مولن کی بار میں ملاقات ہوئی، منصوبے کے خدوخال واضح ہو چکے تھے۔ وہ ابراہام لنکن کی لاش چرانا چاہتے تھے۔

''ہم راتوں رات تیز رفتار گھوڑا گاڑی کے ذریعے تابوت شمالی انڈیانا پہنچا دیں گے۔ مشی گن جھیل کے اطراف کئی ٹیلے ہیں۔ وہ خاصا سنسان علاقہ ہے۔ وہیں کسی مقام پر ہم اسے دفنا دیں گے۔'' مولن نے جام کا گھونٹ بھرا۔

''موسم ہمارے لیے سازگار ہے۔'' جیک نے کہا۔ ''وہاں اس وقت ریت کے جھکڑ چل رہے ہوں گے۔ گاڑی کے پہیوں کے نشانات بھی جلد ہی غائب ہو جائیں گے۔ کوئی سراغ باقی نہیں رہے گا۔''

''ذرا سوچو تو، جب حکومت اور امریکی عوام کو علم ہوگا کہ ان کے عزیز ترین صدر کی لاش چوری ہو گئی ہے، تو ان پر کیا بیتے گی۔'' مولن کی آواز میں حقارت تھی۔

''شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھیں۔'' جیک کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ''اور پھر سودے بازی ہوگی۔ وہ ہمارا آدمی رِہا کریں، دو لاکھ ڈالر ادا کریں، نہیں تو... لاش کو بھول جائیں۔''

''ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔'' مولن نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم مقبرے کے پاس کوئی شے... مثلاً کسی اخبار کا آدھا صفحہ پھاڑ کر قصداً پھینک دیں گے۔ پولیس یقینی طور پر اسے اہم سراغ سمجھ کر محفوظ کر لے گی۔ بعد میں پولیس سے رابطہ کرنے کے لیے ہم اُس صفحے کے باقی ٹکڑے کا استعمال کریں گے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ لاش ہمارے ہی پاس ہے۔ تم تو جانتے ہو، جونہی یہ سنسنی خیز خبر پھیلے گی، کئی دعوے دار سامنے آ جائیں گے...''

''واہ دوست...!'' جیک مسکرایا۔ ''بالکل جاسوسوں کی طرح سوچ رہے ہو۔''

بہ ظاہر تو منصوبہ مکمل تھا، مگر ایک مسئلہ تھا۔ جیک اور مولن کو جعلی کرنسی کے کام کا تو خوب تجربہ تھا مگر آج سے قبل انہوں نے کبھی کوئی لاش نہیں چرائی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس عمل کو کس طرح انجام دیا جاتا ہے۔

جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ انہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بگ جم سے رابطہ کیا، مگر وہ بھی فوری طور پر کوئی ایسا آدمی فراہم کرنے سے قاصر رہا۔ مولن اور جیک نے دیگر شہروں کے جرائم پیشہ گروہوں سے رابطہ کرنے سے اجتناب برتا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو ان کے منصوبے کی بھنک پڑے۔

کارروائی شروع کرنے کے لیے 6 نومبر کا دن منتخب کیا گیا۔ بگ جم نے اس دن کا انتخاب کیا تھا جس روز صدارتی انتخابات ہونے والے تھے۔

''شہر کی پولیس انتخابی عمل میں مصروف ہوگی۔ عوام کو بھی ہوش نہیں ہوگا۔ قبرستان کا تو کسی کو خیال بھی نہیں آئے گا۔ ہر کوئی اس فکر میں غلطاں ہوگا کہ کس امیدوار نے فتح اپنے نام کی۔'' جم نے سگار جلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''اس وقت تم بہ آسانی اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہو۔''

بگ جم کا خیال سو فیصد درست تھا، مگر مولن کا مسئلہ یہ تھا کہ الیکشن کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اور انہیں تاحال کوئی بھروسے کا آدمی نہیں ملا تھا۔

ان ہی دنوں جیک کی ایک ایسے نوجوان سے ملاقات

ہوئی، جو نیا نیا جرائم کی دنیا میں آیا تھا۔ ماضی میں وہ سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں ملازم رہا تھا اور لاشوں کو محفوظ کرنے کے طریقے سے بہ خوبی واقف تھا۔ نوجوان کا نام لیوس سوگلز تھا۔

جیک کو لیوس اپنے منصوبے کے لیے موزوں لگا۔ وہ اسے مولن سے ملانے لے آیا۔

کسی اجنبی شخص کو اتنے بڑے منصوبے میں شامل کرنا کسی طور دانش مندی نہیں تھی۔ مولن یہ بات جانتا تھا مگر اس کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ 6 نومبر کی تاریخ آن پہنچی تھی اور مردہ خانے میں کام کرنے کا تجربہ لیوس کے حق میں جاتا تھا۔ سو مولن نے چند اِدھر اُدھر کے سوالات کرنے کے بعد اسے لنکن کی لاش چرانے کے منصوبے میں شامل کر لیا۔

اُن کا پلان سننے کے بعد لیوس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چند لمحے حیرت قائم رہی، پھر چہرے پر جوش سمٹ آیا۔ وہ کھڑا ہوا اور فوجیوں کے انداز میں اس نے مولن کو سلوٹ کیا۔ ''کیا دماغ پایا ہے باس! زبردست! ڈرنک میری طرف سے۔ ویٹر...''

مولن کو یہ انداز اچھا لگا۔ جب رات ڈھلے وہ بار سے نکلے، لیوس اُن کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ ان کا دوست بن چکا تھا۔

☆☆☆

ایک نوجوان افسر تیزی سے شکاگو سیکریٹ سروس کے سربراہ پیٹرک ٹیرل کے کمرے میں داخل ہوا۔

پیٹرک نے سر اٹھایا۔ ''کیا خبر ہے؟''

''سر، بگ جم کا گروہ کسی منصوبے پر کام کر رہا ہے۔'' افسر نے کہا۔

''پتا چلا کہ ان کا منصوبہ کیا ہے؟'' پیٹرک کی نظریں افسر پر ٹکی تھیں۔

''ابھی یہ واضح نہیں ہوا سر۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اس کارروائی کا مقصد بن بائڈ کو رِہا کروانا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق شکاگو ان کی توجہ کا مرکز نہیں۔ مخبر کے مطابق کارروائی الونائی کے کسی اور شہر میں ہوگی۔''

''اندازوں سے کام نہیں چلے گا آفیسر۔'' پیٹرک کا لہجہ حکمیہ تھا۔ ''مجھے کل تک پوری رپورٹ چاہیے۔''

''سر...!'' افسر نے سلوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''ہمیں ایک گھوڑا گاڑی کی ضرورت ہے۔'' مولن نے جیک اور لیوس سے کہا۔ وہ تینوں ہب نامی بار میں بیٹھے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے رہے تھے۔

''گھوڑا گاڑی کا انتظام میں کر لوں گا۔'' جیک نے فوراً کہا۔ ''میرا خالہ زاد کوچوان ہے۔''

مولن کے چہرے پر ناپسندیدگی پھیل گئی۔ ''کیا تم جیکی کی بات کر رہے ہو۔ معاف کرنا، لیکن وہ ایک احمق شخص ہے۔ میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''لیکن گاڑی چلانے کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے۔'' جیک نے کہا۔

''ایک شخص ہے، بلی براؤن...'' یہ لیوس کے الفاظ

آزادی کا گھنٹا

تاریخی حیثیت کے اس گھنٹے کا امریکی آزادی کے واقعات سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ فلاڈلفیا کے آزادی ہال میں نصب ہے، تھامس لسٹر نے دولت مشترکہ پینسلوانیا کی 50 ویں سالگرہ کی یاد میں لندن میں بنایا تھا۔ اگست 1952ء میں یہ گھنٹا فلاڈلفیا پہنچا دیا گیا۔ اس پر یہ عبارت کندہ ہے ''یہ پوری سرزمین کے تمام باشندوں کی آزادی کا دعویدار ہے۔'' ستمبر 1752ء میں اس گھنٹے میں دراڑ پڑ گئی، پھر اسے بھر دیا گیا۔ یہ اس وقت استعمال کیا گیا جب برطانوی تجارت کا مقاطعہ کیا گیا اور عوام کو برطانوی ٹیکس دینے سے روک دیا گیا۔ جب امریکا کا اعلانِ آزادی پڑھ کر سنایا گیا تب بھی اس گھنٹے کو استعمال میں لایا گیا۔ 18 ستمبر 1777ء کو برطانوی فوج نے فلاڈلفیا پر قبضہ کر لیا تو اسے ایک گرجا گھر میں چھپا دیا گیا۔ جب برطانوی فوجیں فلاڈلفیا سے چلی گئیں تو پھر اسے واپس اپنے اصلی مقام پر لایا گیا۔ 1835ء میں جب امریکا کے چیف جسٹس جان مارشل کے جنازے پر اسے بجایا گیا تو پھر اس میں دراڑ پڑ گئی لیکن بعدازاں مرمت نہ کی گئی۔ 1976ء میں امریکا کی آزادی کی 200 ویں سالگرہ منائی گئی تو اسے آزادی کے ہال کے عقب میں لٹکا دیا گیا۔ اس کا قطر 12 فٹ، وزن 2080 پونڈ ہے اور اس کے بنانے پر 60 پاؤنڈ 14 شلنگ اور 5 پنس خرچ آیا۔

مرسلہ: نسرین ممتاز، سیالکوٹ

تھے۔ اس سے قبل کہ مولن کے چہرے پر اندیشوں کا سایہ ظاہر ہوتا تھا اس نے تیزی سے کہا۔ ''وہ میرا دوست ہے، مگر ہم اُسے اپنے منصوبے میں شامل نہیں کریں گے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بس، وہ مقبرے سے کچھ دور جھاڑیوں میں گاڑی لے کر کھڑا رہے گا۔ ہم خاموشی سے تابوت گاڑی میں ڈال کر اسپرنگ فیلڈ کی سرحد عبور کر جائیں گے۔ اس بے چارے کو ہمارے کارنامے کا اندازہ بھی نہیں ہوگا۔ کیا خیال ہے باس؟''

''آئیڈیا برا نہیں۔'' جیک نے کہا۔ ''کیوں مولن؟''

''ہاں!'' مولن نے کہا۔ ''تو طے رہا، گاڑی کی ذمے داری اب تمہارے کاندھوں پر ہے، سمجھے لیوس۔''

''سمجھ گیا باس۔ کام ہو جائے گا۔'' لیوس مسکرایا۔

''ابراہام لنکن کی لاش گیارہ برس سے آرام کر رہی ہے۔ اب اُسے پریشان کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔'' مولن کے لہجے سے وحشت جھلکتی تھی۔

☆☆☆

6 نومبر کی شام اترتے ہی مولن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسپرنگ فیلڈ جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

جب انہوں نے لنکن کے قصبے میں قدم رکھا، وہاں صبح کا ٹھہرا چھایا تھا۔ الیکشن کی گہما گہمی کے بعد شہری نتائج کے منتظر تھے۔ جیسے ہی سورج چڑھا، سیاسی جماعتوں کے کارکنان سڑکوں پر آ گئے۔ وہ اپنے لیڈر کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ریلیاں نکلنے لگیں۔ جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ شور شرابے کے اس ماحول میں قبرستان کی بھلا کسے پروا تھی اور ویسے بھی وہ آبادی سے کچھ دور تھا، جنگل کے کنارے۔

جونہی 7 نومبر کا سورج غروب ہوا، وہ تینوں بڑی خاموشی سے لنکن کے مقبرے کی جانب بڑھنے لگے۔

جب انہوں نے قبرستان میں قدم رکھا، وہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ وہ رات، دیگر راتوں کے مقابلے میں زیادہ تاریک تھی۔

احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ مقبرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اب ان کے سامنے ایک اسٹیل کا دروازہ تھا جس پر موٹا سا تالا پڑا تھا۔

تینوں ہی تالا کھولنے کے فن سے ناواقف تھے، مگر وہ انتظام کر کے آئے تھے۔ ان کے پاس بڑا سا کٹر تھا... انہیں اطمینان تھا کہ آج کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔

مولن کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ جیسے ہی قفل کھلا، اس کے رگ و پے میں ایک بیمار سی خوشی دوڑ گئی۔

جیک نے دروازے کو دھکیلا۔ چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ خوشی سے سرشار مولن نے اندر داخل ہو کر دیا سلائی جلائی۔

سامنے سنگِ مرمر کی قبر تھی، جس میں اپنے عہد کے عظیم ترین انسان کا تابوت رکھا تھا جو شاید باقی دنیا کی نظروں میں اپنی اہمیت کھو چکا ہو مگر ان کے لیے وہ بیش قیمت تھا۔

مولن اور جیک تیزی سے آگے بڑھے۔ اُنہوں نے سنگِ مرمر کا بھاری تختہ ہٹایا۔ اب چوبی تابوت ان کے سامنے تھا جو اُن کے لیے خوش قسمتی کی کنجی ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ تابوت کو کھینچنے لگے۔ تابوت ان کی توقع سے زیادہ بھاری نکلا، اس کا وزن لگ بھگ 500 پونڈ تھا۔ پوری قوت صرف کرنے کے باوجود وہ تھوڑا ہی سرک سکا۔

''جاؤ... تم گاڑی لے آؤ۔'' مولن نے لیوس کو مخاطب کیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

''گاڑی قریب ہی ہے ناں؟'' جیک نے زور لگاتے ہوئے پوچھا۔

''بس، یہاں سے دو سو گز دور ایک نالا ہے، وہاں کھڑی ہے۔ ابھی لایا۔'' لیوس یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

یہ اِس کہانی کا سب سے ایک اہم موڑ تھا۔

بگ جم کا منصوبہ تکمیل کے قریب تھا... مولن اور جیک تابوت گھسیٹ رہے تھے اور لیوس گھوڑا گاڑی لینے گیا تھا۔

اس زاویے سے اس رات... اس تاریک رات بن بائڈ کی رہائی کے امکانات انتہائی روشن نظر آ رہے تھے، مگر... ایک قباحت تھی۔ لیوس سوگلز نامی شخص کبھی مردہ خانے میں ملازم نہیں رہا تھا... نہ اس کا جرائم کی دنیا سے تعلق تھا... وہ تو سیکریٹ سروس کا اہل کار تھا، جو انڈر کور کام کیا کرتا تھا اور جونہی اسے مولن کے پلان کا پتا چلا تھا، وہ سیدھا اپنے باس پیٹرک ٹیرل کے پاس گیا تھا۔

اُس نے مولن اور جیک کے لیے انتظام ضرور کیا تھا مگر کسی گھوڑا گاڑی کا نہیں... بلکہ پولیس اہل کاروں کا۔

مقبرے کے ایک حصے میں مسلح پولیس اہل کار چھپے ہوئے تھے۔ لیوس نے وہاں جا کر سگار جلایا۔ یہ ایک اشارہ تھا۔ اہل کار چوکس ہو گئے۔ پھر اس نے ''کوڈ ورڈ'' دہرایا۔

اگلے ہی پل آٹھ افسران اس کے سامنے کھڑے تھے جن میں شکاگو پولیس کا چیف پیٹرک بھی شامل تھا۔ اُن میں

براؤن نامی ایک افسر بھی تھا جسے لیوس نے گزشتہ شام مولن سے بہ طور کوچوان متعارف کروایا تھا۔

چند ہی پلوں میں پولیس افسروں نے مقبرے کو گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، جن کا رخ دروازے کی جانب تھا۔

''مولن اور جیک...!'' پیٹرک نے بلند آواز میں کہا۔ ''کھیل ختم ہوا۔ باہر آ کر خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں فقط سناٹا تھا۔

''دیکھو میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔'' پیٹرک کی یہ کوشش بھی ناکام گئی۔ جواب ندارد!

اس نے تیسری بار یہی جملے دہرائے۔ تب لیوس کو گڑبڑ محسوس ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ قبر والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دیا سلائی جلائی۔ تاریکی میں روشنی چمکی... اور وہ بھونچکا رہ گیا۔ کمرا خالی تھا... وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے دوسری دیا سلائی جلائی۔ کمرے میں ہر شے معمول کے مطابق تھی، ماسوائے لنکن کے تابوت کے، جو اپنی جگہ سے ہل چکا تھا، لیکن اب تک اُس کا ڈھکن نہیں اٹھایا گیا تھا۔

''وہ دونوں کہاں گئے؟'' پیٹرک دہاڑا۔ ''چلو تلاش کرو۔''

کچھ ہی دیر میں پولیس اہل کار قبرستان میں پھیل گئے۔ وہ شدید غصے میں تھے۔ یہاں وہ ملزمان کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے ارادے سے آئے تھے مگر اُن کی یہ کوشش ناکام گئی۔ جیک اور مولن کسی طرح انہیں چکما دینے میں کامیاب رہے۔

اُس دوران چند اہل کاروں نے جذبات کی شدت میں ہوائی فائرنگ بھی کی، تاکہ جھاڑیوں میں چھپے مجرم خوف زدہ ہو کر باہر آ جائیں، مگر یہ کوشش رائگاں گئی۔ اس ناکامی پر پیٹرک بہت برافروختہ ہوا، مگر یہ وقت پریشان ہونے کے بجائے اگلا قدم اٹھانے کا تھا۔

''لیوس...!'' اس نے آواز لگائی۔ ''اِدھر آؤ۔''

☆☆☆

مولن اور جیک کا یوں فرار ہو جانا بہ ظاہر عجیب لگتا ہے مگر اس کے پیچھے... فقط اتفاقات کارفرما تھے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ لنکن کا تابوت خاصا بھاری تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اسے چند انچ ہی ہلا پائے اور ہانپنے لگے۔ لیوس کو روانہ کرنے کے بعد بھی انہوں نے کوشش کی، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ تابوت پُراسرار انداز میں زمین سے چپک گیا تھا۔

''رہنے دو۔'' مولن نے ہانپتے ہوئے جیک سے کہا۔ ''جب لیوس آئے گا، تو اس کی مدد سے ہم اسے قبر والے کمرے سے باہر کھینچ لیں گے۔ یہاں بہت اندھیرا ہے، ذرا تازہ ہوا میں چلتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

وہ دونوں باہر آ گئے اور ایک گھنے درخت سے ٹیک لگا کر اپنا سانس درست کرنے لگے۔ اسی اثنا میں انہوں نے دیکھا کہ چند سائے مقبرے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

''یہ کون ہے؟'' جیک نے دبی آواز میں کہا۔

''شاید پولیس والے۔'' مولن کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''لگتا ہے، لیوس پکڑا گیا۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔''

جتنی دیر میں پولیس اندازہ لگاتی کہ مقبرہ خالی ہے، وہ دوڑتے ہوئے ایک میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔

7 نومبر کی رات مولن اور جیک نے قطعی آرام نہیں کیا۔ وہ بغیر رکے سفر کرتے رہے۔ انہوں نے زیادہ بات بھی نہیں کی۔ یہ اندیشہ انہیں کھائے جا رہا تھا کہ لیوس پولیس کو اُن کے منصوبے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر چکا ہوگا۔

چند گھنٹوں بعد وہ شکاگو میں تھے۔ دوپہر تو انہوں نے جیسے تیسے اپنے فلیٹوں میں گزاری۔ شام ہوتے ہی وہ ہب کی جانب نکل گئے، جہاں حیرت اُن کی منتظر تھی۔

جونہی اُنہوں نے بار میں قدم رکھا، وہ اچھل پڑے۔ سامنے لیوس بیٹھا تھا۔

''تم... یہاں؟'' مولن بوکھلا گیا۔

''تو اور مجھے کہاں ہونا چاہیے باس؟'' لیوس کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور حیرت بھی۔ وہ شاندار اداکاری کر

آلوچہ Plum

ایک درخت اور اس کا پھل۔ درخت تیس فٹ اونچا ہوتا ہے اور اس میں چھدرے گچھوں کی شکل میں سبزی مائل سفید پھول لگتے ہیں، پھل عموماً مستطیل، نیلگوں مائل سیاہ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ آلو بخارا damson بھی اسی خاندان سے ہے۔ یوریشیا میں کاشت کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی اس کی کاشت ہوتی ہے۔

مرسلہ: فرحت، کراچی

رہا تھا۔ ”میں گاڑی لے کر پہنچا مگر آپ دونوں غائب تھے۔ میں نے کافی انتظار کیا، لیکن...“

”تم... گرفتار نہیں ہوئے تھے؟“ جیک نے سوال کیا۔

”گرفتار، کیا مطلب؟“ لیوس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا پولیس نے چھاپا مارا تھا؟“

”ہاں۔“ مولن نے جواب دیا۔ ”اور مجھے یقین تھا کہ تمہاری گرفتاری کے بعد پولیس ہم تک بھی پہنچ جائے گی، مگر... شاید ہم خوش قسمت رہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ وہ چہکا۔

جیک کا سانس بھی بحال ہو چکا تھا۔ ”تو ہم منصوبے کی ناکامی کو بھول کر گرفتاری سے محفوظ رہنے کا جشن مناتے ہیں۔ چلو دوستو، سب کو میری طرف سے ایک ڈرنک!“

اس رات بار میں جشن منایا گیا۔ مولن اور جیک بہت خوش تھے۔ بات بات پر چہک رہے تھے۔ اُن بے چاروں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک افتاد نازل ہونے والی ہے۔

لیوس اپنے چیف پیٹرک کے ساتھ اُن مجرموں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔

8 نومبر کی رات جیک اور مولن کو اسی بار سے گرفتار کیا گیا، جہاں وہ اپنی شامیں گزارہ کرتے تھے۔ ان پر لنکن کی لاش چرانے کا منصوبہ ترتیب دینے کا الزام تھا۔

جب مولن کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے جا رہے تھے، وہ لیوس کی طرف دیکھ کر چلّایا۔ ”تم... تم نے ہمیں دھوکا دیا۔“

”جعل سازوں کے ساتھ دھوکا جائز ہے۔“ لیوس مسکرایا۔ ”لے چلو اُنہیں۔ اب ان کی شامیں بیئر بار میں نہیں، حوالات میں گزریں گی۔“

☆☆☆

اگلی صبح کے اخبارات نے پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ جس شخص کو اس واقعے کی تفصیلات کا علم ہوا، وہ غم و غصے سے بھر گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ امریکیوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ ہر شخص منصوبہ سازوں کو کڑی سزا دینے کا تقاضا کر رہا تھا، مگر اُن کی راہ میں ایک رکاوٹ حائل تھی... قانون!

20 نومبر 1876ء کو اس کیس کی سماعت کے لیے گرینڈ جیوری تشکیل دی گئی۔ ابتدائی پیشیوں کے بعد ہی یہ نکتہ موضوعِ بحث بن گیا کہ امریکی قانون میں لاش کی چوری کو جرم کے زمرے میں نہیں رکھا جاتا۔

یہ نکتہ قانون کے عین مطابق تھا مگر عوام کا اصرار تھا کہ جس شخص کی لاش چرانے کی کوشش کی گئی، وہ عام انسان نہیں تھا، امریکا کا سابق صدر تھا۔

یہ دلیل بے کار ثابت ہوئی۔ قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔

اس موقع پر ابراہام لنکن کے بیٹے رابرٹ نے سامنے آنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ملک کے بہترین وکیلوں کی خدمات حاصل کیں، دلائل اکٹھے کیے، مگر اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ نعش چرانے کا عمل کسی قانون کے تحت نہیں آتا تھا۔

رابرٹ لنکن نے معاملے کو نیا رخ دینے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے لاش چرانے کے بجائے ملزمان پر تابوت چوری کرنے کا الزام عائد کرتے ہوئے مقدمہ چلانے کی درخواست کر دی۔

ہاں، یہ معاملہ قانون کے زمرے میں آتا تھا۔ چوری بہرطور جرم تھا مگر اس میں بھی ایک قباحت تھی۔

اس کیس میں چوری کا فعل تکمیل نہیں پاسکا تھا، پھر تابوت کی مالیت فقط ستر ڈالر تھی... ان عوامل کی وجہ سے مولن اور جیک کو عوام کے مطالبے کے مطابق کڑی سزا سنانا قانوناً ممکن نہیں تھا۔

1876 کے اواخر میں شروع ہونے والے اس مقدمے کے دوران کئی وقفے آئے۔ 30 مئی 1877 کو اِسے پھر شروع کیا گیا۔ ان آٹھ ماہ میں پُلوں کے نیچے سے خاصا پانی بہہ چکا تھا۔ عوام کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ حکمراں طبقہ بھی ملکی مسائل میں الجھ چکا تھا۔ اخبارات کو بھی یہ اسٹوری بے معنی لگنے لگی تھی۔

شاید اس وجہ سے پینل میں شامل بارہ میں چار ججوں نے پہلی ہی سماعت میں مقدمہ خارج کرنے کی سفارش کی، لیکن استغاثے کے اصرار پر اسے جاری رکھا گیا۔ بالآخر 2 جون کو چند ساعتوں کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

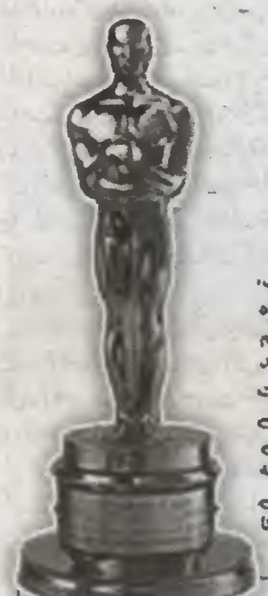
ابراہام لنکن کی لاش چوری کرنے کا منصوبہ بنانے والے ٹیرینس مولن اور جیک ہوگس کو امریکی قانون کے تحت ایک سال قید کی سزا سنائی گئی اور اُنہیں ہتھکڑیاں لگا کر الونائی کی جولیٹ جیل بھیج دیا گیا۔

اس فیصلے نے لنکن کے چاہنے والوں کو شدید مایوس کیا۔ البتہ مولن اور جیک ایک معنوں میں فائدے ہی میں رہے... اب وہ پورا سال اس شخص کے قریب رہ سکتے تھے جسے رہا کرانے کے لیے انہوں نے یہ شرم ناک منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

ان کا ساتھی بن بائڈ جولیٹ جیل ہی میں قید تھا!!

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں



یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

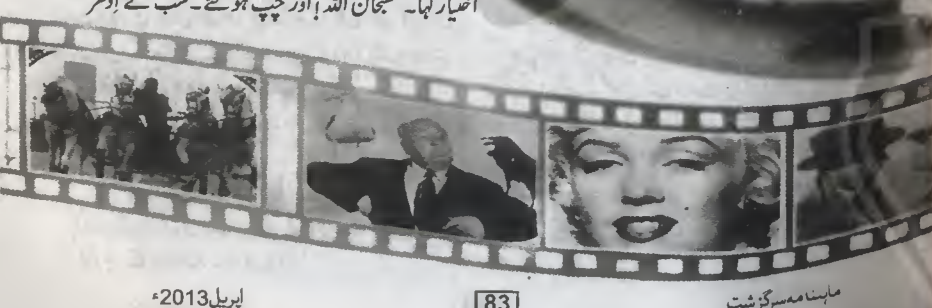
قسط: 214



حبیب جالب کا ایک شعر ہے

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ شعر حبیب جالب نے اس وقت کہا تھا جب وہ کراچی میں رہا کرتے تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار تنویر نقوی کراچی سے واپس آئے اور حسبِ معمول شام کے وقت سب دوست اکٹھے ہوئے تو تنویر صاحب نے بے اختیار کہا۔ ”سبحان اللہ“! اور چپ ہو گئے۔ سب نے اِدھر



اُدھر دیکھنا شروع کیا لیکن کوئی حوا کی بیٹی نظر نہیں آئی۔ تنویر صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب بھی وہ کوئی اچھا ماہتابی چہرہ دیکھتے تھے تو ان کی زبان سے بے اختیار ''سبحان اللہ'' نکلتا تھا۔ خواہ وہ کسی جگہ بیٹھے ہوں یا سڑک پر کار چلا رہے ہوں خوبصورت چہروں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اور خطرناک بات یہ تھی کہ جب تک وہ چہرہ نظر آتا رہتا تھا تنویر صاحب کی گردن اسی طرف مڑی رہتی تھی۔ شکر ہے کہ اس زمانے میں لاہور میں ٹریفک بہت کم تھا پھر بھی ڈر رہتا تھا کہ وہ سبحان اللہ کہتے ہوئے دوسری طرف منہ موڑے کار چلاتے رہتے تھے یہاں تک کہ ہم لوگ شور مچا دیتے تھے کہ تنویر صاحب سامنے دیکھیے۔ خدا کے لیے اِدھر دھیان دیجیے، اپنی جان ہمیں بہت پیاری ہے۔

تنویر صاحب بہت عاشق مزاج اور خوش نظر آدمی تھے۔ خوبصورتی ہر رنگ میں انہیں بے قرار کردیتی تھی۔ خوبصورت چہرہ ہو، خوبصورت منظر ہو، خوبصورت شعر ہو، خوبصورت آواز ہو۔ یہ سب رعنائیاں تنویر صاحب کے دل میں ہلچل پیدا کردیتی تھیں۔ علاؤ الدین صاحب کہا کرتے تھے۔ مجھے ایک نجومی نے بتایا ہے کہ میری موت ٹریفک ایکسیڈنٹ میں ہوگی اور اس وقت کار میرا کوئی دوست چلا رہا ہوگا۔

تنویر چہکتے ''علاؤ الدین نجوی کی بات پر یقین نہ کرو۔''

''کیوں، کیا آپ کو علم نجوم پر بھروسا نہیں ہے؟''

''علم نجوم پر تو بھروسا ہے مگر آپ کی تاریخ پیدائش پر نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا آپ کو میرے پیدا ہونے پر بھی شبہ ہے؟''

''ارے نہیں بھائی۔ علم نجوم تو ایک باقاعدہ علم ہے لیکن آپ کی تاریخ پیدائش کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ تاریخ اور سن تو آپ کو یاد نہیں ہے۔ بس یہ بتا دیتے ہیں کہ اس روز بہت زور کی بارش ہورہی تھی۔ آندھی چل رہی تھی۔ کئی مسجدوں کے مینار گر گئے تھے۔ دریائے راوی میں سیلاب آگیا تھا اور دریا کا پانی مال روڈ تک آگیا تھا۔''

''یار تو جو سچی بات ہے وہی بتائیں گے نا۔ اپنی طرف سے تو گھڑ نہیں سکتے۔''

''علاؤ الدین! یہ سب اندازے ہیں۔ تم نے خود ہی اپنی تاریخ پیدائش کی ایک تاریخ طے کرلی ہے ورنہ صحیح تاریخ تو نہ تم جانتے ہو نہ تمہارے اماں ابا۔''

''ٹھیک ہے یار۔ اس زمانے میں کون تاریخ پیدائش لکھ کر رکھتا تھا۔ بس انکل سے کام چلتا تھا۔''

یہ ساٹھ کی دہائی کا ذکر ہے۔ ان دنوں ہم چند دوست شام کو تنویر صاحب کی کوٹھی پر ضرور اکٹھے ہوتے تھے۔ بعض اوقات تنویر صاحب کوئی فلمی گیت لکھنے میں مصروف ہوتے تو موسیقار کا بھی محفل میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ورنہ ہم، تنویر صاحب، علاؤ الدین صاحب، ہدایت کار لقمان، آئی اے رحمان، موسیقار حسن لطیف ملک، کبھی کبھی ریاض شاہد بھی اس محفل میں شریک ہوا کرتے تھے۔ لقمان صاحب اور علاؤ الدین صاحب، تنویر صاحب کے پڑوسی تھے۔ تینوں کی کوٹھیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ سامنے ایک دو منزلہ عمارت میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ مینڈوڈی رہا کرتے تھے مگر وہ اپنی مصروفیات اور عادت کی وجہ سے کبھی اس سبھا میں شریک نہیں ہوئے۔ سامنے والے نکڑ پر سنتوش صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کے گھر میں آئے دن مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ پھر ان کی دلچسپیاں بھی مختلف تھیں اس لیے وہ اس محفل میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ ہم مستقل آنے والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کی آمدورفت بھی جاری رہتی تھی۔ رشید عطرے، ماسٹر عنایت حسین یا کوئی اور موسیقار بھی شریکِ محفل ہوتا تھا۔ چائے کافی کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا تھا۔ گرمی کے موسم میں لسی یا ''سردائی'' کا دور چلتا تھا۔ سردائی دراصل بھنگ پینے کا بہانہ تھا۔ لیکن اس کو بہت اچھی طرح گھوٹا کرنے کے لیے دو تین ملازم کافی دیر تک بھنگ کو پتھر کی سلوں پر رگڑتے تھے۔ پھر اس میں دودھ یا دہی اور چاروں مغز پیس کر ملائے جاتے تھے۔ ایک بالٹی میں یہ مشروب مہمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ملازم خوبصورت گلاسوں میں انڈیل کر مہمانوں کو پیش کرتے تھے۔ تنویر صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ دوپہر کو فلم ساز سے کوئی بہانہ کرکے گھر آجاتے تھے۔ کچھ دیر قیلولہ کرتے تھے۔ پھر اٹھ کر ہلکی سی ورزش کرتے۔ نہاتے، سفید کرتہ پاجامہ زیب تن کرتے، بالوں میں چنبیلی کے تیل کی مالش کراتے۔ آنکھوں میں سرمے کی گہری لکیریں ڈالتے اور لان میں بچھی ہوئی تمام کرسیوں کو چھوڑ کر ایک پلنگ پر براجمان ہوجاتے۔ نغمہ نگاری کا طریقہ یہ تھا کہ ایک گاؤ تکیے پر اوندھے نیم دراز ہوکر شعر موزوں کرتے تھے۔ موسیقار اور اس کا اسسٹنٹ ڈھولک بجاتا اور تنویر صاحب گنگناتے اور شعر لکھتے رہتے تھے۔


کلفٹن ساحل کی ایک یادگار تصویر

ایسی ہی ایک محفل میں گیت نویسی سے فارغ ہونے کے بعد گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے بتایا کہ حضور، کیا عرض کروں۔ اس بار کراچی میں ایک نوجوان شاعر سے ملاقات ہوئی۔ غضب کا ذہین اور بلا کا شاعر ہے۔ بہت اچھے شعر کہتا ہے۔ میں نے اس کو لاہور آنے کی دعوت دی ہے اور کہا ہے کہ جب تک کوئی اور بندوبست نہ ہو میرے مہمان رہو۔ میں تمہیں فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے بھی ملاؤں گا۔

دیکھیے، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر دراصل حبیب جالب کا تھا۔ وہ غضب کے شاعر تھے۔ بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ کس بلا کے شاعر تھے۔ حبیب جالب نے جب یہ شعر کہا تھا اس وقت کراچی ''شہر خرابی'' نہیں تھا بلکہ شہر رعنائی تھا۔ عروس البلاد کہلاتا تھا اور واقعی یہ دلہن کی طرح سجا بنا رہتا تھا۔ لاہور سے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی جانے والے رات کے وقت کراچی کی قطار اندر قطار جگمگاتی ہوئی روشنیاں دیکھنے کے لیے ہوائی جہاز کی کھڑکیوں کے پاس کھڑے ہوجاتے تھے۔ زیادہ اونچائی سے یہ جگنوؤں کا شہر نظر آتا تھا۔ ہر طرف ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں پھیلی نظر آتی تھیں۔ جیسے جیسے ہوائی جہاز نیچے زمین کے نزدیک آتا تھا یہ روشنیاں زیادہ چمکدار ہوجاتی تھیں۔ لاہور والوں کے لیے یہ ایک انتہائی دلکش منظر تھا چونکہ لاہور میں اس زمانے میں مال روڈ کے سوا کسی اور جگہ روشنیوں کی بہار نظر نہیں آتی تھی۔ کیا آج سوچ سکتے ہیں کہ ماڈل ٹاؤن سے مال روڈ جانے والی سات میل طویل فیروز پور روڈ کے راستے پر بجلی کے قمقمے بھی نہیں تھے۔ یہ سارا علاقہ اس وقت غیر آباد تھا اور اندھیروں میں ڈوبا رہتا تھا۔ مسلم ٹاؤن کے نزدیک چند عمارتیں اور روشنیاں نظر آجاتی تھیں یا پھر اچھرہ کے سامنے حلوائیوں کی دکانوں پر رونق ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر خاموشی اور گمبھیر اندھیرا۔ فیروز پور روڈ ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے دونوں جانب اونچے اونچے پرانے درخت اور کھیت تھے۔ اس سڑک پر سورج ڈوبتے ہی رات اور سناٹا ہوجاتا تھا۔ کبھی کبھی ماڈل ٹاؤن میں بس یا دودھ والے کا ریڑھا گزرتا تھا۔ اس کے سوا کسی اور قسم کا ٹریفک نہ تھا۔

اس کے برعکس کراچی روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک صاف ستھرا اور خوبصورت شہر تھا جہاں کشادہ سڑکیں تھیں جن پر گندگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

لاہور کا ائرپورٹ پہلے والٹن میں تھا، یہ ایک پرانے طرز کی مختصر سی عمارت تھی۔ عمارت کے سامنے دو فٹ کا ایک جنگلا سا تھا جس کے سامنے کھلے میدان میں بالکل نزدیک ہوائی جہاز اترتے اور پرواز کرتے نظر آتے تھے۔ لوگ مسافروں کو رخصت کرنے یا ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے سامنے ہی کھڑے ہوتے تھے۔ لاہور سے بہت کم پروازیں آتی اور جاتی تھیں۔ اس کے برعکس کراچی کا وسیع اور خوبصورت ائرپورٹ ایک بین الاقوامی ائرپورٹ تھا جہاں ہر وقت ہوائی جہازوں اور مسافروں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس وقت تک لاہور وہی پرانا لاہور تھا۔ اس شہر میں کوئی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ لاہور شہر

میں تبدیلیوں کا عمل درحقیقت 1970ء کے بعد شروع ہوا ورنہ اس سے پہلے لاہور میں ہر چیز اسی طرح تھی جیسی قیام پاکستان سے قبل تھی۔ البتہ شاہ عالمی دروازے اور شہر کے پرانے علاقے جو فسادات کے زمانے میں جل چکے تھے وہاں ان کی جگہ نئی عمارتیں بن گئی تھیں لیکن ان میں بھی کوئی جدت اور شان وشوکت نہیں تھی۔

کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ ابتدائی سالوں میں یہاں مہاجرین کی آمد کی وجہ سے افراتفری کا عالم رہا۔ سرکاری دفاتر فوجی بیرکس میں بنائے گئے۔ دفتروں میں میز کرسیاں اور ضروری لوازمات تک نہ تھے۔ کراچی کی تیز وتند ہوا سے کاغذات کو محفوظ رکھنے کے لیے ویٹ پیپر تک نہیں تھے۔ ان کی جگہ پتھر استعمال کیے جاتے تھے۔ کامن پن دستیاب نہیں تھی جن کا متبادل کانٹے تھے، پاکستان کے نئے دارالحکومت نے بہت غربت اور مشکل حالات دیکھے تھے جبکہ نئی دہلی میں انگریزوں کی بنائی ہوئی شاندار سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں، اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ انڈین گورنمنٹ کے حصے میں آئی تھیں۔ مگر پاکستانیوں کے پاس جوش وجذبہ تھا۔ سرکاری افسر ہمدرد اور محنتی تھے۔ عام لوگ نئے سرے سے آشیانے بنانے میں مصروف تھے۔

ہم نے پہلی بار کراچی کا سفر 1956ء میں کیا تھا۔ ہوائی جہاز کے ذریعے صحافیوں کو نئی اور نیٹ ائر لائنز کی پہلی پرواز سے کراچی لے جایا گیا تھا مگر رہائش کا بندوبست خود کرنا تھا۔ حبیب جالب نے جس ''شہر خرابی'' کا تذکرہ کیا ہے وہ دراصل شاعر کے دل کا شہر تھا۔ کراچی شہر اس وقت خرابیوں سے محفوظ، ایک بارونق، صاف ستھرا اور خوبصورت شہر تھا۔

ائرپورٹ سے ٹرمنل تک کا راستہ کشادہ اور بہت صاف ستھرا تھا۔ اس وقت تک لاہور میں چوڑی سڑکیں دیکھنے کو نہیں ملتی تھیں۔ سب سے کشادہ اور خوبصورت سڑک مال روڈ ہی تھی اس کے برعکس کراچی قیام پاکستان سے قبل ساڑھے تین لاکھ پر مشتمل آبادی کا شہر تھا۔ اس پورٹ سٹی میں سڑکیں بہت کشادہ اور خوبصورت تھیں۔ سبزے سے محروم اس شہر میں لاہور کی طرح سبزہ زار اور خوبصورت پرانے سایہ دار اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت تو نہیں تھے مگر شہر کی سڑکیں خوبصورت قمقموں، صاف ستھرے فٹ پاتھوں اور کھجور کے درختوں سے آراستہ تھیں۔ کراچی میں اس زمانے میں ہر وقت تیز ہوا چلتی رہتی تھی۔ ویسٹ اوپن فلیٹوں اور گھروں میں پنکھوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سڑکوں پر بھی یہ ہوا آپ کا خیر مقدم کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہاں زیادہ گرمی نہیں پڑتی تھی۔ شام ہوتے ہی آسمان پر بادل چھا جاتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تروتازہ کردیتے تھے۔ شہر میں خاک اور مٹی کا نام ونشان تک نہیں تھا...... سارے دن سڑکوں پر پیدل چلنے کے بعد بھی نہ تو جوتے خاک آلود ہوتے اور نہ ہی قمیص کا کالر میلا ہوتا۔

کراچی کی آبادی اس وقت بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ بندر روڈ اور دوسری سڑکیں بہت بارونق تھیں۔ دکانیں صاف ستھری اور فٹ پاتھ تجاوزات سے پاک تھے۔ ہر وقت چلنے والی ہوا پیدل چلنے والوں کو بھی تازہ دم رکھتی تھی۔ دکاندار بہت بااخلاق تھے۔ کراچی اس زمانے میں لاہور کے مقابلے میں سستا شہر تھا۔ جوتے، کپڑے، کھانا، سواری ہر چیز کی بہتات تھی اور ہر چیز سستی۔ لاہور سے جانے والے واپسی میں ڈھیر سارے جوتے، کپڑے اور چپلیں خرید کر لاتے تھے، ریسٹورانوں میں ہر قیمت کا کھانا دستیاب تھا۔ مہنگے ریستوران میں مہنگا اور عام ریستوران میں سستا۔ یہ ایک غریب پرور شہر تھا۔ گھروں کے کرائے بہت کم تھے۔ رکشا اور ٹیکسی والے لاہور کے برعکس میٹر کے حساب سے کرایہ وصول کرتے تھے اور میٹر میں بھی کبھی خرابی نہیں ہوتی تھی۔ لاہور میں ٹیکسی رکشا میں میٹر تو تھے لیکن بتایا جاتا تھا کہ خراب ہے۔ اس لیے کرائے پر بحث اور جھگڑے عام تھے۔ کراچی میں یہ ذہنی کوفت نہیں ہوتی تھی۔ اشارہ کرتے ہی ٹیکسی یا رکشہ رک جاتی تھی۔ نہ یہ سوال کے بابو جی کدھر جانا ہے، نہ منزل کا نام بتانے پر یہ جواب کہ میں تو اس طرف نہیں جارہا۔ کوئی دوسری سواری تلاش کرلیں۔

کراچی میں اس وقت تک ٹریفک کا ہجوم نہ تھا۔ اگرچہ کاریں لاہور سے زیادہ تھیں مگر ٹریفک کے اصولوں کی پاسداری کی جاتی تھی۔ سڑکوں پر لین سسٹم کا خیال رکھا جاتا تھا، کراچی کے دوست ہمیں ڈرائیونگ کے لیے اپنی کار دیتے تو خاص طور پر ہدایت کرتے کہ اپنی لین کا خیال رکھنا اور ٹریفک میں بلاوجہ گڑبڑ پیدا نہ کرنا۔ کراچی میں ٹریفک کے سپاہی سفید وردیاں پہنتے تھے اور ٹریفک کو بخوبی کنٹرول کرلیا کرتے تھے۔ کسی نے ذرا سی خلاف ورزی کی اور پولیس والے کی سیٹی کی آواز کانوں میں پڑگئی اور ٹریفک وہیں رک گیا۔

صدر ایمپریس مارکیٹ کی ایک یادگار تصویر



کراچی کی خوبصورت تاریخی عمارتیں شہر کے وقار اور حُسن میں اضافے کا سبب تھیں۔ ساحلِ سمندر کلفٹن سب سے پسندیدہ تفریح گاہ تھی۔ سیر کو آنے والے بھی مہذب اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے تھے۔ بندر روڈ، وکٹوریہ روڈ، زیب النساء اسٹریٹ بہت خوبصورت کمرشل سینٹر تھے۔

کراچی اس زمانے میں صحیح معنوں میں ایک کاسموپولیٹن شہر تھا۔ غیر ملکی مرد وعورتیں بہت بڑی تعداد میں بازاروں اور ہوٹلوں میں گھومتے نظر آتے تھے۔ ہر ہوٹل اور بڑے ریستوران میں بار ہوتا تھا۔ نائٹ کلب بھی تھے جہاں نیم عریاں رقاصاؤں کے علاوہ کسی اور قسم کی بے ہودگی یا بدتہذیبی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔

کراچی کی بندر روڈ (شاہراہ قائداعظم) پر چلنے والی ٹرام ایک رومان انگیز نظارہ تھا۔ سڑک کے درمیان میں ٹرام کی پٹڑی تھی اور جب گھنٹی کی ٹن ٹن سنائی دیتی تو معلوم ہوجاتا تھا کہ ٹرام آرہی ہے۔

ہم نے بعد میں دوسرے ملکوں کے شہروں کی ٹرام بھی دیکھی ہے مگر کراچی کی ٹرام کی شکل کی ٹرام کہیں نہیں دیکھی۔ یہ ٹرام صرف چھت پر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آمنے سامنے بیٹھنے والوں کے لیے سیٹیں تھیں۔ ٹرام میں داخل ہونے کے لیے کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی کہ چلتی ٹرام میں سوار ہونا اور اس سے اتر جانا ایک معمول تھا۔ ٹرام کا سفر دلچسپ بھی تھا اور سستا بھی۔ ایک کنارے سے شہر کے دوسرے کنارے تک جانے کا کرایہ ایک آنہ یا چھ پیسے تھا۔ کراچی جاؤ اور ٹرام پر سفر نہ کرو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ کراچی کے لوگ صلح کُل اور خوش اخلاق تھے۔ لڑائی جھگڑے کا منظر ہم نے کبھی کسی جگہ نہیں دیکھا۔ یہ ایک پُرامن شہر تھا۔ رات کے کسی پہر بھی بلا خوف وخطر گھومنا پھرنا کراچی والوں کی عادت میں شامل تھا۔ جرائم بہت کم تھے۔ کراچی کی ایک انفرادیت شام کے اخبارات تھے۔ سڑکوں کے چوراہوں پر لڑکے شام کے اخبار لیے کھڑے ہوتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ہر کار والا ایک یا زیادہ اخبار ضرور خریدتا تھا۔ شام کے اخبار اپنی خوبصورت تصاویر اور سنسنی خیز خبروں کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ اس وقت تک پاکستان کے کسی اور صوبہ میں شام کے اخبارات نہیں ہوتے تھے۔

کلفٹن، کیماڑی اور منوڑہ ساحلِ سمندر پر واقع تفریح گاہیں تھیں۔ ہاکس بے پر بھی بہت رونق ہوتی تھی۔ یہاں دولت مندوں کی چھوٹی چھوٹی ہٹس بھی تھیں۔ ساحلِ سمندر پر غیر ملکی مرد اور خواتین غسل آفتابی کرتے نظر آتے تھے۔ کوئی لیٹا ہوا ہے کوئی اوندھا پڑا ہے۔ ان میں مرد بھی ہوتے تھے اور خواتین بھی۔ اگر کسی کے ساتھ گھر کی خواتین ہیں تو وہ ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا تھا لیکن اگر صرف مرد ہیں تو وہ گزرنے کے لیے یہ راستہ ضرور اختیار کرتے تھے اور کن انکھیوں سے یہ منظر دیکھتے ہوئے خاموشی سے گزر جاتے تھے۔ آس پاس کے جزیروں کو جانے کے لیے ساحل پر سے کشتیاں (لانچز) چلتی رہتی تھیں۔ عورت مرد، بچے سبھی مسافروں میں شامل ہوتے تھے اور بڑی بے فکری سے گھومتے پھرتے تھے۔ کراچی میں نگار کے مالک ومدیر الیاس رشیدی صاحب سے ہماری بہت اچھی شناسائی تھی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ وہ اپنے پرچے کے سلسلے میں لاہور آتے رہتے تھے۔ ان کے کہنے پر ہم نے ''نگار'' میں ہفت روزہ فلمی معلومات اور تبصروں کا کالم ''علی بابا کی ڈائری'' بھی شروع کردیا تھا جو کافی طویل عرصے تک جاری رہا۔ ''نگار'' کا دفتر اس زمانے میں عید گاہ کے علاقے میں تھا۔

ہم رات کے وقت کراچی پہنچے تھے۔ پہلی بار گئے تھے

اس لیے کراچی کے ہوٹلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ہوائی سفر کے دوران میں ہمیں بتایا گیا کہ فی الحال آپ پاکستان چوک کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ وہاں ایک ''نگار'' ہوٹل ہے۔ جس میں اے پی پی کا دفتر بھی ہے وہاں صحافیوں کی آمد ورفت لگی رہتی ہے۔ آپ کو وہاں سے ہر قسم کی معلومات حاصل ہوجائیں گی۔

ٹرمنل سے ٹیکسی لے کر ہم پاکستان چوک پہنچ گئے۔ سارے راستے کراچی کی کھلی کھلی ہوا اور سڑکوں اور روشنیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لاہور کے مقابلے میں کراچی بالکل ایک نئی دنیا کا شہر لگ رہا تھا۔ ''نگار'' ہوٹل چار منزلہ تھا۔ دیکھنے میں معقول اور صاف ستھرا۔ آس پاس کی سڑکیں بھی روشن اور کشادہ۔ کراچی کی سمندر میں بھیگی ہوئی ہوا بھی ہمارے لیے ایک انوکھی چیز تھی۔

ہوٹل میں سنگل روم کا کرایہ غالباً دس روپے روزانہ تھا۔ سستا زمانہ تھا۔ بعد میں جب کراچی کے بہترین ہوٹلوں میٹروپول اور بیچ لگژری میں ٹھہرے تو وہاں کے بہترین کمروں کا کرایہ 54 روپے روزانہ ہوتا تھا جس میں صبح کا ناشتا بھی شامل تھا۔

کھانا ہم نے ہوائی جہاز میں ہی کھالیا تھا جو بہت لذیذ اور صحت بخش تھا۔ جب پی آئی اے نے جنم لیا تو مسافروں کو انگریزی اور دیسی کھانے میں سے کوئی پسند کرنا ہوتا تھا اور یہ بہت ہی لذیذ ہوتا تھا جو دوسری ائر لائنز کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر ہی پایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پی آئی اے ایک زمانے میں واقعی باکمال لوگوں کی لاجواب پرواز تھی۔ جب یورپ اور مغربی ملکوں کے غیر ملکی ائر لائنز سے سفر کیے تو پی آئی اے سے ان کا موازنہ کرتے رہتے تھے اور ہمیشہ پلڑا پی آئی اے کا ہی بھاری رہتا تھا۔

نگار ہوٹل میں ہمارا کمرا سڑک کی جانب تھا۔ ٹریفک زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں کی جانب کے کمرے بھی پُرسکون تھے۔ جیسے جیسے کراچی میں ٹریفک بڑھتا رہا۔ شور بھی بڑھتا رہا اور سڑکوں کی جانب کے کمروں میں سونا بھی مشکل ہوگیا تھا۔

ہوٹل کا کمرا معقول تھا۔ کمرے میں ہی ایک صاف ستھرا باتھ روم بھی تھا۔

اس زمانے میں ہوٹلوں میں پیشگی کرایہ وصول کرنے کا دستور نہیں تھا۔ یہ رواج بہت عرصے بعد شروع ہوا۔

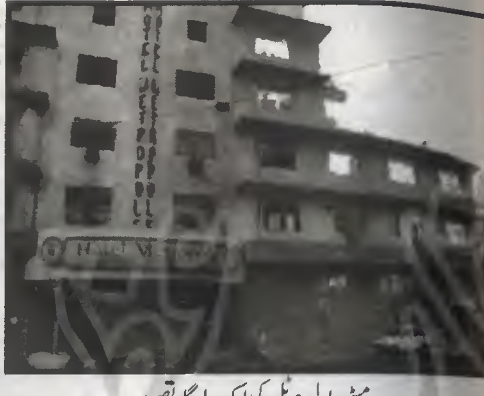
کچھ دیر اپنے ساتھ لے جانے والے میگزین پڑھتے رہے اور پھر سو گئے۔ کمرے میں روشنی ہو تو ہم سو نہیں سکتے۔ روشنی بجھادی، کھڑکی سے سڑک کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی وہی کافی تھا۔

رات کو کسی وقت یوں محسوس ہوا جیسے سارے جسم میں کسی نے گرم سوئیاں چبھودی ہیں۔ اٹھ کر روشنی کی تو دیکھا کہ بستر کی سفید چادر پر بے شمار کھٹمل ہمارا خون چوسنے کے لیے موجود تھے۔ پریشان ہوگئے کہ کیا کریں۔ کسی بھی کیڑے کو مارنا ہمارے بس میں نہیں ہے مگر جب جان پر بن جائے تو تنگ آمد بجنگ آمد، والا فلسفہ اپنانا ہی پڑتا ہے۔ یہ کھٹمل انتہائی چوکس اور چالاک تھے، جیسے ہی کمرا روشن ہوا وہ تیزی سے غائب ہونے لگے۔ پھر بھی جتنے کھٹمل مار سکے ہم نے انتقاماً مارے باقی سب روپوش ہوگئے۔ ایسے جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں۔

ہم زخمی جسم کھجاتے رہے پھر روشنی گُل کرکے سوگئے مگر کچھ دیر بعد پھر کھٹملوں کا حملہ شروع ہوگیا۔ مجبوراً جاگنا پڑا۔ بستر کی چادر ہم نے فرش پر جھاڑی تو بے شمار کھٹمل فرش پر بکھر گئے۔ پریشانی اور غصے میں آکر ہم نے زندگی میں پہلی اور آخری بار کیڑے مکوڑے مارنے کی مہم شروع کی۔ اتنے بہت سے کھٹمل ہاتھوں سے نہیں مار سکتے تھے اس لیے جوتا پہن کر انہیں ہلاک کرنا شروع کردیا۔ جتنے مار سکتے تھے مارے باقی غائب ہوگئے۔ کھٹمل اگر ایک بھی کاٹ لے تو سارے جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یہاں تو بے شمار کھٹملوں نے ہمیں نشانہ بنایا تھا۔ سارا جسم انگارا تھا۔ لیکن نیند کے ہاتھوں بھی مجبور تھے۔ اس کے بعد کھٹملوں سے باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمرے میں روشنی کرکے جتنے کھٹمل مار سکتے تھے مارتے تھے۔ آخر سوچا کہ یہ روشنی میں بھاگ جاتے ہیں کیوں نا روشنی جلا کر سوئیں۔ کمرے کی روشنی جلا کر ہم سوگئے۔ مگر معلوم ہوا کہ کھٹمل بہت ذہین اور حساس مخلوق ہے۔ انہیں جب احساس ہوا کہ ہم سوگئے ہیں تو وہ پھر آگئے مگر ہمارے بیدار ہوتے ہی غائب ہوگئے۔ پھر بھی جتنے دشمنوں کو ہلاک کرسکتے تھے ہم نے ہلاک کیے۔ رات بھر یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ صبح ہوتے ہی کھٹمل لاپتا ہوگئے لیکن کمرے کا فرش خونم خون ہوچکا تھا۔

ہم نے منیجر سے شکایت کی تو وہ بالکل معصوم بن گئے۔ ''کھٹمل؟ پہلے تو کبھی کسی گیسٹ نے شکایت نہیں کی۔''

رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور بھوکے تھے۔ اس لیے آملیٹ اور پراٹھوں کا ناشتا کیا۔ لاہور سے ساتھ آئے


میٹروپول ہوٹل کی ایک یادگار تصویر

ہوئے ایک صحافی جو قریب ہی کسی عزیز کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے مزاج پرسی کے لیے آئے تو ہم شکایات کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔ وہ سنتے رہے لیکن ان کی توجہ اور نظریں کسی اور طرف تھیں۔ دراصل وہ کھڑکی سے سامنے والی بلڈنگ کی بالکونی کا نظارہ کررہے تھے جہاں ایک خوبصورت لڑکی دھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لیے پھیلا رہی تھی۔ اُس کو دیکھے جانے کا احساس ہوا تو اندر چلی گئی۔

ہمارے دوست بولے ''آفاقی صاحب' یہ تو بہت رنگین جگہ ہے۔ اب یہ ہوٹل نہ چھوڑنا۔'' ہم نے الیاس بھائی کو فون کیا۔ ان کے لیے ہماری آمد اچانک تھی، انہوں نے ہوٹل کا پتا نشان پوچھا اور کہا کہ گیارہ بجے تک میں آرہا ہوں۔

ان کے انتظار میں ہم کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اخبار پڑھتے رہے۔ نظریں اٹھیں تو سامنے بالکونی میں وہی لڑکی نظر آئی۔ اس کا دھیان ہماری کھڑکی کی طرف تھا مگر کسی کام کے بہانے بالکونی پر آئی تھی۔ نظریں ملیں تو ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔ شاید کسی کے پکارنے پر وہ اندر چلی گئی مگر جاتے جاتے ایک نگاہِ غلط انداز میں کہہ گئی کہ انتظار کرو، بس میں ابھی آئی۔

ہم نے اخبار کا مطالعہ شروع کردیا۔ کچھ دیر بعد سڑک کی جانب سے کپڑے جھٹکنے کی آواز آئی۔ وہی لڑکی تھی۔ زور زور سے تولیے اور دوسرے کپڑے جھٹک رہی تھی۔ غالباً ہمیں متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ اس بار ہم نے ذرا غور سے دیکھا۔ کھلتے ہوئے رنگ کی خاصی خوش شکل لڑکی تھی۔ مگر ہم نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہم تو وہاں مسافر تھے۔ اسی روز رخصت ہوجانا تھا۔ اس طرح کے کھیل ہمیں ویسے بھی پسند نہیں ہیں۔ ہم نے اخبار سنبھالا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر تک کپڑے جھٹکنے کی آوازیں آتی رہیں مگر ہم نے سنی ان سنی کردی۔

ٹھیک گیارہ بجے الیاس بھائی آگئے۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگے۔ ''ارے میاں تم یہاں کہاں ٹھہر گئے۔ مجھے تو بتایا ہوتا۔ میرے دفتر کے ساتھ ہی بہت اچھا ہوٹل ہے۔''

نگار کا دفتر اس زمانے میں عیدگاہ کے علاقے میں تھا۔ سڑک عبور کرکے پارک ہوٹل تھا جو بہت اچھا اور جدید ہوٹل تھا۔ اس کا دروازہ دوسری سڑک پر تھا۔ یوں کہیے کہ ہوٹل کے پچھواڑے ''نگار'' کا دفتر تھا۔ یہ ایک دومنزلہ عمارت تھی۔ دفتر دوسری منزل پر تھا۔

الیاس بھائی نے ہمارا سوٹ کیس سنبھالا، ہوٹل کا کرایہ ہمارے منع کرنے کے باوجود ادا کیا اور اپنے دفتر لے گئے۔

''نگار'' کا دفتر ایک کلب کی طرح تھا۔ لاہور سے آنے والے فلم والے اور صحافی، کراچی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، ادیب، شاعر، فلم والے، سبھی کا یہاں ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ یہ جگہ بھی خاصی بارونق تھی۔ رٹنز سنیما کے سامنے ایک دومنزلہ عمارت میں ''نگار'' ویکلی کا دفتر تھا۔ بورڈ تو الیاس بھائی نے کبھی لگایا ہی نہیں مگر سب کو معلوم تھا کہ یہ نگار کا دفتر ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت اس زمانے میں پر پرزے نکال رہی تھی۔ اس زمانے کی فلمی صنعت میں ''نگار'' ویکلی اور الیاس بھائی کا بہت اہم کردار تھا۔ انہوں نے درجنوں نئے چہروں کو اسٹار بنادیا۔ فلم سازوں کو ڈسٹری بیوٹرز سے یا سرمایہ کار سے وہ سرمایہ بھی دلوادیا کرتے تھے۔ الیاس بھائی ایک درویش قسم کے آدمی تھے۔ اپنا ذاتی فائدہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس زمانے میں کروڑوں کا سرمایہ لوگوں کو دلوایا مگر خود فقیر کے فقیر ہی رہے۔ عرصہ دراز تک تو ان کا ذاتی گھر تک نہ تھا حالانکہ کراچی اور لاہور کے کروڑپتی فلم ساز، تقسیم کار... اور ان کے لگائے ہوئے پودے جو سپر اسٹار بن چکے تھے لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ الیاس بھائی کے پاس کبھی کار نہ رہی تھی۔ ٹیکسی میں بلکہ اکثر رکشا میں سفر کرتے تھے۔ مگر انہیں کسی قسم کا احساس کمتری یا احساس برتری نہیں تھا۔ ایسے مخلص اور بے لوث دوست بھی کم ہی دیکھے ہیں۔

”نگار“ کے دفتر کے قریب ایک سڑک عبور کرکے جو نیا ہوٹل بنا تھا اس کا نام ”پارک“ ہوٹل تھا۔ یہ بہت اچھا اور صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ ابتدائی دنوں میں کئی بار ہم اسی ہوٹل میں ٹھہرتے رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو یہ ”نگار“ کے دفتر کے نزدیک تھا جہاں کراچی میں ہمارا بیشتر وقت گزرتا تھا۔ سب دوست احباب وہیں آجاتے تھے۔ پھر نزدیک ہی برنس روڈ تھی۔ یہ آج بھی ہے لیکن اس زمانے میں یہی کراچی کی واحد فوڈ اسٹریٹ تھی۔ ہر قسم کا مزیدار چٹ پٹا کھانا یہاں دستیاب تھا۔ مغلئی کھانے، پنجابی اور سندھی کھانے، نہاری، سری پائے، مختلف قسم کے کباب، سیخ کباب، روایتی گولا کباب، قسم قسم کے نان، پراٹھے، پوری حلوہ، پوری کچوری، یہ ایک ایسی جگہ تھی جس کا نام سنتے ہی کھانے کے شوقین لوگوں کے منہ میں پانی آجاتا تھا۔

بندو خان کے پراٹھے اور کباب بھی کراچی کی سوغات کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوئی کراچی جائے اور بندو خان کے کباب پراٹھے نہ کھائے، یہ ناممکن تھا۔ بندو خان کی دکان کے سامنے خریداروں کا ہجوم رہتا تھا۔ صبح سویرے سے رات گئے تک اس دکان کے سامنے انسانوں اور کاروں کا ہجوم رہتا تھا۔ بندو خان کے نام سے کباب پراٹھے کی دکانیں اب لاہور میں بھی ہیں لیکن جو ذائقہ کراچی کے بندو خان کے کباب پراٹھے میں تھا وہ کسی اور جگہ کے بندو خان کے کباب پراٹھے میں نہ تھا۔ آج کل یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اصلی بندو خان کون ہے۔ ہر جگہ تو بندو خان کے ریستوران نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ وہی اصلی بندو خان کا وارث ہے۔ یہ رواج ہمارے ہی ملک میں ہے کہ نقل مطابق اصل کرتے ہیں اور ڈھٹائی یہ کہ سبھی خود کو اصلی کہتے ہیں۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں بھیا کے سیخ کباب بہت مشہور تھے۔ سائز میں چھوٹے لیکن ذائقے میں بے مثال، منہ میں رکھتے ہی کباب یوں گھل جاتا تھا جیسے مکھن گھل جاتا ہے۔ شہر کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں بھیا کے کبابوں کی شہرت سن کر آتے تو پتا چلتا کہ وہاں تو درجن بھر ”بھیا“ کے کباب والوں کی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں کے سیلز مین ”شکار“ کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں جیسے ہی کوئی کار نزدیک آئے اس کی طرف یوں جھپٹتے ہیں جیسے عقاب اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔

کیوں بھئی، کیا آپ اصلی بھیا کی دکان سے آئے ہیں۔ جواب میں ایک درجن لڑکوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ”جی صاحب جی! اصلی بھیا کے کباب صرف ہم ہی آپ کو کھلا سکتے ہیں۔“

اب بتائیے، یہ کیسے پتا چلے کہ ان درجن بھر میں سے اصلی بھیا کا نمائندہ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت بارہ اصلی بھیا تو ہو نہیں سکتے۔ کیا بھیا کے بھی کولون کے ذریعے بارہ بھیا بنا دیے گئے ہیں۔ واقعی سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔

نگار کے دفتر میں کراچی کے قریب قریب سبھی قابلِ ذکر لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ لاہور سے کراچی آنے والوں سے بھی یہیں ملاقات ہوجاتی تھی۔ الیاس بھائی کے ساتھ ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز جانے لگے تو وہاں کراچی کے سبھی فلم والوں سے مل لیے۔ اسٹوڈیو کے مالک سعید ہارون سے الیاس بھائی کی بہت گہری دوستی تھی۔ ان کی بیگم نے الیاس بھائی کو منہ بولا بھائی بنایا تھا۔ سعید صاحب کو سب لوگ اور الیاس بھائی (بے تکلف دوست) سعید سیٹھ کہا کرتے تھے۔ وہ بہت دلچسپ شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں تفصیل سے پہلے تذکرہ ہوچکا ہے۔

کراچی میں یوں تو بے شمار دوست اور ملاقاتی بن گئے لیکن ابراہیم جلیس، طفیل احمد جمالی کے ساتھ بہت گہری چھننے لگی۔ کاموں سے فراغت پا کر شام کو ہم سب اکٹھے مل بیٹھتے یا گھومتے پھرتے۔ اکثر ہمارے ہوٹل کے کمرے میں محفل آرائی ہوتی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ہم سمندر کی سیر کو بھی گئے۔ منوڑہ کے جزیرے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ بہت پُرفضا مقام تھا۔ کشتیوں کے ذریعے وہاں گئے جنہیں کراچی والے ”لانچ“ کہتے تھے۔ ہم تو پانی کے حوض کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں، یہاں تو سمندر میں ایک چھوٹی سی لانچ میں سفر کرنا تھا۔ ڈر کے مارے ہماری جان نکلی ہوئی تھی۔ دل ہی دل میں آیات پڑھتے رہے۔ جمالی صاحب اور ابراہیم جلیس ہمارے خوف سے آگاہ تھے۔ ہم سے تو کچھ نہیں کہا مگر آپس میں بات چیت کرتے ہوئے ایسے واقعات سناتے رہے جن سے ہمیں مزید ڈرانا مقصود تھا۔

یہ قصہ بھی انہوں نے سنایا کہ ایک بار ایک بہت عالم فاضل پروفیسر کشتی میں بیٹھ کر دریا پار جا رہے تھے۔ وہ کشتی بان کی جہالت سے بہت پریشان تھے اور اس کو لیکچر دے رہے تھے کہ دنیا میں کتنے علوم ہیں مگر تم ان میں سے ایک سے بھی واقف نہیں ہو۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے، ڈوب مرو۔ دریا کے بیچ میں پہنچے تو کشتی منجدھار میں



کبھی کراچی کی شاہراہیں ایسی ہوا کرتی تھیں

پھنس گئی۔

کشتی بان نے پوچھا۔ ”بڑے صاحب، آپ نے دنیا میں بہت کچھ سیکھا ہے مگر کیا تیرنا بھی سیکھا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے تو تیرنا آتا ہی نہیں۔“

کشتی بان بولا۔ ”تو پھر اللہ ہی آپ کو بچانے والا ہے۔ کشتی منجدھار میں پھنس گئی ہے۔ میں تو چلا۔“ یہ کہہ کر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا رخصت ہوا۔ پروفیسر صاحب اس کو پکارتے رہ گئے یہاں تک کہ کشتی سمیت ڈوب گئے۔

ابراہیم جلیس نے کہا۔ ”جمالی، ایسے قصے سنا کر تم آفاقی کو ڈرا رہے ہو۔“

”ارے بھئی، میں تو لطیفے سنا رہا ہوں۔ ویسے تیرنا تو میں بھی نہیں جانتا۔“

”تو میں کب جانتا ہوں“ ابراہیم جلیس بولے۔ ”اچھا لو، ایک ڈوب مرنے والا لطیفہ مجھے بھی یاد آگیا۔ سنو۔“

الیاس بھائی کہتے رہے کہ کیوں آفاقی کو ڈراتے ہو۔ ایسے لطیفے مت سناؤ۔

ابراہیم نفیس نے کہا ”الیاس بھائی، ہمارا تو خود ڈر کے مارے برا حال ہے۔ اپنا ڈر بہلانے کے لیے یہ لطیفے سنا رہے ہیں۔“

کچھ دیر تو ہم ساتھی سہمے رہے مگر جب لانچ ساحل سے دور کھلے سمندر میں پہنچی اور سمندر کے ہلکورے کھاتے ہوئے نیلے پانی کو حدِ نظر تک دیکھا تو ایک عجیب سا سرور اور فرحت محسوس ہوئی۔ ذہن تازہ ہوگیا۔ سمندر کی سطح کے اوپر اُڑتے ہوئے سفید پرندے سمندر کے حُسن میں مزید اضافہ کررہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے چند پرندے تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی ہم سفر ہیں۔ وہ کبھی سمندر کی سطح پر پانی میں بیٹھ جاتے۔ کبھی اُڑتے ہوئے فضا میں چاروں طرف پھیل جاتے۔ اس کے بعد بھی ہم نے یورپ میں بحری سفر کیے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر سمندر پُرسکون ہو تو اس سے زیادہ دلکش اور انوکھا لطف کسی اور منظر کو دیکھنے میں نہیں آتا۔

منوڑہ پر بھی ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کچھ خواتین تیراکی کا لباس پہنے سمندر میں غوطے بھی لگا رہی تھیں۔ یہاں کھلا سمندر تھا اور تیرنا خطرے سے خالی نہ تھا لیکن یورپ کے لوگوں کو بچپن ہی سے سمندر میں تیرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی کسی یورپین مرد یا عورت کے سمندر میں ڈوبنے کی خبر نہیں سنی۔

ہم لوگ اس ساحلی حصے کی طرف چلے گئے جہاں سمندر کی لہریں ساحل پر آکر جھاگ اڑاتیں اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں۔ یہاں لوگ گھٹنوں تک پائنچے چڑھائے ساحل پر کھڑے تھے۔ سمندر کی لہریں آکر ان کے پیروں کو پانی میں ڈبو دیتی تھیں اور پھر آہستگی سے واپس چلی جاتیں۔ سب نے ہمیں بھی سمندر میں جانے کے لیے کہا مگر ہم ڈر رہے تھے لیکن جب خواتین اور بچوں کو بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا دیکھا تو کچھ ہمت افزائی ہوئی اور ہم بھی ڈرتے ڈرتے اتنی دور چلے گئے کہ جب لہریں آتیں تو پانی ہمارے ٹخنوں کو چوم کر واپس چلا جاتا تھا۔ پہلی بار لہر آئی

تو ہم بہت خوفزدہ تھے مگر اپنی جگہ ہی کھڑے رہے' پانی ہمارے ٹخنوں سے ٹکرایا تو بہت مزہ آیا۔ جب لہر واپس گئی تو پیروں تلے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ ریت بھی لہر کے ساتھ چلی گئی تھی یہ ایک انوکھا اور بہت مزیدار تجربہ تھا۔

کراچی کا ساحل اُن دنوں بہت صاف ستھرا تھا۔ کوڑے کرکٹ اور گندگی کا نام تک نہ تھا۔ ساحلِ سمندر پر اونٹ والے لوگوں کو اونٹوں کی سواری کرا رہے تھے۔ عورتیں، بچے ، بوڑھے سب اونٹ کی سواری کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک طرف گول گپے اور مختلف کھانے کی چیزیں فروخت کرنے والے اپنے کاروبار میں معروف تھے۔ ساحل پر بہت رونق اور چہل پہل ہوتی تھی۔ دن ہو، شام ہو، یا رات کا ابتدائی حصہ، یہاں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ہر طرف بے فکری اور ہنسی دل لگی کرتے ہوئے لوگ نظر آتے تھے۔

کراچی کی کھلی سڑکوں پر فٹن کی سواری کا لطف بھی لیا۔ دراصل یہ ایک شاہی یا رئیسوں کی سواری ہے۔ چست و چالاک گھوڑے اور چاق و چوبند صاف ستھرے لباس میں ملبوس کوچوان آٹھ آنے میں فٹن کی سواری کرا دیتے تھے۔ لاہور میں تانگے کا رواج رہا ہے۔ سجے ہوئے تانگے اور گھوڑے کی سواری مہنگی ہوتی تھی۔ فٹن لاہور میں صرف چند شوقین ہستیوں نے ہی ذاتی استعمال کے لیے رکھی ہوتی تھی۔ اب تو وہ بالکل ہی ناپید ہوگئی ہے۔

فٹن میں کوچوان اگلے حصے میں اونچی جگہ بیٹھتا ہے، مسافر نیچے کی آرام دہ سیٹوں پر بیٹھ کر تازہ ہوا اور آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے محبوب کی فلم ''آن'' دیکھی ہے تو وہ گانا بھی آپ کو یاد ہوگا جس میں دلیپ کمار فلم کی ہیروئین نادرہ کو فٹن میں بٹھا کر لے جاتے ہیں اور گانا گاتے ہیں۔

دل میں چھپا کے پیار کا ارمان لے چلے
ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے

کراچی میں یوں تو اس زمانے میں ہر جگہ صفائی، سکون اور دلکشی کے سامان نظر آتے تھے لیکن صدر کا علاقہ یورپ کا منظر پیش کرتا تھا، میٹروپول ہوٹل کے پچھواڑے سامنے کے کونے میں سینٹرل ہوٹل تھا۔ درمیان میں کشادہ سڑک اور چوراہا تھا۔ ٹریفک بہت کم تھا۔ ان ہوٹلوں کے نیچے کی منزل والے باہر سڑک پر الغوزہ بجانے والوں یا لوک گیت گانے والوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ لوگ سرِ شام ہی گانے بجانے آجاتے تھے۔ ہم لوگ کھڑکیوں میں اکٹھے بیٹھ کر ان کی موسیقی سنتے اور بات چیت بھی کرتے۔ یہ لوگ اپنی زندگی، گاؤں اور علاقوں کے بارے میں بتاتے تھے۔ ان سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ یہ لوگ سندھی گیت اور کافیاں بھی سناتے تھے جسے جمالی، عارفانہ کلام کہتے تھے۔ یہ عجیب و غریب ماحول ہوتا تھا جو کہ اب خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کراچی کیا دل کو لبھانے والا شہر تھا۔

میٹروپول ہوٹل اس زمانے میں فلم والوں کا مرکز تھا۔ لاہور سے جو بھی فلم والا یا فلم یونٹ کراچی جاتا تھا وہ میٹروپول ہی میں ٹھہرتا تھا۔ ہوٹل کے سامنے والی کشادہ سڑک پر ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جو اپنے پسندیدہ فنکاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے مشتاق ہوتے تھے۔ میٹروپول کے کمرے اور گیلریاں بہت خوبصورت اور کھلے کھلے تھے۔ یورپ کے ہوٹلوں میں بھی ہم نے ایسے ہوٹل نہیں دیکھے۔ میٹروپول میں قیام کرکے ایک روحانی سکون اور سرور ملتا تھا۔ میٹروپول کے اندر ایک وسیع لان تھا۔ سامنے ایک اسٹیج بنا ہوا تھا، یہاں عموماً رقص و نغمے کے پروگرام ہوا کرتے تھے۔ ایمی مینوالہ کا رقص ایک مخصوص پروگرام تھا۔ ایمی اور ان کی ممی میٹروپول ہوٹل ہی میں رہا کرتی تھیں۔ میٹروپول کے اس لان اور اسٹیج جیسا منظر ہم نے کہیں اور نہ دیکھا۔ لان میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب ڈائننگ ہال کے سامنے وسیع برآمدہ تھا جہاں ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی چائے کافی پینے اور اس کے ساتھ ہی رقص و نغمے کے مفت پروگراموں سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ کیسے اچھے دن تھے۔ کیسے زندہ دل اور خوبصورت لوگ تھے۔ سارے کا سارا کراچی ہی بہت خوبصورت تھا۔ ہم لاہور والے کراچی جانے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے اور کراچی جا کر دنیا کے سارے غم اور دکھ بھول جاتے تھے۔ وہاں کے ہوٹلوں میں کھانوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ریستورانوں میں گھومتے پھرتے اور قسم قسم کی چیزیں کھاتے پیتے تھے، میٹروپول کے عقب میں ایک جانب خوبصورت عمارتیں اور ان کے سامنے سرسبز لان تھے۔ درمیان میں بہت وسیع اور کشادہ سڑک تھی جس کے فٹ پاتھوں پر لکڑی اور لوہے کی بینچیں تھیں۔ ان پر لوگ بیٹھ کر راہ گیروں کا تماشا دیکھتے تھے۔ اسی چوک میں پاکستان کا پہلا میوزیکل فوارہ لگایا گیا تھا۔ رات کو فوارے کے پانی پر


جوڑیا بازار 1895ء

رنگین روشنیاں پڑتیں تو ایک خوشنما ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔

کراچی میں گدھا گاڑی بھی ایک نمایاں شے تھی۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کو گدھا ساتھ لے کر دوڑتا نظر آتا تھا۔ مگر عجب بات یہ تھی اس گدھے کے ساتھ ایک اور گدھا بھی جُتا ہوا نظر آتا تھا جو گاڑی کو نہیں کھینچتا تھا صرف اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا تھا۔

ہم نے پہلی بار یہ منظر دیکھا تو حیرت ہوئی کہ جب ایک گدھے سے گاڑی چل رہی ہے تو دوسرے گدھے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔

ابراہیم جلیس نے ہمیں سمجھایا۔ ''آفاقی اس دوسرے گدھے کو پخ کہتے ہیں۔''

''مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟''

''بھئی، گاڑی کو جو گدھا کھینچ رہا ہے اس کی مورال سپورٹ (Moral Support) کے لیے، تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ سارا بوجھ وہی کھینچ رہا ہے۔''

''اور پخ؟''

''پخ یہ سمجھتا ہے کہ دراصل گاڑی وہی کھینچ رہا ہے۔''

ہم نے کہا ''واقعی یہ دونوں گدھے ہی ہیں۔ بے وقوف انسانوں کو شاید اسی لیے گدھا کہا جاتا ہے۔ بھئی آپ کے کراچی میں گدھے بہت زیادہ ہیں۔''

جمالی صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں اور باہر سے بھی آجاتے ہیں' دوسرے شہروں سے۔'' انہوں نے جوابی فقرہ کسا، ہم سب ہنسنے لگے۔

کراچی کی بہت سی باتیں لاہور سے مختلف تھیں۔ مثلاً پیٹرول پمپ پر آپ کار میں پیٹرول ڈلوائیں تو ایک یونیفارم میں ملبوس نوجوان فوراً آکر کار کے شیشے صاف کردیتا تھا۔ کسی معاوضے کے بغیر۔ ہاں اگر آپ بخشش دینا چاہیں تو اور بات ہے لیکن کوئی بخشش مانگتا نہیں تھا۔

کراچی کے سینما بہت ہی صاف ستھرے اور بارونق ہوتے تھے۔ ہال کے اندر سفید قمیص اور پتلون پہنے، کالی ٹائی لگائے کئی اسمارٹ نوجوان موجود رہتے تھے جو لوگوں کو ان کی نشستوں پر بٹھانے کے علاوہ ''تمیز'' بھی سکھاتے تھے، مثلاً اگر کوئی سامنے والی سیٹ پر پیر رکھتا تو یہ فوراً پاس جا کر تمیز سے کہتا۔ ''معاف کیجیے سر...... پیر نیچے رکھیے۔ سامنے والے صاحب کو ناگوار گزرے گا۔''

ریستوران تو لاہور کے سینما گھروں میں بھی تھے۔ بہت اچھے سینما بھی تھے لیکن کراچی کے سینما گھروں میں کافی بہت اچھی ملتی تھی۔ کافی کا ایک کپ آٹھ آنے میں ملتا تھا۔ ایسی کافی اور اتنی سستی کہیں اور نہیں ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ کراچی کے نواحی علاقوں میں بھی سینماؤں کی تعمیر شروع ہوئی تو فلم دیکھنے والوں کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ خواتین گھر کی لڑکیوں اور بچوں کی انگلی پکڑ کر پیدل ہی سینما دیکھنے چلی جاتی تھیں۔ جن عورتوں کو رات گئے گھریلو کاموں سے فرصت ملتی وہ اپنی ہم جولیوں اور پڑوسنوں کے ساتھ آخری شو دیکھنے میں کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی تھیں۔

کراچی میں ابتدا میں دو نئی آبادیاں وجود میں آئی تھیں۔ ایک پیر الٰہی بخش کالونی اور دوسرا ناظم آباد۔ یہ مہاجرین کی آبادیاں تھیں۔ ہمارے بہت سے قریبی رشتے دار یہاں رہتے تھے۔ جب کراچی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم بھی سے ملنے جاتے تھے۔ ٹیکسی لی اور دن یا رات کے کسی پہر اکیلے ہی پہنچ گئے۔ واپسی میں رات گئے بھی ٹیکسیاں مل جاتی تھیں۔ شمیم آرا اور زیبا بیگم بھی ایک زمانے میں ناظم آباد ہی میں رہا کرتی تھیں۔ اور بھی کئی فلم

والے ناظم آباد کی نئی آبادی میں رہتے تھے۔ بعد میں تو خود رو پودوں کی طرح کراچی میں نئی نئی آبادیاں بن گئیں، کراچی ہر طرف پھیلتا چلا گیا اور اس کی رونق اور حسن میں اضافہ ہوتا رہا۔

کراچی میں نئی نئی آبادیاں اور عمارتیں بن رہی تھیں۔ ہم لاہور والے اس پر رشک کرتے تھے کیونکہ لاہور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی مگر کراچی کی ترقی دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ کراچی جب دارالحکومت نہ رہا تب بھی اس کی ترقیوں میں کمی نہیں آئی۔ جب سنا کہ کراچی میں ایک دس منزلہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شکر ہے کہ ہمارے ملک کا کوئی شہر بھی مغربی ملکوں کے شہروں کی طرح ترقی کر رہا ہے۔ یہ محمدی بلڈنگ تھی، کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے ہم محمدی بلڈنگ دیکھنے گئے اور بہت فخر محسوس ہوا۔ کراچی میں آبادی کے ساتھ ساتھ عمارتیں، آبادیاں، اور رعنائیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ ٹریفک میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ کراچی کی چہل پہل ریل پیل میں تبدیلی آ گئی۔

پہلے تو ہاؤسنگ سوسائٹی وجود میں آئی، اس کے بعد بے شمار نئی آبادیوں نے کراچی کے حسن و جمال میں اضافہ کر دیا، لیکن کراچی والوں کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

کراچی کی کشادہ سڑکیں تنگ پڑ گئیں۔ صفائی کا بھی وہ معیار نہیں رہا۔ کراچی میں ہر وقت فرفر چلنے والی ہوا رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ گرمی میں اضافہ ہو گیا۔ پنکھوں کے بعد اے سی بھی لازم ہو گئے۔ درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ساحلِ سمندر پر پہلے جیسی صفائی نہ رہی۔ لوگوں کے ہجوم میں بھی اضافہ ہو گیا۔ کاروں کو شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ نئی نئی کئی منزلہ عمارتیں اور شاپنگ سینٹر بن گئے۔ کراچی ایک ماڈرن شہر بن رہا تھا۔ یہ سب تبدیلیاں ہو رہی تھیں لیکن کراچی کے سکون اور امن و امان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ٹریفک کی بہتات کے باعث شور اور کثافت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا لیکن کراچی ایک پُرامن شہر تھا۔ جہاں لوگ رات کو دس گیارہ بجے سیر و تفریح اور میل ملاقات کے لیے گھروں سے نکلتے اور رات گئے واپس آتے۔ کسی خوف و خطر کے بغیر۔ شادیاں رات کو ایک دو بجے بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتی تھیں۔ زیورات سے لدی پھندی خواتین، زرق برق ملبوسات میں قیمتی کاروں میں آتی تھیں اور رات گئے تک شادیوں کے ہنگاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ نہ کسی کو لوٹے جانے کا ڈر تھا' نہ یہ خوف تھا کہ کار روک کر کوئی تمام زیور اور پرس چھین لے گا۔ کاروں کے چھینے جانے اور لوٹے جانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہم جب کراچی جاتے تو دوست اپنی کاریں ہمارے حوالے کر دیتے اور ہم سارا دن مارے مارے پھرتے تھے۔ سارے راستے یاد ہو گئے تھے۔ کاریں کئی بار مقفل کیے بغیر سڑکوں پر چھوڑ دیتے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ کوئی ایک شیشہ کھلا رہ گیا ہے۔ چوکیدار تو بہت مالدار لوگ ہی رکھتے تھے اور وہ بھی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ اپنی شان و شوکت ظاہر کرنے کے لیے۔ مسلح گارڈز کہیں نظر نہیں آتے تھے، بلٹ پروف کاریں محض ایک افسانہ تھیں۔ سعید ہارون صاحب رات کو (یا صبح کو) تین بجے ہمیں دور دراز آبادیوں میں لے جاتے، چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں مزیدار چائے پلاتے اور پوچھتے، ''کبھی تمہارے لاہور میں تین بجے رات کو ایسی مزیدار چائے مل سکتی ہے؟''

سعید ہارون صاحب کی عادت تھی کہ وہ لاہور پر کراچی کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح کے نظارے دکھاتے اور پوچھتے۔ ''کیا تمہارے لاہور میں ایسا ہوتا ہے؟''

غیر ملکی ہر طرف نظر آتے تھے۔ کراچی کے بعض ہوٹلوں میں بیرونِ ملک سے ڈانسرز آ کر شو کیا کرتی تھیں۔ کراچی میں نائٹ کلب بھی تھے جن میں یورپ اور امریکا کی ڈانسرز رقص کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

ایک بار ہم زیب النساء اسٹریٹ کے نکڑ والے ہوٹل ایکسلیئر میں ٹھہرے۔ وہاں رات کو نائٹ کلب میں رقص ہوتا تھا۔ ہمیں تیسری منزل پر کمرا ملا۔ اس منزل پر ڈانسرز کا بھی قیام تھا۔ یہ خواتین اپنے کمروں کے دروازے بند کرنے کی عادی ہی نہیں تھیں۔ نیم برہنہ اپنے کمروں میں دروازے کھول کر بیٹھی رہتی تھیں یا آپس میں ہنسی مذاق کرتی نظر آتی تھیں۔ ہم تو نظریں بچا کر اپنے کمرے میں جاتے تھے۔ ایک بار گلوکار مسعود رانا سہ پہر کے وقت ملنے آ گئے۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا۔ ''آفاقی صاحب، آپ تو پرستان میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ایک ٹکٹ میں دو مزے۔''

مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ کراچی کس قدر پُر رونق، زندگی سے بھرپور اور محفوظ شہر تھا۔ کہاں وہ کراچی اور کہاں آج کا کراچی۔ جہاں لوٹ مار، ٹارگٹ کلنگ، بھتا وصولی، چوری ڈکیتی، قتل کے واقعات معمول بن چکے ہیں۔ امیر ہو یا غریب، کوئی نہ اپنے گھر میں محفوظ ہے نہ سڑک پر، مسلح



1905ء کراچی کا ہوائی منظر

گارڈز رکھنے والے بھی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ خواتین شام کے بعد تو کیا دن کے وقت بھی گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ غیر ملکی کراچی آنے کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ پرانا کراچی کہیں گم ہو گیا ہے۔ اب یہ شہر نہیں ایک مقتل ہے۔ میدانِ جنگ ہے، روشنیوں کی جگہ اندھیروں نے لے لی ہے۔ خوشیوں اور ہنسی، قہقہوں کی جگہ آہیں، سسکیاں اور نوحے سنائی دیتے ہیں۔ لوگ نئی کار نہیں رکھتے کہ چھین لی جائے گی۔ موبائل فون چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ کوئی پستول دکھا کر نہ چھین لے۔ عورتیں نقلی زیور پہن کر بھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں چونکہ لوٹنے والے جب نقلی زیور پاتے ہیں تو جھنجلا کر گولی مار دیتے ہیں۔ کراچی کہیں کھو گیا ہے، اسے نظر لگ گئی ہے۔ اب یہ عروس البلاد نہیں رہا۔ شہرِ خرابی بن کر رہ گیا ہے۔ حبیب جالب نے سالہا سال پہلے یہ شعر کہا تھا جو آج سچ محسوس ہوتا ہے اور کراچی والوں کی زبانوں پر ہے۔

اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

گلوکارہ مہناز نے تقریباً ایک دہائی تک پاکستان کی فلمی دنیا اور موسیقی کے حلقوں میں راج کیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب وہ مقبول فلمی گلوکارہ تھیں اس وقت بھی پیشہ ور موسیقی سے تعلق رکھنے والے حلقے انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ پاکستان میں ہمیشہ موسیقی پر چند گھرانوں کی حکمرانی رہی ہے۔ جو شخص ان کی برادری، سے باہر ہے اس کو وہ بہت مشکل سے فن کار تسلیم کرتے ہیں۔ خواجہ خورشید انور جیسے مایہ ناز موسیقار کو بھی اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ راگ راگنیوں اور سر تال سے بخوبی واقف تھے بلکہ اس میں مہارت رکھتے تھے اس کے باوجود ''برادری'' والے انہیں باہر کا آدمی سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ وہ نہ گا سکتے ہیں نہ بجا سکتے ہیں تو موسیقار کیسے بن گئے۔ بالآخر خواجہ خورشید انور نے پیشہ ور ہنرمندوں سے بھی اپنے آپ کو منوا لیا اور سب نے بھی خواجہ صاحب کو ایک ہنرمند موسیقار تسلیم کر لیا۔

موسیقار نثار بزمی کو بھی ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے فن کے زور پر خود کو موسیقار تسلیم کرا لیا۔ گلوکاروں میں احمد رشدی، مسعود رانا، محمد علی شہکی، اخلاق احمد، مہناز، ناہید نیازی، سلیم رضا، رونا لیلیٰ وغیرہ کو بھی ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ گلوکارہ مہناز کا شمار بھی ایسے ہی فن کاروں میں کیا جاتا رہا جو ''برادری کے باہر'' والے کہلاتے ہیں۔ اپنی آوز اور گائیکی کی خوبصورتی کے وجود انہیں کافی حسد اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو بعض اوقات ان کے لیے تکلیف دہ بھی تھا لیکن انہوں نے اپنا گلوکاری کا سفر جاری رکھا۔

مہناز کا تعلق ایک مرثیہ خواں خاندان سے تھا۔ ان کا خاندان سات نسلوں سے مرثیہ خوانی اور سوز خوانی کرتا رہا ہے۔ ان کی والدہ کجن بیگم برصغیر کی نامور نوحہ خواں اور سوز خواں تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد بھی وہ اور مہناز محرم کے ایام میں سوز خوانی کی محفلوں میں شرکت کرتی رہیں۔ مہناز کی آواز میں قدرت نے مٹھاس اور سُریلا پن بھر دیا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ گائیکی کی تربیت اپنی والدہ ہی سے

حاصل کی تھی۔ وہ کسی اور کو اپنا استاد تسلیم نہیں کرتی تھیں لیکن ملکہ ترنم نور جہاں کو اپنا روحانی استاد تسلیم کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میڈم نور جہاں جونیئر گلوکاراؤں کے ساتھ ایک فاصلہ رکھنے کی قائل تھیں۔ نئی گلوکارائیں بھی میڈم سے مرعوب رہا کرتی تھیں اور ان کی عظمت اور فن کاری کا احترام کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ذاتی واقعہ بھی سنایا تھا۔ آپ بھی سنیے۔

''ایک بار مجھے میڈم کے ساتھ ایک دوگانا ریکارڈ کرانا تھا۔ گانے میں مجھے ایک مصرعہ ادا کرنا تھا۔ ''میں تمہیں تھپڑ ماردوں گی''، لیکن میں کوشش کے باوجود یہ الفاظ ادا نہیں کرپارہی تھی۔ بار بار گانے کی دوبارہ ریکارڈنگ کی جارہی تھی۔ کوشش کے باوجود جب میں یہ الفاظ نہ کہہ سکی تو مجھے میڈم ایک طرف لے گئیں اور سمجھایا کہ تم سچ مچ تو مجھے تھپڑ نہیں ماررہی ہو، گانا ایک نند اور بھابی پر فلمایا جائے گا۔ تم جھجک کیوں محسوس کررہی ہو۔''

ان کے سمجھانے کے باوجود میں ان کے سامنے یہ الفاظ منہ سے نہ نکال سکی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کاغذ رکھ لیا تاکہ میڈم کو نہ دیکھ سکوں۔ اس طرح وہ گانا ریکارڈ کیا گیا۔''

گلوکاری کے شعبے میں آنے کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ کالج کے زمانے میں مجھے پینٹنگ، مصوری کا شوق تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ میں مصورہ کی بجائے گلوکارہ بن گئی۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ کالج میں ایک بار بزم طلبہ کی جانب سے موسیقی کا ایک مقابلہ ہورہا تھا جس میں کئی کالجوں کی طالبات حصہ لے رہی تھیں۔ ہمارے کالج کی طرف سے جس لڑکی کو حصہ لینا تھا وہ عین وقت پر بیمار ہوگئی۔ اس کی جگہ لینے کے لیے میرا انتخاب کیا گیا لیکن میں شرمیلی اور خاموش طبع لڑکی تھی اس لیے میری ٹیچرز ہچکچارہی تھیں کہ کہیں میں سارا پروگرام ہی خراب نہ کردوں۔ کافی بحث مباحثے کے بعد مجبوراً میرا انتخاب کرلیا گیا کیونکہ کوئی دوسری لڑکی میرے مقابلے میں بہتر نہ تھی۔

گلوکاری کے اس مقابلے میں، میں نے ملکہ ترنم کا ملی نغمہ ''اے وطن کے سجیلے جوانوں، میرے نغمے تمہارے لیے ہیں'' جس وقت میں گارہی تھی اس وقت ہال میں مکمل خاموشی طاری تھی جب میں نے گانا ختم کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

میری خوش قسمتی کہ اس وقت مقابلے میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے میرے گائے ہوئے نغمے اور میری آواز کو پسند کیا اور ریڈیو پاکستان سے گلوکاری کرنے کے لیے منتخب کرلیا۔ ریڈیو میں میری گلوکاری اور موسیقی کی تربیت کا باقاعدہ بندوبست کیا گیا تھا۔ پنڈت غلام قادر میرے استاد تھے۔ وہ شہنشاہ غزل مہدی حسن کے بھائی اور بہت ہنرمند انسان تھے۔ اس زمانے میں مہدی حسن صاحب بھی ریڈیو اسٹیشن آیا کرتے تھے۔ مجھے گاتے ہوئے سن کر انہوں نے مجھ سے کہا ''تم بہت باصلاحیت ہو۔ ریاض کرتی رہنا، ایک دن تم بہت بڑی گلوکارہ بنوگی۔''

ریڈیو پاکستان سے مہناز نے جو پہلا گانا گایا اس کے بول یہ تھے۔

''بولے رے پپیہا''

اس گانے کی موسیقی غلام قادر صاحب نے ترتیب دی تھی۔

مہناز کا گایا ہوا گانا پی ٹی وی کے غزل منیجر امیر امام نے سنا تو اس آواز سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے مہناز کو ٹی وی پر گانے کی پیشکش کی۔ اس وقت ان کی منگنی ہوچکی تھی اور جلد ہی شادی ہونے والی تھی اس لیے ان کے والدین ٹی وی پر ان کے گانے کے حق میں نہ تھے لیکن پھر بعد میں انہوں نے اجازت دے دی۔ اس طرح ان کی گلوکاری کا سفر شروع ہوا۔

یاد رہے کہ ٹی وی پر گانے کے بعد ان کی منگنی ٹوٹ گئی اور شادی کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا اور مہناز تمام عمر غیر شادی شدہ رہیں۔

اسی زمانے میں موسیقار سہیل رعنا کا ٹی وی سے ایک پروگرام ''نغمہ زار'' کے عنوان سے نشر ہوتا تھا۔ انہوں نے اس پروگرام کے لیے چار گانے گائے جن کی دھنیں بھی مسعود رعنا نے ہی بنائی تھیں۔ ''نغمہ زار'' میں مہناز کے گائے ہوئے نغموں نے فلم سازوں کو بھی ان کی طرف متوجہ کردیا۔ مہناز کی آواز میں جو شیرینی اور سُریلا پن تھا وہ سننے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ اس طرح ایک نئی آواز فلمی صنعت میں متعارف ہوئی جس نے فلمی صنعت کے لیے بہت کارنامے سرانجام دیے۔

مہناز 1970ء میں گلوکارہ کی حیثیت سے نمودار ہوئی تھیں تب پاکستان کی فلمی صنعت میں بڑی بڑی نامور ہستیاں موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں اپنا نام اور مقام


اقبال بانو


ناہید اختر


کجن بیگم

پیدا کرلینا بجائے خود ایک کارنامہ تھا۔

ٹی وی پر ان کے نغمے سن کر فلم سازوں کے بھی کان کھڑے ہوگئے اور کئی فلم ساز اور موسیقار انہیں اپنی فلموں میں بطور گلوکارہ پیش کرنے کے خواہش مند ہوگئے۔ موسیقار اے حمید نے انہیں گلوکارہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ مہناز نے استاد نیر حسین سے باقاعدہ کلاسیکی موسیقی کی تربیت حاصل کی۔ ان کی والدہ کجن بیگم نے بھی انہیں راگ راگنیوں سے آگاہ کرایا اور ریاض کرایا۔ اس طرح مہناز نیم کلاسیکی نغمے، ٹھمریاں اور دادرا بھی گانے لگیں۔


مہناز

قدرت نے انہیں ایک نہایت خوبصورت آواز سے نوازا تھا۔ اس پر تربیت اور ریاض نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

مہناز نے گلوکارہ کی حیثیت سے بہت جلد اپنا مقام پیدا کرلیا لیکن صحیح معنوں میں ان کا سنہری دور اس وقت شروع ہوا جب انہیں مہدی حسن کے ساتھ ڈوئیٹ گانے کا موقع ملا۔ ان دونوں کے گائے ہوئے اکثر نغمے لافانی بن گئے۔ مہناز نے ریڈیو، ٹی وی اور فلموں کے لیے کئی یادگار گانے گائے۔ فلموں میں مہناز کا پہلا نغمہ یہ تھا۔

میں جس دن بھلادوں تیرا پیار دل سے
وہ دن آخری ہو میری زندگی کا

پلے بیک سنگر کی حیثیت سے ان کی آخری فلم ''بابو'' تھی جو 2001 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ مہناز نے اپنے دور کے تقریباً تمام نامور موسیقاروں کے ساتھ کام کیا جن میں خواجہ خورشید انور، نثار بزمی، روبن گھوش، ایم اشرف، رشید عطرے، صفدر حسین، نذیر علی، کمال احمد، امجد بوبی جیسے نامور موسیقار شامل ہیں۔ ان کے سپرہٹ گانوں کی تعداد کافی زیادہ ہے، ان کے گائے ہوئے نغمات اس دور کی مقبول ترین اداکاراؤں شمیم آراء، شبنم، زیبا، رانی، بابرہ شریف، نشو اور سنگیتا پر فلمائے گئے۔ انہوں نے مہدی حسن، احمد رشدی، اخلاق احمد، مسعود رانا، اے نیرّ، محمد علی شہکی، عالمگیر، غلام عباس اور دیگر گلوکاروں کے ساتھ ڈوئیٹ گاکر بھی شہرت حاصل کی۔

جب فلموں کا زوال شروع ہوا تو مہناز بھی فلموں سے دور ہوگئیں حالانکہ غزل کے علاوہ ٹھمری، دادرا، خیال، دروپد گائیکی پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ 2001 کے بعد وہ فلمی صنعت کے حالات اور اپنی ناقدری کی وجہ سے کافی دل شکستہ تھیں۔ انہوں نے شکایت کی تھی کہ اتنا کام کرنے کے باوجود پی ٹی وی میں ان کی تصویر آویزاں نہیں کی گئی۔ فلمی حلقوں نے بھی انہیں بھلادیا۔

مہناز اور ناہید اختر بطور گلوکارہ آگے پیچھے ہی فلمی دنیا میں آئی تھیں اور دونوں نے بہت جلد سخت مقابلے کے باوجود اپنی علیحدہ شناخت بنالی تھی۔ ناہید اختر کے ساتھ انہوں نے دوگانے گاکر بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ناہید اختر بھی ایک خوبصورت کھنک دار آواز کی مالک تھیں۔ اس کے برعکس مہناز کی آواز میں مٹھاس، سُریلا پن اور شائستگی نمایاں تھی۔ میڈم نور جہاں سے وہ عقیدت کی حد تک محبت کرتی

تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ملکہ ترنم جیسی گلوکارہ دوبارہ پیدا نہیں ہوگی۔ مہناز میں بطور گلوکارہ ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اشعار اور مصروں کو سمجھ کر ان کے مطابق اپنی آواز اور ادائیگی کا استعمال کرتی تھیں۔ وہ ذاتی طور پر روبن گھوش کے نغمات گاتے ہوئے زیادہ مسرت اور آسانی محسوس کرتی تھیں۔

مہناز کی ایک خصوصیت امیر خسرو کا کلام گانا بھی رہا ہے۔ امیر خسرو کا نیم کلاسکی کلام مہناز کے علاوہ ناہید اختر نے بھی گایا ہے اور خوب گایا ہے اگرچہ دونوں کی آواز اور گائیکی کا انداز مختلف رہا۔ مہناز کا ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ اچھی شاعری ان کی کمزوری تھی۔

مہناز نے بہترین گلوکارہ کی حیثیت سے متعدد اعزازات اور ایوارڈز حاصل کیے۔ ایک بار ازراہِ مزاح انور مقصود نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ پاکستان میں ایک گلوکارہ ایسی بھی ہے جسے ''نشانِ حیدر'' کے سوا تمام اعزاز مل چکے ہیں۔

مہناز کی مصروفیات زیادہ تر لاہور ہی میں تھیں کیونکہ لاہور ہی اردو فلموں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جب فلمی صنعت زوال پذیر ہوئی تو مہناز کو شدت سے یہ احساس تھا کہ انہیں نظر انداز کیا جارہا ہے اور بہت حد تک درست بھی تھا۔ دراصل ان سے گلوکاری کرانے والے قدر دان فلم ساز اور ہدایت کار یا تو فلم سازی کو ترک کر چکے تھے یا دنیا سے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ اپنی تہذیبی تربیت کی وجہ سے وہ ہر ایک کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے ان کا حلقہ بہت محدود یہاں تک کہ غائب ہو کر رہ گیا اور مہناز خود کو لاہور میں اجنبی محسوس کرنے لگیں۔ انہیں شکایت تھی کہ ریڈیو، ٹی وی اور فلموں میں انہوں نے بہت نمایاں کام کیا تھا مگر جب پی ٹی وی لاہور نے کئی گلوکاروں اور گلوکاراؤں کی آواز میں قومی ترانہ ریکارڈ کیا تو انہیں مدعو نہیں کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے لاہور میں بے شمار گانے گائے ہیں مگر اس کے بدلے مجھے ملا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ آج کل کی پوپ موسیقی کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کا شارٹ کٹ ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ نوجوانوں کو سکھا رہی ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ آج کے نوجوانوں میں زیادہ محنت کرنے کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ ملک میں موسیقی کی تربیت دینے کے لیے اکیڈمیاں بھی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو گانے والے سُر اور تال سے واقف نہ ہوں وہ گلوکار کیسے بن سکتے ہیں۔

مہناز گزشتہ پندرہ سال سے ذیابیطس اور دیگر بیماریوں کا مقابلہ کر رہی تھیں مگر اپنے کام کے ساتھ بھی انصاف کر رہی تھیں اس لیے کسی کو پتا نہ چلا کہ وہ کتنی بیمار ہیں۔ وہ علاج کے سلسلے میں امریکا میں مقیم اپنے بھائی کے پاس جاتی رہتی تھیں۔ ان کا انتقال بھی علاج کے لیے لاہور سے امریکا جاتے ہوئے ہوا۔ بحرین کے پاس پہنچ کر ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تو ہوائی جہاز کو بحرین کے ہوائی اڈے پر اتار لیا گیا۔ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے وہ بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ ائرپورٹ کے حکام نے انہیں فوراً اسپتال پہنچایا لیکن اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ وفات پاگئیں۔ پاکستانی سفارت خانے کو اطلاع ملی تو کمرشل اتاشی اسپتال پہنچ گئے مگر پاسپورٹ پر کنیز رضا مہناز کا نام دیکھ کر وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ بعد میں ان کے کاغذات سے ان کی شناخت ہوئی۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ پاکستان کے پریس اتاشی پاسپورٹ پر تصویر اور کنیز رضا مہناز دیکھنے کے بعد بھی ملک کی مایہ ناز گلوکارہ کو نہیں پہچان سکے۔ سفارشی عہدے داروں سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

پاکستان کے فلمی حلقوں میں اظہارِ غم کیا گیا اور سب نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ مہناز نے بے شمار پاکستانی فلموں میں گلوکاری کی ہے جن میں چند قابلِ ذکر فلموں کے نام پیش کیے جارہے ہیں۔

خوشبو، شیشے کا گھر، ناگ اور ناگن، محبت اور مہنگائی، دلہن ایک رات کی، بندش، خوشبو، بازارِ حسن، چوری چوری، آنسو، انمول، بلندی، کبھی الوداع نہ کہنا، امبر، محبت، سلاخیں، آبشار، بلے بوائے اور کندن وغیرہ۔

مہناز نے ہماری فلموں کے لیے بھی گلوکاری کی۔ پرویز ملک کی فلموں میں ان کی آواز کی شمولیت لازمی ہوتی تھی۔ مہناز ایک خوش اخلاق، وضع دار اور شائستہ خاتون تھیں۔ انہیں جب بھی کوئی اپنی گھریلو تقریب میں مدعو کرتا تھا وہ بلا تامل پہنچ جاتی تھیں اور موسیقی کی محفل سجاتی تھیں۔ وہ آخر دم تک ہنس مکھ رہیں۔ ملاقات میں وہ بہت جلد آنے والے کے لیے اپنائیت کا ماحول پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ مشکل سے مشکل گانا اتنی آسانی سے گاتی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی۔ مہناز اس نسل سے تعلق رکھنے والی آخری گلوکارہ تھیں جو کہ اب معدوم ہو چکی ہے۔ ایسی آواز، ایسا ہنر، ایسا رکھ رکھاؤ اور وضع داری اب کہاں۔ مہناز تو رخصت ہوگئیں مگر اپنی



ملکہ پکھراج

آواز اور مسکراہٹ کی یادیں چھوڑ گئیں۔

مہناز کے چند مقبول نغمات پیش ہیں:

1۔ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں

2۔ میں جس دن بھلا دوں تیرا پیار

3۔ او میرے سانوریا بانسری بجائے جا

4۔ میرا پیار تیرے جیون کے سنگ رہے گا

5 پیارِ بنا آدمی کچھ نہیں

6۔ پردہ اٹھا کے جانِ من

☆☆☆

مہناز تو دنیا سے چلی گئیں۔ انہوں نے بہت شہرت اور مقبولیت کمائی لیکن ان کی نجی زندگی پُرسکون نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس کافی تلخیاں اس میں گھلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ والدہ کی وفات کے بعد وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھیں۔ نہ فلمی مصروفیات تھیں نہ وہ لوگ جن کی فلموں میں انہوں نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ صحت کے معاملات کی وجہ سے بھی وہ پریشان رہتی تھیں۔ مالی حالات بھی ناگفتہ بہ تھے۔ امریکا میں مقیم بھائی کے سوا ان کی دست گیری کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

اس ضمن میں دیکھا جائے تو شہرت کی چکاچوند کے پیچھے گلوکاراؤں کی زندگی کافی تاریک ہوتی ہے۔ اس بارے میں معروف شاعرہ اور کالم نگار کشور ناہید نے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ ذرا آپ بھی غور کیجیے اور تصور کیجیے کہ ہر چمکنے والی چیز دراصل سونا نہیں ہوتی۔ آیئے ان کے تاثرات کا بھی جائزہ لیتے ہیں وہ لکھتی ہیں۔

''مہناز کے مرنے نے میرے بہت سے زخم ہرے کردیے ہیں۔ مہناز نور جہاں کے بعد بہت سریلی گانے والی تھیں جس نے خواجہ خورشید انور کو بھی متاثر کیا تھا۔ ایک مدت تک رضا کاظم کے گھر کجن بیگم اور مہناز نوحے، سلام، پرانے گیت اور ٹھمریاں ریکارڈ کراتی رہیں۔ کجن بیگم کے ریکارڈ تقسیم سے پہلے بھی بہت فروخت ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو موسیقی کی خود ہی تعلیم دی تھی۔ نثار بزمی کہا کرتے تھے کہ مہناز جیسے سُر کو سمجھتی ہے ایسا میری کوئی شاگرد نہیں سمجھتی۔ مہناز نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو پڑھایا، ان کی شادیاں کیں اور امریکا میں نوکریاں بھی دلوائیں مگر ان بھائیوں کی انا یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ ان کی بہن گانے والی ہے اس لیے انہوں نے امریکا ہی میں مستقل رہنے کا بندوبست کرلیا۔

یہ کہانی کوئی نئی نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ اقبال بانو نے اپنے بیٹوں کو پڑھایا لکھایا۔ شادیاں کیں اور جب وہ کسی قابل ہوگئے تو اعتراض کرنے لگے اسی ماں کے گانے پر جس نے کمائی کر کے انہیں کسی لائق بنایا تھا۔ پھر انہوں نے بھی غیر ممالک کا رخ کیا، بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی۔ ن کی ایک بیٹی بھی تھی۔ اس کی شادی کی تو داماد گھر داماد بن گیا۔ اس میں وہ شرم محسوس نہیں کر رہا تھا البتہ اقبال بانو کے گانے پر معترض تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کبھی گائیں تو اخبار میں تصویر شائع نہیں ہونی چاہیے۔ وہ دکھیاری گاتی بھی رہیں کہ گھر کا خرچ چلانا تھا۔ مگر ہر ایک سے دست بستہ گزارش کرتی تھیں کہ کہیں یہ خبر شائع نہ ہو، کوئی تصویر شائع نہ ہوجائے ورنہ داماد میرا گلا گھونٹ دے گا۔ وہ تو اتفاق یہ ہوا کہ داماد گردن توڑ بخار میں مبتلا ہوا، مرگیا۔ اب پھر پورے خاندان کا بوجھ اقبال بانو پر ہی رہا۔ بعد میں جب گھٹنوں کی تکلیف زیادہ ہوئی تو انہوں نے گانا ہی چھوڑ دیا۔ لوگوں کو ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' گنگنانا چھوڑ گئیں۔

خواجہ خورشید انور کی وفات کے دن میں اور میڈم نور جہاں اکٹھے بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگیں کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اب مت گایا کرو مگر کیا کروں۔ پہلی تاریخ کو اکبر کو، اصغر کو اور چاروں بیٹیوں کو جیب خرچ دینا ہوتا ہے۔ پھر گھر کا خرچ بھی چلانا ہوتا ہے۔ بس اس لیے ابھی تک گا رہی ہوں۔ بولیں، جب میں منہ میں نوالہ لے جانے لگتی ہوں تو خیال آتا ہے معلوم نہیں میرے بیٹوں نے بھی کھایا ہوگا کہ نہیں۔ کبھی کبھی تو ہنڈیا اٹھا کر ان کے گھر جا کر دے آتی ہوں۔ یہ تھی مامتا میڈم نور جہاں کی کہ جس کے بارے میں لوگ اپنی طرف سے کہانیاں گھڑ کر سنا دیتے ہیں۔

فریدہ خانم نے اپنی بیٹیوں کی شادی بڑی دھوم دھام

سے کی۔ بیٹے کو بھی غیر ممالک میں پڑھایا۔ ان کو بھی ایک مدت تک گانا چھوڑنا پڑا کہ سسرالی طعنے دیتے تھے بیٹیوں کو۔ بیس برس بعد گانا شروع کیا۔ مگر وہ بات کہاں۔ آواز بقول روشن آرا بیگم کے روزانہ ریاض کے بعد ہی ٹھیک رہتی ہے۔ یہ وہی ملکہ موسیقی ہیں جنہیں شوہر کے کہنے پر بھینسوں کے باڑے میں جا کر ریاض کرنا پڑتا تھا کہ شوہر کا حکم تھا کہ آواز باہر نہ جائے۔ یہ وہی ملکہ موسیقی ہیں جن کے نام پر بڑے غلام علی خان کا سر ادب سے جھک جاتا تھا۔ یہ وہی ملکہ موسیقی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ستار کا تار اور روشن آرا کی آواز میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آج جب بھی لالہ موسیٰ سے گزر ہو وہ بہت یاد آتی ہیں۔

اکیلی ملکہ پکھراج تھیں جن کے گانے کو سننے کے لیے ان کے شوہر ادب سے زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور ہمیشہ ملکہ پکھراج کے علاوہ طاہرہ کو اور اپنی نواسی کو بڑی محنت سے اور زبردستی گانا سکھایا۔

ہماری بہت سی گانے والیوں کے سُر پر عاشق ہو کر لوگوں نے شادیاں کیں مگر آصف علی پوتا جیسے موسیقی کے شیدائیوں نے بھی ناہید اختر کو گھر میں بٹھا لیا۔ کہتے یہ ہیں کہ اپنی مرضی سے نہیں گاتیں۔ مگر نفسیات دان کچھ اور کہتے ہیں۔

عابدہ پروین کے شوہر شیخ صاحب چونکہ خود ریڈیو پہ ملازم تھے اس لیے وہ عابدہ کو سندھی اور اردو کلام منتخب کر کے دیا کرتے تھے۔ وہ تو ان کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ عابدہ پروین میں بھی صوفیانہ طرز کے علاوہ ٹھمری اور غزل کی نئی آب و تاب بھی آ سکتی تھی۔ تصور خانم نے بھی کسی زمیندار سے شادی کی تھی۔ کچھ دن کے سکھ چین کے بعد جب شوہر کی اچانک رحلت ہوئی تو تصور خانم کو اپنے بھائیوں کے گھر لوٹنا پڑا اور بھولی ہوئی سنگت کو یاد کرنا پڑا۔

نیرہ نور کا گانا اس لیے سلامت رہا کہ اس کی شادی بھی موسیقی کے شیدائیوں میں ہوئی۔ شوہر کو بھی گانے کا شوق تھا۔ نیرہ نے فلموں کے لیے بہت کم گایا کہ فلم والے دستخط تو دس ہزار کے کرواتے اور دیتے چند ہزار تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اگر مرضی نہ ہو تو کوئی بھی فن چھوڑ دینا ذاتی خواہش ہو سکتی ہے۔ مگر ہم نے دیکھا کہ منور سلطانہ نے گانا چھوڑا کہ ایوب لومانی نے خود ریڈیو میں ہونے کے باوجود ان کا گانا چھڑوا دیا تھا۔ اب کس کس کا نام لوں اور بتاؤں کہ سیاں چوہدری نے کس طرح گانا ترک کیا۔ بلقیس بیگم نے کبھی کبھی گانے پر کیوں انحصار کیا۔ رہ گئی اکیلی ٹینا ثانی جو

بچے کے ذرا بڑا ہونے کے بعد استقامت کے ساتھ اور بہت اچھا گا رہی ہیں۔ ورنہ ایک دو غزلیں گانے کے بعد گل بہار غائب ہو گئیں۔ شاہدہ پروین کے ساتھ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ کافی اور ٹھمری گانے میں ان کا جواب نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ ہماری فنکار خواتین اپنے خاندان کو عزت دلانے کے لیے بہت کام کرتی ہیں۔ جب خاندان زندگی کی معراج پر پہنچ جاتا ہے تو ان کا وہی گانا گھر والوں کو لائقِ عزت نہیں لگتا۔ امیر خسرو کو ناہید اختر اور مہناز نے گا کر امر کر دیا تھا۔ ان کی زندگی میں بہت کٹھن مراحل آئے مگر سب سہہ گئیں۔ آج جب مہناز نہیں ہے تو مجھے اپنی ساری دوستیں یاد آ رہی ہیں۔ جو ہیں ان کو خدا سلامت رکھے۔

کشور ناہید نے اپنے دل کا درد بیان کر دیا ہے۔ دراصل ان کو دکھ اس بات کا ہے کہ وہ فنکارائیں جن کے لاکھوں کروڑوں مداح اور پرستار ہوتے ہیں۔ بظاہر ان کی زندگی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ دولت، شہرت، مقبولیت ان کے قدم چومتی ہے۔ لیکن درحقیقت ان پر کیا گزرتی ہے، یہ کون جانتا ہے؟ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب فن کارہ کو فن کا اظہار کرنے سے ہی روک دیا جائے تو پھر کسی فن کارہ کی بجائے گھریلو لڑکی سے شادی کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ شادی فن کارہ کے فن کو دیکھ کر کی جاتی ہے لیکن پھر اس کو فن کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تو پھر فن کارہ ہی سے شادی کرنا کیا ضروری ہے۔ ناہید اختر اگر شادی کے بعد گانا ہی چھوڑ دیں تو ناہید اختر تو نہ رہیں گی۔ کسی بھی لڑکی سے شادی کی جا سکتی تھی۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ جب تک ضرورت پڑی ان کی کمائی سے عیش کرتے رہے مگر جب خود کسی قابل ہوئے تو ان کا وہی فن باعثِ شرم بن گیا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ خود فن کاراؤں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ گانا تو ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن جاتا ہے اگر ان کو گانے سے ہی روک دیا جائے تو یہ اسی طرح ہے جیسے مچھلی کو پانی کے تالاب سے نکال کر ڈال دیا جائے۔

کشور ناہید ایک اور نامی گرامی گلوکارہ کا تذکرہ کرنا بھول گئیں۔ یہ ہیں زبیدہ خانم، زبیدہ خانم فلمی گلوکارہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہی منظرِ عام پر آئیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ریاض بخاری سے شادی کے بعد گوشہ نشین ہو گئیں۔ پھر ان کی خوبصورت آواز کسی نے نہیں سنی جو گانے گا چکی تھیں وہی اب ان کی یاد دلانے کو رہ گئے ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار گزری، وفادار شوہر،



تابعدار اولاد، ہر طرح کا سکھ اور آرام لیکن گانا گانے سے محروم۔ سمجھیے کہ ان کی آواز دل میں گھٹ کر ہی رہ گئی۔

میڈم نور جہاں نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب اداکار اعجاز سے شادی کی تو اداکاری چھوڑ دی۔ زندگی کا رہن سہن تبدیل کر لیا بلکہ خود کو ہی بدل لیا۔ انہوں نے اعجاز سے التجا کی تھی کہ ان کو گلوکاری سے نہ روکا جائے۔ گانا ان کی زندگی ہے لیکن اگر اعجاز منع کریں گے تو وہ گانا بھی چھوڑ دیں گی۔ اعجاز نے انہیں گلوکاری سے نہیں روکا۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر اعجاز سے شادی کے بعد وہ گلوکاری چھوڑ دیتیں تو ہم اور آپ کتنے بڑے موسیقی کے خزانے سے محروم رہ جاتے؟

☆☆☆

پاکستان کے نامور اور بہترین حقیقی اداکاری کرنے والے فن کار آغا طالش نے فلمی صنعت سے وابستہ ہونے سے پہلے اور بھی بہت سے کام کیے لیکن ان کی آخری منزل اداکاری تھی۔ اتنے باصلاحیت اداکار نے اوکار بننے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ایسے فن کاروں کو یاد رکھنا اور انہیں نئی نسل سے متعارف کرانا بہت ضروری ہے۔

آغا طالش کا پورا اصلی نام آغا عباس علی طالش تھا۔ عام تصور کے برعکس وہ پشاور میں نہیں، مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں 15 نومبر 1924ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق ایران سے تھا۔ گھر میں فارسی بولی جاتی تھی اس لیے آغا طالش بھی بڑی روانی سے فارسی بول سکتے تھے۔ ان کے والد پولیس میں افسر تھے اور مختلف شہروں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

آغا طالش نے یو پی کے شہروں متھرا اور میرٹھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی جہاں ان کے والد سرکاری فرائض سرانجام دینے کے لیے تعینات کیے گئے تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے بمبئی میں ایک سول گزیٹڈ آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ سرکاری ملازمت ان کے مزاج کو راس نہیں تھی۔ ان کا رجحان فنونِ لطیفہ، خصوصاً فلمی صنعت کی طرف تھا۔

بمبئی میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ان کی مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اتفاق سے اداکار سریش (جو پاکستان بھی آئے تھے) ان کے پڑوسی تھے۔ دونوں ہم عمر تھے اس لیے بہت جلد دوستی کے رشتے میں بندھ گئے۔ سریش کے ساتھ وہ فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے فلم اسٹوڈیوز جانے لگے۔ آغا طالش بذاتِ خود ایک خوبرو اور خوش گفتار انسان تھے۔ سرخ و سفید رنگت، متناسب نقوش، بڑی بڑی آنکھیں، وہ بہت خوش لباس اور خوش گفتار بھی تھے۔ مطالعے کے شوقین ہونے کی وجہ سے معلوماتِ عامہ پر دسترس رکھتے تھے اور مختلف موضوعات پر روانی سے گفتگو کرتے تھے۔

بمبئی میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے فلم ساز اور ہدایت کار منور ایچ قاسم ان دنوں ''سراج'' کے نام سے ایک فلم بنا رہے تھے جس میں سریش مرکزی کردار ادا کر رہے تھے، اس طرح آغا طالش کے دل میں فلموں کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ سرکاری ملازمت ان کی طبیعت کو راس نہیں تھی اس لیے وہ گزیٹڈ افسر کی ملازمت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔

آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں وہ ریڈیو آرٹسٹ کے طور پر کام کرنے لگے۔ اداکاری ان کا پسندیدہ شعبہ تھا جس میں انہیں بہت راحت ملتی تھی۔ اس دوران میں ان کی ملاقات ادبی حلقوں میں سرگرم لوگوں سے بھی ہو گئی اور بمبئی کے ادبی حلقوں میں بھی ان کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں ان کی ملاقات بمبئی کے مختلف ادیبوں اور شاعروں سے رہتی تھی جن میں اردو کے مایۂ ناز افسانہ نگار کرشن چندر بھی شامل تھے۔ اپنی شگفتہ مزاجی کے باعث طالش کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہو گئی۔ کرشن چندر نے اس زمانے میں ایک فلم ''سرائے کے باہر'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فلم کرشن چندر کی پہلی اور آخری فلم ثابت ہوئی۔

سرائے کے باہر، کے لیے اداکاروں کا انتخاب کیا جارہا تھا۔ طالش کا بھی انٹرویو لیا گیا اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔ ان کا انتخاب ایک اہم کردار کے لیے کرلیا گیا۔

یہ فلم 1945-46ء میں بنائی گئی تھی۔ طالش کی اداکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 35 امیدواروں میں سے ان کا انتخاب کیا گیا تھا اور پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی جو کہ اس زمانے میں بہت معقول مشاہرہ تھا۔

کرشن چندر اس فلم کے ہدایت کار اور ڈی سی دت اس کے موسیقار تھے۔ طالش نے اس فلم میں ولن کا کردار ادا کیا تھا۔ سینا دیوی اس فلم کی ہیروئین تھیں۔ رقاصہ ککو بھی کاسٹ میں شامل تھیں۔ یہ فلم 1947ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کو زیادہ کامیابی تو حاصل نہ ہوسکی لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کو بہت سراہا گیا تھا۔ لیکن اس فلم کو کلاسیکی فلموں کی فہرست میں شامل کرلیا گیا جن پر بالی وڈ فخر کرتا ہے۔ اس فلم میں کام کرتے ہوئے انہیں نہ صرف کرشن چندر جیسے قلم کار سے سیکھنے کا موقع ملا بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا۔ سب سے اہم بات یہ کہ طالش نے مستقبل میں اپنے لیے اداکاری کے شعبے کا انتخاب کرلیا۔

فلم ''سرائے کے باہر'' کے بعد طالش کو اچھا موقع نہیں ملا۔ ملک کی تقسیم کی وجہ سے کشیدگی اور فسادات کی فضا پیدا ہوگئی تھی اس لیے آغا طالش نے بھی رختِ سفر باندھا اور پاکستان کا رخ کیا۔ پاکستان آنے پر آغا طالش اور ان کے گھر والوں نے پشاور میں رہائش اختیار کی کیونکہ پشاور میں ان کے کچھ اور رشتے دار بھی رہتے تھے۔ پشاور آکر طالش اپنے مستقبل کے بارے میں منصوبے بنانے لگے۔ کوئی اور کام تو تھا نہیں، نفسا نفسی کا عالم تھا مگر پشاور میں ریڈیو اسٹیشن تو موجود تھا اور آغا طالش کو ریڈیو کا بہت اچھا تجربہ تھا۔ پشاور کے ریڈیو اسٹیشن میں انہیں ڈراما سیکشن میں رکھ لیا گیا اور وہ یہاں بھی بمبئی کی طرح اسٹاف آرٹسٹ بن گئے۔ پشاور ریڈیو سے ان کا تبادلہ آزاد کشمیر اور پھر لاہور ہوگیا۔ لاہور میں طالش کو اپنے مطلب کا ماحول میسر آیا اور ان کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہوگیا جن میں شاعر، ادیب، فلموں کے شوقین اور مستقبل کے فلم ساز اور ہدایت کار شامل تھے۔ ریڈیو سے اس زمانے میں سازندے، موسیقار اور اداکار، فلمی صنعت میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ میکلوڈ روڈ کی ایک عمارت کے تہ خانے میں کئی نوجوان اور منصوبے بنانے والے لوگ اکٹھے ہوا کرتے تھے جن میں موسیقار، شاعر، فلم ساز مصنف اور صحافی بھی شامل تھے۔ اس تہ خانے کے ٹھکانے کو ''ڈین'' کہا جاتا تھا۔ دوستوں کی محفلیں سجتی تھیں۔ جس کسی کو وقت ملتا تھا وہ ''ڈین'' میں حاضری ضروری دیتا تھا۔

لاہور میں انہوں نے جس پہلی فلم میں کام کیا اس کا نام ''نتھ'' تھا۔ یہ فلم 1952ء میں ریلیز ہوئی اور ناکام ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستانی فلمیں سرمائے، جدید آلات اور ہنرمندوں کی کمی کے باعث ابتدائی مرحلے میں تھیں اور کامیابی انہیں نصیب نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے فلم ''وفا'' اور ''چندا'' میں بھی کام کیا لیکن یہ فلمیں مکمل نہ ہوسکیں لیکن فلم ''وفا'' کے دوران ان کی ملاقات ہدایت کار لقمان سے ہوگئی جو کہ ایک طویل دوستی بن گئی۔ بعد میں طالش نے لقمان صاحب کی کئی فلموں میں کام کیا۔

1955ء میں انہوں نے فلم ''جھیل کنارے'' میں کام کیا۔ سدھیر اس فلم کے ہیرو، اور گلشن آرا ہیروئین تھیں۔ یہ فلم بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی۔ انہوں نے ہدایت کار ایم صادق کی فلم ''دیارِ حبیب'' میں یاسمین کے ساتھ کام کیا۔ اس فلم کے موسیقار حسن لطیف ملک تھے جو ان کے ''ڈین'' کے ساتھیوں میں بھی شامل تھے۔ کامیابی ابھی تک طالش سے دور ہی تھی۔

صحیح معنوں میں آغا طالش کی کامیابیوں کا آغاز پنجابی فلم ''جبرو'' سے ہوا تھا۔ یہ ایک ڈاکو کی کہانی تھی۔ فلم میں یاسمین کے ساتھ اداکار اجمل کے چھوٹے بھائی نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اکمل کو اس فلم کی نمائش کے بعد ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ سدھیر جیسے اداکاروں کے ہوتے ہوئے وہ پنجابی فلموں کے سپر اسٹار اور ضرورت بن گئے۔ اکمل نے فلموں میں میک اپ مین کی حیثیت سے آغاز کیا تھا۔ فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا نے انہیں سب سے پہلے اپنی فلم میں ایک چھوٹا سا کردار دیا تھا مگر ان کی شہرت کا آغاز ''جبرو'' سے ہوا۔ آغا طالش نے اس فلم میں ویلن اور کامیڈین کا ملا جلا کردار ادا کیا تھا اور پہلی بار ایک کامیاب اداکار کی حیثیت سے وہ سامنے آئے تھے۔ اس کے بعد طالش کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوگیا۔ ہدایت کار اشفاق ملک کی سپر ہٹ فلم ''باغی'' میں انہوں نے ویلن کا کردار ادا کیا۔ سدھیر اور مسرت نذیر اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔


اور دورِ حاضر کا کراچی



یہ بہت کامیاب فلم تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ''سہتی'' اور ''سردار'' میں کام کیا۔ ''سردار'' میں مرکزی کردار سنتوش کمار اور صبیحہ خانم نے ادا کیے تھے۔

آغا طالش نے سیف الدین سیف کی فلم ''سات لاکھ'' میں ایک شرابی کا کردار ادا کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ شرابی کی حیثیت سے ان پر ایک گانا فلمایا گیا تھا جس کے بول یہ تھے۔

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

اس فلم میں ان کی اداکاری سے لوگ فلم ''داغ'' کے دلیپ کمار کے کردار کے موازنہ کرتے تھے، اس فلم کے ہدایت کار جعفر ملک تھے۔

آغا طالش اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں کے کامیاب اور مقبول اداکار تھے۔ انہیں عموماً ویلن یا کیریکٹر ایکٹر کی حیثیت دی جاتی تھی اور وہ اپنے ہر کردار میں نپی تلی اداکاری سے جان ڈال دیا کرتے تھے۔

ہدایت کار خلیل قیصر اور مصنف ریاض شاہد کی فلموں ''شہید'' اور ''فرنگی'' میں انگریزوں کے یادگار کردار ادا کیے اور داد حاصل کی۔ اس زمانے میں علاؤالدین بھی کیریکٹر ایکٹر تھے۔ دونوں ذاتی زندگی میں بہت بے تکلف دوست بھی تھے مگر فلموں میں ان کی اداکاری کا موازنہ ضرور کیا جاتا تھا۔ علاؤالدین اپنے کردار میں ڈوب کر جذباتی ہوجایا کرتے تھے مگر طالش اپنا ہر کردار سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر ادا کرتے تھے اور ہر کردار کے ساتھ مکمل انصاف کرتے تھے۔

آغا طالش نے اس کے بعد کئی کامیاب اور معیاری فلموں میں کام کر کے شہرت پائی۔ فلم ساز کی حیثیت سے ہماری پہلی فلم ''کنیز'' میں بھی وہ ایک خاندانی رئیس کے کردار میں موجود تھے اور ان کے اس کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

طالش عملی زندگی میں ایک خوش لباس، شائستہ اور بااخلاق انسان تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں وہ محفل کی جان سمجھے جاتے تھے۔ فوٹوگرافی اور شکار ان کے شوق تھے۔ ان کے پاس ایک جیپ کار بھی جو وہ کار اور شکار دونوں مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے جس فلم میں بھی کام کیا فلم بینوں اور ہدایت کاروں کے دل موہ لیے۔ ضیاء سرحدی نے پاکستان آکر فلم رہگزر، بنائی تھی۔ وہ طالش کی شخصیت اور اداکارانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اگلی فلم ''آخرِ شب'' میں طالش کی اداکاری کے سحر میں گرفتار ہو کر انہوں نے ان کے کردار میں کافی اضافہ کردیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ فلم مکمل نہ ہوسکی تھی۔

آغا طالش نے اپنے وقت کے تمام ممتاز اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا۔ وہ ہر حلقے میں مقبول تھے۔ ان کا دامن ہمیشہ اسکینڈلز سے پاک رہا۔ سبھی ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی ذاتی خوبیوں کے معترف تھے۔

آغا طالش بے مثال اداکار تھے لیکن انہوں نے کبھی معاوضہ بڑھانے یا فلم سازوں کو تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر حال میں مست اور مگن رہنے والے انسان تھے۔

فلم سازوں سے مکمل تعاون کرتے تھے۔ جو فلم ساز معاوضہ ادا کرنے سے معذور تھے ان کی فلموں میں کسی معاوضے کے بغیر کام کرتے تھے اور کسی کو علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ معاوضے کے بغیر کام کررہے ہیں۔ جن لوگوں کو فلم سازی یا ہدایت کاری کا پہلا موقع ملتا تھا طالش ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

آغا طالش محفل آرائی کے قائل تھے۔ شاہ نور اسٹوڈیوز کے ایک سرسبز درختوں سے گھرے ہوئے لان میں سید شوکت حسین رضوی نے انہیں ایک ہٹ بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ فارغ اوقات میں وہ اسی کٹیا میں پائے جاتے تھے۔ یہ ان کا دفتر بھی تھا، ٹھکانا بھی تھا اور تفریح کا مرکز بھی تھا۔ دوست احباب اور فلم ساز انہیں وہیں تلاش کرنے جاتے تھے۔ جہاں وہ ہر ایک کی مہمانداری کرتے تھے۔ ایک چھوٹے قد کے اداکار ان کے سیکریٹری کے طور پر بھی کام کرتے تھے اور دوست بھی تھے۔ ان کی کوتاہ قامتی کے باعث طالش نے ان کا نام ''پوا'' (یعنی ایک پاؤ) رکھ دیا تھا۔ ان کی کٹیا میں دوستوں کا جمگھٹا اور ہنسنے ہنسانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

آغا طالش دوستوں کے دوست تھے اور دوست کی خاطر کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔ ہماری فلم ''کنیز'' میں انہوں نے کام کیا تھا۔ یہ بے حد اہم کردار تھا کیونکہ ہر منظر میں وگ، ڈاڑھی، مونچھ لگانی لازمی تھی۔ وہ عادت کے مطابق مقررہ وقت پر میک اپ کر کے اور لباس پہن کر آجاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں فلاں دفتر میں ہوں، جب ضرورت ہو بلالینا۔ حالانکہ دوسرے اداکار اس بات سے شاکی رہتے تھے کہ ان کو بلا تو لیا جاتا ہے مگر شوٹنگ دیر سے کی جاتی ہے۔ وحید مراد اور طالش دو ایسے فنکار تھے جنہوں نے کبھی اس طرح کی شکایت نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں تو اپنی ڈیوٹی دینی ہے۔ ہدایت کار کو جب ضرورت ہوگی وہ سیٹ پر بلالے گا۔ معاوضہ طے کرتے وقت ہم نے ان سے پوچھا تو بولے ''میرا معاوضہ تو باٹا کے جوتوں کی طرح فلم والوں نے مقرر کر رکھا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ تم بھی وہی دے دینا۔''

ہم نے پوچھا ''آپ قسطوں میں معاوضہ لیں گے یا یکمشت؟''

جواب دیا۔ ''یکمشت دو گے تو کسی کام آجائے گا۔ مجھے تم پر بھروسا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''بہت شکریہ۔''

ساری فلم کے دوران میں انہوں نے صرف ایک بار پوے صاحب کو چٹ لکھ کر بھیجی تھی کہ آفاقی، انہیں ایک سو روپے دے دو۔''

ہم نے سو روپے پیش کر دیے۔

فلم ختم ہوگئی۔ ریلیز کا وقت آیا تو ہم نے سب کو ڈھونڈا اور معاوضے ادا کیے۔ طالش نے نئے نوٹ اکٹھے دیکھ کر ہمیں گلے لگالیا بلکہ گود میں اٹھا کر پیار بھی کیا اور فلم کی کامیابی کی دعائیں کیں۔ اس کے بعد ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

''آغا صاحب یہ کیا ہے؟''

''بھئی تم سے ایک بار سو روپے منگائے تھے نا۔''

ہم ہنس پڑے ''ارے چھوڑیں یہ حساب کتاب' پیسے جیب میں رکھیں۔''

کہنے لگے۔ ''یہ بات غلط ہے۔ دیکھو میاں، حساب سوسو، بخشش سوسو۔''

ہم نے کہا۔ ''تو پھر بخشش سمجھ کر رکھ لیں۔''

بولے ''بخشش کے تو تم حقدار ہو۔ اتنی اچھی فلم بنائی ہے۔''

اور سو روپے کا نوٹ ہماری جیب میں ٹھونس دیا۔

آغا طالش کے ساتھ ہمارا بہت زیادہ اور بہت اچھا وقت گزرا۔ ایک بار ہم نے ان سے طویل انٹرویو لینے کا کہا تو وہ ٹال گئے، بولے ''تم جانتے ہو کہ میں انٹرویو نہیں دیتا۔''

''مگر انٹرویو نہ دینے کی قسم تو نہیں کھائی ہے۔ اور پہلی بار ہم نے کچھ مانگا ہے۔'' مگر وہ رضامندہ نہ ہوئے۔

اس وقت ہم ان ہی کے گھر میں بیٹھے تھے۔ لیلیٰ دوسرے کمرے میں بھابی سے باتیں کررہی تھیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا وہ نہ مانے۔

ہم نے کہا۔ ''آغا صاحب سن لیجیے۔ اگر انٹرویو نہیں دیں گے تو ہماری دوستی ختم۔''

ہنسنے لگے۔ ''ارے میاں' دوستی انٹرویو سے مشروط نہیں ہوتی۔''

ہم ضد کرتے رہے اور وہ انکار یہاں تک کہ ہم روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا' خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔ مگر چائے تو پی لو۔''

''شکریہ' چائے تو ہر جگہ مل جاتی ہے۔''

ہم غصے میں اٹھ کر آگئے۔ وہ ہنستے رہے اور ہمیں پکارتے رہے۔



نشاط سینما کی ایک یادگار تصویر

ہم نے جب اچانک لیلیٰ سے کہا کہ چلو، ہم جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گئیں۔

''میں چائے تو پی لوں۔''

''اس گھر کی چائے ہم نہیں پئیں گے۔''

بھابی حیران رہ گئیں مگر ہم لیلیٰ کے ساتھ وہاں سے چلے آئے۔

اس کے بعد کافی عرصے تک ہم روٹھے رہے۔ ملاقات کا اتفاق بھی نہ ہوا۔

کچھ عرصے بعد ایک شادی میں ملے تو ہنس کر گلے لگالیا۔ ''ارے میاں، یہ نہ میرا گھر ہے نہ تمہارا۔ یہ تو شادی گھر ہے، چلو آؤ گلے ملو۔''

ہم بھی شکایت بھول کر اُن کے گلے لگ گئے اور اس طرح ناراضی دور ہوگئی۔

آغا صاحب بہت صحت مند انسان تھے مگر عمر کے آخری حصے میں بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔ فلم والوں سے دل برداشتہ ہوکر گھر میں بیٹھ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے صحت خراب رہنے لگی یہاں تک کہ اسپتالوں تک نوبت پہنچ گئی حالانکہ زندگی بھر انہوں نے کبھی سر درد کی گولی بھی نہیں کھائی تھی۔ فلم والے انہیں بھول گئے تھے۔ پرانے دوست رہے نہیں تھے۔ کافی عرصے بیمار رہنے کے بعد فروری 1998ء میں وفات پاگئے۔

آغا طالش ایک یادگار ہستی تھے۔ افسوس کہ فلم والوں اور زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ان کا بیٹا احسن طالش آج کل ٹی وی پروڈیوسر ہے۔ آغا صاحب کے بہت سے لطیفے یاد آرہے ہیں۔ ایک واقعہ آپ بھی سنیے۔ ان کی شادی ہوئی تو دوستوں کا ایک ہجوم ٹرین کے ذریعے پشاور گیا۔ واپسی میں بھی ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی بیگم بھی ریڈیو میں ان کے ساتھ کام کرتی رہی تھیں اور یہ پسند کی شادی تھی۔ کچھ عرصے بعد ایک دن کوئی ان کے گھر کے دروازے پر ایک نوزائیدہ بچی چھوڑ کر چلا گیا۔ صبح اٹھ کر آغا صاحب نے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ دوستوں نے بہت مذاق اڑایا اور بھابی سے کہا کہ ذرا تحقیقات کرلیں کہ یہ معاملہ گڑبڑ تو نہیں؟ وہ بھی ہنس کر ٹال گئیں۔

اس بچی کو آغا صاحب اور بھابی نے اپنی حقیقی بیٹی کی طرح پالا پوسا اور دھوم دھام سے اس کی شادی کی۔ وہ حقیقی

بیٹی کی طرح اس سے پیار کرتے تھے۔

واقعات تو بہت ہیں کچھ بیان بھی کیے جاچکے ہیں، یہ تحریر ان کی سالگرہ اور برسی کے موقع پر لکھی جارہی ہے۔

☆☆☆

چکرم بھی کوئی نام ہے؟ لیکن یہ نام پاکستان کی فلمی صنعت کے حوالے سے ایک ایسا نام ہے۔ جس نے اپنی جوانی بلکہ ساری زندگی فلمی صنعت اور اداکاری کی نظر کردی۔ جب ہم صحافی تھے چکرم اس وقت بھی فلمی نگار خانوں میں نظر آتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں نوجوان اور اسمارٹ تھے حالانکہ ان کی جوانی کے بارے میں ان کے دوست کہتے ہیں کہ چکرم جوان کب تھے؟

اس سلسلے میں ایک پرانا لطیفہ سن لیجیے۔ ظہیر کاشمیری بہت ہی عالم فاضل تھے۔ انگریزی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔ نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ تنقید نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ سرخ و سفید رنگ، ستواں چہرہ، سر اور ڈاڑھی کے سرمئی بال۔ ان کے بال لمبے لمبے پٹوں کی صورت میں شانوں پر سجے رہتے تھے، ان کی ڈاڑھی فرنچ کٹ تھی۔ اس زمانے میں اس انداز کی ڈاڑھی خال خال ہی نظر آتی تھی۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کا بہت چرچا اور رعب تھا۔ وہ واحد آدمی تھے جو سعادت حسن منٹو کو صرف منٹو کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ دونوں بے تکلف دوست بھی تھے۔ یہ دوستی امرتسر سے چلی آرہی تھی۔ ظہیر کاشمیری اپنے بالوں اور سرخ و سفید چہرے سے میچ کرنے والے گہرے رنگوں کا لباس پہنتے تھے مثلاً گہری نیلی پتلون، پیلی قمیص، سرخ ٹائی، کسی گہرے رنگ کا کوٹ، وہ مجسم ٹیکنی کلر کہلاتے تھے۔ انہوں نے بھی نہ تو اپنی وضع بدلی نہ ہی لباس اور نہ ہی طور طریقے۔ بہت زیادہ علم ان کے پاس تھا جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔ ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی۔ بہت اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ہم ہمیشہ یہ افسوس کرتے رہے ہیں کہ سیف الدین سیف اور ظہیر کاشمیری جس پائے کے شاعر تھے انہیں اتنی شہرت اور وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حقدار تھے۔ ظہیر کاشمیری کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے۔

ہمیں پتا ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔

ضیاء سرحدی کی شاہکار فلم ''ہم لوگ'' اسی ایک شعر کی تفسیر تھی۔

ظہیر کاشمیری کے والد ایک ریٹائرڈ پولیس والے تھے۔ پرانے زمانے اور پرانے خیالات کے بزرگ تھے۔ یہ تو جانتے تھے کہ بیٹا صبح جاکر رات گئے واپس لوٹتا ہے مگر اس کی ادبی حیثیت سے بے خبر تھے۔ بیڈن روڈ پر ان کی رہائش تھی۔

ایک بار چند نوجوان ایک ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے ظہیر صاحب کے گھر آگئے۔ ظہیر صاحب حسبِ معمول گھر میں موجود نہیں تھے۔ والد بزرگوار سے ملاقات ہوئی۔ نوجوانوں نے درخواست کی کہ ہمارا یہ دعوت نامہ ظہیر صاحب کو ضرور پہنچا دیجیے گا۔

والد نے دریافت کیا (یہ گفتگو پنجابی میں ہوئی)

''ظہیر سے آپ کو کیا کام ہے؟''

''جی ایک ادبی سیمینار اور مشاعرے میں انہیں مدعو کرنا ہے۔''

''ان چیزوں سے ظہیر کا کیا سروکار ہے۔''

''وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے بغیر مشاعرے میں رونق نہیں ہوگی۔''

''اچھا...!'' والد صاحب نے حیرت سے کہا ''ظہیر شاعری کرتا ہے، اچھا اس کا کوئی شعر سناؤ۔''

ایک نوجوان نے سنایا۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیر انہیں اجالا ہے

والد نے منہ بنا کر کہا ''جھوٹ، بالکل جھوٹ۔''

انہوں نے دوسرا مصرعہ سنایا۔

جوان تھے تو ستارے شکار کرتے تھے

والد بول پڑے ''یہ اس سے بھی بڑا جھوٹ ہے، وہ کب جوان تھا؟''

معاف کیجیے۔ بات سے بات نکل آئی۔ دراصل تذکرہ تھا چکرم صاحب کا۔ ہم نے انہیں کبھی جوان نہیں دیکھا۔ جوانی میں بھی وہ تھوڑے تھوڑے بوڑھے نظر آتے تھے۔ اب بڑھاپا آیا تو زیادہ بوڑھے نظر آتے ہیں مگر جوش جذبہ وہی پہلے جیسا ہے۔

چکرم کو اداکاری سے عشق رہا ہے۔ یہ عشق آج بھی بدستور قائم ہے۔ ہنس مکھ، فقرہ باز اور انتہائی خوش اخلاق انسان ہیں۔ بے تکلفی کے ساتھ چھوٹے بڑے کا لحاظ ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

''چکرم'' کے نام سے ہی سب ان کو جانتے ہیں لیکن

ان کا اصلی نام سید ظلِ حسنین رضوی ہے۔ ''چکرم'' کا فلمی نام انہوں نے خود اختیار کیا یا کسی فلم ساز نے منتخب کیا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ چکرم ہر طرح کے کردار کر چکے ہیں۔ سنجیدہ، المیہ، مزاحیہ ہر قسم کے کردار وہ بخوبی ادا کرتے ہیں۔ ان کے حساب اور بیان کے مطابق وہ اب تک اردو اور پنجابی کی بارہ سو فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ یہ غالباً ایک ریکارڈ ہے جس کا گنیز بک آف ریکارڈز میں تذکرہ ہونا چاہیے۔

چکرم کو فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ جب بھی لاہور آتے تو شاہ نور اسٹوڈیو میں سید شوکت حسین رضوی کے پاس حاضری ضرور دیتے تھے جو ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہیں ایک بار مشتاق زیدی سے ملاقات ہوئی جو ''یاراں نال بہاراں'' بنا رہے تھے۔ اس فلم میں اکمل اور فردوس مرکزی کردار تھے۔ منور ظریف اور رنگیلا جیسے کامیڈین بھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ان کی مادری زبان اردو تھی اور پنجابی سے وہ ناآشنا تھے۔ اتنے کم وقت میں پنجابی سیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔ ہدایت کار مشتاق زیدی نے مشورہ دیا کہ تم فلم میں گلابی پنجابی بولو اور کوئی ایک تکیہ کلام ضرور اپناؤ۔ اس فلم میں چکرم کا نام مرلی شاہ تھا۔ اس سے پہلے شباب کیرانوی کی فلم ''وطن کا سپاہی'' ریلیز ہوگئی مگر جس فلم میں انہوں نے پہلی بار کام کیا وہ ''یاراں نال بہاراں'' ہی تھی۔

چکرم نے شباب کیرانوی اور ان کے بیٹوں نذر شباب اور ظفر شباب کی تقریباً ہر فلم میں کام کیا ہے۔ کیمرا مین اور ہدایت کار اے حمید ان سے بہت محبت کرتے تھے بلکہ کافی عرصے تک وہ اے حمید کے ساتھ ہی رہے ہیں۔ ''وطن کا سپاہی'' ان کی طرح رفیع خاور ننھا کی بھی پہلی فلم تھی۔ اس میں انہوں نے ایک کریانہ مرچنٹ مرزا صاحب کا کردار کیا تھا۔ شوکت حسین رضوی کی ''عاشق'' جلوہ، دلہن رانی کے علاوہ شیون رضوی کی فلم ''میری زندگی ہے نغمہ'' میں انہوں نے مسٹر زلہ کا مزاحیہ کردار کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ انہوں نے سنگیتا کے ساتھ بھی کام کیا اور ان کی فلموں سوسائٹی گرل، مجھے گلے لگالو، تیرے میرے سپنے، لاڈ پیار اور بیٹی میں بھی ان کے دلچسپ کردار تھے۔ انہوں نے بے شمار ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ فلمی زندگی کا آغاز انہوں نے 1964ء میں کیا تھا۔

پاکستان کے قریب قریب تمام اداکاروں، ہیروئنوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ انہوں نے کام کیا ہے۔ ہماری

ایف آئی آر

First Information Report(FIR)

اس سے مراد وہ ابتدائی اطلاع ہوتی ہے جو متعلقہ پولیس کو کسی جرم کے سرزد ہونے پر دی جاتی ہے۔ یہ اطلاع دونوں صورتوں میں (تحریری اور زبانی) ہوسکتی ہے لیکن آج کل زبانی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ایف آئی آر کے لیے ضروری ہے کہ وہ

1۔ کسی قابل دست اندازی پولیس جرم کے بارے میں ہو۔

2۔ اگر انچارج تھانہ کو زبانی اطلاع دی جائے تو انچارج خود یا اپنی نگرانی میں اسے تحریر میں لائے گا۔

3۔ یہ تحریر اطلاع کنندہ کو پڑھ کر سنائی جائے، اور وہ اس پر دستخط کرے۔

4۔ اس کے اصل مواد کا اندراج تھانے کے پاس مقررہ فارم میں رکھی ہوئی کتاب میں ہونا چاہیے۔

5۔ ٹیلی فون پر پیغام جو پولیس قلمبند کرتی ہے ایف آئی آر متصور نہیں ہوتا بلکہ جو بیان شکایت کنندہ نے بعدازاں پولیس کے روبرو دیا ہوا سے ایف آئی آر سمجھا جائے گا۔

ایف آئی آر کے غلط لکھے جانے یا ناقص ہونے کی صورت میں مجرموں کو فائدہ ہوتا ہے اور وہ سزا کے شکنجے سے بچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایف آئی آر لکھواتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جائے جو مجرموں کو فائدہ نہ پہنچاسکیں۔ قابل دست اندازی جرم کے معاملے میں پولیس ایف آئی آر لکھنے سے انکار نہیں کرسکتی۔

مرسلہ: انسپکٹر نعیم خان، لالیاں

فلموں میں بھی انہوں نے اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ان کی فلموں کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے۔ وہ فلموں کی شوٹنگ کے لیے بیرونِ ملک بھی جا چکے ہیں۔

انہوں نے ٹی وی پر بھی کام کیا۔ 1966ء میں ننھا نے انہیں ایک لائیو پروگرام میں پیش کیا تھا۔ کئی ڈراما سیریلز میں انہوں نے کام کیا۔ الف لیلہ سیریز کی 75 اقساط میں بھی انہوں نے کام کیا اور پسند کیے گئے۔

چکرم نے پاکستان کے سبھی ممتاز اور نامور اداکاروں کے ساتھ کام کیا ہے اور سبھی ان کو پسند کرتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ اسلم پرویز کو وہ آج تک "پرنس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وحید مراد اور ندیم کے علاوہ محمد علی بھی ان پر مہربان رہے۔ دوسرے نامور کامیڈین بھی ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے۔ انہوں نے سدھیر صاحب کا ایک واقعہ سنایا۔ وہ جنگجو ہیرو اور بہت بارعب انسان تھے مگر چکرم سے بے تکلف تھے۔ ایک بار انہوں نے پوچھا "یار چکرم، تمہارے چہرے پر ہر وقت اطمینان اور سکون نظر آتا ہے۔ اس کا راز کیا ہے؟"

چکرم نے جواب دیا۔ "لالہ جی، میں فضول خواہشات کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ جو ملا ہے اسی پر صابر شاکر ہوں۔"

چکرم 1940ء میں الہ آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان دو بھائیوں اور تین بہنوں پر مشتمل تھا، ان کے والد کا نام سید فتح محمد رضوی تھا۔ انہوں نے ابتدائی دینی تعلیم ناصریہ عربک کالج جونپور سے حاصل کی۔ عربی کے طالب علم بھی رہے۔ ان کی پہلی شادی 1960ء میں اور دوسری شادی 1977ء میں ہوئی۔ ان کے صاحب زادے ظلِ عباس رضوی نے ایم بی اے کیا ہے اور اسلام آباد میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ بیٹی نے بی اے کیا ہے اور خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس طرح اپنے خاندان کی طرف سے بھی وہ مطمئن ہیں۔ ان دنوں وہ کراچی میں مقیم ہیں۔

اپنی خوشی اور اطمینان کا راز وہ یہ بتاتے ہیں کہ نہ تو کبھی کسی کا دل دکھایا نہ ہی کسی نے ان کا دل دکھایا۔ ہمیشہ صبر و قناعت سے کام لیا۔ انہوں نے ہمیشہ لالچ سے پرہیز کیا۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوستی نبھانا جانتے ہیں۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی ہدایت کار، مصنف، موسیقار، اداکار، اداکارہ، کامیڈین، شاعر ایسا ہوگا جس کے ساتھ انہوں نے کام نہ کیا ہو۔ فلمی دنیا کے زوال پر وہ بہت رنجیدہ اور دل برداشتہ ہیں مگر کہتے ہیں کہ جو اللہ کی رضا۔ ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں سوائے بہتری کی دعا کے۔

چکرم بہت بڑے اداکار نہیں تھے مگر اپنی خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بڑے بڑے فن کاروں نے انہیں اپنے گھروں میں بلا کر بڑی محبت سے مہمان رکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد علی صاحب تو مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ وہ ندیم اور وحید مراد کے گھروں میں بھی مہمان داری کا لطف اٹھاتے رہے ہیں۔

چکرم کو اگر پاکستان کی فلمی صنعت کی چلتی پھرتی تاریخ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بچپن میں وہ محرم کی مجالس میں شرکت کرتے تھے۔ ان میں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے۔ "لکھنؤ" سے انہوں نے عربی فاضل کا امتحان دیا مگر یہ عربی دانی زندگی میں ان کے کام نہ آسکی۔ مرثیہ خوانی اور سوز خوانی بھی کی۔ کراچی میں انہوں نے ابتدائی زندگی میں چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کیں لیکن جب لاہور آئے تو لاہور ہی کے ہو کر رہ گئے۔ 50 برس میں بارہ سو کے قریب فلموں میں اداکاری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اتنا زیادہ کام کرنے کے باوجود نہ ان کے پاس ذاتی گھر ہے نہ کار۔ ان کا کہنا ہے کہ میں دکھ کی دکان پر بیٹھ کر سکھ کا سودا بیچتا ہوں۔

ہم نے ایک بار پوچھا۔ "چکرم، آپ اتنے شریف آدمی ہیں کبھی کسی کو چکر نہیں دیا تو پھر چکرم نام کس لیے؟"

بولے "کم از کم چکر باز تو نہیں ہوں۔ خود ہی چکر میں رہتا ہوں" ایک بات جس پر انہیں فخر ہے یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان میں وہ مسلم لیگ زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ اول و آخر وہ پاکستانی ہیں۔ ایک بار انہیں قائداعظم سے مصافحہ کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چکرم ایک زمانے میں اسٹوڈیو کی لازمی ڈیکوریشن سمجھے جاتے تھے۔ اب فلمیں خواب و خیال ہوگئی ہیں۔ اسٹوڈیو پرانے اور اجڑے دیار بن چکے ہیں۔ اب وہاں الو بولتے ہیں فلم والوں کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں اسٹوڈیو سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا، اب اسٹوڈیو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ صرف چکرم کی کہانی نہیں ہے۔ سبھی فلم والوں کا قصہ ہے۔

☆☆☆

"مرزا صاحباں" پنجاب کی ایک لوک رومانی داستان ہے۔ "ہیر رانجھا اور سسی پنوں" کی طرح یہ کہانی بھی پنجاب میں گھر گھر سنی دسنائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "ہیر رانجھا" کی طرح یہ بھی ایک فرضی داستان ہے۔

"ہیر" وارث شاہ کے زورِ قلم کا شاہکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "ہیر وارث شاہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وارث شاہ کی شخصیت، علمیت اور روحانیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ہیر رانجھا، نفسانی خواہشات سے پاک ایک روحانی محبت کی کہانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیر رانجھا کا تذکرہ لوگ احترام اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ دونوں عشق کی معراج تک پہنچ چکے تھے لیکن اس میں کسی جسمانی اور نفسانی خواہش کا دخل نہیں ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے عشق کے لیے بہت قربانیاں دیں۔ اس کے برعکس "مرزا صاحباں" ایک ایسی داستان ہے جس میں روحانیت سے زیادہ نفسانی خواہشات کا دخل زیادہ ہے۔ مرزا اور صاحباں ایک ایسی کہانی ہے جس میں مرزا صاحباں کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ مرزا کے گھر والے اس کا انتقام لینے کے لیے صاحباں کے گاؤں پہنچ گئے اور جوشِ انتقام میں گاؤں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ضلع جھنگ میں کھیوہ گاؤں کے باہر ایک پرانے قبرستان میں مٹی کا ایک تودہ یا ڈھیر نظر آتا ہے۔ اس گاؤں کی آتش زدہ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے کھنڈر اپنی اداسی اور سوگواری کی داستان سنانے کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔ اس قبر یا مٹی کے تودے کے آس پاس آج بھی جلی ہوئی اینٹیں اس کے ماضی کی گواہی دینے کے لیے موجود ہیں۔ پرانے اجڑے ہوئے جلے ہوئے گاؤں میں صرف ایک پرانی تاریخی مسجد کی عمارت آج بھی داستانِ غم سنانے کے لیے دنیا کی بے ثباتی کے ثبوت کے طور پر موجود ہے۔ اس مسجد کے در و دیوار آج بھی باقی ہیں لیکن اب کوئی اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے نہیں آتا۔ یہ نمازیوں سے محروم مسجد ہے۔ پرانے کھیوہ کے برابر ایک نیا گاؤں آباد ہو چکا ہے۔

نئے گاؤں والوں کے بیان کے مطابق اس مسجد کے مدرسے میں مرزا اور صاحباں بچپن میں پڑھا کرتے تھے اور یہیں سے ان کی محبت کا آغاز ہوا تھا۔ گاؤں والے مرزا صاحباں کی داستان کو بھولنا چاہتے ہیں لیکن اس مسجد کی حرمت اور پاکیزگی کے باعث اس عمارت کو سب باعثِ احترام سمجھتے ہیں مگر اس مسجد میں کوئی نماز پڑھنے کے لیے نہیں آتا۔ اب یہ محض پرانی داستان کی ایک یادگار کے طور پر موجود ہے۔ اس مسجد کی عمارت چھوٹی لیکن بہت پاکیزہ اور باوقار ہے۔ گاؤں والے اس عمارت کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ اس کے لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں آج بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ مرزا صاحباں کی داستان گاؤں والوں کے



کبھی کراچی میں ایسے رقص بھی ہوا کرتے تھے

لیے باعثِ شرم ہے۔ وہ اس داستان اور اس کے کرداروں کو یاد نہیں رکھنا چاہتے لیکن یہ مسجد انہیں ہر وقت پرانے واقعات یاد دلاتی رہتی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب مرزا کے بھائی اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے حملہ آور ہوئے تو انہوں نے ہر سامنے آنے والے کو ہلاک کر دیا۔ گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ بس ایک مسجد ہی باقی رہ گئی۔ شاید اس لیے کہ مسجد اللہ کا گھر ہوتی ہے اور وہی اپنے گھر کی حفاظت کرنے والا ہے۔

کھیوہ کا نیا گاؤں آباد ہو گیا تو پرانا جلا ہوا گاؤں ایک قبرستان بن کر رہ گیا۔ اب اس کو قبرستان ہی کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں قبروں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔

کھیوہ سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے راوی کے کنارے ایک اور تاریخی گاؤں رن آباد ہے۔ یہ وہ گاؤں ہے جہاں مرزا رہتا تھا۔ اس گاؤں کے باہر ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے اندر صاحباں اور مرزا کے گھوڑے بکی کی قبریں ہیں۔ مرزا صاحباں کو لوگ عزت اور احترام سے نہیں دیکھتے اس لیے مرزا صاحباں کی قبروں پر کوئی فاتحہ پڑھنے بھی نہیں آتا۔ خصوصاً گاؤں کی عورتوں کو اس قبرستان کے نزدیک جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

مرزا صاحباں کے مزار کے بعد دیہاتی عورتوں نے ان کے نقش قدم پر چل کر گھروں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ خرابی آج بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے کرداروں کی طرح مرزا صاحباں کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے برعکس ہیر رانجھا کے مزاروں پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

جلا ہوا گاؤں، اجڑی ہوئی مسجد اور وہ درخت جس کے سائے میں مرزا صاحباں کو ہلاک کیا گیا تھا تو اسی جگہ لیکن آج تک وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ کیا واقعی مرزا صاحباں کا کوئی وجود بھی تھا یا ایک فرضی داستان ہے؟ یہی معاملہ ہیر رانجھا کے بارے میں بھی ہے۔ ان کے مزاروں پر عقیدت مندوں کا ہجوم تو نظر آتا ہے لیکن اس بات کا ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے کہ اس داستان کی کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ یہ بات حیران کن ہے مرزا صاحباں کے قتل کے بعد ان کی میتیں رن آباد سے کھیوہ کیسے پہنچ گئیں؟ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ محض فرضی قبریں ہیں۔ سچائی کیا ہے یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ سچ ہے کہ یہ داستان نسلاً بعد نسلاً سنائی جاتی رہی ہے اور آج بھی سنائی جاتی ہے۔ جہاں تک رومانی داستانوں کا تعلق ہے جو لوک کہانیوں کی شکل اختیار کر چکی ہیں ان میں سے اکثر کے بارے میں ٹھوس شہادتیں اور ثبوت موجود نہیں ہیں۔ لیکن خواہ فرضی سہی ان داستانوں کو آج تک فراموش نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی آئندہ اس کا امکان ہے۔ یہ بھی ایک سوال ہے کہ جدید زمانے کی محبت کی داستانیں اس طرح سینہ بہ سینہ چل کر لوک کہانیوں کی صورت اختیار کیوں نہیں کرسکیں؟

اس کا ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے یہ جدید ایجادات کا زمانہ ہے۔ فلم ٹی وی کمپیوٹر نے لوگوں کی تفریح کے ذرائع اور طور طریقے بدل کر رکھ دیے ہیں۔ میڈیا اس قدر طاقتور ہوچکا ہے کہ دنیا سکڑ کر گاؤں بن چکی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ تفریح کا کوئی اور ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ شام کو ایک جگہ یا چوپالوں میں اکٹھے ہوکر قصہ گوئی اور داستان گوئی سے لطف اندوز ہوسکیں۔ اب دوسری بے شمار تفریحات وجود میں آچکی ہیں اس لیے داستان سننے اور سنانے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی رسائی ہوچکی ہے۔ کیسٹ اور ویڈیو پلیئر عام ہوچکے ہیں۔ اب وہ دادیاں اور نانیاں بھی نہیں رہیں جو خاندان کے بچوں کو بٹھا کر کہانیاں سناتی تھیں۔ آج کی نانیاں اور دادیاں کہانیاں بھول چکی ہیں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بچوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ ٹی وی کمپیوٹر اور دوسرے نئے زمانے کے کھیلوں کو چھوڑ کر دادی اماں کے پوپلے منہ سے دقیانوسی کہانیاں سننے بیٹھ جائیں۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ لوگ بدل چکے ہیں۔ تفریحات بدل چکی ہیں سبھی کچھ بدل چکا ہے۔

بہاولپور سے سلطان مسعود کا مکتوب ملاحظہ کیجیے۔ ان کی سطور ذرا تاخیر سے پیش کی جارہی ہیں لیکن یہ مفید معلومات ہیں اس لیے قارئین کو محروم رکھنا مناسب نہ ہوگا۔

گزشتہ مہینوں میں آپ کی کمی بہت شدت سے محسوس کی۔ اللہ آپ کو مکمل صحت عطا کرے آمین! جولائی کے سرگزشت میں ایک تصویر کے نیچے دیو آنند اور کلپنا کارتک لکھے دیکھ کر یہ خط لکھنے پر مجبور ہوا۔ تصویر میں کلپنا کارتک نہیں بلکہ سادھنا ہے۔ اسی طرح مارچ کے سرگزشت میں تنویر ریاض صاحب نے ”چلبلا“ کے عنوان سے شمی کپور کے بارے میں مضمون لکھا تھا، اس میں انہوں نے شمی کپور کی فلموں کی فہرست میں فلم ”دل اپنا اور پریت پرائی“ کا نام دے دیا ہے، حالانکہ اس فلم میں مینا کماری کے ساتھ راجکمار تھے۔ میرے پاس آج بھی یہ فلم ڈی وی ڈی اور وی ایچ ایس پر موجود ہے۔ سرگزشت کے کسی گزشتہ شمارے کے فلمی الف لیلہ میں برطانوی مزاحیہ اداکار نارمن وزڈم Norman Wisdom کی تصویر چھپی تھی، مگر آپ کے مضمون میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ اور نہ ہی کبھی بعد میں ہوا۔ سوچا چلو میں ہی اس کے متعلق چند جملے لکھ دوں۔ میں نارمن وزڈم کی تقریباً تمام فلمیں ساٹھ اور ستر کی دہائی میں انگلینڈ میں سنیما گھروں یا ٹی وی پر دیکھ چکا ہوں۔ چھوٹے قد کا یہ اداکار چند برس پہلے 95 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے اسے سر کا خطاب دیا تھا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ البانیہ کے لوگ اسے پوجنے کی حد تک پسند کرتے تھے۔ کمیونسٹ دور میں نارمن وزڈم واحد غیر ملکی اداکار تھا، جس کی فلموں کو البانیہ میں دکھائے جانے کی اجازت تھی۔ یہ اداکار پہلی بار جب البانیہ گیا، تو ترانہ کے ہوائی اڈے پر اس کے استقبال کے لیے لاکھوں لوگوں کے علاوہ اس وقت کے صدر بھی موجود تھے اور البانیہ کی حکومت نے اسے وہاں کی اعزازی شہریت کے علاوہ ترانہ شہر کی چابی بھی دے دی تھی۔

میں کچھ ماہ پہلے ایک کام کے سلسلے میں پھر انگلینڈ گیا تھا اور اس دفعہ برمنگھم میں قیام کیا تھا۔ آپ نے بھی اکثر برمنگھم کا ذکر کیا ہے۔ سمتھ راک کا پورا بازار پاکستانیوں کا ہے۔ یوں سمجھیے آپ کراچی کے طارق روڈ پر گھوم رہے ہیں۔ پتا نہیں اس علاقے کو پھٹکری سے کیا نسبت ہے؟ شاید کسی زمانے میں یہاں پھٹکری کی پہاڑی ہو! جس کی وجہ سے اس کو آلم راک کہا جاتا ہے۔ یہاں آپ کو خواتین کے کپڑوں کے بڑے بڑے اسٹور اور بوتیک ملیں گے۔ دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے گر سری اسٹور، دیسی کھانوں کے ریسٹورنٹ ہیں، جن میں آپ کو انتہائی صاف ستھرے ماحول میں سری پائے سے لے کر سرسوں کا ساگ اور سموسے پکوڑے بھی ملتے ہیں۔ آج کے برمنگھم میں تقریباً ایک لاکھ پاکستانی اور کشمیری رہتے ہیں۔

مانسہرہ سے ایاز راہی کا مکتوب: سرگزشت دو ہزار عیسوی کے فلمی الف لیلہ میں سرفہرست اپنا خط دیکھ کر جہاں بے حد خوشی ہوئی ڈھیروں، سیروں خون بڑھا۔ آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلیں کہ آپ نے میرے قلم کو اعتماد سے نوازا وہاں شرمندگی بھی ہوئی کہ آپ جیسے بڑے تخلیق کار اور قلم کار مجھ جاہل اناڑی سے معذرت کا اظہار کررہے ہیں لیکن پھر آپ کی عظمت کا احساس بھی دل میں فزوں تر ہوا کہ اس نفانفسی کے دور میں نفیس اخلاق اور اعلیٰ روایات واقدار آپ ہی جیسے مہذب و نستعلیق بزرگوں کے دم قدم سے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ عمر طبعی عطا فرمائے (آمین) ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔ ایک بات مکرر عرض کروں گا کہ میں قابل آدمی بالکل بھی نہیں ہوں، ہرگز نہیں ہوں اس لیے فون پر دوران گفتگو اگر کوئی بات جملہ، یا فقرہ ناگوار خاطر گزرے تو چشم پوشی سے کام لیجیے گا کہ میں بہرحال ایک بے سلیقہ آدمی ہوں۔ سرگزشت میں میانوالی کے ایک محترم غازی نے فلموں میں رقص کو یکسر فضول اور بے فائدہ قرار دیا تھا۔ ان کی سوچ اور ذہن شاید اپنی جگہ پر ٹھیک ہی ہوگا مگر اس کائنات میں رقص کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، چاہے وہ زیر آسماں فضا میں اڑتے گھومتے رنگین بادلوں کا رقص ہو یا قونیہ (ترکی) میں مولانا جلال الدین رومی کے مزار پر دائرے میں درویشوں کا سادہ رقص۔ زہرہ یا ناہید ستارے کو رقاص فلک بھی کہا گیا ہے۔ صوفیائے کرام کا رقص مستانہ۔ گہے برخاری رقصم گہے درناری رقصم“ اسی دنیا کا حصہ تھا اب بھی شاید کہیں نہ کہیں ہوگا۔ ”بلھے شاہ ہوری نچ کے یار (پیر و مرشد) مناں دے نیں۔“ غالب نے دیدہ ور کی پہچان یہ بتائی ہے کہ جس کی آنکھ پتھر میں بھی رقص بتان آذری دیکھتی ہے اور دیدہ ور کے نزدیک کائنات میں حرکت (رقص) کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آنسو (Tears)

آنسو دو طرح کے ہیں، ایک جذباتی اور دوسرے خراش کے زیر اثر پیدا ہونے والے۔ ان کی کیمیائی ساخت بھی باہم مختلف ہے۔ آنسوؤں کا منبع Lachrymal نامی غدود ہیں، جہاں سے آنسوؤں کا مسلسل اخراج ہوتا ہے۔ آنسوؤں سے آنکھیں صاف اور شفاف اور دل ودماغ کو سکون میسر آتا ہے۔ ایک منٹ میں 60 مرتبہ پلک جھپکنے سے آنکھوں کے پپوٹے آلودگیوں کو اس کے اندرونی کونے کی طرف (ناک کی طرف) دھکیلتے ہیں جہاں آنسوؤں کی قلیل مقدار کے ذریعے باریک نالیوں سے اس کی نکاسی ہوتی ہے۔ خراش کے باعث جو آنسو نکلتے ہیں، ان سے نالیاں (Channels) بھر جاتی ہیں۔ 1972ء میں آنسوؤں میں ایک جراثیم کش انزائم کی موجودگی کا پتا چلا جو جراثیم کے خلیوں کی دیواروں کو آنکھ کی سطح پر تباہ کرکے جراثیم کو چند منٹوں کے اندر بے عمل و بے اثر کردیتا ہے۔

مرسلہ: نعمت اللہ، ٹیری کرک

آنسو گیس

چند ٹھوس یا مائع (عموماً مائع) کیمیائی مرکبات جو نہایت تیزی سے بخار بن کر گیس کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس گیس سے آنکھوں میں شدید جلن ہوتی ہے اور بے تحاشا آنسو بہتے ہیں، لیکن عموماً آنکھوں کو نقصان نہیں پہنچتا۔ متاثرہ علاقے سے ہٹ جانے اور آنکھیں دھو لینے سے گیس کا اثر دور ہوجاتا ہے۔ اس گیس سے بچنے کے لیے پانی میں رومال تر کرکے آنکھوں پر رکھ لینا چاہیے۔ عام طور پر Chloxoace to Phenone آنسو گیس استعمال کی جاتی ہے۔ زیادہ تر اسے پولیس احتجاجی لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

مرسلہ: اظہار الحسن، کراچی

یہاں منفی یا مثبت رقص سے بحث نہیں، بقول مجنوں گورکھپوری ''زندگی کا پہلا اظہار ردھم اور رقص کے ساتھ شروع ہوا۔ پہلا فن رقص ہے، ردھم زندگی کی علامت اور ضامن ہے۔'' جانوروں میں رقصِ طاؤس کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مور فطری طور پر رقاص پرندہ ہے۔ لوک رقص (بھنگڑا، خٹک ناچ، سمی، دھمال وغیرہ) اپنے اپنے علاقوں کی پہچان قرار پاتے ہیں اور تو اور ذبح کیے ہوئے پرندے یا جانور کا تڑپنا اور مذبوحی حرکات کو بھی رقصِ بسمل سے موسوم کیا گیا۔ رقص یقیناً زندگی سے عبارت ہے چاہے وہ روحانی زندگی ہو یا عناصرِ اربعہ کا مجموعہ۔ تو پھر فلم جیسا خالصتاً تفریحی شعبہ رقص سے خالی کیوں کر ہوسکتا ہے جس کا خمیر ہی فنونِ لطیفہ ترتیب پاتا اور تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ فلم کی کچھ اپنی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں جن کے تحت رقص کے مختلف انداز عکس بند کیے جاتے ہیں۔ کہانی یا موضوع کے مطابق موقع محل کا خیال رکھا جاتا ہے اور فن کو تفریح میں ڈھالا جاتا ہے۔

فلمی دنیا میں رقص کے فن اور ہنر کو وحید مراد نے عروج بخشا یہاں پیشہ ورانہ رقص کی بات ہرگز نہیں ہو رہی نہ ہی کسی تربیت یافتہ رقاص یا اداکار کا ذکر مقصود ہے۔ وحید مراد مرحوم دفطری طور پر رقص کا ملکہ لے کر آئے تھے اور اسی پیدائش ہنر کو اپنے قدرتی انداز میں ان بلندیوں تک پہنچایا کہ باید وشاید۔ انہوں نے کسی بھی رقاص استاد یا رقص گاہ سے کبھی بھی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی ہر حرکت ہر ادا ئسُرا اور ردھم کا بڑا مہذب، شائستہ اور خوب صورت اظہار تھیں۔ گانا عکس بند کراتے تھے کہ معمولی سے نغمے کو بھی چار چاند (حسن، شہرت، وقار، دولت) لگ جاتے تھے۔ بڑی سے بڑی ہیروئن بھی رقاص ہدایت کار کی کٹھ پتلی نظر آتی۔ برصغیر میں وحید مراد کا سا انداز کوئی بھی اداکار نہ اپنا سکا۔ بھارت کے اداکار جیتندر انتہائی کوشش کے باوجود بھی صحیح نقالی تک نہ کر سکے کہ کچھ اعلیٰ چیزیں تو نقل وتقلید سے ماورا اور بہت بلندی پر ہوتی ہیں جیسے تاج محل کا پہلو دار جمال، اجنتا ایلورہ کی نقاشی کا کمال۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، آج جدید ذرائع (سی ڈی، ڈی وی ڈی، انٹرنیٹ) پر آپ سب کچھ دیکھ کر موازنہ اور پھر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مگر تعصب، مرعوبیت اور جانب داری سے بالاتر ہو کر۔ وحید مراد اپنے رنگ میں دُرِ یکتا تھے۔ وحید مراد کی پہلی فلم ''اولاد'' خانیوال پیلس سینما میں جلوہ گر ہوئی تو میرے بچپن کا زمانہ تھا چنانچہ سینما کے زنانہ حصے میں خواتین کے درمیان گھس بیٹھ کر یہ متحرک تصویر دیکھی۔ اس وقت اس فلم کے دو ہی مناظر ذہن پر ثبت ہو کر رہ گئے۔ ایک منظر میں اداکار علاؤالدین بیوی کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتے اور کچھ مکالمے ادا کرتے ہیں میرے اردگرد کی خواتین اور لڑکیاں بھی روتی، سسکتی آنسو پونچھتی دوپٹا آنکھوں پر رگڑتی نظر آتی ہیں۔ یہ ایس ایم یوسف کی مسلم گھریلو فلم تھی جبکہ دوسرا منظر کچھ اس طرح یاد رہ گیا کہ وحید مراد کسی ساتھی اداکارہ کے ہم راہ غالباً یہ مکالمہ ادا کرتے ہیں کہ ''یہ جنازہ کس کا ہے؟'' ماں کی گود اور باپ کا سایہ بچوں کا یہ گانا بھی شاید اسی فلم کا تھا بہرکیف بچپن نے ساتھ چھوڑا اور لڑکپن کے جھولے کی باری آئی تو تھوڑی سی آزادی اور دوستوں کا ساتھ ملا گھر سے باہر دیر تک رہنے اور دور تک جانے کی اجازت بھی ملی۔ اچھا زمانہ تھا ایک دفعہ خانیوال ریلوے کے کسی بڑے عہدیدار کے ہاں شادی کی کوئی تقریب تھی۔ ریلوے کالونی میں شام کے بعد کھلی جگہ پر سفید کپڑا تان کر فلم دکھائی گئی وہاں دوسری بار وحید مراد کو ''دل میرا دھڑکن تیری'' میں دیکھا۔ دورانِ فلم جب پردے پر صرف وحید مراد کا چہرہ دکھایا گیا تو میرا کچا ذہن حیرت میں ڈوب گیا۔ وحید مراد کا نقش ذہن ودل پر گہرا ہوتا چلا گیا۔ سرو قد، دل فریب نقش ونگار، انوکھی ادائیں، خوش اطوار وخوش لباس نیز خوش گفتار وخوش رفتار، خصوصاً بالوں کا منفرد انداز جو ایک مستقل رواج بن گیا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھر کے اکلوتے چشم وچراغ تھے۔ میں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کروں گا کہ وحید مراد نہ تو پیشہ ور اداکار تھے نہ ہی پیشہ ور رقاص یہی وجہ ہے کہ وہ عام نوجوانوں کے لیے تقلید کا نمونہ بن گئے تھے۔

ناگ منی کے دوران وحید مراد کے عکس پر سکے نچھاور کرتے بھی دیکھا گیا۔ علی سفیان آفاقی کی فلم ''کنیز'' کا سیدھا سادا گانا دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی، ہو یا فلم ''دیور بھابی'' کا تیز ردھم گانا۔ تھری چیئرز فار بھابی ہپ ہپ ہُرے۔'' وحید مراد ہر جگہ ہیرے کی مانند جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ آج کل کے نوجوان اداکار جو چیخنے چلانے کو اداکاری اور بے ہنگم اچھل کود کو ہی رقص سمجھتے ہیں اور گردانتے ہیں۔ جب ٹی وی پر آتے ہیں تو منہ بگاڑ کر اور کندھے اچکا اچکا کر انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وحید مراد اعلیٰ تعلیم یافتہ (ایم اے انگریزی) ہو کر بھی شستہ اردو ہی بولتے تھے یہ نہیں کہ انہیں انگریزی پر عبور نہ تھا بہ قول مصطفیٰ قریشی وہ ہدایت کار فرید احمد سے انگریزی میں ہی بات چیت کرتے تھے۔

جاری ہے

تلاش

طارق عزیز خان

وہ سب نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ سمندر کے بے کراں سینے پر بہتے بہتے کہاں سے کہاں نکل گئے تھے اور دشمن بھی تاک میں تھا۔ گرم مسالوں کی تلاش میں بھٹک رہے مہم جو کی کتھا۔

ایک مہم جو کے سفر کا دوسرا اور آخری حصہ



نئے قائد کے انتخاب کے لیے کھلے سمندر میں جانا ضروری تھا، بالآخر انہوں نے عمل کرنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ پیگافی ٹا کے مطابق 35 دن تک بندرسری بیگوان میں لاحاصل کھڑے رہنے کے بعد چار اگست 1521ء کے دن ان کے دونوں بحری جہازوں نے لنگر اٹھائے اور بورنیو کے شمال مغرب میں واقع بحیرہ جنوبی چین کھلے سمندر کی طرف بڑھے۔ برونائی کی حدود سے باہر آنے کے بعد سینئر جہاز رانوں نے کارواں کو مہم کی قیادت پر قائل کرنے کی کوشش کی لیکن اس

کے انکار کے بعد انہوں نے اتفاق رائے سے مارٹن مینڈز کو مہم کا پانچواں قائد منتخب کرلیا۔ مارٹن مینڈز نے فلیگ شپ ٹرینی ڈاڈ کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جوآن سباسٹین ایل کانو کو وکٹوریا کا کپتان مقرر کردیا۔ مارٹن مینڈز نے اپنی ترجیحات کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ انہیں خورک جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ملوکا تک رسائی کے لیے نئے راہنما تلاش کرنے تھے۔

9 اگست کے دن دونوں بحری جہاز بورنیو کے شمال میں واقع آبنائے بالاباک میں سفر کررہے تھے۔ وہ برونائی آتے ہوئے پہلے بھی اسی آبنائے سے ہوکر گزرے تھے۔ یہاں ہر طرف بے شمار چھوٹے بڑے جزائر کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ بعض جزیرے اس حد تک ایک دوسرے کے قریب تھے کہ ایک دوسرے سے جڑے معلوم ہوتے تھے۔ ان جزائر کے درمیان کم گہرے اور سبزی مائل شفاف پانی کے اندر کئی میٹر کی گہرائی میں موجود گھونگے کی چٹانیں، جھاڑیاں اور ان کے درمیان تیرتی رنگ برنگی مچھلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں موسم خوشگوار لیکن تیزی سے رخ بدلتی ہوا کی رفتار قدرے زیادہ تھی۔ اردگرد کے نظارے دلکش لیکن احتیاط کا تقاضا کررہے تھے۔ ٹرینی ڈاڈ ایک بڑے جزیرے کے برابر سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک سطح سمندر کے نیچے موجود ایک پوشیدہ چٹان سے ٹکرا گیا۔ جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ بادبان بدلنے پر مامور ملاحوں نے پھرتی سے ہاتھ پیر چلائے لیکن ناکام رہے۔ ٹرینی ڈاڈ رخ بدلتی ہوا کے زور پر تیزی سے گھوما اور قریب ہی موجود ایک جزیرے کی نرم ریت پر چڑھ گیا۔ ٹرینی ڈاڈ کے پیچھے پیچھے آرہے وکٹوریا کو اس کے ملاحوں نے بروقت سنبھال لیا اور ریت میں دھنسے جہاز سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اسے لنگر انداز کردیا۔ دونوں جہازوں کا عملہ نیچے اتر آیا۔ مارٹن مینڈز نے پایا کہ کسی بھی ملاح کو کوئی سنگین چوٹ نہیں آئی تھی۔ تاہم ٹرینی ڈاڈ کا اگلا حصہ کئی فٹ تک ساحل کی نرم ریت میں دھنس گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جہاز کے تہ خانوں کا باریک بینی سے معائنہ کرنے کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ جہاز کے ہل اور اس کے پیندے کو اچھا خاصا نقصان پہنچا تھا۔ مارٹن مینڈز فکرمند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بظاہر غیر آباد دکھائی دے رہے ان جزائر سے اسے کس قسم کی مدد مل سکتی تھی؟

ہسپانوی ملاح اس وقت بورنیو کے 40 کلومیٹر شمال اور خطِ استواء سے 7.30 ڈگری شمال میں آبنائے بالاک میں واقع جزائر بنگی (Banggi) کی حدود میں موجود تھے۔

یہاں پچاس کلومیٹر کے دائرے میں تین بڑے اور بے شمار چھوٹے جزائر پھیلے ہوئے تھے۔ بنگی کا مرکزی جزیرہ 35 کلومیٹر لمبا اور 22 کلومیٹر چوڑا تھا جبکہ ٹرینی ڈاڈ کی جائے حادثہ بنگی کے صرف پانچ کلومیٹر مغرب میں تھی۔ یہ 25 کلومیٹر لمبا اور 6 کلومیٹر چوڑا جزیرہ تھا۔ ملاحوں کو اس مقام سے بورنیو کے بڑے جزیرے کے خدوخال بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم وہ دوبارہ وہاں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ آنے والے دنوں میں جہازوں کے عملے نے شکار کی تلاش میں قرب و جوار میں واقع تمام چھوٹے بڑے جزائر کو کھنگال ڈالا۔ انہوں نے پایا کہ بنگی کے مرکزی جزیرے پر ایک چھوٹا ماہی گیر قبیلہ آباد تھا۔ جزیرے پر موجود ان کی گھاس پھوس سے بنی جھگیوں کی تعداد کسی طور پر پچاس سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ اس حد تک پسماندہ تھے کہ ان سے خوراک اور جہازوں کی مرمت کے نام پر کسی تکنیکی مدد کی توقع رکھنا بے کار تھا۔

آنے والے دنوں میں ٹرینی ڈاڈ کا عملہ جہاز کی مرمت میں مصروف رہا جبکہ ایل کانو سمیت باقی کے افراد نے جزیروں کی چھان بین کی۔ ہسپانوی ملاحوں کو ان استوائی جزیروں پر قیام کے دوران بہت سے نئے تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ جزائر اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں پر مشتمل گھنے استوائی جنگلوں سے اٹے ہوئے تھے۔ یہاں گرم مرطوب موسم اور بارشوں کی بہتات کے ساتھ فطرت بھی اپنے اصل رنگ و روپ میں موجود تھی۔ جزیروں پر پھل دار درختوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اوسطاً سو فٹ تک بلند درختوں کی ٹہنیوں پر بندروں کی کئی اقسام کو جھولتا اور انواع و اقسام کے استوائی پرندوں کو شور مچاتا دیکھا جاسکتا تھا۔ جزیرے کے اندرونی دلدلی جنگلوں میں ٹے پیر سور، جنگلی خرگوش، گلہریاں، جنگلی بلیاں، تیندوے، انواع و اقسام کے سانپ، مینڈک اور حشرات کی متعدد اقسام پائی جاتی تھیں۔

جزیروں پر موجود جنگل بے حد گھنا تھا۔ گھنی سرسبز جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں اس حد تک آپس میں الجھی ہوئی تھیں کہ وہاں دن میں بھی رات کا سماں محسوس ہوتا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹے سیکڑوں فٹ لمبی جنگلی بیلوں پر رنگ برنگے سانپ دکھائی دینا ایک عام سی بات تھی۔ ان جنگلوں میں شکار کی تلاش میں پیدل چلنا نہ صرف دشوار بلکہ خطرناک

تھا۔ زمین پر پتوں کے نیچے دلدلی کیچڑ اور ذرا نظر چوکی تو ہاتھ میں ٹہنیوں کی جگہ زہریلے سانپ کا آجانا معمولی بات تھی۔ یورپین کے ساتھ موجود ایک پالاوانی ترجمان نے بتایا کہ یہاں کے گیلے ماحول میں ایسے زہریلے مینڈک بھی پائے جاتے تھے کہ جنہیں صرف چھونے ہی سے ان کے دل کی دھڑکن بند ہوسکتی تھی۔ ملاحوں نے بہت جلد یہ جان لیا کہ ان جنگلوں کے گرم مرطوب زہریلے ماحول میں زندہ رہنے کے لیے زندگی کے داؤ پیچ سیکھنا ضروری ہی نہیں بلکہ مجبوری بھی۔ یہاں کسی کی خوراک بننے کی بجائے خود کا پیٹ بھرنے کا ایک ہی اصول تھا کہ شکاری اپنے شکار اور ماحول پر کڑی نظر رکھے۔ ملاحوں نے جنگلی سوروں اور خرگوشوں کے شکار کے دوران جزیرے کے اندرونی دلدلی علاقے میں دس دس فٹ تک لمبے مگرمچھ دیکھے جو کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے پیے بے حس و حرکت پڑے رہتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کچھ لوگوں نے مگرمچھ کو مردہ سمجھ کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی اور وہ پورا منہ پھاڑ کر ان کی طرف اچانک پلٹ پڑا۔ یہاں موجود برساتی تالابوں میں 20 فٹ تک لمبے اور 45 کلوگرام وزنی چتکبرے اژدہے (Python Molurus) بھی پائے جاتے تھے۔ انہوں نے بعض درختوں کے تنوں پر تین سے چار انچ لمبے چوڑے سوکھے زرد پتوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ سبز نم پتوں کی تلاش میں سرگرداں استوائی کیڑوں کی ایک مخصوص نسل تھی۔

سیر سپاٹے کے دوران بنگی کے مرکزی جزیرے پر آباد ماہی گیر قبیلے نے یورپین کو تیندوے کی چند کھالیں بھی فروخت کیں۔ مقامیوں نے بتایا کہ جزیرے کے عین وسط میں واقع پہاڑی سلسلے پر موٹی گردن والے تیندوے کے درجنوں خاندان آباد تھے۔ آبنائے بالاباک کے ان جزائر پر قیام کے دوران ہسپانوی ملاحوں نے مون سون کی شدید بارشوں کا سامنا بھی کیا۔ بارش ایک دم سے شروع ہوجاتی اور لگاتار کئی گھنٹے برسنے کے بعد اچانک ہی رک جاتی تھی۔ بارش کے بعد جہاں مینڈک اور دوسرے کیڑے مکوڑے اپنا راگ الاپنا شروع کرتے وہیں پیڑ پودوں اور گھنی جھاڑیوں میں چھپے بڑے بڑے مچھر بھی باہر نکل آتے اور شدید حبس سے گھبرائے ہوئے ملاحوں پر ٹوٹ پڑتے یہاں ڈینگی بخار سے بچنے کے لیے ماحول کو دھواں دھار رکھنا اور جسم کے نمایاں حصوں پر کیچڑ مل کر رکھنا نہایت

آسلو

نارووے کا دارالحکومت۔ ملک کا صنعتی، تجارتی اور ثقافتی مرکز اور بندرگاہ۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں (1940-1945ء) جرمنی کے قبضے میں رہا۔ آبادی 2000ء، 600,000۔ اسے کرسٹیانا بھی کہا جاتا تھا۔ 1925ء میں اسے آزلو کا نام دیا گیا۔ یہ بہت بڑے بحری تجارتی بیڑے کا مرکز بھی ہے۔ اہم عمارات میں یونیورسٹی (1811) کیتھڈرل (17 ویں صدی) شاہی محل (1825-48ء) اور قلعہ (13 ویں صدی) شامل ہیں۔ ہوائی اڈا اور ریلوے اسٹیشن بھی ہیں۔ نیشنل گیلری میں ناروے کے ممتاز مصوروں کے فن پارے محفوظ کیے گئے ہیں۔ نومبر 1998ء میں یہاں پی ٹی وی ورلڈ کا افتتاح کیا گیا۔ اردو بولنے سمجھنے والے لوگ کل آبادی میں آدھے ہیں۔ اسے منی پاکستان بھی کہا جاسکتا ہے۔

مرسلہ: نوید ظفر، لاہور

ضروری تھا۔ جزائر کے گیلے ماحول میں آگ سلگانا بھی سی جدوجہد سے کم نہیں تھا۔ جنگل میں سوکھی لکڑی ناپید ہونے کے بعد ملاحوں نے اندرونی دلدلی حصے میں اگے بانسوں کو کاٹ کر ان کا ڈھیر اکٹھا کرلیا تھا۔ وہ بانسوں کو کھرچ کر اس کا برادہ جمع کرتے جو آگ سلگانے میں ان کی مدد کرتا۔ آگ جلانے کے بعد گرمی اور مچھروں سے ستائے لوگ ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر بیٹھ جاتے اور وطن میں موجود اپنے پیاروں کی یادوں سے دل بہلاتے۔ انہیں ٹھیک ایک سال پہلے میگلن کی ہمراہی میں پیٹاگونیا میں گزاری ... وہ سردیاں بھی یاد تھیں جب وہ آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کرکے اسی طرح قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس ایک سال میں موسم کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ستمبر 1521ء کے تیسرے عشرے کے دوران ٹرینی ڈاڈ کی مرمت کا کام ختم ہونے کے بعد سینئر جہاز رانوں کے درمیان مستقبل کے لائحہ عمل کو لے کر بات چیت ہوئی۔ اسپینی اوسا اور کاروال کی رائے تھی کہ انہیں وقت ضائع کرنے کی بجائے بورنیو کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ملوکا کی طرف بڑھنا چاہیے تھا۔ وکٹوریا کے کپتان ایل کانو کا

موقف تھا کہ انہیں اندھیرے میں تیر چلانے کی بجائے ایک بار پھر شمال میں منڈاناؤ جانا چاہیے تھا۔ جہاں بہتر وسائل جمع کر لینے کے بعد وہ جنوب میں ملوکا تک رسائی کی منصوبہ بندی کرسکتے تھے۔ دونوں تجاویز کے حق میں زبردست تقریریں ہوئیں لیکن ایل کانو مُصر رہا کہ انہیں آنکھیں بند کر کے پرتگالی علاقے میں جلنے کی بجائے اب کی بار سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں دوبارہ منڈاناؤ جانا چاہیے۔''

مارٹن مینڈز نے دونوں طرف کی رائے سننے کے بعد اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ ''ٹرینی ڈاڈ تیزی سے سفر کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس لیے میں نے یہ طے کیا ہے کہ اب وکٹوریا ہماری قیادت کرے گا۔''

جہازرانوں نے خیال کیا کہ شاید مارٹن مینڈز خود ایل کانو کے ساتھ وکٹوریا پر سفر کرے گا۔ لیکن مارٹن مینڈز نے یہ کہہ کر سب کو حیران کردیا کہ وہ خود ٹرینی ڈاڈ ہی پر رہے گا۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ایل کانو سے کہا کہ وہ نہ صرف ملوکا بلکہ ملوکا سے واپس یورپ جانے کی منصوبہ بندی کرنے میں بھی آزاد تھا۔

جوآن سباسٹین ایل کانو وہ ملاح تھا کہ جسے بطور سزا اس مہم میں شامل کیا گیا تھا۔ اس نے پیٹاگونیا میں میگلن کے خلاف ہوئی ناکام بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ جرم ثابت ہونے پر میگلن نے اسے سزائے موت دینے کی بجائے سخت محنت کی سزا دی تھی۔ آبنائے میگلن کی دریافت کے دوران میگلن نے اس کی سزا معاف کرتے ہوئے اسے وکٹوریا کا جہازراں مقرر کردیا تھا۔ چند ہفتے پہلے اس کی مزید ترقی ہوگئی تھی جب برونائی سے روانگی کے بعد مارٹن مینڈز نے اسے وکٹوریا کا کپتان مقرر کیا تھا۔ اب آبنائے بالاباک سے روانگی کے وقت مہم کی قیادت عملی طور پر اس کے ہاتھ میں تھی۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے کہ تجربہ کار ہسپانوی جہازرانوں کے ہوتے ہوئے ایک 35 سالہ نوجوان ملاح نے کیونکر مہم کی قیادت کی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پے در پے ہوئے جانی و مالی نقصان کے بعد ہسپانوی جہازرانوں کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ وہ ملوکا کے جزائر کی تلاش میں انجان سمندروں میں اِدھر سے اُدھر بھٹک رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ مارٹن مینڈز سمیت تمام اہم جہازرانوں کو وطن واپسی پر چارلس اول کی طرف سے جواب طلبی کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ مہم سے متعلق براہِ راست کوئی ذمّے داری قبول کرنے پر تیار نہیں تھے اور یہی وجہ تھی کہ مارٹن مینڈز نے عملی طور مہم کے معاملات کو ایل کانو کے سپرد کردیا تھا۔ ایل کانو کو بھی اپنی نئی ذمّے داری کا احساس تھا۔ مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کے راستے کی دریافت کے بعد ہسپانوی مہم کو ناکام نہیں کہا جاسکتا تھا۔ تاہم ایل کانو جانتا تھا کہ اسپین کا بادشاہ مالے کے جزائر کو ہاتھ لگا کر واپس آنے پر راضی نہیں ہوگا۔ اس نے مہم کا نام ملوکا کا بیڑا رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیڑا ملوکا تک ضرور جائے۔

ایل کانو نے 27 ستمبر 1521ء کے دن جزائر بنگی سے لنگر اٹھائے اور ایک نئے عزم کے ساتھ مہم کا دوبارہ آغاز کیا۔ اس کے بحری جہازوں نے شمال مشرق کی طرف آگے بڑھتے ہوئے آبنائے بالاباک کو پار کیا۔ وہ بحیرہ سولو کے کھلے سمندر میں داخل ہوئے تو انہیں ایک چھوٹا جنک بحری جہاز دکھائی دیا۔ پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ جنک پر قریب ہی واقع ایک چھوٹے جزیرے کا مقامی حکمران سوار تھا۔ ایل کانو کے حکم پر مقامیوں کو یرغمال بنانے کے بعد جنک کو سمندر میں ڈبو دیا گیا۔ ایل کانو نے گرفتار شدگان کو مجبور کیا کہ وہ ان کے بحری جہازوں کو اپنے جزیرے تک لے جائے اور انہیں خشک خوراک مہیا کرے۔ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ راجا کے جزیرے پر تھے جہاں دو دن کے قیام کے دوران انہیں اپنی مطلوبہ خوراک مل گئی۔

اگلے ایک ہفتے کے دوران ایل کانو نے مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے بحیرہ سولو کو پار کیا اور اکتوبر 1521ء کے آغاز پر وہ ایک بار پھر منڈاناؤ میں تھا۔ اس نے منڈاناؤ کے مغربی جزیرہ نما حصے میں خطِ استواء سے 7 ڈگری شمال اور 122 ڈگری مشرق کے خط پر ٹھیک اس مقام پر لنگر گرائے جہاں آج زانبوآنگا (Zamboanga) کی بندرگاہ واقع ہے۔ یہ جگہ تین ماہ پہلے ان کے جزیرے پر قیام سے قریب 200 کلومیٹر جنوب میں واقع تھی۔ ایل کانو نے زانبوآنگا میں قیام کے دوران مقامی ماہی گیروں سے بات چیت کی جنہوں نے اسے جنوب میں واقع باسی لان (Basilan) کے جزیرے پر جانے کا مشورہ دیا۔ پانچ اکتوبر کے دن ایل کانو کے بحری جہازوں نے زانبوآنگا سے لنگر اٹھائے اور پندرہ کلومیٹر چوڑی آبنائے باسی لان کو پار کر کے باسی لان کے جزیرے پر پہنچ گئے۔ باسی لان میں باجاؤ (Bajau) قبیلے کی ایک شاخ نے یورپین کا استقبال کیا۔

جزیرے پر تین چار دن کے قیام کے دوران باجاؤ قبائلیوں نے اسے منڈاناؤ کے جنوبی حصے میں واقع ان بندرگاہوں کے بارے میں بتایا جہاں ملوکا سے آنے والے تاجر ٹھہرا کرتے تھے۔

اکتوبر کے دوسرے عشرے کے آغاز پر ایل کانو کے بحری جہاز باسی لان کے مشرق اور منڈاناؤ کے جنوب میں واقع خلیج مورو (Moro Gulf) میں داخل ہوئے۔ خلیج میں مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے باجاؤ قبیلے ہی سے تعلق رکھنے والے بحری قزاقوں کے ساتھ ان کی جھڑپ ہوئی۔ قزاقوں کی کشتیاں، ہسپانوی گولہ باری کے آگے نہ ٹھہر سکیں اور کچھ دیر کے مقابلے کے بعد اِدھر اُدھر فرار ہوگئیں۔

اکتوبر کے وسط میں ایل کانو نے 250 کلومیٹر چوڑی خلیج مورو کو پار کر کے منڈاناؤ جزیرے کے جنوب مغربی حصے میں اس مقام پر لنگر گرائے جہاں آج فلپائن کی جنوبی بندرگاہ کوٹاباٹو (Cotabato) واقع ہے۔ یہ ایک پُررونق اور آباد بندرگاہ تھی۔ ایل کانو کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں موجود ہر تیسرا شخص ملوکا کے نام سے آشنا تھا۔ مقامی تاجروں نے اسے بتایا کہ ملوکا کے جزائر یہاں سے جنوب میں دو سے تین ہفتے کی مسافت پر واقع تھے۔ کوٹاباٹو کے گرد و نواح میں ایل کانو اور اس کے ساتھیوں نے اس درخت کو قریب سے دیکھا جس کی چھال دارچینی کہلاتی ہے۔ کوٹاباٹو میں قیام کے دوران مقامی حکمران کے بھائی نے ایل کانو کے ساتھ ملاقات کی۔ ایل کانو نے اس کی خدمت میں چند تحائف پیش کیے اور اسے شراب نوشی کے لیے وکٹوریا پر مدعو کیا۔ راجا کا بھائی اور اس کے چند ساتھی جونہی جہاز پر پہنچے ہسپانوی سپاہیوں نے پہلے سے طے شدہ پلان کے تحت انہیں گرفتار کرلیا۔ ایل کانو نے راجا کے بھائی کو مجبور کیا کہ وہ ان کی جنوب میں ملوکا کے جزائر تک راہنمائی کرے۔

☆☆☆

22 اکتوبر 1521ء کے دن جوآن سباسٹین ایل کانو کی قیادت میں ہسپانوی بحری جہازوں نے منڈاناؤ کی بندرگاہ کوٹاباٹو سے لنگر اٹھائے اور جزیرے کی جنوبی گولائی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اگلے پانچ دنوں کے دوران ایل کانو نے لگ بھگ 300 کلومیٹر کا سفر طے کیا اور خطِ استواء سے 5.30 ڈگری شمال کے خط پر واقع منڈاناؤ کی جنوبی ٹیل کے قریب پہنچا۔ ایل کانو نے خشکی پر جانے کی بجائے اپنے جہازوں کا رخ جنوب کے کھلے سمندر کی طرف موڑ دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جزیرے کی جنوبی ٹیل سے 10 کلومیٹر جنوب میں واقع دو چھوٹے جزیروں بالوٹ اور سرنگانی کے قریب موجود تھا۔ جزیروں کے قرب و جوار میں مقامی قبائلیوں کی درجنوں چھوٹی بڑی کشتیاں اِدھر اُدھر گشت لگاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایل کانو نے ایک کشتی پر سوار مقامی باشندے کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی کوئی چیز دیکھی۔ غالباً کچھ لوگ انہیں قریب آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

''اُن کے ہاتھوں میں کیا ہے؟'' ایل کانو بڑبڑایا۔

''چارہ۔۔۔۔'' وکٹوریا پر سوار ایک راہنما نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ان کے ہاتھوں میں کچھ نوادرات ہیں اور وہ ہمیں جزیروں کی طرف آنے پر اُکسا رہے ہیں۔''

''کون ہیں یہ لوگ اور کیوں ایسا چاہتے ہیں؟''

16 ویں صدی کے دوران منڈاناؤ کے جنوبی حصے اور اس سے ملحق جزائر میں توہم پرست آدم خور، مانوبو قبائل کی کئی شاخیں آباد تھیں۔ یہ خطرناک قبائلی اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اردگرد کے سمندر میں گشت لگاتے رہتے تھے۔ وہ موقع ملنے پر کمزور اجنبیوں کو زبردستی جبکہ اپنے سے طاقتور غیر ملکی تاجروں کو سونے چاندی کا لالچ دے کر اپنے علاقے میں لے جاتے تھے۔ ایل کانو کے راہنماؤں نے اسے بتایا کہ مقامیوں کے چنگل میں پھنسنے والے بدقسمت انسانوں کو ایک تنگ و تاریک باڑے میں بھیڑ بکریوں کی طرح پالا جاتا تھا۔ کسی خاص موقع یا تہوار کے دن خاندان کا بزرگ خوب چھان پھٹک کر موٹے تازے انسان کا انتخاب کرتا۔ یہ لوگ ایک تیز دھار آلے سے اس کے جسم کے کسی حصے پر زخم لگاتے اور پھر وہاں سے رسنے والے خون کو نہایت احتیاط سے کسی برتن میں محفوظ کرلیتے۔ اس مقدس مشروب کے کچھ حصے کو دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں بہا دیا جاتا۔ جبکہ باقی کے خون میں حصہ پانے کے لیے مقامیوں میں خوب گرما گرمی اور مارا ماری ہوتی۔ اُدھر خوف و دہشت اور خون کی کمیابی کی وجہ سے یرغمالی کو موت کسی بدروح کی طرح گھیر لیتی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا وزن کم اور رنگ لٹھے کی طرف سفید پڑتا جاتا۔ تب آدم خور قبائلی اپنے قیدی کے معاملے کو انجام تک پہنچانے کے لیے اسے ذبح کردیتے اور اس کے گوشت کی دعوت اُڑاتے۔

''ٹھیک ہے انہیں قریب آنے کا اشارہ کرو۔'' ایل

کانو نے اپنے راہنما سے کہا۔ ”آج شکاری خود شکار ہوگا۔“

کچھ ہی دیر میں مقامیوں کی چند کشتیاں وکٹوریا کے قریب پہنچ گئیں۔ ایل کانو نے دیکھا کہ کشتیوں میں لنگی باندھے سرخ آنکھوں والے بدصورت ماہی گیر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیشتر کے بھدے سیاہ جسموں پر سفید رنگ سے مختلف نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور انہوں نے سر پر بندھی ایک پٹی میں مختلف پرندوں کے پَر اُڑسے ہوئے تھے۔ بظاہر غیر مسلح دکھائی دینے والے مقامیوں کے ہاتھوں میں چند انچ لمبے چوڑے خالص سونے کے کچھ ٹکڑے تھے۔ انہوں نے وہ ٹکڑے لہراتے ہوئے سفید فاموں کو اپنے علاقے میں چلنے کی دعوت دی اور انکشاف کیا کہ ان کی سرزمین پر سونے کے ذخائر موجود تھے۔ ہسپانوی ملاحوں نے غور کیا کہ مقامی قبائلی انہیں ایک خاص وحشیانہ انداز سے گھور رہے تھے اور ان کی سرخ انگارہ آنکھوں میں انسانی خون کی بھوک واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔ ایل کانو نے اسپینی اوسا کو حکم دیا کہ وہ مقامیوں میں سے چند ایک کو گرفتار کرکے ان کا مال ضبط کرلے۔

”اور...... باقی لوگوں کا کیا کریں؟“ اسپینی اوسا نے پوچھا۔

”یہ درندے رحم کے قابل نہیں ہیں۔“ ایل کانو نے مقامیوں پر نظر جماتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”باقی سب حرامزادوں کو سمندر میں غرق کردو۔“

ایل کانو کا حکم ملتے ہی اس کے سپاہی حرکت میں آگئے۔ ان کی فائرنگ کے نتیجے میں مقامیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بیشتر لوگ مارے گئے جبکہ کچھ نے پھرتی دکھائی اور سمندر میں کود گئے۔ سپاہیوں نے اُن کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن وہ اگلے کئی منٹ تک بھی سطح سمندر پر نہیں اُبھرے۔ ایل کانو کو حیران دیکھ کر اس کے ایک راہنما نے بتایا کہ یہ آدم خور بلا کے تیراک اور غوطہ خوری کے ماہر تھے۔ گہرائی میں تیرتے ہوئے سیکڑوں میٹر کا فاصلہ طے کرلینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آدم خوروں سے نمٹنے کے بعد ایل کانو نے اپنے جہاز رانوں کو حکم دیا کہ وہ بغیر وقت ضائع کیے جنوب کے کھلے سمندر کی طرف بڑھیں۔ کچھ ہی گھنٹوں میں ہسپانوی قافلہ منڈاناؤ کے جنوب میں واقع بحیرہ سولاویسی میں داخل ہوا۔ لگ بھگ 800 کلومیٹر لمبے اور 900 کلومیٹر چوڑے بحیرہ سولاویسی کے شمال میں فلپائن کا جزیرہ منڈاناؤ، جنوب میں انڈونیشیا کا جزیرہ سولاویسی، مشرق میں بحرالکاہل کا کھلا سمندر، جنوب مشرق میں بحیرۂ ملوکا اور مغرب میں بورنیو کا جزیرہ واقع ہے۔ ایل کانو کے بحری جہاز فلپائنی جزائر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور تیزی سے جنوب کی طرف گامزن تھے۔ یہاں موسم گرم مرطوب اور جنوب مغرب کی طرف چلنے والی ہواؤں کی رفتار معمول سے زیادہ تھی۔ آبنائے بالاباک سے لے کر منڈاناؤ تک ایل کانو نے کچھ اس طرح کی حکمت عملی اپنائی تھی کہ عام ملاح اور سپاہی اُس کے فوری فیصلوں سے خوش دکھائی دیتے تھے۔ دونوں بحری جہاز اس کے مکمل کنٹرول میں تھے اور سینئر جہاز راں مارٹن مینڈز، اور اسپینی اوسا اس سے تعاون کررہے تھے۔

28 اکتوبر کے دن وہ لوگ خطِ استواء سے 3 ڈگری شمال اور 125 ڈگری مشرق کے خط پر واقع جزائر سانگ ہی کے قریب پہنچے۔ بحیرۂ سولاویسی اور بحیرۂ ملوکا کی سرحد پر واقع چار بڑے اور سو کے قریب چھوٹے ان جزائر کا کل زمینی رقبہ 810 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2010) آبادی 30 ہزار کے قریب ہے۔ لاوے سے بنے یہ استوائی جزائر انتظامی لحاظ سے انڈونیشیا کا حصہ ہیں۔ یہاں کی مشہور پیداوار میں ناریل اور جوز کے ساتھ ساتھ آبنوس اور بید کی قیمتی لکڑی نمایاں ہیں۔ ایل کانو نے سانگ ہی کے مرکزی جزیرے کے قریب شکار کررہے ماہی گیروں کی چند کشتیوں سے تازہ مچھلی اور جھینگوں کا لین دین کیا۔ اگلے دو دن کے دوران ہسپانوی قافلہ سانگ ہی کے دیگر چھوٹے جزائر کے برابر سے ہوکر جنوب کی طرف آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اکتوبر کے آخر میں انہوں نے بحیرہ سولاویسی کو پار کرکے انڈونیشیا کے جزیرے سولاویسی کا نظارہ کیا۔

☆☆☆

سولاویسی کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یہ جزیرا مالے اور انڈونیشیا کی حدود میں واقع چوتھا بڑا جزیرہ ہے جس کا کل زمینی رقبہ 1 لاکھ 89 ہزار 40 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2010) آبادی ڈیڑھ کروڑ کے قریب ہے۔ سولاویسی کے شمال میں بحیرہ سولاویسی، جنوب میں بحیرہ باندا، مشرق میں بحیرہ ملوکا اور مغرب میں آبنائے ماکاسار واقع ہے۔ دنیا کے نقشے پر سولاویسی کا جزیرہ کسی آکٹوپس کی طرح پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے چار جزیرہ نما لمبے بازوؤں میں سے دو مشرق کی طرف اور دو جنوب کی طرف باہر نکلے ہوئے ہیں۔ سولاویسی کے جنوبی حصے میں جزیرے کا دارالحکومت،

سب سے بڑا شہر اور معروف بندرگاہ ماکاسار واقع ہے جس کی موجودہ آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ سولاویسی بھی انڈونیشیا کے دیگر جزائر کی طرح گھنے استوائی جنگلوں سے اٹا ایک پہاڑی جزیرہ ہے۔ جزیرے کے طول و عرض میں متعدد زندہ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ جنوبی حصے میں جزیرے کا سب سے بلند مقام ماؤنٹ لومپو باٹانگ واقع ہے جس کی بلندی 9 ہزار 4 سو 19 فٹ ہے۔ جزیرے کے جنوبی حصے میں چھوٹے برساتی ندی نالوں کی کثرت ہے اور یہاں بہنے والا سب سے نمایاں دریا ساڈانگ ہے جس کی لمبائی 400 کلومیٹر کے قریب ہے۔ جزیرے کے وسطی حصے میں چند میٹھے پانی کی جھیلیں بھی واقع ہیں۔ ان جھیلوں میں جھیل پوسو اور جھیل ٹووٹی نمایاں ہیں۔ سولاویسی کا جزیرہ پام، کافی، چاول، تمباکو اور لونگ کی پیداوار کے لیے مشہور ہے جبکہ یہاں شاہ بلوط، دیودار اور بانس کی قیمتی لکڑی کے درخت بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں پائی جانے والی اہم معدنیات میں کوئلہ، کاپر اور سونا نمایاں ہیں۔ سولاویسی کو 1512ء میں پرتگالیوں نے دریافت کیا تھا۔ اس زمانے میں یہ جزیرہ کنگڈم آف ملاکا کی حدود میں شامل تھا اور یہاں توہم پرست شکاری قبائل مینا ہاسانس، بوگیس ماکاساریز اور ٹوراجا کی کئی شاخیں آباد تھیں۔

☆☆☆

اندازہ ہے کہ یکم نومبر 1521ء کی صبح ایل کانو کے بحری جہاز سولاویسی جزیرے کے شمالی حصے کے قریب پہنچے۔ ایل کانو کو اندازہ ہوگیا کہ اب وہ دشمن (پرتگال) کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ ایل کانو نے جزیرے کی مرکزی سرزمین کے قریب جانے کی بجائے کھلے سمندر میں لنگر گراتے ہوئے اسپینی اوسا کے ساتھ سپاہیوں کے ایک گروپ کو دو چھوٹی کشتیوں میں خشکی کی طرف روانہ کیا۔ ایل کانو اگلے چوبیس گھنٹوں تک وہیں رکا رہا۔ اس دوران اسپینی اوسا نے مقامی قبائل سے راستے کے لیے کچھ خشک خوراک اور چاول کا لین دین کیا۔ اگلے دن دوپہر کو سفر دوبارہ شروع ہوا اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے دونوں بحری جہاز بحیرہ ملوکا میں داخل ہوچکے تھے۔

لگ بھگ 650 کلومیٹر لمبے 850 کلومیٹر چوڑے بحیرہ ملوکا کے شمال میں بحرالکاہل، جنوب میں سولا کا جزیرہ، مشرق میں ٹرنیٹ اور ٹی ڈور کے جزیرے، شمال مغرب میں بحیرہ سولاویسی اور مغرب میں سولاویسی کا جزیرہ واقع ہے۔ بحیرہ ملوکا خطرے والا علاقہ تھا جہاں پرتگالی بحری بیڑے کی موجودگی کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ ایل کانو نے اپنے سپاہیوں کو چوکس رہنے اور قرب و جوار کے علاقے پر نظر رکھنے کا حکم دیا۔

یہ 4 نومبر کا حبس زدہ دن تھا۔ ایل کانو کے بحری جہاز سولاویسی کے جزیرے سے قریب 100 کلومیٹر مشرق میں موجود تھے کہ اچانک ہی موسم کے تیور بگڑنے لگے۔ بحرالکاہل کی طرف سے اٹھا ایک سمندری طوفان تیزی سے بحیرہ ملوکا کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ طوفان کی آمد کو محسوس کرتے ہی ملاح حرکت میں آگئے۔ اس دوران کالی گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر لیا اور ہواؤں کی رفتار بڑھنے لگی۔ ملاحوں نے بادبانوں کی ادلا بدلی شروع کی ہی تھی کہ تیز گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ چنگھاڑتی ہوئی تیز ہواؤں کے ساتھ لہروں کی بلندی خطرناک حدوں کو چھونے لگی۔ بحری جہازوں پر افراتفری سی مچ گئی اور وہ بپھری ہوئی لہروں کے رحم و کرم پر اِدھر سے اُدھر ڈولنے لگے۔ ایل کانو کو وکٹوریا سے زیادہ فکر ٹرینی ڈاڈ کی تھی، جس کی تازہ تازہ مرمت ہوئی تھی۔ اس مرحلے پر ٹرینی ڈاڈ کی ذرا سی بھی کمزوری سے پوری مہم داؤ پر لگ سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت بھی ان کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ لہروں کے وحشیانہ حملوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ٹرینی ڈاڈ طوفانی ہواؤں اور بلند ہوتی لہروں کے آگے بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ لہریں جب بھی اسے اپنے زور پر اوپر اٹھاتیں ایل کانو کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ معاملہ گمبھیر ہوتا دیکھ کر وکٹوریا پر سوار اس کے ملاح اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے کے لیے ٹرینی ڈاڈ کی طرف دیکھ کر چیخنے چلانے اور نعرے لگانے لگے۔ اُدھر ٹرینی ڈاڈ کے عملے نے بھی ایک نئے عزم کے ساتھ بھاگ دوڑ شروع کردی۔ سینئر جہاز راں میدان میں کود پڑا اور اس نے اپنا تجربہ آزمانا شروع کیا۔ لگ بھگ دو سے تین گھنٹے تک لہروں کے آگے سینہ سپر رہنے کے بعد ایسا لگنے لگا کہ جیسے اُن کی جدوجہد رنگ لارہی تھی۔ ہواؤں کی رفتار میں کمی واقع ہونا شروع ہوئی۔ لہریں دھیرے دھیرے پُرسکون ہونے لگیں اور طوفان مغرب میں سولاویسی کے جزیرے کی طرف بڑھتا محسوس ہونے لگا۔

6 نومبر کی صبح ہسپانوی ملاحوں نے بحیرہ ملوکا کے وسط میں واقع ایک چھوٹے سے جزیرے کا نظارہ کیا۔ یہ خط

استواء سے ایک ڈگری شمال اور 126 ڈگری مشرق پر واقع پاسر پوتھ کا جزیرہ تھا۔ ایل کانو نے جزیرے پر چند گھنٹوں کے مختصر قیام کے دوران ٹرینی ڈاڈ کا معائنہ کیا۔ اس نے پایا کہ جہاز کے تہ خانوں کے بعض جوڑ ہل گئے تھے اور وہاں سے پانی رس رہا تھا۔ وکٹوریا کی حالت کو بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چھ کلومیٹر لمبے اور اتنے ہی چوڑے پاسر پوتھ کے جزیرے پر ماہی گیروں کے چند مفلوک الحال خاندان آباد تھے۔ ایل کانو نے ان کے ساتھ بات چیت کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ملوکا سے صرف دو دن کی مسافت پر موجود تھا۔ اس نے وقت ضائع کرنے کی بجائے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اب ان کی اگلی منزل ملوکا کے جزائر تھے۔ خدشات اور اندیشوں کے بھنور میں گھرا ایل کانو پُرجوش لیکن فکر مند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

7 نومبر 1521ء کے دن ہسپانوی ملاحوں نے بحیرہ ملوکا کو پار کرکے مشرق میں شمالاً جنوباً پھیلے ہالماہیرا کے بڑے جزیرے کا نظارہ کیا۔ انہیں ہالماہیرا کے مغربی ساحل کے ساتھ دو چھوٹے جزیرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر واقع یہ ٹرنیٹ اور ٹی ڈور کے جزیرے تھے اور درحقیقت یہی اُن کی منزل تھی۔ ایل کانو نے کسی ایک جزیرے کی طرف بڑھنے کی بجائے فی الحال ٹرنیٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر کھلے سمندر میں لنگر گرادیے۔ وہ کسی بھی بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے یہ تسلی کرلینا چاہتا تھا کہ یہ جزیرہ پرتگالیوں کی عملداری میں تو نہیں؟ ایل کانو کی درخواست پر مارٹن مینڈز وکٹوریا پر آگیا جہاں انہوں نے باہمی مشاورت کے بعد اسپینی اوسا اور اس کے سپاہیوں کو دو چھوٹی کشتیوں پر ٹرنیٹ کی طرف روانہ کیا۔ لگ بھگ پانچ سے چھ گھنٹے کے تناؤ بھرے انتظار کے بعد اسپینی اوسا جزیرے سے چند مقامیوں کو لے کر واپس لوٹ آیا۔ ایل کانو کے پوچھنے پر مقامیوں نے بتایا چند سال پہلے انہی جیسے دکھائی دینے والے سفید فاموں نے ٹرنیٹ کا دورہ کیا تھا۔ ایل کانو سمجھ گیا کہ ٹرنیٹ کے ساتھ پرتگالیوں کے تجارتی معاہدے تھے۔ وہ کچھ بجھ سا گیا تاہم مقامیوں کے اس انکشاف کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک آگئی کہ ٹرنیٹ کے جنوب میں واقع ٹی ڈور کے سلطان کے ساتھ سلطان آف ٹرنیٹ کے اختلافات تھے اور ٹی ڈور ابھی تک سفید فاموں کی رسائی سے محفوظ تھا۔ ایل کانو نے ٹی ڈور کے بارے میں مزید پوچھ گچھ کی اور ایک فیصلے تک پہنچ گیا۔

''دوستو، میری رائے میں ہمیں ٹی ڈور کی طرف بڑھنا چاہیے۔'' ایل کانو نے اپنے سینئر ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔

''ہمیں ٹی ڈور کے سلطان کے ساتھ بات چیت میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔'' مارٹن مینڈز نے رائے دی۔ ''مقامیوں کی آپس کی دشمنی ایک بار پھر ہمارے لیے مسائل پیدا کرسکتی ہے۔''

''ٹھیک کہا۔'' ایل کانو نے مارٹن مینڈز کی تائید کی۔ ''ہم حکمتِ عملی سے کام لیں گے اور اپنی غرض پوری ہوتے ہی ٹی ڈور سے روانہ ہوجائیں گے۔''

☆☆☆

8 نومبر 1521ء کی صبح ہسپانوی بحری جہازوں نے لنگر اٹھائے اور ٹی ڈور کی طرف بڑھے۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ٹی ڈور کے قریب تھے۔ ملاحوں نے دیکھا کہ سطح سمندر سے باہر نکلی چند میٹر لمبی چوڑی چٹانوں نے جزیرے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ایل کانو کی قیادت میں دونوں بحری جہاز دھیرے دھیرے آگے بڑھے اور انہوں نے ٹی ڈور کے مغربی ساحل پر ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج ماریکو کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ غالباً ان کی ٹی ڈور آمد کی اطلاع وہاں پہلے ہی سے پہنچ چکی تھی۔ ایل کانو نے دیکھا کہ تلواروں اور بھالوں سے لیس لگ بھگ پچاس کے قریب مقامی سپاہی قطار در قطار وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ سپاہیوں کے دستے سے کچھ دور مقامی باشندوں کی ایک بھیڑ بھی جمع تھی۔ اس بھیڑ میں مرد عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ دلچسپی سے سفید فاموں اور ان کے بحری جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ ملاحوں کے بندرگاہ میں قدم رکھتے ہی مقامی سپاہیوں کے افسر نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں ٹی ڈور کے سلطان المنظور کی طرف سے جزیرے پر خوش آمدید کہا۔ مختصر سی استقبالیہ تقریب کے بعد ایل کانو نے اپنے ملاحوں کو بندرگاہ کے ایک محفوظ علاقے میں کیمپ لگانے سے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ ملاح اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تو اس نے مارٹن مینڈز سے درخواست کی کہ وہ سلطان المنظور سے ملاقات کے لیے شاہی محل جانے والے ہسپانوی وفد کی قیادت کرے۔

''یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' مارٹن مینڈز نے ایل کانو کے

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بردنائی سے یہاں تک ہماری قیادت کی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آگے بھی تم اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔'' مارٹن مینڈز نے تائید طلب نظروں سے کاروال ہو اور اسپینی اوسا کی طرف دیکھا جنہوں نے سر ہلا کر اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

ایل کانو اور اس کے تیس رکنی وفد کو ایک جلوس کی صورت میں سلطان المنظور کے محل لے جایا گیا۔ شاہی محل بندرگاہ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پہاڑی ڈھلان کے کنارے واقع تھا۔ ناریل کے گھنے درختوں سے گھرے ایک وسیع احاطے کے درمیان چونے پتھر سے بنی ایک محراب دار خوبصورت عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ بھاری جسم اور پستہ قد کا سلطان، سر پر سونے کا تاج اور ریشمی لباس زیب تن کیے محل کے مرکزی دروازے پر موجود تھا۔ سلطان نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ یورپین کا استقبال کیا۔ اس نے ایل کانو سے ہاتھ ملایا اور اس سے بغل گیر بھی ہوا۔ کچھ ہی دیر میں تمام لوگ ایک وسیع ہال میں موجود تھے۔ ایل کانو نے اپنے ساتھ لائے چند نوادرات اور کپڑے کے کچھ تھان بطور نذر سلطان کی خدمت میں پیش کیے۔ اُس نے سلطان کو واضح طور پر یہ بتایا کہ اس کا تعلق اسپین کی بحریہ سے ہے۔ وہ ہسپانوی فوج کے ہراول دستے کے طور پر یہاں پہنچا ہے اور اس کی یہاں آمد کا مقصد اسپین اور ٹی ڈور کے مابین تجارتی تعلقات استوار کرنا ہے۔

ایل کانو کی تقریر کے جواب میں سلطان المنظور نے خود کو اسپین کا دوست قرار دیتے ہوئے انکشاف کہ ماضی قریب میں پرتگالیوں نے ٹی ڈور کے ساتھ تجارتی معاہدہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے انکار کے بعد انہوں نے ٹی ڈور کے دشمن ٹرنیٹ کے ساتھ تعلقات قائم کرلیے۔ سلطان نے کہا کہ اسے اسپین کی دوستی پر فخر ہے اور مستقبل قریب میں دونوں ریاستوں کا اتحاد ان کے مشترکہ دشمنوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے گا۔ سلطان نے اپنے ہسپانوی دوستوں کو جزیرے پر گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی دیتے ہوئے حکم دیا کہ اُن کی خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

☆☆☆

ہسپانوی ملاحوں کی سلطان آف ٹی ڈور سے ہونے والی ملاقات بظاہر سود مند رہی تھی تاہم انہوں نے اندازہ لگایا کہ سلطان کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ انہیں مقامی سیاست میں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ بندرگاہ میں قائم اپنے کیمپ واپس پہنچ کر ایل کانو نے اپنے ساتھیوں پر واضح کیا کہ ٹی ڈور میں طویل قیام سے یہاں بھی سیبو جیسی صورت حال کے پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ لوگ کسی بھی صورت میں ٹرنیٹ کے خلاف محاذ آرائی کا حصہ نہیں بنیں گے اور جزیرے پر لین دین مکمل ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ ایل کانو نے دونوں بحری جہازوں کا معائنہ کرنے کے بعد ان کی مرمت سے متعلق ہدایات دیں اور فیصلہ کیا کہ خریدے گئے گرم مصالحے کی بڑی کھیپ کو ٹرینی ڈاڈ پر لادا جائے گا۔

ایل کانو کی ٹی ڈور آمد کے وقت وہاں پاپوان نسل کے بیس ہزار سے زیادہ قبائلی آباد تھے۔ عربوں، ہندوستانیوں اور چینیوں سے میل جول کی وجہ سے مقامی تہذیب میں ایشیائی رنگ نمایاں تھا۔ گو کہ مقامیوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ تاہم معاشرے میں توہم پرستی اور پیڑھی در پیڑھی چلی آرہی فرسودہ روایات کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ مقامیوں کے قد درمیانے، رنگ سیاہی مائل گندمی اور نقوش تیکھے تھے۔ مقامی لوگ ستر پوشی کے قائل تھے اور گرم مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے مرد عام طور پر لنگی جبکہ عورتیں سینے سے لے کر گھٹنوں تک ایک ساڑھی نما کپڑا باندھتی تھیں۔ یہاں کی سانولی لیکن پُرکشش عورتوں میں جنسی کشش نمایاں تھی۔ فلپائنی جزائر کی نسبت ملوکا میں عورتوں کے ساتھ کھلے عام جنسی تعلقات کے مواقع کم تھے۔ ٹی ڈور سمیت قرب و جوار کے تمام جزائر کی مقامی آبادی کا سب سے بڑا ذریعہ معاش زراعت اور ماہی گیری تھا۔ زمین بادشاہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ مقامی لوگ ان زمینوں پر گرم مصالحوں سمیت چاول، آلو اور مختلف قسم کی سبزیاں کاشت کرتے۔ اجناس کے تین حصے سرکاری اہل کار وصول کرلیتے جبکہ چوتھے حصے کی فروخت سے مقامی آبادی اپنا گزر بسر کرتی۔ ٹی ڈور کے اکلوتے لیکن پُررونق بازار میں ہر طرف لونگ، الائچی، جاوتری اور دارچینی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہاں پیدا ہونے والی لونگیں بردنائی کی نسبت انتہائی سستی تھیں۔ یہاں ہالماہیرا اور سولاویسی کے جزیروں سے لایا گیا خشک چاول بھی فروخت کے لیے موجود تھا۔ گرم مصالحوں کے علاوہ ٹی ڈور میں یورپین کی دلچسپی کا مرکز یہاں فروخت ہورہے خوبصورت پرندے تھے۔ اپنے خوش نما رنگوں اور سُریلی آوازوں کی وجہ سے یورپین نے ان پرندوں کو جنت کے پرندوں کا نام دیا۔ یہاں زندہ پرندوں

بحرِ ہند کرہ ارض پر واقع پانچ بڑے سمندروں میں بحرالکاہل اور بحراقیانوس کے بعد تیسرا بڑا سمندر ہے۔ یہ کرہ ارض کے باقی عظیم سمندروں کی نسبت گرم پانی کا سمندر کہلاتا ہے۔ بحرِ ہند، کرۂ ارض کے 14 فیصد اور یہاں واقع سمندروں کے 20 فیصد رقبے کو گھیرے ہوئے ہے۔ شمال میں کراچی کی بندرگاہ سے جنوب میں 60 ڈگری کے دائرے تک اس کی لمبائی 9 ہزار 4 سو کلو میٹر اور مشرق میں نیوگنی کے جزیرے سے مغرب میں تنزانیہ تک چوڑائی 11 ہزار کلومیٹر ہے۔ بحر ہند کا کل رقبہ 73.4 ملین مربع کلومیٹر ہے۔ جبکہ اس میں موجزن کھارے پانی کے ذخیرے کا اندازہ 269.3 ملین کیوبک کلومیٹر ہے۔ بحرِ ہند کے شمال میں برصغیر پاک و ہند، شمال مغرب میں مشرق وسطیٰ، شمال مشرق میں مالے کے جزائر، جنوب میں انٹارکٹیکا، مشرق میں براعظم آسٹریلیا اور مغرب میں براعظم افریقا واقع ہیں۔ یہ شمال مشرق میں بحیرہ جاوا، بحیرہ بانڈا اور بحیرہ تیمور کے ذریعے بحرالکاہل، جنوب مشرق میں بحیرہ تسمانیہ کے ذریعے بھی بحرالکاہل، جنوب میں 60 ڈگری کے دائرے پر بحر جنوبی اور جنوب مغرب میں راس امید کے قریب بحراوقیانوس سے ملا ہوا ہے۔ قدرتی سمندری راستوں کے علاوہ بحر ہند کی حدیں شمال مغرب میں افریقا اور ایشیا کی سرحد پر واقع نہر سویز کے راستے بحراوقیانوس (بحیرہ روم) سے ملتی ہیں۔ یاد رہے کہ نہر سویز کی لمبائی 163 کلومیٹر ہے اور اسے 17 نومبر 1869ء کے دن جہاز رانی کے لیے کھولا گیا تھا۔ بحر ہند کے ذیلی سمندروں میں بحیرہ عرب، خلیج بنگال، خلیج فارس، بحیرہ احمر، بحیرہ جاوا، خلیج اومان اور آبنائے موزمبیق نمایاں ہیں۔ بحر ہند کے شمال مشرقی حصے میں خطِ استواء سے 10 ڈگری شمال اور 110 ڈگری مشرق کے خط پر واقع جاوا کی گھاٹی اس سمندر کا سب سے گہرا مقام ہے۔ جس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 7125 میٹر یا 25344 فٹ ہے۔ بحر ہند میں واقع کل جزائر کی تعداد لگ بھگ 5 ہزار ہے۔ ان جزائر میں مڈغاسکر یا مالاگاسی کا جزیرہ سب سے بڑا ہے جس کا کل رقبہ 587041 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2010) آبادی 2 کروڑ کے قریب ہے۔ یہاں واقع باقی کے نمایاں جزائر میں سماٹرا، جاوا، سری لنکا، مالدیپ، لکادیپ، انڈیمان، نکوبار اور زین زی بار قابلِ ذکر ہیں۔

تاریخ میں پہلی بار بحرِ ہند میں سفر کرنے کے شواہد 116 سے 118 قبل مسیح میں ملتے ہیں جب ایک یونانی ملاح ڈوکسس آف سیزس نے بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب سے ہوتے ہوئے جنوبی ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس کے بعد پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں مصریوں اور جنوبی ہندوستان کی تامل تہذیب کے مابین انہی دونوں سمندروں کے راستے تجارت کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ 13 ویں صدی کے آخر میں مشہور اطالوی سیلانی مارکو پولو نے خلیج بنگال، بحیرہ عرب اور خلیج فارس کی سیاحت کی۔ 1342ء میں مراکش سے تعلق رکھنے والے مسلمان سیلانی ابن بطوطہ نے بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں سفر کیا۔ 1405ء میں چینی سپہ سالار ژینگ ہی نے اپنے 317 بحری جہازوں کے بیڑے کے ساتھ خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کو پار کرکے افریقا تک رسائی حاصل کی۔ 1498ء میں پرتگالی مہم جو واسکوڈے گاما وہ پہلا یورپین تھا جس نے راس امید کے گرد گھوم کر ہندوستانی سرزمین پر قدم رکھا۔

اقتباس: مہم جو، از طارق عزیز خان

کے ساتھ ساتھ بھس بھرے مردہ پرندے اور ان کے پر بھی دستیاب تھے۔ ایل کانو نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ان پرندوں کا یورپ کے ٹھنڈے ماحول میں زندہ رہنا مشکل تھا، چارلس اول کے لیے چند ایک مردہ پرندوں اور الگ سے کچھ رنگین پروں کا لین دین کیا۔

نومبر کے دوسرے عشرے کے دوران ایل کانو کی سلطان المنظور سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور تقریباً ہر ملاقات میں سلطان نے اسے ٹرنیٹ کے خلاف بھڑکایا۔ تاہم ایل کانو نے یہ کہہ کر سلطان کو ٹال دیا کہ ہسپانوی بیڑے کی آمد کے بعد سلطان کے دشمنوں سے نمٹ لیا جائے گا۔ سلطان نے ایل کانو سے اپنی متعدد بیویوں، کنیزوں اور قریب تین درجن بچوں سے بھی ملوایا۔ سلطان یہ سن کر حیران ہوا کہ ہسپانوی بحری جہازوں پر عورتوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

ٹی ڈور میں بحری جہازوں کی مرمت اور گرم مصالحوں کی خریداری کے معاملات چل رہے تھے کہ اس دوران ملاحوں کو ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ یہاں کے شدید حبس، چپچپاتی فضا اور مچھروں کی بھرمار نے اُنہیں بیمار کردیا۔ مکھی سے بھی بڑے یہاں کے مچھروں کے ڈنک بھڑوں کے ڈنک سے کم نہیں تھے۔ وہ جہاں کاٹتے وہ جگہ سوج جاتی اور پھر متاثرہ حصے میں خارش شروع ہوجاتی۔ ان کی ہر رات مچھروں سے جنگ کرتے ہوئے گزرتی۔ مچھر غول در غول حملہ آور ہوتے اور ملاحوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتے۔ ابتدائی چند دنوں کے دوران ہی دو درجن سے زیادہ ملاحوں کو خارش اور بعض کو آشوب چشم کی بیماری لاحق ہوگئی۔ اُنہوں نے مقامی جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج معالجہ کیا۔ جس سے انہیں کچھ نا کچھ افاقہ تو ضرور ہوا لیکن مسلسل بے آرامی اور نیند کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوتا چلا گیا۔ محض دو ہفتوں ہی میں گرمی سے ستائے ملاحوں نے ایل کانو سے وطن واپسی کا مطالبہ کرنا شروع کردیا۔

☆☆☆

نومبر کے تیسرے عشرے کے دوران ہسپانوی مہم جوؤں کی ٹی ڈور میں سرگرمیوں کی خبریں قریب قریب واقع تمام جزائر تک پہنچ چکی تھیں۔ ٹی ڈور میں سیر سپاٹے کے دوران ہمسایہ جزیرے ٹرنیٹ سے تعلق رکھنے والے چند مقامیوں نے ایل کانو سے خفیہ ملاقات کی۔ انہوں نے ایل کانو کو سلطان آف ٹرنیٹ کے ساتھ ملاقات کا پیغام دیا۔ ایل کانو کو یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ پرتگالیوں کا اتحادی سلطان اس کے ساتھ تجارتی معاہدے کا خواہش مند تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ دونوں سلطان علاقے میں اپنی اپنی بالادستی چاہتے تھے۔ ایل کانو کے ٹال مٹول کے بعد ایک رات اُسے خفیہ اطلاع دی گئی کہ بندرگاہ میں ٹرنیٹ سے آئے کچھ یورپین اُس کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ایل کانو آدھی رات کے بعد ہتھیار بند سپاہیوں کے ساتھ مقررہ جگہ پر پہنچا جہاں مقامی ماہی گیر کے بھیس میں ایک سفید فام نے اُس کے ساتھ ملاقات کی۔ آنے والے نے پیڈرو الفانسو ڈی لوروسا (Pedro Alfonso de Lorosa) کے نام سے اپنا تعارف کروانے کے بعد بتایا کہ چند سال پہلے وہ فرانسسکو سیراؤ (میگلن کا پرانا دوست) کے ساتھ ٹرنیٹ پہنچا تھا۔

"جہاں تک میری معلومات ہیں..... ہسپانوی بیڑے کی قیادت میگلن کے پاس تھی؟" الفانسو نے سوالیہ نظروں سے ایل کانو کی طرف دیکھا۔

"وہ سیبو میں مقامی جنگجوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔" ایل کانو نے میگلن کی ہلاکت کی مختصر سی تفصیل بتائی۔

"سن کر افسوس ہوا۔" الفانسو نے تاسف سے سر ہلایا۔ "میں نے کئی سال اس کے ساتھ کام کیا تھا..... وہ ایک بہادر کپتان تھا۔"

"کیا میگلن کا دوست فرانسسکو سیراؤ اس وقت بھی ٹرنیٹ میں موجود ہے؟" ایل کانو نے پوچھا۔

"نہیں..... سیراؤ بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔" الفانسو نے انکشاف کیا۔ "سلطان المنظور نے ٹرنیٹ میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے فرانسسکو سیراؤ کو زہر دے کر ہلاک کروادیا تھا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" ایل کانو نے الفانسو کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ ملوکا کے جزائر پرتگال کی ملکیت ہیں۔ تم لوگوں کی یہاں آمد دنیا کی تقسیم کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پرتگالی بیڑے کی آمد سے پہلے پہلے یہاں سے کسی بھی قسم کا لین دین کیے بغیر چپ چاپ روانہ ہوجاؤ۔"

"میں خود بھی یہاں زیادہ دیر تک رکنے کے حق میں نہیں ہوں۔" ایل کانو نے کہا۔ "سلطان المنظور ہمیں سلطان آف ٹرنیٹ کے خلاف کارروائی کرنے پر اکسا رہا ہے اور ہم ---- اسے کوئی واضح جواب دیے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"یہاں کا کوئی بھی حکمران بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ میگلن کا دوست ہونے کے ناتے میں یہی مشورہ دونوں گا کہ تم جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے نکل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" ایل کانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں اپنے ساتھیوں سے بات کرتا ہوں۔“

☆☆☆

پیڈرو الفانسو سے ملاقات کے بعد ایل کانو نے ٹی ڈور سے نکلنے کا پروگرام بنالیا۔ دسمبر 1521ء کے شروعاتی دنوں میں کاروال ہو اور مارٹن مینڈز نے مقامی بازار سے کل ملا کر 26 ٹن کے قریب گرم مصالحے کی خریداری مکمل کی جس کا زیادہ تر حصہ لونگوں پر مشتمل تھا۔ اس وقت تک ٹرینی ڈاڈ کی مرمت کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ ایل کانو نے دو من کے قریب لونگوں کے چھوٹے چھوٹے پارسلوں کو وکٹوریا پر لوڈ کرنے کے بعد باقی کا تمام گرم مصالحہ ٹرینی ڈاڈ کے تہ خانوں میں محفوظ کروادیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایل کانو نے راستے کے لیے خشک خوراک کے طور پر پندرہ من چاول، دو من خشک کھوپرا، مونگ پھلی، مقامی پھلوں سے کشید کی گئی شراب اور چند زندہ جانوروں کا لین دین کیا۔ روانگی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں کہ تب ہی سلطان المنظور نے ایل کانو کو ملاقات کا پیغام بھجوایا۔ سلطان نے ایل کانو کو بتایا کہ اس کے پاس بعض ایسی اطلاعات ہیں کہ سلطان آف ٹرنیٹ نے بحیرہ ملوکا کی حدود میں اُن کے بحری جہازوں کی چھیڑ چھاڑ کا منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ سلطان المنظور نے ایل کانو کو سلطان آف ٹرنیٹ کے خلاف اکسایا اور کہا کہ موجود حالات میں اُن کا ٹی ڈور سے روانہ ہو جانا مناسب نہیں تھا۔ ایل کانو نے ٹال مٹول سے کام لیا اور سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔

”سب بکواس ہے۔“ اسپنی اوسا نے کہا۔ ”مجھے تو خود سلطان المنظور کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔“

”جہنم میں جائے سلطان، اگر ہم رات کے اندھیرے میں لنگر اٹھادیں تو......“

”نہیں......“ ایل کانو نے فرانسسکو ایل بو کی بات کاٹی۔ ”میری رائے میں ہمیں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے کہ جس سے سلطان ناراض ہو جائے۔“

اگلے دو تین دن تک ہسپانوی جہاز رانوں کے درمیان ٹی ڈور سے لنگر اٹھانے کے معاملے پر بات چیت ہوتی رہی لیکن وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ حقیقت یہ تھی کہ ملوکا کے جزائر میں پرتگالی بیڑے کی دوبارہ آمد کی افواہیں سرگرم تھیں۔ سلطان المنظور چاہتا تھا کہ پرتگالیوں کی آمد سے پہلے پہلے ایل کانو کی مدد سے اپنے مقامی دشمن کے معاملے کو انجام تک پہنچا دے۔ پرتگالیوں کی آمد کے بعد وہ بڑی آسانی سے سلطان آف ٹرنیٹ کے قتل کا الزام ہسپانوی مہم جوؤں کے سر تھوپ سکتا تھا۔ اُدھر سیبو کے خونی تجربے کے بعد ایل کانو اور اس کے ساتھی مقامی سیاست میں الجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ پرتگالیوں کے اتحادی سلطان آف ٹرنیٹ کے خلاف کارروائی آسان نہیں تھی۔ پرتگالی جو پہلے ہی ہسپانوی بیڑے کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ٹرنیٹ کے معاملے میں دخل اندازی سے اشتعال میں آسکتے تھے۔

ایل کانو کشمکش میں تھا کہ اس دوران ٹرنیٹ کے ولی عہد کی ٹی ڈور کے خفیہ دورے کی افواہیں سرگرم ہو گئیں۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دو دشمنوں کی یہ خفیہ ملاقات ہسپانوی ملاحوں کے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھی۔ ایل کانو کو ٹی ڈور میں موجود بعض عرب ذرائع نے یہ سنسنی خیز خبر پہنچائی کہ ولی عہد ٹرنیٹ نے سلطان المنظور کو یہ پیش کش کی ہے کہ اگر وہ ہسپانوی مہم جوؤں کو قتل کروادے تو نہ صرف یہ کہ دونوں ریاستوں کے مابین دوستی کے نئے دور کا آغاز ہوگا بلکہ مستقبل میں پرتگالیوں سے ہونے والے معاہدوں میں بھی ٹی ڈور کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ایل کانو کو بتایا گیا کہ بعض مقامی سردار بھی سلطان آف ٹرنیٹ کو کچھ ایسی ہی پٹی پڑھانے میں معروف تھے۔ یہ خبریں سن کر ایل کانو کی پریشانی بڑھ گئی۔ اس نے فوری طور پر اپنے ساتھیوں کے مقامی بازاروں میں آزادانہ گھومنے پھرنے پر پابندی لگادی اور اپنے کیمپ کے گرد سپاہیوں کا پہرا سخت کردیا۔

دسمبر کے دوسرے عشرے کے آغاز پر حالات جوں کے توں تھے کہ اس دوران جنوبی جزیرے باکان کے ہندو راجا نے ٹی ڈور کا سرکاری دورہ کیا۔ راجا باکان نے سلطان المنظور سے کہا کہ اسپین اور پرتگال دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہیں جن کے درمیان ملوکا کے جزائر کی ملکیت کو لے کر تنازعہ چلا آرہا ہے۔ راجا نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ دونوں طاقتوں کے درمیان چل رہی رسا کشی سے دور رہے اور ایل کانو کو بخوشی ٹی ڈور سے جانے کی اجازت دے دے۔ سلطان کی رضامندی کے بعد راجا باکان نے ایل کانو سے ملاقات کی اور اسے سلطان المنظور کی طرف سے تجدیدِ دوستی کا پیغام پہنچاتے ہوئے کہا کہ وہ جب چاہے یہاں سے روانہ ہو سکتا ہے۔ ایل کانو نے راجا باکان کا شکریہ ادا کیا اور اسے تحفے کے طور پر کچھ نوادرات اور جنت کے پرندوں کے خوبصورت پر پیش کیے۔

☆☆☆

راجا باکان سے ملاقات کے فوراً بعد ایل کانو نے اپنے ساتھیوں کو ملوکا کے جزائر سے یورپ واپسی کا گرین سگنل دے دیا۔ واپسی کے روٹ سے متعلق اس نے یہ پالیسی طے کی کہ وہ بحیرہ ملوکا اور بحیرہ سولا دیسی سے ہوتے ہوئے منڈاناؤ کے شمال مشرقی حصے تک رسائی حاصل کریں گے اور پھر وہاں سے مزید خوراک حاصل کرنے کے بعد مشرق میں بحرالکاہل کے کھلے سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔ دسمبر کے وسط میں دونوں بحری جہاز ٹی ڈور چھوڑنے کے لیے تیار تھے کہ تب ہی ایک گڑبڑ ہو گئی۔ روانگی سے ایک دن پہلے ایک ملاح نے پندرہ بیس چوہوں کو تیزی سے ٹرینی ڈاڈ کے تہ خانے سے باہر آتے دیکھا۔ بحری جہاز پر چوہا دیکھنا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن حیرت انگیز طور پر تہ خانے سے باہر آنے والے تمام چوہے گیلے تھے۔ ملاح نے جانچ پڑتال کے لیے تہ خانے کا رخ کیا جہاں کا منظر اُس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ تہ خانے میں بھرتے پانی کو دیکھ کر اُس نے شور مچا دیا۔ جہاز پر بھگدڑ مچ گئی۔ ملاح حرکت میں آگئے اور انہوں نے ٹرینی ڈاڈ کے تہ خانوں میں لادے گئے گرم مصالحے کو تیزی سے باہر نکالنا شروع کردیا۔

اس دوران مارٹن مینڈز اور ایل کانو نے جہاز کا معائنہ کرنے کے دوران پایا کہ وہاں پانی کی سطح دھیرے دھیرے بلند ہو رہی تھی اور معاملہ ان کی توقع سے زیادہ گمبھیر تھا۔ حقیقت یہ تھی ٹرینی ڈاڈ کے تہ خانے 26 ٹن وزنی گرم مصالحے کا بوجھ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ غالباً گرم مصالحہ لوڈ کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ شام تک ٹرینی ڈاڈ سے تمام سامان باہر نکالنے کے بعد وہاں موجود تہ خانوں کے چھید عارضی طور پر بند کردیے گئے تھے۔ اگلی صبح ایک بار پھر جہاز کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ اس جانچ پڑتال کے دوران یہ واضح ہو گیا کہ ٹی ڈور سے ان کی روانگی کم از کم دو ماہ کے لیے موخر ہو گئی تھی۔ ٹرینی ڈاڈ کے بعض حصے مرمت کے قابل نہیں تھے اب ان حصوں کو نئے سرے سے تیار کرنا تھا۔

ملاحوں میں بھی بددلی سی پھیل گئی اور سینئر جہاز رانوں میں بحث ہونے لگی کہ نئے حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ یہ بات تو طے تھی کہ دونوں بحری جہازوں کے بیک وقت ٹی ڈور میں رکے رہنے سے نہ صرف مہم کے اخراجات میں اضافہ ہو جاتا بلکہ سلطان المنظور کے رویّے کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی امکان تھا کہ اس کے دماغ میں ٹرنیٹ دشمنی کا کیڑا ایک بار پھر کلبلانے لگتا۔ جہازوں کا عملہ یہ بات بھی سمجھ رہا تھا کہ اکیلا وکٹوریا خوراک اور گرم مصالحے کے ساتھ سو سے زیادہ ملاحوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ وکٹوریا کا ڈیزائن کچھ اس طرح کا تھا کہ اُس پر محدود سامانِ تجارت اور ضروری سامان کے ساتھ ٹھونس ٹھانس کر زیادہ سے زیادہ 70 ملاحوں کے سوار ہونے کی گنجائش تھی۔ اب جہاز رانوں کے سامنے ایک ہی سوال تھا کہ اگر آدھے ملاحوں کے ساتھ وکٹوریا کو جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا وہ ٹرینی ڈاڈ کی مدد کے بغیر بحرالکاہل میں تن تنہا ایک طویل سفر کا بوجھ برداشت کر پائے گا؟ اس سوال کا حقیقت پر مبنی جواب یہ تھا کہ مسلسل دو سال تک کھارے پانی اور موسموں کے مختلف مزاجوں کو براداشت کرنے کے بعد خود وکٹوریا کی حالت بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ انہیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ بحرالکاہل کے طویل راستے سے وکٹوریا کی روانگی کا مطلب آدھے ملاحوں کی زندگی کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ معاملہ سلجھنے کی بجائے الجھ گیا تھا۔ کیا وکٹوریا کی روانگی بھی موخر کردی جائے؟ یا پھر.... بحرالکاہل میں سفر کا خطرہ مول لیا جائے؟ بحث جاری تھی کہ ایسے میں ایل کانو نے رائے دی کہ اب سوائے اس کے کوئی حل نہیں کہ مشرق کے طویل راستے کی بجائے مغرب کے شارٹ کٹ پر غور کیا جائے۔

کیا مطلب؟“ کاروال ہو نے چونک کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ ہمارے پاس وکٹوریا کو بحرِ ہند کے راستے اسپین واپس لے جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ایل کانو نے جواب دیا۔

بحر ہند میں سفر کا سن کر ملاحوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا کی تقسیم کے معاہدے کی رو سے بحر ہند پرتگالی علاقہ مانا جاتا تھا جہاں ہسپانوی بحری جہازوں کی آمد و رفت غیر قانونی تھی۔ اگر بحر ہند میں سفر کے دوران وہ پرتگالیوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو انہیں زندہ وطن لوٹنا نصیب نہ ہوتا۔ بحر ہند میں سفر سے خائف ملاحوں کی رائے میں دشمن کی ناک کے عین نیچے سفر کرنے سے بہتر تھا کہ ٹی ڈور ہی میں رک کر خطرات کا مقابلہ کیا جائے۔ ایل کانو کی رائے تھی کہ یورپ سے مالے کے جزائر آنے والے پرتگالیوں کے بحری جہاز راس امید کو پار کرنے کے بعد افریقا کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے پہلے جنوبی

ہندوستان کی بندرگاہوں تک جاتے تھے اور پھر وہاں سے خلیج بنگال کے راستے مالے کے جزائر آتے تھے۔

''بحر ہند کے وسطی حصے میں براہِ راست جنوب مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے ہمارا پرتگالی بحری جہازوں سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' ایل کانو نے کہا۔

''راس امید کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟'' سینئر جہاز راں میگوئل ڈمی روڈاس نے سوال کیا۔ ''جنوبی افریقا میں پرتگالی چیک پوسٹ کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں نے اس بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں سوچا کہ ہم رات کے اندھیرے میں راس کو پار کرنے کی کوشش کریں گے۔'' ایل کانو نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔ ''اور دوسری بات یہ کہ..... خطرہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرے ہوئے چوہے کھانے سے دشمن کی توپ کے گولے کھانا زیادہ بہتر ہے۔ اگر ہمیں اپنے پیاروں تک جلد از جلد پہنچنا ہے تو ہمیں ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ایل کانو کی رائے سب سے بہتر ہے۔'' مارٹن مینڈز نے اپنا فیصلہ سنایا۔

پیگافی ٹا کے مطابق گرم موسم اور مچھروں کے ستائے ہوئے ملاحوں کے ایک گروپ نے ایل کانو کے فیصلے کی تائید کی۔ مارٹن مینڈز کی حمایت کے بعد یہ طے ہوگیا کہ ٹرینی ڈاڈ کچھ عرصے کے بعد بحرالکاہل کے راستے جبکہ وکٹوریا چار سے پانچ روز میں بحر ہند کے راستے اسپین واپس روانہ ہوجائے گا۔ اب ٹرینی ڈاڈ اور وکٹوریا سے جانے والے ملاحوں کی فہرست تیار کی گئی۔ کل 115 یورپین ملاحوں میں سے 4 کا بطور ہسپانوی نمائندوں کے ٹی ڈور میں تقرر کردیا گیا۔ چند گھنٹوں کی بحث مباحثہ کے بعد مارٹن مینڈز، کاروال ہو اور اسپینی اوسا سمیت 55 ملاحوں نے ٹرینی ڈاڈ کے ساتھ ٹی ڈور میں رکنا منظور کرلیا جس کے بعد وکٹوریا کے ساتھ جانے والے 5 ملاحوں کی فہرست کو حتمی شکل دے دی گئی۔

ایل کانو کی قیادت میں وکٹوریا کے ساتھ اسپین جانے والوں میں اطالوی مورخ پیگافی ٹا، سینئر جہاز راں فرانسسکو ایل بو، میگوئل ڈی روڈاس، جوآن ڈی ایکوریو، خدمت گاروں کا سربراہ مارٹن ڈی جوڈی بس، دیگر ملاحوں میں ہرنانڈو ڈی بسٹامینٹے، نکولس دی گریک، جوآن ڈی اریٹیا اور ڈیا گو کارمینا نمایاں تھے۔ دونوں بحری جہازوں کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد اب بھی وکٹوریا کی فہرست میں شامل بعض ملاح بحر ہند میں سفر کو لے کر تحفظات رکھتے تھے۔ ایسے ملاحوں میں سے تین غیر ہسپانوی ملاحوں (ممکنہ طور پر اٹلی سے تعلق) نے وکٹوریا پر سفر کرنے سے انکار کردیا۔ انہوں نے ٹرینی ڈاڈ میں گنجائش نہ پا کر یورپ جانے کی بجائے مستقل طور پر ٹی ڈور میں رکنا منظور کیا۔ اب وکٹوریا کے ساتھ جانے والے یورپین ملاحوں کی کل تعداد 53 رہ گئی۔

واپسی کے معاملات طے ہوجانے کے بعد مارٹن مینڈز نے اپنے پاس موجود راہنمائی کے سامان میں سے آدھا سامان اور خوراک کی صورت میں چاول کا ایک بڑا حصہ ایل کانو کی تحویل میں دے دیا۔ یاد رہے کہ وکٹوریا پر اس سامان کے علاوہ تقریباً دو من یا سو کلوگرام کے قریب چھوٹے چھوٹے پارسلوں کی صورت میں لونگیں بھی لوڈ تھیں۔

اس سامان کے علاوہ ایل کانو نے چارلس اول کے لیے کچھ نوادرات اور جنت کے پرندوں کے کچھ رنگین پر بطور تحفہ ساتھ لے لیے تھے۔ سلطان المنظور کو روانگی کی اطلاع دینے کے بعد ایل کانو نے اگلے چند دن جنوبی علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے گزارے۔ اُس نے ٹی ڈور سے 7 ایسے مقامی ملاحوں کا انتخاب بھی کیا جو اس سے پہلے جنوبی جزائر کو پار کرکے بحرِ ہند تک گئے تھے۔ راہنمائی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ مقامی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ ہسپانوی بحری جہاز کو محفوظ راستے سے بحرِ ہند تک پہنچا دیں گے۔

☆☆☆

20 دسمبر کی رات ٹی ڈور میں رکنے اور جانے والے ہسپانوی ملاحوں نے آخری بار مل کر رات کا کھانا کھایا۔ دونوں طرف کے ملاح افسردہ تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ اب وہ ایک دوسرے سے دوبارہ کب ملیں گے؟ ٹی ڈور میں رکنے والے بیشتر لوگوں نے واپس جانے والے ساتھیوں کو وطن میں موجود اپنے پیاروں کے نام پیغامات اور تحائف دیے۔ کھانے کے بعد سینئر جہاز رانوں کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ کاروال ہو نے ایل کانو کو بحر ہند میں واپسی کے سفر اور چارلس اول سے ملاقات سے متعلق کچھ مفید مشورے دیے۔ ملاحوں کی یہ رات ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھتے گزر گئی۔

21 دسمبر 1521ء کی صبح ٹی ڈور کی بندرگاہ میں اختتامی دعائیہ تقریب منعقد کی گئی۔ ایل کانو اور اس کے عملے نے بندرگاہ میں کھڑے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملائے اور وکٹوریا پر سوار ہوگئے۔ جہاز کا لنگر اٹھالیا گیا اور وہ دھیرے دھیرے گہرے پانی کی طرف کھسکنے لگا۔ جہاز پر کھڑے ملاحوں نے خشکی پر ہاتھ ہلاتے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر پُرجوش نعرے لگائے اور ایک دوسرے کو دُور ہوتا دیکھنے لگے۔ دوپہر ہوتے ہوتے انہوں نے ٹی ڈور کے جزیرے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ بحیرہ ملوکا کے کھلے سمندر میں جنوب کی طرف گامزن تھے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران وکٹوریا نے ماکیان اور چند دیگر چھوٹے چھوٹے جزائر کے قریب سے ہوتے ہوئے خطِ استواء پار کیا۔ 23 دسمبر کی صبح وہ خطِ استواء سے 0.30 ڈگری جنوب اور 127.30 ڈگری مشرق کے خط پر واقع جزائر باکان کے قریب تھا۔

جہاز کے عملے نے یہاں چار بڑے اور درجنوں چھوٹے چھوٹے سرسبز جزائر کا نظارہ کیا۔ ایل کانو نے 80 کلومیٹر لمبے اور قریب 25 کلومیٹر چوڑے باکان کے مرکزی جزیرے پر رکنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مقامیوں کی راہنمائی میں ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج کوسوکی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ باکان وہی جزیرہ تھا جس کے حکمران نے چند دن پہلے ٹی ڈور کا دورہ کرکے سلطان المنظور سے ہسپانوی ملاحوں کی گلو خلاصی کروائی تھی۔ جزیرے پر ایک ہفتے کے قیام کے دوران ایل کانو نے راجا باکان سے ملاقات کی۔ اس نے اپنی منزل کے بارے میں راجا کے سوالوں کا گول مول جواب دیا۔ کرسمس کے دن وکٹوریا پر منعقد دعائیہ تقریب میں ملاحوں نے اپنے محفوظ سفر کے لیے خصوصی دعائیں کیں۔

یکم جنوری 1522ء کے دن وکٹوریا نے باکان سے لنگر اٹھائے اور دو چھوٹے جزائر کے برابر سے ہوتا ہوا جنوب کے کھلے سمندر کی طرف بڑھا۔ تین جنوری کی شام وہ خطِ استواء سے 1.30 ڈگری جنوب کے خط پر واقع جزائر اوبی کے قریب پہنچا۔ ملاحوں نے بہت دور سے اوبی اور اس کے مغرب میں واقع چند چھوٹے چھوٹے جزائر کا نظارہ کیا۔ وکٹوریا پر سوار ٹی ڈورین راہنماؤں نے بتایا کہ اب ان کے جنوب میں چند گھنٹوں کی مسافت پر ڈیڑھ سو کلومیٹر لمبا اور قریب اتنا ہی چوڑا ایک سمندری ٹکڑا تھا جسے پار کرکے وہ بحیرہ باندا اور پھر بحر ہند کے کھلے سمندر میں داخل ہوجاتے۔

اس چوکور سمندری ٹکڑے کے شمالی کناروں پر اوبی اور سولا جبکہ جنوب میں سیرام اور بورو کے جزائر واقع تھے۔ مقامی راہنماؤں نے ایل کانو کو خبردار کیا کہ یہی ان کے سفر کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ انہیں اس سمندری ٹکڑے کو پار کرکے سیرام اور بورو کے درمیان واقع ایک تنگ سمندری شاہراہ میں سے گزر کر بحیرہ باندا میں داخل ہونا تھا۔ اس سمندری شاہراہ کے مشرقی دروازے پر ایمبون کی بندرگاہ واقع تھی۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں پرتگالی بیڑے کی موجودگی کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایل کانو سوچ میں گم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس مقام پر اندازے کی معمولی سی غلطی انہیں سیدھا دشمن کی ناک کے عین نیچے پہنچا سکتی تھی۔ اس نے اپنے جہاز رانوں کو سمجھایا کہ انہیں براہِ راست جنوب میں جانے کی بجائے پہلے مغرب اور پھر جنوب مشرق کی طرف واپس آتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوبی سمندری شاہراہ میں داخل ہونا تھا۔

''دوستو، اس طرح ہم تین دن کا سفر ایک ہفتے میں طے کریں گے لیکن ایک ہفتے کی یہ احتیاط ہماری کامیابی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔'' ایل کانو نے کہا۔

ایل کانو کے اشارہ کرتے ہی ملاحوں نے بادبانوں کی پوزیشن میں ادلا بدلی شروع کردی جس کے بعد وکٹوریا کا رخ مغرب کی طرف ہوگیا۔ چھ جنوری کی صبح وہ لوگ خطِ استواء سے 2 ڈگری جنوب اور 126 ڈگری مشرق کے خط پر جزائر سولا کے قریب تھے۔ اس مقام پر انہیں چوڑائی کے رخ پر واقع منگولے اور اس کے جنوب میں لمبائی کے رخ پر پھیلا سانانا کا جزیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایل کانو نے کسی بھی جزیرے کی طرف جانے کی بجائے بغیر وقت ضائع کیے جہاز کا رخ جنوب کی طرف کردیا۔ اگلے دو دن کے دوران پُرسکون سمندر، ابر آلود موسم اور پل پل رخ بدلتی ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے وہ لوگ خطِ استواء سے 3 ڈگری جنوب میں بورو کے جزیرے کے قریب پہنچے۔ اب اُنہیں اس جزیرے کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مشرق کی طرف بڑھنا تھا۔ ایل کانو نے کھلے سمندر میں لنگر گرا کر ایک دن آرام کرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا۔ آنے والے دنوں میں وقفے وقفے سے ہونے والی موسلا دھار بارش میں وکٹوریا مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اندازہ ہے کہ گیارہ جنوری کے دن جہاز کے عملے نے بورو کے شمال مشرقی

ہندوستان کی بندرگاہوں تک جاتے تھے اور پھر وہاں سے خلیج بنگال کے راستے مالے کے جزائر آتے تھے۔

''بحرِ ہند کے وسطی حصے میں براہِ راست جنوب مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے ہمارا پرتگالی بحری جہازوں سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' ایل کانو نے کہا۔

''راس امید کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟'' سینئر جہاز راں میگوئل ڈی روڈاس نے سوال کیا۔ ''جنوبی افریقا میں پرتگالی چیک پوسٹ کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں نے اس بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں سوچا کہ ہم رات کے اندھیرے میں راس کو پار کرنے کی کوشش کریں گے۔'' ایل کانو نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔ ''اور دوسری بات یہ کہ...... خطرہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرے ہوئے چوہے کھانے سے دشمن کی توپ کے گولے کھانا زیادہ بہتر ہے۔ اگر ہمیں اپنے پیاروں تک جلد از جلد پہنچنا ہے تو ہمیں ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ایل کانو کی رائے سب سے بہتر ہے۔'' مارٹن مینڈز نے اپنا فیصلہ سنایا۔

پیگافی ٹا کے مطابق گرم موسم اور مچھروں کے ستائے ہوئے ملاحوں کے ایک گروپ نے ایل کانو کے فیصلے کی تائید کی۔ مارٹن مینڈز کی حمایت کے بعد یہ طے ہوگیا کہ ٹرینی ڈاڈ کچھ عرصے کے بعد بحرالکاہل کے راستے جبکہ وکٹوریا چار سے پانچ روز میں بحرِ ہند کے راستے اسپین واپس روانہ ہوجائے گا۔ اب ٹرینی ڈاڈ اور وکٹوریا سے جانے والے ملاحوں کی فہرست تیار کی گئی۔ کل 115 یورپین ملاحوں میں سے 4 کا بطور ہسپانوی نمائندوں کے ٹی ڈور میں تقرر کردیا گیا۔ چند گھنٹوں کی بحث مباحثہ کے بعد مارٹن مینڈز، کاروال ہو اور اسپینی اوسا سمیت 55 ملاحوں نے ٹرینی ڈاڈ کے ساتھ ٹی ڈور میں رکنا منظور کرلیا جس کے بعد وکٹوریا کے ساتھ جانے والے 5 ملاحوں کی فہرست کو حتمی شکل دے دی گئی۔

ایل کانو کی قیادت میں وکٹوریا کے ساتھ اسپین جانے والوں میں اطالوی مورخ پیگافی ٹا، سینئر جہاز راں فرانسسکو ایل بو، میگوئل ڈی روڈاس، جوآن ڈی ایکوریو، خدمت گاروں کا سربراہ مارٹن ڈی جوڈی بس، دیگر ملاحوں میں ہرنانڈو ڈی بستامینٹے، نکولس دی گریک، جوآن ڈی اریٹ اور ڈیاگو کارینا نمایاں تھے۔ دونوں بحری جہازوں کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد اب بھی وکٹوریا کی فہرست میں شامل بعض ملاح بحرِ ہند میں سفر کو لے کر تحفظات رکھتے تھے۔ ایسے ملاحوں میں سے تین غیر ہسپانوی ملاحوں (ممکنہ طور پر اٹلی سے تعلق) نے وکٹوریا پر سفر کرنے سے انکار کردیا۔ انہوں نے ٹرینی ڈاڈ میں گنجائش نہ پاکر یورپ جانے کی بجائے مستقبل طور پر ٹی ڈور میں رکنا منظور کیا۔ اب وکٹوریا کے ساتھ جانے والے یورپین ملاحوں کی کل تعداد 53 رہ گئی۔

واپسی کے معاملات طے ہوجانے کے بعد مارٹن مینڈز نے اپنے پاس موجود راہنمائی کے سامان میں سے آدھا سامان اور خوراک کی صورت میں چاول کا ایک بڑا حصہ ایل کانو کی تحویل میں دے دیا۔ یاد رہے کہ وکٹوریا پر اس سامان کے علاوہ تقریباً دو من یا سو کلوگرام کے قریب چھوٹے چھوٹے پارسلوں کی صورت میں لونگیں بھی لوڈ تھیں۔

اس سامان کے علاوہ ایل کانو نے چارلس اول کے لیے کچھ نوادرات اور جنت کے پرندوں کے کچھ رنگین پر بطور تحفہ ساتھ لے لیے تھے۔ سلطان المنظور کو روانگی کی اطلاع دینے کے بعد ایل کانو نے اگلے چند دن جنوبی علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے گزارے۔ اُس نے ٹی ڈور سے 7 ایسے مقامی ملاحوں کا انتخاب بھی کیا جو اس سے پہلے جنوبی جزائر کو پار کر کے بحرِ ہند تک گئے تھے۔ راہنمائی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ مقامی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ ہسپانوی بحری جہاز کو محفوظ راستے سے بحرِ ہند تک پہنچا دیں گے۔

☆☆☆

20 دسمبر کی رات ٹی ڈور میں رکنے اور جانے والے ہسپانوی ملاحوں نے آخری بار مل کر رات کا کھانا کھایا۔ دونوں طرف کے ملاح افسردہ تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ اب وہ ایک دوسرے سے دوبارہ کب ملیں گے؟ ٹی ڈور میں رکنے والے بیشتر لوگوں نے واپس جانے والے ساتھیوں کو وطن میں موجود اپنے پیاروں کے نام پیغامات اور تحائف دیے۔ کھانے کے بعد سینئر جہاز رانوں کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا۔ کاروال ہو نے ایل کانو کو بحرِ ہند میں واپسی کے سفر اور چارلس اول سے ملاقات سے متعلق کچھ مفید مشورے دیے۔ ملاحوں کی یہ رات ایک دوسرے سے باتیں کرنے اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھتے گزر گئی۔

21 دسمبر 1521ء کی صبح ٹی ڈور کی بندرگاہ میں اختتامی دعائیہ تقریب منعقد کی گئی۔ ایل کانو اور اس کے عملے نے بندرگاہ میں کھڑے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملائے اور وکٹوریا پر سوار ہوگئے۔ جہاز کا لنگر اٹھالیا گیا اور وہ دھیرے دھیرے گہرے پانی کی طرف کھسکنے لگا۔ جہاز پر کھڑے ملاحوں نے خشکی پر ہاتھ ہلاتے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر پُرجوش نعرے لگائے اور ایک دوسرے کو دُور ہوتا دیکھنے لگے۔

دوپہر ہوتے ہوتے انہوں نے ٹی ڈور کے جزیرے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ بحیرہ ملوکا کے کھلے سمندر میں جنوب کی طرف گامزن تھے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران وکٹوریا نے ماکیان اور چند دیگر چھوٹے چھوٹے جزائر کے قریب سے ہوتے ہوئے خطِ استواء پار کیا۔ 23 دسمبر کی صبح وہ خطِ استواء سے 0.30 ڈگری جنوب اور 127.30 ڈگری مشرق کے خط پر واقع جزائر باکان کے قریب تھا۔

جہاز کے عملے نے یہاں چار بڑے اور درجنوں چھوٹے چھوٹے سرسبز جزائر کا نظارہ کیا۔ ایل کانو نے 80 کلومیٹر لمبے اور قریب 25 کلومیٹر چوڑے باکان کے مرکزی جزیرے پر رکنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مقامیوں کی راہنمائی میں ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج کوسوکی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ باکان وہی جزیرہ تھا جس کے حکمران نے چند دن پہلے ٹی ڈور کا دورہ کر کے سلطان المنظور سے ہسپانوی ملاحوں کی گلو خلاصی کروائی تھی۔ جزیرے پر ایک ہفتے کے قیام کے دوران ایل کانو نے راجا باکان سے ملاقات کی۔ اس نے اپنی منزل کے بارے میں راجا کے سوالوں کا گول مول جواب دیا۔ کرسمس کے دن وکٹوریا پر منعقد دعائیہ تقریب میں ملاحوں نے اپنے محفوظ سفر کے لیے خصوصی دعائیں کیں۔

یکم جنوری 1522ء کے دن وکٹوریا نے باکان سے لنگر اٹھائے اور دو چھوٹے جزائر کے برابر سے ہوتا ہوا جنوب کے کھلے سمندر کی طرف بڑھا۔ تین جنوری کی شام وہ خطِ استواء سے 1.30 ڈگری جنوب کے خط پر واقع جزائر اوبی کے قریب پہنچا۔ ملاحوں نے بہت دور سے اوبی اور اس کے مغرب میں واقع چند چھوٹے چھوٹے جزائر کا نظارہ کیا۔ وکٹوریا پر سوار ٹی ڈورین راہنماؤں نے بتایا کہ اب ان کے جنوب میں چند گھنٹوں کی مسافت پر ڈیڑھ سو کلومیٹر لمبا اور قریب اتنا ہی چوڑا ایک سمندری ٹکڑا تھا جسے پار کر کے وہ بحیرہ باانڈا اور پھر بحرِ ہند کے کھلے سمندر میں داخل ہوجاتے۔

اس چوکور سمندری ٹکڑے کے شمالی کناروں پر اوبی اور سولا جبکہ جنوب میں سیرام اور بورو کے جزائر واقع تھے۔ مقامی راہنماؤں نے ایل کانو کو خبردار کیا کہ یہی ان کے سفر کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ انہیں اس سمندری ٹکڑے کو پار کر کے سیرام اور بورو کے درمیان واقع ایک تنگ سمندری شاہراہ میں سے گزر کر بحیرہ باانڈا میں داخل ہونا تھا۔ اس سمندری شاہراہ کے مشرقی دروازے پر ایمبون کی بندرگاہ واقع تھی۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں پرتگالی بیڑے کی موجودگی کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایل کانو سوچ میں گم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس مقام پر اندازے کی معمولی سی غلطی انہیں سیدھا دشمن کی ناک کے عین نیچے پہنچا سکتی تھی۔ اس نے اپنے جہاز رانوں کو سمجھایا کہ انہیں براہِ راست جنوب میں جانے کی بجائے پہلے مغرب اور پھر جنوب مشرق کی طرف واپس آتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوبی سمندری شاہراہ میں داخل ہونا تھا۔

''دوستو، اس طرح ہم تین دن کا سفر ایک ہفتے میں طے کریں گے لیکن ایک ہفتے کی یہ احتیاط ہماری کامیابی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔'' ایل کانو نے کہا۔

ایل کانو کے اشارہ کرتے ہی ملاحوں نے بادبانوں کی پوزیشن میں ادلا بدلی شروع کردی جس کے بعد وکٹوریا کا رخ مغرب کی طرف ہوگیا۔ چھ جنوری کی صبح وہ لوگ خطِ استواء سے 2 ڈگری جنوب اور 126 ڈگری مشرق کے خط پر جزائر سولا کے قریب تھے۔ اس مقام پر انہیں چوڑائی کے رخ پر واقع منگولے اور اس کے جنوب میں لمبائی کے رخ پر پھیلا سانانا کا جزیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایل کانو نے کسی بھی جزیرے کی طرف جانے کی بجائے بغیر وقت ضائع کیے جہاز کا رخ جنوب کی طرف کردیا۔ اگلے دو دن کے دوران پُرسکون سمندر، ابر آلود موسم اور پل پل رخ بدلتی ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے وہ لوگ خطِ استواء سے 3 ڈگری جنوب میں بورو کے جزیرے کے قریب پہنچے۔ اب اُنہیں اس جزیرے کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مشرق کی طرف بڑھنا تھا۔ ایل کانو نے کھلے سمندر میں لنگر گرا کر ایک دن آرام کرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا۔ آنے والے دنوں میں وقفے وقفے سے ہونے والی موسلا دھار بارش میں وکٹوریا مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اندازہ ہے کہ گیارہ جنوری کے دن جہاز کے عملے نے بورو کے شمال مشرقی

ساحل پر واقع جیکو میر اسا کی چھوٹی سی بندرگاہ کا نظارہ کیا۔

یہ وہ مقام تھا کہ جہاں سے چند کلومیٹر مشرق میں بورو اور سیرام کے جزیروں کے درمیان وہ آبی شاہراہ واقع تھی کہ جسے پار کرکے وہ بحیرہ بانڈا میں داخل ہو جاتے۔ ایل کانو نے مقامی بندرگاہ کی طرف جانے کی بجائے کھلے سمندر میں لنگر گرائے اور دن گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ ملاحوں کو قرب و جوار میں مقامی ماہی گیروں کی چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں شکار کرتی دکھائی دیں۔ ایک دو کشتیوں نے اُن کے بحری جہاز کو دیکھ لیا۔ اُنہوں نے وکٹوریا کے قریب آکر ان سے بات چیت کی کوشش کی لیکن ایل کانو کے ساتھیوں نے مقامیوں کو نظر انداز کر دیا۔ سورج غروب ہوتے ہی ایل کانو نے لنگر اٹھائے اور لگ بھگ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس کا بحری جہاز، بورو اور سیرام کے درمیان واقع آبی راستے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ تقریباً 25 کلومیٹر چوڑی اور 50 کلومیٹر لمبی یہ سمندری شاہراہ بحیرہ ملوکا کو بحیرہ بانڈا سے ملاتی ہے۔ ایل کانو نے آبی شاہراہ کے کھلے حصے میں جانے کی بجائے بورو کی مشرقی گولائی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اُس نے ملاحوں کو قرب و جوار کے سمندر پر نظر رکھنے اور جہاز پر روشن تمام مشعلوں کو گل کر دینے کی ہدایت کی۔ ہلکی بوندا باندی اور گھپ اندھیرے میں وکٹوریا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج کی پہلی کرنوں کے نمودار ہوتے ہوتے وہ خطرے والے علاقے سے باہر نکل آیا تھا۔ ایل کانو نے آبی شاہراہ کو پار کرنے کے بعد بورو کے جنوب مشرق میں خطِ استواء سے 4 ڈگری جنوب کے خط پر واقع ایک چھوٹے جزیرے کو دیکھا۔

یہ ایلارا کا سرسبز جزیرہ تھا۔ ایل کانو نے جزیرے کی طرف جانے کی بجائے سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ بحیرہ بانڈا کے کھلے سمندر میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

مالے کے جنوب مشرق اور انڈونیشیا کے مشرق میں شمالاً جنوباً 550 کلومیٹر لمبا اور شرقاً غرباً 1300 کلومیٹر چوڑا بحیرہ بانڈا واقع ہے۔ اس کے مشرق میں نیوگنی کا جزیرہ، مغرب میں سولاویسی کا جزیرہ، شمال میں بورو اور سیرام کے جزائر جبکہ جنوب میں تیمور کا جزیرہ واقع ہے۔ بانڈا کے اطراف میں واقع سمندروں میں سے مشرق میں بحیرہ آرافورا، مغرب میں بحیرہ جاوا، شمال میں بحیرہ ملوکا اور جنوب میں بحر ہند واقع ہے۔ ہسپانوی جہاز راں جوآن سباسٹین ایل کانو نے ٹی ڈور کے جزیرے سے بانڈا تک پچھلے تین ہفتوں کے دوران لگ بھگ ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اب اُس کی اگلی منزل بانڈا کے جنوب میں واقع تیمور تھا جہاں سے وہ خوراک حاصل کرنے کے بعد بحر ہند میں داخل ہو جاتا۔ اب تک کے سفر کے دوران سوائے معمول کی بارشوں کے سب کچھ معمول کے مطابق رہا تھا۔ وکٹوریا کا عملہ ایل کانو سے تعاون کر رہا تھا اور مقامی راہنماؤں نے اُسے امید دلائی تھی کہ انہیں تیمور میں جہاز کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ خوراک جمع کرنے کا موقع بھی ملے گا۔

جنوری 1522ء کے وسط میں ایل کانو نے بحیرہ بانڈا میں سفر کا آغاز کیا۔ اس کا بحری جہاز 127 ڈگری مشرق کے خط پر رہتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں موسم خوشگوار تھا اور جنوب مشرق کی طرف چل رہی ٹھنڈی ہوائیں وکٹوریا کو آگے بڑھنے میں مدد دے رہی تھیں۔ 17 جنوری کے دن جہاز کے عملے نے بحیرہ بانڈا کے وسط میں خطِ استواء سے 5.30 ڈگری جنوب کے خط پر واقع جزائر لوسی پارا (Lucipara) کا نظارہ کیا۔ جزائر لوسی پارا پچاس کلومیٹر کے دائرے میں پھیلے ایک درجن بڑے اور قریب دو سو چھوٹے چٹانی جزائر کا مجموعہ ہیں۔ یہاں واقع کسی بھی جزیرے کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ یورپین کی آمد کے وقت ان جزائر میں ماہی گیروں کے چند خاندان آباد تھے۔ ایل کانو نے ان جزیروں میں کوئی کشش محسوس نہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران وکٹوریا نے لوسی پارا کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ خطِ استواء سے 6 ڈگری جنوب کے خط پر سفر کر رہا تھا کہ ایل کانو نے اپنے معاون جہاز راں فرانسسکو ایل بو کو تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' ایل کانو نے پوچھا۔

''جہاز کے ایک تہ خانے سے پانی رس رہا ہے۔'' فرانسسکو ایل بو نے جواب دیا۔

''او خدایا۔'' ایل کانو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

ایل کانو نے پایا کہ نقصان زیادہ نہیں ہوا تھا، تاہم متاثرہ حصوں میں پانی کی ایک انچ اونچی تہ جمع ہو چکی تھی اور وہاں موجود ملاح جگہ خشک کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔

اپنے کپتان کو سوچ میں گم دیکھ کر بعض ملاحوں نے اسے پیچھے لوسی پارا کی طرف چلنے کا مشورہ دیا لیکن مقامی راہنماؤں سے پتا چل جانے کے بعد کہ وہ لوگ تیمور کے قریب تھے، ایل کانو نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے ملاحوں کو حکم دیا کہ وہ دورانِ سفر متاثرہ جگہوں کی کڑی نگرانی کریں اور وہاں پانی جمع نہ ہونے دیں۔ خوش قسمتی سے اگلے دو دن کے دوران سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا یہاں تک کہ انہوں نے جنوب میں واقع چھوٹے بڑے جزائر کے سلسلوں کو دیکھ لیا۔

☆☆☆

بحیرہ بانڈا کو پار کرنے کے بعد وکٹوریا، مقامیوں کی راہنمائی میں ویٹا اور الور کے جزیروں کے درمیان واقع آبنائے الور میں سے ہوتا ہوا بحیرہ ساؤو (Savu Sea) میں داخل ہوا۔ ایل کانو نے کچھ سوچ کر براہِ راست جنوب میں تیمور کی طرف جانے کی بجائے پہلے الور میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اندازہ ہے کہ 20 جنوری 1522ء کے دن وکٹوریا نے الور کے جنوبی ساحل پر ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج کوئی (Kui) کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ ایل کانو نے جزیرے پر دو دن کا مختصر قیام کیا۔ اس دوران اس نے مقامی ماہی گیروں سے جنوب میں دکھائی دے رہے تیمور کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ 23 جنوری کے دن ایل کانو نے الور سے لنگر اٹھائے اور جنوب مغرب کی طرف سفر کرتا ہوا تیمور کی طرف بڑھنے لگا۔

25 جنوری کی صبح ہسپانوی ملاح خطِ استواء سے 10 ڈگری جنوب اور 123.30 ڈگری مشرق کے خط پر تیمور کے مغربی حصے کے قریب موجود تھے۔ یہ وہ جگہ تھی کہ جہاں آج انڈونیشیائی تیمور کا دارالحکومت کوپانگ واقع ہے۔ ایل کانو کو ساحل کے قریب لنگر انداز مقامی ماہی گیروں کی درجنوں کشتیاں دکھائی دے گئیں۔ تاہم اُس نے آبادی کی طرف جانے کی بجائے بندرگاہ سے کسی قدر فاصلے واقع ایک ویران دکھائی دے رہے ساحل پر لنگر گرا دیے۔ خشکی پر قدم رکھنے کے بعد ایل کانو نے اپنے کچھ سپاہیوں کو مقامی آبادی کی طرف روانہ کر دیا۔ دراصل وہ مقامی بندرگاہ میں پرتگالیوں کے ہونے یا نہ ہونے کی اطلاعات کو لے کر کشمکش کا شکار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ

آواری، بہرام ڈی

اقلیتی رہنما آواری ہوٹل کے مالک اور کشتی رانی کے عالمی کھلاڑی، کراچی گرامر اسکول سے سینئر کیمبرج کیا، ازاں بعد میٹرک، بی کام اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔ بزنس میں دلچسپی کے باعث کراچی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں امریکا سے ہوٹل مینجمنٹ کا ڈپلوما کورس اور برطانیہ کے ٹرینٹی کالج سے میوزک وائلن میں سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ تعلق پارسی مذہب سے ہے۔ بارہ سال تک سیاست سے وابستہ رہے۔ 1982ء سے 1985ء تک مجلسِ شوریٰ، 1988ء سے 1993ء تک قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ اس دوران 1990ء میں کراچی پارسی انجمن ٹرسٹ فنڈ، 1988ء میں پارسی نیو ایریلی بریشن کمیٹی اور 1998ء میں دستور ڈاکٹر وہالد میموریل انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1984ء سے انٹرنیشنل ہوٹل ایسوسی ایشن ساؤتھ ایشیا کے نائب صدر، 1985ء سے انگلش اسپیکنگ یونین آف پاکستان کے نائب صدر، اور 1988ء سے کراچی سے اسکاؤٹس کونسل کے پیٹرن بنے۔ 1992ء میں کشتی رانی کا مقابلہ جیتنے پر انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ دیا گیا۔ محکمہ ڈاک نے 31 دسمبر 1983ء کو ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ اردو، انگریزی گجراتی، فرانسیسی اور پنجابی زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ 1978ء میں تھائی لینڈ میں ہونے والے آٹھویں ایشیائی کھیلوں اور 82ء میں بھارت میں نویں ایشیائی کھیلوں میں گولڈ میڈل لیا۔ 1981ء میں کینیڈا میں ہونے والے ورلڈ سیلنگ چمپئن شپ رنر اَپ رہے۔

مرسلہ: شاہنواز بھٹیو، لاڑکانہ

مقامیوں میں گھلنے ملنے سے پہلے وہاں اپنے دشمنوں کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کر لے۔ اگلے دو دن کی کڑی جانچ پڑتال کے بعد ایل کانو کے خدشات غلط ثابت ہوئے جس کے بعد اس کے ساتھیوں نے بے دھڑک کو پانگ کی مقامی آبادی کی طرف آنا جانا شروع کر دیا۔

تیمور میں ایل کانو کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر وکٹوریا کے تہ خانوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ خوراک کی خریداری کے کام کا آغاز کر دیا۔ اُس نے وہاں چند ایک مقامی قبائلی سرداروں سے ملاقات کی اور اُنہیں کچھ قیمتی اشیاء کے بدلے چاول، مکئی، سرکہ اور شراب مہیا کرنے پر راضی کیا۔ تیمور میں ملوکا کی نسبت موسم قدرے بہتر تھا تاہم یہاں بھی مچھروں کی بہتات نے یورپین کو پریشان کیے رکھا۔ فروری کے پہلے عشرے کے دوران بعض ملاحوں کو خارش کی شکایت ہو جانے کے بعد ایل کانو نے تیمور سے نکلنے کی تیاریاں تیز کر دیں۔ سامانِ رسد اکٹھا کرنے کے بعد ایل کانو نے تیمور میں چند تجربہ کار مقامی ماہی گیروں سے ملاقات کی۔ اُس نے اُنہیں بطور معاوضہ بحرِ ہند میں راہنمائی کی دعوت دی۔ تاہم لالچ دینے کے باوجود کوئی بھی مقامی ان کے ساتھ بحرِ ہند میں سفر پر آمادہ نہ ہوا۔

مقامیوں نے بحرِ ہند کے پار جانے کا سن کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ انہوں نے ایل کانو کو خبردار کیا کہ بحرِ ہند کی وسعت کے پیشِ نظر اسے پار کرنا ناممکن تھا۔ مقامیوں کے انکار کے بعد ایل کانو نے پرانی چال چلی اور اُن میں سے چند ایک کو گرفتار کر کے یرغمال بنا لیا۔ اس دوران اُس نے ملوکا سے آئے راہنماؤں میں سے چار کا انتخاب کرنے کے بعد باقی کے لوگوں کو وہیں تیمور ہی میں چھوڑ دیا۔ روانگی کی تمام تیاریاں مکمل تھیں کہ ایل کانو کو 2 یورپین (غیر ہسپانوی) ملاحوں کے غائب ہونے کی اطلاع دی گئی۔ اُسے بتایا گیا کہ فرار ہونے والے ملاح انہی لوگوں میں سے تھے کہ جو بحرِ ہند میں سفر کو لے کر تحفظات رکھتے تھے۔ ایل کانو کو اپنے ساتھیوں کے یوں بغیر بتائے مہم سے الگ ہونے پر افسوس ہوا، تاہم اُس نے فرار ہونے والوں کو تلاش کرنے کی بجائے سینئر جہاز رانوں کا ایک اجلاس طلب کیا اور انہیں بحرِ ہند میں سفر سے متعلق ہدایات دیں۔

ایل کانو نے اپنے پاس موجود دنیا کے نقشے پر مالے کے جزائر سے راس امید تک کے راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت خطِ استواء سے 10 ڈگری جنوب کے خط پر موجود ہیں اور انہیں براہ راست جنوب مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے خطِ استواء سے 35 ڈگری جنوب پر واقع راس امید تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ ایل کانو نے واضح کیا کہ انہیں بحرِ ہند میں ایک طویل سفر کے پیشِ نظر نہ صرف پانی بلکہ خوراک کے استعمال میں بھی کفایت برتنی ہوگی۔ اُن کی کوشش ہوگی کہ وہ راس کے علاقے میں رکے بغیر جنوبی بحراوقیانوس میں داخل ہو جائیں۔ تاہم اگر کوئی ناگہانی صورتِ حال پیش آ گئی تو وہ راس کے قرب و جوار میں کسی غیر آباد افریقی ساحل پر رکنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

نومبر 1521ء میں ہسپانوی بیڑے کی ملوکا کے جزائر میں آمد کے بعد بحرالکاہل کے راستے ایشیا تک رسائی کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اس دوران ملوکا کے جزائر میں پیش آئی ناگہانی صورتِ حال کے بعد مہم نے ایک نیا موڑ لیا۔ ٹرینی ڈاڈ کے حادثے کے بعد جوآن سباشین ایل کانو نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ دنیا کی تقسیم کے معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی، اپنے اکلوتے بحری جہاز کے ساتھ بحرِ ہند کے راستے اسپین واپسی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ مقامیوں کی راہنمائی اور اپنی سمجھ بوجھ کو بروئے کار لاتے ہوئے ایل کانو نے بحیرہ بانڈا کو پار کر کے تیمور میں قدم رکھا۔ اب تیمور کے بعد اُس کے سامنے بحرِ ہند کا کھلا سمندر موجزن تھا۔ پرتگالیوں کی مڈھ بھیڑ سے بچنے کے لیے ایل کانو نے طے کیا تھا کہ وہ تیمور کے جزیرے سے براہِ راست جنوب مغرب میں راس امید کی طرف بڑھتے ہوئے بحرِ ہند کو وسط سے پار کرنے کی کوشش کرے گا۔ یاد رہے کہ ہسپانوی مہم جوؤں کو اسپین سے نکلے پورے ڈھائی سال ہو چکے تھے اور اس دوران وہ مجموعی طور پر 46 ہزار کلومیٹر کا ریکارڈ فاصلہ طے کر چکے تھے۔

11 فروری 1522ء کے دن وکٹوریا پر سوار 51 یورپین اور 10 مالین ملاحوں نے تیمور کے جزیرے سے بحرِ ہند کے راستے اسپین واپسی کے سفر کا آغاز کیا اور بالآخر اس سفر کو اختتام تک پہنچا دیا۔

*

ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

ترکی وہ ملک ہے جس کی تاریخ روشن ' لوگ ملنسار اسی لئے ان لوگوں نے وہاں کے سفر کا ارادہ کیا پھر کیا ہوا ' یہی اس سفر نامے کی خصوصیت ہے ' اچھے اور جداگانہ سفرنامے پیش کرنا سرگزشت کا خاصہ ہے۔ اس بار بھی ایک دلچسپ سفرنامہ حاضر ہے' یہ سفر نامہ علی سفیان آفاقی کے قلم کا شہکار ہے اس لیے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سفرنامے کا انداز کیسا ہوگا



ایک پُراثر اور شگفتہ انداز کا دلچسپ سفرنامہ

میں اتاترک کے مجسمے کے سامنے کھڑا تھا اور ذہن کے دریچے سے ترکی کی تاریخ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یوں بھی ترکی کا نام سنتے ہی ایک عجیب سی مسرت اور سرمستی کی لہر سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس نے اسلام کا جھنڈا نصف دنیا پر لہرا دیا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ اپنے عہد میں ایک سپر پاور تھی اور یہ حیثیت ترکی کو پانچ سو سال تک حاصل رہی۔ ترکوں نے دنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ یورپ کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ترک فوج کے سامنے

نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی افواج فتوحات کرتے ہوئے یورپ کے آخری کنارے تک پہنچ چکی تھیں۔اگر مشرقی صوبوں.... سے فوجی نقل وحرکت کی خبر نہ آتی تو آج سارا یورپ ترکوں کے زیرِ نگیں اور مسلمان ہوتا۔ پھر بھی ترک جانباز فوجی جہاں بھی گئے اپنی نشانیاں چھوڑ آئے۔ چیچنیا اور بوسنیا میں ترکوں کا اثر آج تک دیکھنے میں آتا ہے۔ یورپ میں اسلام کا اثر ورسوخ پھیلانے میں ترکوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

زمانہ بھی کیسے کیسے رنگ اور انقلابات دکھاتا ہے۔ وہ ترکی جو سارے یورپ اور مشرق وسطیٰ میں سپر پاور کے طور پر پہچانا جاتا تھا تاریخ کی ستم گری نے اس کو سمیٹ کر اپنی سرحدوں تک محدود کردیا، صلیبی جنگوں میں ترکوں نے یورپ کی متحدہ طاقت کو شکست فاش دی تھی۔ یہ زخم یورپ کے عیسائیوں کے دلوں سے کبھی نہ جاسکا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ترکی کا خلیفہ جسے سارا عالمِ اسلام اپنا خلیفہ تسلیم کرتا تھا اور جو دنیائے اسلام کی طاقت، عظمت اور شان وشکوہ کا مظہر تھا یورپ کے ممالک کے سامنے بے دست وپا ہوگیا۔ قسطنطنیہ (آج کے استنبول) میں جو مرکزِ خلافت تھا یورپ کے ممالک کے سفیر وائسرائے کی حیثیت سے رہنے لگے۔ برطانیہ، یونان اور جرمنی کے جنگی بحری بیڑے قسطنطنیہ کے سمندر میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے ان کی منظوری اور اجازت کے بغیر خلیفہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا تھا، دوسرے لفظوں میں خلیفۂ اسلام یورپی طاقتوں کا یرغمال تھا۔ اس کا دربار سازشوں کا مرکز بن چکا تھا۔ مفاد پرست اور خوشامدی ٹولے نے خلیفہ کو اپنے دام میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا، یورپی سفیر اس سے جو چاہے منوالیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ترک سلطنت کے زوال کا آغاز سلطان سلیمان کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ یہ وہی سلیمان ہے جسے تاریخ میں سلیمان عالیشان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سلطان سلیمان عالیشان کو یہ لقب یورپ کے ممالک نے دیا تھا۔ سلطان سلیمان کے دور میں یورپ میں بھی بڑے عظیم بادشاہ موجود تھے۔ اس کے ہم عصر بادشاہوں میں فرانس کا بادشاہ فرانسس اول، روم کا مقدس شہنشاہ چارلس پنجم، روس کا طاقتور اور جابر بادشاہ آئیوان، انگلستان میں ہنری ہشتم جیسے طاقتور بادشاہ حکمرانی کرتے تھے لیکن ان ہی بادشاہوں نے سلطان سلیمان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو سلیمان عالیشان کا خطاب دیا تھا۔ سلطان سلیمان دانا، بہادر اور قابلِ رشک شخصیت کا مالک تھا۔ وہ شان وشوکت اور طاقت کے اعتبار سے اپنے دور کے دوسرے تمام بادشاہوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ ترکوں کی بحری قوت سمندروں خصوصاً بحیرۂ روم پر حکمرانی کرتی تھی جس کے آگے بڑی سے بڑی طاقت بھی جھک جاتی تھی۔ تین براعظموں میں ترک افواج پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا غلبہ تھا، دنیا کی کوئی دوسری طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ یورپ کے حکمراں اس کے سامنے لرزہ براندام رہتے تھے اور اس کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ قدرت نے اس کو دوسری صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ اس کے دور میں ترکی میں عالیشان عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ وہ فنونِ حرب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتا تھا اس کے دربار میں دو درجن سے زیادہ مصور تھے جن میں یورپ کے مصور بھی شامل تھے۔ شاہی ملبوسات خصوصاً خواتین کے ملبوسات تیار کرنے پر بے شمار کاری گر متقرر تھے جو شب و روز مصروف رہ کر بہتر سے بہتر ملبوسات تیار کرتے تھے۔ ملک میں امن وامان اور خوشحالی تھی، جرائم کا نام ونشان تک نہ تھا۔ رعایا بھی خوشحال تھی۔

ترک اپنے حکمراں پر فخر کرتے تھے، ترک قوم آج بھی ایک بہادر، غیور، خوددار اور سربلند قوم ہے۔ ترکوں نے کبھی غلامی کا مزہ نہیں چکھا۔ وہ ہمیشہ حکمراں اور آزاد رہے ہیں اور اسی لیے فخر سے سر بلند کیے ہوئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن مردوں کی ناکامی کے پیچھے بھی عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے، اور یہی افتراق اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔

سلطان سلیمان کی زندگی میں بھی ایک عورت داخل ہوئی جس نے محل میں سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ اس کا نام رخلینہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ترک سلطان عموماً کنیزوں سے دل بہلاتے تھے مگر کسی سے شادی نہیں کرتے تھے۔ سلطان سلیمان نے رخلینہ کو دیکھا اور اپنا سب کچھ ہار بیٹھا یہاں تک کہ اس سے شادی کرلی۔ وہ سلطان کی محبوب بیوی تھی جس کے حکم سے سرتابی کی کسی کو مجال نہ تھی۔ وہ فطرتاً ایک سازشی اور خود پسند عورت تھی۔ اپنا مطلب نکالنے کے گر وہ بخوبی جانتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سلیم کو سلطان سلیمان کا جانشین بنانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے سلیم کے آگے رکاوٹ بن جانے والے تمام لوگوں یہاں

تک کہ شہزادوں تک کو موت کے گھاٹ اتروادیا۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ سازشی اور چالاک عورت شاہی محل میں داخل نہ ہوتی تو سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ نہ بکھرتا۔ وہ 25 سال تک سیاہ وسفید کی مالک رہی۔ سلطان رخلینہ کی محبت میں اندھا ہوچکا تھا۔ رخلینہ کے بہکاوے میں آکر اس نے تخت کے وارث مصطفیٰ کو ہلاک کروادیا۔ اس کے بعد چار اور بیٹوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وہ ایک ایسی ہستی تھی جو بالآخر سلطنت کے زوال کا سبب بنی۔ جب اہلیت اور صلاحیت کی بجائے اپنے مفاد میں فیصلے کیے جائیں تو بڑی بڑی سلطنتوں کی چولیں ہل جاتی ہیں اور جب بنیادیں کھوکھلی ہوجائیں تو عظیم الشان عمارتیں بھی زمیں بوس ہوجاتی ہیں۔

1914ء کی پہلی جنگِ عظیم ترکی کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں ترکوں نے جن طاقتوں کا ساتھ دیا انہیں شکست فاش ہوئی۔ بہت بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصانات ہوئے۔ کہاں ترکی سلطنت اطرافِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی، کہاں یہ نوبت آئی کہ ترکی کے بیشتر علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ سپر پاور 1918ء میں ایک بے دست وپا اور کمزور حکومت بن کر رہ گئی۔ یورپ جس نے سلطان سلیمان کو عالیشان کا خطاب دیا تھا اب ترکی کو یورپ کا مردِ بیمار کہنے لگا۔ ترکی کا ایک حصہ مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ہے۔ پھر ترکوں نے یورپ کے بہت سے ممالک فتح کرکے خود کو ایک یورپین طاقت کے طور پر منوالیا تھا۔ اس لیے اس کو یورپ کے مردِ بیمار کا خطاب دیا گیا۔ سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے۔ مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستیں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ یورپ میں بھی پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ جنگ میں ترکوں کو شدید جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کی فوجی قوت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی تھی۔ معاشی بدحالی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔

یورپ کی عیسائی طاقتوں کے لیے یہ ایک نادر موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے علاوہ استنبول پر بھی قبضہ کرلیا۔ فرانس، جرمنی اور اٹلی جو تاک میں تھے انہوں نے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں اور جزیروں پر قبضہ کرلیا جو کہ اس سے پہلے ترک سلطنت کا حصہ تھے۔ ترکی کے حصے بخرے کرکے آرمینیا، کردوں اور یونانیوں کو بھی حصہ دے دیا گیا۔ مشرقی اناطولیہ میں آرمینیا کو حکومت دے دی گئی۔

ترک خلیفہ بے دست وپا ہوکر رہ گیا تھا، خاموشی اور بے بسی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا مگر کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن قدرت کو ترکوں کی ذلت گوارا نہ تھی۔

مصطفیٰ کمال وہ شخص تھا جس نے ترک قوم کے جذبۂ آزادی اور حب الوطنی کو جھنجوڑ کر بیدار کیا تو سارے ملک میں آزادی کی لہر سی دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے سوئے ہوئے شیر کو جگا دیا ہے۔ اپریل 1920ء میں گرینڈ نیشنل اسمبلی نے جنگِ آزادی کا اعلان کیا اور جنگ کا آغاز ہوگیا۔ مغربی طاقتیں یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ یہ مرد بیمار اب جاں بلب ہے لیکن جب ان پر توپوں کے گولے اور بندوقوں کی گولیاں برسنے لگیں تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ شکست خوردہ ترکی کبھی جوابی حملے کی جرأت بھی کرے گا۔

ترک جان توڑ کر لڑے اور بھوکے شیروں کی طرح دشمنوں پر پل پڑے۔ اب ترکی میں طاقت اور اختیار کا مرکز استنبول کی بجائے انقرہ ہوگیا تھا۔ فرانس نے پسپائی کے بعد انقرہ سے صلح کی بات چیت شروع کردی۔ جس کے نتیجے میں فرانس کی فوجیں ترکی کی سرزمین سے رخصت ہوگئیں۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے حوصلہ مند ساتھیوں کے لیے یہ بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ انہوں نے عرصے کے بعد فتح کا مزہ چکھا تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو ایک منصوبہ بندی کے تحت مختلف محاذوں پر پھیلا دیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کردیا۔ اس نے اناطولیہ سے آرمینیا کی افواج کو دھکیل کر باہر کردیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے اٹلی اور فرانس کی طرف توجہ دی۔ فرانس کے بعد اٹلی کی فوجوں نے بھی لقمۂ اجل بننے کی بجائے ترک سرزمین سے رخصت ہونے میں ہی عافیت جانی اور ترک سرحدوں سے رخصت ہوگئیں۔

اب یونان اور برطانیہ کی فوجیں ترک سرزمین پر رہ گئی تھیں۔ یونانی فوجیں سمرنا میں پیش قدمی کررہی تھیں۔ (سمرنا کو اب ازمیر کہا جاتا ہے) وہ پیش قدمی کرتی ہوئی انقرہ کے نواح تک پہنچ گئی تھیں۔ مصطفیٰ کمال کی کمان میں ترکوں نے ان کا راستہ روک لیا اور خون ریز جنگ کے بعد انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ لیکن یونانی ترک سرزمین چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

پندرہ بیس دن کی خون آشام جنگ میں ترکوں نے یونانی فوج کا صفایا کردیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا اس محاذ پر بذاتِ خود موجود تھے اور ترک فوجیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ یونان ترکی میں اپنا حصہ لینے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ

ان علاقوں کو واپس لینا چاہتا تھا جو ترکوں نے اس سے چھین لیے تھے۔ ان میں استنبول کا مغربی حصہ (جو یورپ میں واقع ہے) ایجین کی بندرگاہ کے علاوہ کچھ اور علاقے بھی شامل تھے۔ خلیفہ بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا استنبول میں بیٹھا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ترکوں کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ ان میں اتنا دم خم نہیں رہا ہے کہ کسی کے مقابلے میں کھڑے ہوسکیں۔ یہی وجہ تھی کہ استنبول میں شاہی محل میں سازشوں کا بازار گرم تھا۔ خود اپنے ہی یہ سازشیں کررہے تھے۔ دوسری طرف برطانیہ کا سفیر استنبول میں براجمان تھا اور خلیفہ کو اپنے اشاروں پر چلا رہا تھا۔

لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ترکی کا وجود ہی باقی نہ رہے، یہ بات درست ہے کہ نوجوان ترک فوجی خلیفہ کی حکمت عملی کے سخت خلاف تھے۔ ترک فوج میں آزادی کی تحریک چل پڑی تھی۔ یہ نوجوان فوجی خفیہ طور پر اکٹھے ہوکر بیٹھتے تھے اور اپنے وطن عزیز کو دشمنوں کے پنجے سے آزاد کرانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان کا سربراہ مصطفیٰ کمال تھا۔ مصطفیٰ کمال دیکھ رہا تھا کہ استنبول میں کس قسم کی سازشوں کا بازار گرم ہے اور خلیفہ دشمنوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوا ہے۔

مئی 1919ء وہ دن تھا جب یونان نے اپنی فوجیں سمرنا کے ساحل پر اتار دیں۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو ترکوں کے لیے باعث برکت ثابت ہوئی۔ ترکوں کا جذبۂ آزادی اور وطن پرستی اچانک بیدار ہوگیا۔ خلیفہ نے مصطفیٰ کمال کو مشرقی محاذ کی نگرانی پر جانے کی اجازت دی اور مصطفیٰ کمال کو استنبول کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات مل گئی۔ استنبول کو خیر باد کہتے ہی مصطفیٰ کمال نے ترک فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے کی سخت جدوجہد کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ نوجوان اور محب وطن فوجی جوان کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے۔ مصطفیٰ کمال نے فوج کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ کر ایک مضبوط آواز بنا دیا۔ اس نے انقرہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور گرینڈ نیشنل اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے بعد جنگ آزادی کا اعلان کردیا۔

ترکوں کے جوابی حملے نے یونانی فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ بیشتر یونانی فوجی ہلاک ہوگئے۔ ان کے کمانڈر انچیف کو ترک فوج نے گرفتار کرلیا۔ بچی کچھی یونانی فوج نے واپس سمرنا کی طرف رخ کیا مگر ترک ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ترکوں نے یونانیوں کو سمرنا سے رخصت ہونے پر مجبور کردیا، سمرنا کو یونان کے قبضے سے آزاد کرالیا گیا۔ اب ترک فوج نے فتح کا مزہ چکھ لیا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ ترکوں کی آزادی کی لگن نے دشمنوں کو بوکھلا دیا تھا۔ اب صرف برطانیہ کی فوج اور بحری جہاز ترکی میں باقی رہ گئے تھے جو استنبول کے سامنے لنگر انداز تھے۔ برطانیہ کو بخوبی علم تھا کہ اب ان کی باری آنے والی ہے۔ برطانوی فوجیں ترکی سے رخصت ہوگئیں اور ایک صلح نامے پر دستخط ہوگئے جس کے بعد ترکی اپنی تمام سرحدوں کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ترک قوم کو ایک نجات دہندہ اور قائد مل گیا تھا جس کی انہیں کافی دیر سے تلاش تھی۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے اصولوں اور طرز حکومت سے اختلاف رکھنے والے ترک بھی اس کی عظمت اور بہادری کو سلام کرتے ہیں۔ اس کے کارناموں کی وجہ سے اس کو قابل تعظیم سمجھتے ہیں۔ ہر ترک مصطفیٰ کمال کو اپنی قوم اور ملک کا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ اسی لیے مصطفیٰ کمال کو پیار سے ساری ترک قوم ''اتاترک'' کہتی ہے۔ یعنی ''ترکوں کا باپ!''

مصطفیٰ کمال نے ترکی دشمنوں کے جبڑوں سے چھین تو لیا تھا مگر ابھی ملک اور قوم کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا مشکل مسئلہ سامنے تھا۔ مصطفیٰ کمال کی سربراہی میں ری پبلکن پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ بادشاہت اور خلافت کا خاتمہ کرکے جمہوریہ ترکی کا اعلان کردیا گیا۔ مصطفیٰ کمال پورے نظام کو تبدیل کرنے کے خواہاں تھے۔ اس مسئلے پر قدامت پسند، اسلام پسند عناصر کی ناراضی بھی مول لینی پڑی لیکن مصطفیٰ کمال اپنی دھن کے پکے تھے۔ مسلمان علماء کی پالیسی کو ترک کرکے انہوں نے ترکی کو ایک سیکولر نظام حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ مصطفیٰ کمال کا خیال تھا کہ ترکوں کو اپنی قدامت پسندی چھوڑ کر جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا ورنہ یہ دیمک زدہ نظام ملک کو ایک بار پھر اندھیروں میں دھکیل دے گا۔

اب نئے نظام کو قائم کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال نے سب سے پہلے تعلیم پر توجہ دی۔ مذہبی فرقوں کے زیر اثر کام کرنے والے مذہبی مدارس کو بند کرکے پرائمری تک تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ عربی رسم الخط کو ترک کرکے لاطینی حروف تہجی کو رائج کردیا گیا۔ سرخ رومی پھندنے والی ٹوپی جو ترکوں کی پہچان تھی اور آج تک ترکی ٹوپی کہلاتی ہے اس کا

استعمال ترکی میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہاں تک کہ پگڑی دستار اور سر کے رومال کو بھی استعمال کرنے پر پابندی عائد کردی گئی حالانکہ انقلاب سے پہلے خود مصطفیٰ کمال بھی ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ مصطفیٰ کمال کو یقین تھا کہ ملا ازم، خلافت اور بادشاہت کے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر مغربی طرز زندگی اپنانے سے ہی ملک میں انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ روایتی مشرقی لباس کی جگہ کوٹ پتلون اور ٹائی کو رائج کیا گیا۔ سرکاری طور پر خواتین کو بھی مغربی طرز زندگی اپنانے کا حکم دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال کی خواہش تھی کہ ترک خواتین بھی مغربی خواتین کی طرح مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں۔ جدید تعلیم حاصل کریں اور مغربی لباس اور طور طریقے اپنائیں۔ ترکی کے پرانے قانونی نظام کو تبدیل کرکے سوئٹزرلینڈ کے قوانین نافذ کیے گئے۔ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کی زندگی میں صحیح معنوں میں ایک انقلاب پیدا کردیا تھا۔ نیشنل اسمبلی نے ملک کے نجات دہندہ کو ''اتاترک'' کا خطاب عطا کیا۔ مصطفیٰ کمال نے واقعی ملک و قوم کے لیے ایک باپ کا کردار سرانجام دیا تھا۔ ایک مفتوح اور غلام قوم کو آزادی اور فتح سے ہم کنار کیا تھا۔ ترکی کا بچہ بچہ اتاترک کے اس کارنامے اور احسان کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کی پالیسیوں سے اختلاف رکھنے والے بھی اتاترک کو ''نئے ترکی'' کا بانی قرار دینے پر مجبور تھے۔

ترکی کے ہر بڑے شہر میں اہم چوراہوں اور سڑکوں پر کمال اتاترک کے مجسمے نصب کردیئے گئے۔ یہ قوم کی طرف سے اپنے نجات دہندہ کو خراج تحسین تھا۔ کانسی کے بنے ہوئے قدِ آدم بلکہ اس سے بھی بڑے مجسمے آج بھی ترکی کے ہر چوک اور اہم سڑک پر نظر آتے ہیں جن میں مصطفیٰ کمال کا سراپا ہو بہو پیش کیا گیا ہے۔ مصطفیٰ کمال ایک خوبرو اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ بلند قامت، مضبوط سراپا، نیلی آنکھیں، سرخی مائل بال مصطفیٰ کمال کی مسحور کن شخصیت اور دلکشی میں اضافے کا سبب تھے۔ اپنے بہادری کے کارناموں اور شخصیت کی دلکشی کے باعث کمال اتاترک کو آج بھی ترکی میں ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔

یکایک خان صاحب کی آواز آئی تو میں چونک گیا، ہم اتاترک کے مجسمے کے ساتھ دست بستہ کھڑے تھے۔ ترکوں کی پرانی تاریخ کے نقوش ذہن میں اجاگر ہورہے تھے۔ ہم اس شخص کے مجسمے کے سامنے کھڑے تھے جس نے اپنی شجاعت، جرأت اور دانائی کے علاوہ جنگی مہارت سے اپنے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی سوانح عمری کے ابواب ہمارے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ ہم خیالوں کی دنیا میں گم تھے۔ تاریخ کی راہ داریوں میں سفر کررہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ قائداعظم کے بعد کیا پاکستانیوں کو بھی ایک ایسا قائد اور نجات دہندہ مل سکتا ہے؟

خان صاحب نے ہمیں خواب وخیال کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس پہنچا دیا تھا۔ ہم نے چونک کر خان صاحب کو یوں دیکھا جیسے اچانک کوئی عجیب مخلوق ہمارے سامنے آگئی ہو۔

''بھائی جان، اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو؟ میرا نام جانتے ہو؟ مجھے پہچانتے بھی ہو یا بھول گئے؟''

''نہیں نہیں خدا کے لیے ایسا نہ کرنا آفاقی صاحب۔ ہم دونوں تو آپ کے بغیر اکیلے رہ جائیں گے۔'' یہ بٹ صاحب تھے جو ہانپتے کانپتے دور سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ترکی کے چند مخصوص نوادرات تھے۔

''بھئی یہ تو بہت مہنگے ہیں۔ میرے دونوں ہاتھوں میں جو چیزیں ہیں اتنی قیمت میں تو میں بہت سی قیمصیں جوتے اور ٹائیاں خرید سکتا تھا۔''

''یہ آپ نے بہت عقلمندی کی ہے بٹ صاحب۔ قمیص، پتلونیں اور ٹائیاں تو پاکستان میں بھی مل جاتی ہیں لیکن ترکی کے یادگار نوادرات وہاں کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ یہ بھی تو سوچو کہ کپڑے اور جوتے تو پھٹ پھٹا جاتے ہیں اور گھروں میں صفائی کرنے کے کام آتے ہیں لیکن یہ نوادرات آپ کی آنے والی نسلیں بھی گھروں میں سجا کر رکھیں گی اور فخریہ طور پر سب کو بتایا کریں گی کہ ہمارے دادا اور پردادا جب ترکی گئے تھے تو یہ سب نوادرات وہاں سے لے کر آئے تھے۔''

''تو کیا میں نے سمجھداری کا کام کیا ہے؟''

''ارے بہت زیادہ، مجھے تو حیرت ہے کہ ترکی پہنچ کر تم اچانک اتنے سمجھ دار کیسے ہوگئے؟ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمہارے سوٹ کیسوں میں دوسرا سامان رکھنے کی بھی جگہ ہوگی۔''

اب ہم ماضی کی دنیا سے حال میں واپس آگئے تھے۔ ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا ''بٹ صاحب آپ نے کمال اتاترک کا کوئی مجسمہ بھی خریدا ہے؟''

''لاحول ولا قوة!'' جواب میں بٹ صاحب نے

پُرزور آواز میں کہا۔ ہم غصے میں انہیں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ پاس سے گزرتی ہوئی مغربی ملبوسات میں نیم عریاں خواتین پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ "یہ لاحول" بٹ صاحب نے ان کو دیکھ کر پڑھی تھی۔

"کس قدر بے حیائی اور بے شرمی ہے" بٹ صاحب ان خواتین کو ہمہ تن دیکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی تمام تر توجہ ان کی ننگی پنڈلیوں اور بالائی نیم عریاں جسم پر مرکوز تھی۔

ہم نے کہا "بٹ صاحب، کم از کم آواز تو نیچی رکھیں۔ یہ ترک میزبان ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

"انہیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ بھائی یہ کب اسلامی ملک ہے؟"

خان صاحب نے انہیں ٹوکا۔ "یہ اسلامی نہیں سیکولر ملک ہے۔ یہاں کے قوانین بھی سیکولر بنیادوں پر بنائے گئے ہیں۔ ترک فوج کی یہ ذمے داری بھی ہے کہ ملک میں سیکولر نظام کی حفاظت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سیاستدان آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں یا کوئی حکومت ملک میں سیکولر مخالف اقدامات کرتی ہے تو آئین کے مطابق فوج کو یہ حق حاصل ہے کہ مداخلت کرے اور ایسے اقدامات کو روک دے۔ مگر ترک فوج کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد واپس فوجی بیرکس میں چلی جاتی ہے۔ اور سیاستدانوں کو اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔"

"یار کمال ہے یہ تو۔ ترک فوجی جنرل تو بہت شریف ہیں۔" بٹ صاحب نے تعریف کی۔

"اس میں شرافت کا کیا دخل ہے؟"

"آپ شاید بھول گئے کہ ہمارے ملک میں بھی گندگی صاف کرنے کے لیے جب کوئی فوجی جنرل اقتدار سنبھالتا ہے تو پھر وہ اقتدار چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔

"آپ یحییٰ خان کو بھول گئے ہیں۔ اس بے چارے کو تو زیادہ عرصے تک فوجی آمر بنے رہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

قدرت کا نظام ہے کہ سیر کو سوا سیر مل جاتا ہے۔ یحییٰ خان کی بدنصیبی یہ تھی کہ ان کا بھٹو جیسے ہوشیار سیاستدان سے واسطہ پڑا۔ اُدھر شیخ مجیب الرحمان نے ان کا ناطقہ بند کر دیا جس کی وجہ سے ان کو خوابوں کی تعبیر نہ مل سکی۔"

"یہ تو ہے۔ ترک فوج تو آئین کے تحت یہ کارروائی کرتی ہے مگر ہمارے جنرل اقتدار میں آتے ہی آئین توڑ کر ایک نیا آئین بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ آئین توڑنے کی سزا بہت سنگین ہے لیکن آج تک کسی آئین توڑنے والے کو سزا نہیں دی جا سکی۔ آئین کو ہمارے ملک میں کچی مٹی کا گھڑا سمجھ کر جو چاہتا ہے توڑ دیتا ہے۔ جو ملک آئین اور قانون کی پابندی نہیں کرتا وہ ہمیشہ افراتفری اور مشکلات میں مبتلا رہتا ہے۔"

بٹ صاحب نے فوراً دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا "جناب خان صاحب، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ لندن نہیں ہے اور نہ ہی آپ ہائیڈ پارک میں کھڑے ہیں کہ جو چاہیں تقریر کر دیں اور پولیس کا سپاہی آس پاس گھومنے کے سوا اور کچھ نہ کرے۔ آپ استنبول کے مستقیم چوک میں کھڑے تقریر کر رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ترک ہماری زبان نہیں سمجھتے اس لیے آپ کی دانشمندانہ باتوں سے فائدہ اٹھانے سے معذور ہیں۔"

"بٹ صاحب، میں نے نوٹ کیا ہے کہ پاکستان سے باہر جاتے ہی آپ بہت اعلیٰ قسم کی اردو بولنے لگتے ہیں۔ اردو سیکھنے کے لیے آپ کا پاکستان سے باہر رہنا ضروری ہے۔"

"یہ کیا فضول بات ہے۔ کیا میں پاکستان میں اردو نہیں بولتا۔"

"بولتے تو ہو مگر وہاں سوچ سمجھ کر بولتے ہو ورنہ لوگ غلطیاں نکالتے ہیں۔ باہر کے ملکوں میں لوگ اردو سمجھتے نہیں ہیں اس لیے غلط سلط اردو بھی بے دھڑک بول سکتے ہو۔"

ہم نے کہا۔ "دراصل غلط انگریزی بولنے کے لیے دوسرے ممالک بہت موزوں ہیں کیونکہ وہ خود بھی انگریزی نہیں جانتے اس لیے بے چارے غلطیاں نہیں نکالتے۔"

"ایسا نہ کہیے۔ میں تو انگریزوں سے بھی انگلش بولتا ہوں۔"

"ہاں، اس لیے کہ انگریز سوچتے ہیں کہ اس بے چارے کی تو زبان ہی انگلش نہیں ہے اس لیے غلطیوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور روک ٹوک نہیں کرتے۔"

ہم لوگ اس وقت استنبول کے مستقیم چوک میں کھڑے تھے، ترک اس کو مستکم چوک کہتے ہیں۔ ہم پاکستانی اسے مستقیم چوک کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اور لمبا چوڑا چوک ہے۔ یہاں بسیں اور ٹرامیں بھی چلتی ہیں۔ چاروں طرف دکانیں ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے پُرکشش دکان ڈونر کباب کی تھی۔ شوارما کی بھی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ان دکانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر کباب خریدے جو نرم موٹی روٹی میں لپٹے ہوتے ہیں۔ چاہیں تو وہیں کھڑے ہو کر کھائیں اور آس پاس کا نظارہ دیکھیں یا پھر ایک بڑے سینڈوچ کی طرح اسے کھاتے پھریں۔ ترکش کباب کا ایک الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ گوشت ہوتا ہے جسے ایک لمبے گاؤ تکیے کی شکل میں اکٹھا کر کے مشین کے اندر لٹکا دیا جاتا ہے جہاں وہ بھاپ سے بھنتا رہتا ہے۔ جب آپ کباب کی فرمائش کرتے ہیں تو ایک بہت تیز لمبی چھری سے اس کے چھوٹے چھوٹے پارچے اتار کر پلیٹ میں رکھ کر یا نرم روٹی میں سینڈوچ کی طرح لپیٹ کر آپ کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بے حد لذیذ اور صحت بخش خوراک ہوتی ہے۔

ڈونر کباب ہم نے 1974ء میں پہلی بار لندن میں پکاڈلی کے عقبی بازار میں دریافت کیے تھے۔ ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ پر "ترکش ڈونر کباب" کا بورڈ دیکھ کر ہم بے تاب ہو گئے۔ کباب ہم پاکستانیوں کی مرغوب غذا ہے اسی لیے ترکش کا نام سن کر دل کو عجیب مسرت سی محسوس ہوئی۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی ترکوں اور ترکی سے ہمیں اللہ واسطے کی محبت ہے۔ نہ ہم نے ترکی دیکھا تھا نہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے لیکن ترکی سے ایک انجانی سی محبت تھی، مصطفیٰ کمال پاشا ہمارا بچپن ہی سے ہیرو تھا۔ مصطفیٰ کمال نے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا تھا مگر بچپن میں ہی سنا کرتے تھے کہ مصطفیٰ کمال وہ شخص ہے جس نے ترکی کو غلامی سے نجات دلائی تھی۔

جب باشعور ہونے کے بعد ہم نے مصطفیٰ کمال پاشا کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب پڑھی تو ہمیں مصطفیٰ کمال کی شجاعت، دانائی، جنگی مہارت اور تنظیمی طاقت کا اندازہ ہوا۔ اس کتاب کا نام "گرے ولف Gray Wolf" ہے جو آج بھی لائبریریوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایک غیر ملکی اور وہ بھی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں شکست کھانے والے انگریزوں کا ان کے بارے میں خراجِ تحسین پڑھا تو ہمیں مصطفیٰ کمال کی عظمت اور قیادت مندانہ صلاحیتوں کا علم ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے دنیا کو دکھا دیا کہ اگر کوئی قوم آزادی کے لیے جدوجہد کرے تو اس کو اللہ کامیابی ضرور دیتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کی ماہرانہ جنگی چالوں کی وجہ سے انگریز اس کو لومڑی کی طرح چالاک کہا کرتے تھے۔ اسی لیے اس کا نام "گرے ولف" پڑ گیا۔ مصطفیٰ کمال ایک خوبرو انسان تھا۔ وہ انگریزوں کی محفل میں انگریزوں سے بڑھ کر انگریز لگتا تھا۔ قدرت نے اسے جرأتِ رندانہ سے نوازا تھا۔ وہ ایک بے خوف اور انتہائی بہادر جنگجو تھا۔

ترک قوم کبھی غلام نہیں رہی۔ آج بھی وہ ایک آزاد، غیور اور خوددار قوم ہے، وہ اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔ ایک زمانے میں سوویت یونین کے مقابلے میں صرف ترک فوج سینہ تان کر کھڑی ہوتی تھی اور سپر پاور کو یہ جرأت کبھی نہ ہوئی کہ ترک سرزمین پر اس کا کوئی فوجی قدم رکھتا۔ آج کی واحد سپر پاور بھی ترکی سے اپنی من مانی نہیں کر سکتی۔ ترکی نیٹو کا ایک اہم رکن ہے۔ ترک فوج کی شجاعت اور بے جگری پر سب کو اعتماد ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تقریباً آدھی دنیا کو فتح کرنے والی ترک فوج سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے۔ اسی لیے امریکا اور دوسری مغربی طاقتیں ترکی کی اہمیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں ترکی یورپین یونین میں شامل ہونے کا خواہش مند تھا لیکن یورپین یونین کے عیسائی ملک ایک مسلمان ملک کو یونین کا رکن بنانے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے رکن بنانے کے لیے ترکی پر بہت سی شرائط عائد کیں۔ ترکوں نے ان کی ہر شرط مکمل کر دی لیکن یونین نے ترکی کو اپنا رکن نہیں بنایا۔ اس کے مقابلے میں یورپ کے بہت سے کمزور اور بے سروسامان ملکوں کو یورپین یونین بنا لیا جو ترکی کے مقابلے میں ہر اعتبار سے کمزور تھے۔ لیکن اب زمانے نے ایسی کروٹ لی ہے یورپین یونین کے معاشی حالات بدترین ہو چکے ہیں اس کے مقابلے میں ترکی ایک مضبوط اور مستحکم معیشت کا مالک ہے۔ دنیا بھر میں اس کی اقتصادی صورتِ حال پندرھویں اور یورپ میں ساتویں ہے۔ ترکی ائرلائن، یورپ کی مستحکم ترین فضائی کمپنی ہے جو منافع میں جا رہی ہے جبکہ یورپ کی ائرلائنز نقصان میں جا رہی ہیں..... ترکی جو آخری خلیفہ کے زمانے میں یورپ کا مردِ بیمار کہلاتا تھا آج یورپ کا سب سے صحت مند ملک ہے۔

دیکھیے یہ بات چلتی ہے تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ تذکرہ لندن میں پکاڈلی کے ترکش ڈونر کباب کو دیکھ کر ہمارے بے قرار ہونے کا تھا۔ ہماری بیگم لیلیٰ بھی ہمارے ساتھ تھیں اور ہم سے زیادہ ترکش ڈونر کباب کھانے کی

شوقین تھیں۔ یہ ایک مختصر خوبصورت ریستوران تھا۔ باہر ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا جہاں سے آپ ڈونر کباب خرید کر مزے سے کھاتے پھریں۔ اس زمانے میں یہ لندن میں سب سے سستا کھانا تھا۔ ڈونر کباب اور روٹی 70 پنس کی تھی۔ برابر والی دکان سے دس پنس کا کوک خرید لیں اور قریبی باغ میں بیٹھ کر یا پکاڈلی کے رنگین مناظر دیکھتے ہوئے اس سے لطف اندوز ہوں۔

لندن میں پکاڈلی ایک ایسا چوک ہے جہاں دن اور رات کے ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ آس پاس بے شمار دکانیں اور سینما گھر ہیں۔ چوڑے فٹ پاتھ دلکش راہ گیروں کے ہجوم سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں کسی ریلنگ کے سہارے کھڑے ہو جائیں تو ہزار طرح کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خریداری کرنے والی خواتین اور مرد، سیر دیکھنے والے سیاح، گرمیوں میں برائے نام لباس پہنے حسین خواتین، آپس میں پیار محبت کرنے والے جوڑے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے بوس و کنار کرتے ہوئے گھومتے نظر آتے ہیں۔ پکاڈلی ایک جنت نگاہ مقام ہے، رنگین اشتہاروں سے جگمگاتا ہوا۔ حسن و جمال کی ریل پیل دیکھنی ہو تو وہاں کھڑے ہو جائیں۔ پھر آپ کو فلم یا اسٹیج دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پکاڈلی کی عقبی گلیوں میں ریستوران، سینما گھر اور لندن کے بہترین تھیٹر اس کی رونق میں اضافے کا سبب ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کوئی پاکستانی لندن میں رہتا ہے یا سیاحت کے لیے لندن آیا ہوا ہے تو اس سے پکاڈلی میں ملاقات ضرور ہو جاتی ہے۔ کئی کئی سال کے بچھڑے ہوئے پاکستانی دوست یہاں اچانک مل جاتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر اخبار فروش بھی ٹھڑے لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس پلے بوائے کے علاوہ ہر قسم کے فحش میگزین آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ میگزین پاکستان میں ممنوع ہیں لیکن ان دکانوں اور ٹھڑوں پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ شوقین لوگ ان کے صفحات الٹ الٹ کر عریاں اور نیم عریاں تصاویر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ قدامت پسند یا خود کو شریف ظاہر کرنے والے انہیں کن انکھوں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اس چوک میں ایک شوارما کا چھوٹا سا ریستوران بھی تھا۔ ہم اور خان صاحب وہاں کھانے کے لیے بٹ صاحب کے منتظر تھے جن کا دوپہر سے کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ موبائل ٹیلی فونز کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا کہ ان کی خیر خیریت دریافت کرتے۔ ایک تو مستقل پیدل گھومنے کی وجہ سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے دوسرے شوارما کی اشتہا انگیز خوشبو نے بھوک کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔

خان صاحب بولے ”لعنت بھیجیے آفاقی صاحب، ہم تو کھانا شروع کرتے ہیں۔ خدا جانے بٹ صاحب کہاں کہاں نظر بازی کرتے اور لاحول پڑھتے پھر رہے ہوں گے۔“

ہم نے ابھی آرڈر دیا ہی تھا کہ لاحول کی آواز کانوں میں آئی۔ آواز کے پیچھے پیچھے بٹ صاحب خود بھی نمودار ہو گئے۔

”لاحول ولاقوۃ! آفاقی صاحب لکھ کر رکھ لیجیے، یہ قوم کبھی نہیں بخشی جائے گی۔“

”وہ کیوں؟“

”ارے ننگی تصویریں، بے ہودہ اور فحش مضامین، کھلے عام فروخت ہو رہے ہیں، میں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکیاں اور عورتیں یہ میگزین فروخت کر رہی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ!“

خان صاحب بولے ”پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو ان میگزینوں کو دیکھنے اور پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بٹ صاحب یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یہ لوگ تو اس کو برائی اور گناہ سمجھتے ہی نہیں مگر آپ کو یہ سب دیکھنے اور تفتیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”خان صاحب، انسان جس ملک میں جاتا ہے وہاں کے طور طریقے نہ دیکھے تو پھر سیاحت کا کیا فائدہ۔ یہ چیزیں معلومات اور علم میں اضافہ کرتی ہیں۔“

”اگر یہ علم ہے تو اس کو پڑھ کر آپ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ لاحول پڑھنے سے آپ کے گناہ تو نہیں بخشے جائیں گے۔“

”آفاقی صاحب، سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے اتنی بار لاحول پڑھی ہے کہ میرا تو گلا ہی سوکھ گیا۔ اب کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیجیے ورنہ میرا تو دم ہی گھٹ جائے گا۔“

خان صاحب نے کہا ”بٹ صاحب، آپ جو قدم قدم پہ لاحول پڑھ کر اپنا گلا خشک کرتے ہیں اس سے بہتر ہے کہ آپ ایک ہی بار لاحول ولاقوۃ ایک ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونک لیا کریں۔“

خان صاحب کا خیال تھا کہ لندن خصوصاً پکاڈلی پہنچ کر بٹ صاحب باؤلے ہو جاتے ہیں۔

”دیکھیے، آپ مجھے باؤلا کتا کہہ رہے ہیں۔“

”میں نے کتے کا تو استعمال ہی نہیں کیا۔ انسان بھی باؤلے ہو جاتے ہیں جیسے کہ آپ۔“

ایک عرب ویٹر نے ہمارے سامنے شوارما کی تین پلیٹیں لاکر رکھ دیں، ساتھ میں لذیذ اور دبیز روٹی بھی تھی۔ دو پیالیوں میں سرکہ اور مرچیں بھی آگئیں۔ اس روز ہم نے دو دو شوارما کھائے۔ پیٹ تو بھر گیا مگر دل نہیں بھرا۔ لندن میں شوارما اور ڈونر کباب اتنے مقبول ہیں کہ انگریزوں نے بھی ہاٹ ڈاگ چھوڑ کر یہ چٹ پٹے کھانے شروع کر دیے ہیں۔ واقعی مسالے اور نمک کا ایک الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ پاکستانی کھانے بھی انگریزوں کے من پسند ہو گئے۔ پاکستانی اور بنگالی ریستورانوں میں .... ہم نے مرچ مسالے والے کھانے انگریزوں کو بڑے شوق سے کھاتے دیکھا۔ چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں مگر چٹورے پن کا مزہ ایسا پڑا ہے کہ ابلے ہوئے نمک مرچ کے بغیر انگریزی کھانوں میں اب ان کے لیے لطف ہی نہیں رہا۔ یہ کئی سال پرانی بات ہے۔ اب تو یورپ کے ہر ملک میں دیسی کھانوں کے ریستوران نظر آتے ہیں جہاں بہت مزیدار کھانے فراہم کیے جاتے ہیں اور کھانے والوں میں مقامی لوگ بھی کافی تعداد میں ”سوں سوں“ کرتے، آنسو بہاتے اور مرچ مسالے دار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔

ایک بار ہم لیلیٰ کے ساتھ لندن گئے۔ لندن جائیں اور پکاڈلی نہ جائیں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ہر قسم کے ہوٹل یہاں پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر مہنگے ہیں کیونکہ پکاڈلی ایک بارونق، کاروباری مرکز ہے۔ اس زمانے میں ہمیں صرف ایک سستا ہوٹل مل گیا تھا۔ اس کا نام ریجنٹ پیلس ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل میں بے شمار کمرے تھے اس لیے لندن میں کسی اور ہوٹل میں جگہ نہ بھی ملے تو ریجنٹ پیلس ہوٹل میں مل جاتی تھی۔ البتہ بعض اوقات کچھ دیر انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہوٹل میں آنے اور جانے والوں کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ کمرے بہت آرام دہ تھے اور کرایہ سنگل روم کا صرف دو پونڈ۔ دو افراد کے لیے چار پونڈ روزانہ، کمی صرف یہ تھی کہ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم نہیں تھا۔ چھ سات کمروں کے لیے ایک باتھ روم تھا مگر انتہائی صاف ستھرا۔ جب کوئی مسافر باتھ روم استعمال کر کے جاتا تھا تو اس کی فوراً صفائی کر دی جاتی تھی اور دھلے ہوئے صاف تولیے رکھ دیے جاتے تھے۔ آسانی یہ تھی کہ آپ کہیں سے

آلِ احمد سرور، پروفیسر 1912ء

اردو نقاد اور شاعر، بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آگرہ اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ وہاں سے لکھنؤ یونیورسٹی چلے گئے اور پھر علی گڑھ واپس گئے اور رشید احمد صدیقی کے ریٹائر ہونے کے بعد صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ 1973ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ 1977ء میں انہوں نے علامہ اقبال کے صد سالہ جشن منعقدہ لاہور کی تقریب میں شرکت کی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے اعزازی سیکریٹری بھی رہے۔ وہ نہ صرف اردو شعبوں کے سربراہ رہے، بلکہ کاروانِ ادب کے قافلہ سالار بھی رہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی ادبی تحریکوں کی کامیاب قیادت کی۔ وہ غالب پرسند کا درجہ رکھتے تھے۔ غالب کی زندگی اور شاعری پر رسائل و جرائد میں بہت کچھ لکھا۔ سید حسین ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے دسمبر 1955ء تا اپریل 1958ء تک خدمات انجام دیں۔ غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ غالب پر ان کی مرتبہ دو کتابیں عرفان غالب اور عکس غالب 1973ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ انہوں نے غالب کے نسخہ حمیدیہ کا انتخاب بھی کیا۔ 1981ء میں انہیں صدر جمہوریہ بھارت کے ہاتھوں مودی غالب انعام برائے ارد و نثر ملا۔ تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔ 1۔ تنقید کیا ہے؟۔ 2۔ تنقیدی اشارے۔ 3۔ نئے پرانے چراغ۔ 4۔ ادب اور نظریہ۔ 5۔ نظر اور نظریے، 6۔ مسرت سے بصیرت تک۔

مرسلہ: زاہد فاروقی، کراچی

گھوم پھر کر یا شاپنگ کر کے آئیں اور اپنے آرام دہ بستر میں آرام کریں۔ جب چاہیں اٹھ کر کہیں چلے جائیں کیونکہ یہ مختلف انڈر گراؤنڈ ٹرینوں کا مرکز بھی ہے اور بسیں بھی کافی تعداد میں ہر طرف آتی جاتی رہتی ہیں۔ ٹیکسیوں کی بھی کمی نہیں صرف ویک اینڈ پر ٹیکسی ملنا مشکل ہوتا ہے مگر اس مسئلے کا بھی ایک حل تھا۔ ریڈیو کار، یہ نام ہم نے پہلی بار لندن میں سنا تھا اور اس کا مزہ بھی اٹھایا تھا۔ ریڈیو کار کے آفس فون کریں۔ ان کا نمبر ہر ہوٹل سے مل جاتا ہے۔ چند منٹ بعد ایک آرام دہ کار آجائے گی عام ٹیکسی کے مقابلے میں اس کا کرایہ کچھ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو نرخ مقرر ہیں وہ ٹیکسی میں لکھے ہوتے ہیں۔ ٹیکسی والے کی مجال نہیں کہ ایک پینس بھی زیادہ کرایہ وصول کرے۔ لندن کے ٹیکسی والے لالچی بھی نہیں ہوتے جو چاہے ٹپ دے، جو چاہے نہ دے۔ ٹیکسی والا ''تھینک یو'' کہہ کر مسکراتا ہوا رخصت ہوجائے گا۔ بٹ صاحب کو لندن کے ٹیکسی والوں کی عادت پسند نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں تو ٹیکسی میں سفر کرنے کا لطف ہی نہیں ہے۔

''وہ کیوں؟''

''نہ تو ٹیکسی والے سے بات کرتے ہوئے بات چیت ہوتی ہے اور نہ ٹیکسی چھوڑتے وقت کوئی جھگڑا ہوتا ہے۔ ریٹ پر کوئی بھی بحث نہیں ہوتی۔ ٹیکسی یا رکشا والے نے کرایہ سو روپیا مانگا اور بھاؤ تاؤ شروع ہوگیا۔''

''بھائی وہاں تک تو ہم پچاس روپے دیتے ہیں۔''

رکشا والا جواب دیے بغیر آگے چل پڑتا ہے یا پھر مسافر منہ موڑ کر چل دیتا ہے۔

''ارے ارے بات تو سنیں، چلیں، آپ بتادیں۔''

اس طرح چار پانچ منٹ کے بحث مباحثے کے بعد فیصلہ ہوجاتا ہے۔

ایک بار ایک پٹھان رکشے والے سے واسطہ پڑ گیا۔

''کیوں لالہ، ریگل کے کتنے پیسے؟''

''پچیس روپے۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

''آؤ بحث کرلو۔ فیصلہ ہوجائے گا۔'' رکشے والے نے کہا تھا تو ہم سر پیٹ کر رہ گئے تھے۔

شوارما تو ہم لوگوں نے دکان میں کھڑے کھڑے ہی کھالیا کیونکہ بیٹھنے کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''ہم غلط جگہ چلے آئے۔'' خان صاحب بولے۔

''کیوں، صحیح جگہ کیا ہوگی۔''

''بھائی کسی جگہ بیٹھ کر مشورہ کریں گے۔ اب ہمارے پاکستان واپس جانے کا وقت ہو رہا ہے فیصلہ کرنا ہے کہ کس راستے سے جائیں گے؟''

''خان صاحب، ہم کسی راستے سے نہیں بائی ائر جائیں گے، یعنی ہوائی جہاز سے۔''

''آپ تو بیوقوف ہیں۔ ارے میاں ہوائی جہاز کا بھی ایک راستہ ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو سارے ہوائی جہاز ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔''

ہم نے کہا۔ ''مشورہ تو ہم یہاں کھڑے کھڑے کرسکتے ہیں۔ پکاڈلی چوک میں بیٹھ کر کرسکتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ، ارے اس چوک میں تو لوگ شراب کے ڈبے پیتے رہتے ہیں یا نشہ کرتے رہتے ہیں۔''

''یا پھر پیار محبت کرتے رہتے ہیں۔ یار بے حیائی کی بھی حد ہے۔ کھلے بازار میں عین چوک میں بیٹھ کر پیار کرنا۔ کتنی بے حیائی اور بے شرمی کی بات ہے۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔'' بٹ صاحب نے کہا۔ ''مگر میری سنتا کون ہے۔''

''بٹ صاحب، اگر آپ ان کے پاس جاکر کہیں گے تب ہی سن سکیں گے۔ دل ہی دل میں کہہ دینے سے تو وہ سننے سے رہے۔''

''ارے یہ بگڑی ہوئی نسل ہے، انہیں سمجھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں تو دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہہ کر ثواب حاصل کرلیتا ہوں۔''

''یہ ثواب حاصل کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟''

''ارے تم جانتے نہیں، اسلام کہتا ہے کہ اگر برائی دیکھو تو اس کو طاقت سے روکو، ورنہ زبان سے سمجھا بجھا کر روکو، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو دل ہی دل میں اس کو برا کہہ کر روکو۔ بھائی ہمارے بس میں تو دل ہی دل میں روکنا رہ گیا ہے۔''

شوارما ختم کر کے باہر نکلے تو ہر طرف خوب رونق تھی۔ یہ لندن کی ایسی جگہ ہے جہاں دن ہو یا رات ہر وقت رونق رہتی ہے۔ کبھی چوری، ڈکیتی، اغوا، آبروریزی کا کوئی واقعہ نہیں سنا۔ بٹ صاحب کہتے تھے کہ لندن کے ٹریفک اور جرائم کو تو روحیں کنٹرول کرتی ہیں۔''

''روحیں؟ کیسی روحیں، بدروحیں یا نیک روحیں؟''

''دیکھیے نا، چاروں طرف آپ کو ایک بھی پولیس والا نظر نہیں آتا، لیکن جیسے ہی آپ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں، غلط جگہ کار پارک کرتے ہیں، کوئی خلافِ قانون کام کرتے ہیں خدا جانے کہاں سے پولیس کی وردی میں ایک روح نمودار ہوکر آپ کا چالان کردیتی ہے۔ آپ مانیں نہ مانیں، ان انگریزوں کا روحانی سسٹم بہت اچھا ہے۔''

بٹ صاحب کا المیہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت انگریزوں کو ناپسند بھی کرتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔ ان کی تمیزداری، نظم وضبط، اخلاق وآداب کے وہ بہت قائل ہیں مگر ان کی بے حیائی اور بے شرمی سے انہیں نفرت ہے۔ اور ہاں ان کا سؤر کا گوشت کھانا اور شرابیں پینا بھی انہیں پسند نہیں ہے۔

خان صاحب نے ہمارے کان میں کہا۔ ''عریانی بھی انہیں ناپسند نہیں ہے کیونکہ وہ ہر وقت لڑکیوں کی ننگی ٹانگیں ہی دیکھتے رہتے ہیں۔''

''مگر وہ لاحول بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔''

''ہم پر اپنی نیکی کا رعب ڈالنے کے لیے۔ اگر انہیں یہ بات پسند نہ ہو تو وہ ایسی عریاں چیزیں دیکھیں ہی نہیں۔''

یہ بات ہم نے ایک بار خود بٹ صاحب سے بھی پوچھی تھی۔ وہ بہت زور شور سے لاحول پڑھ رہے تھے۔ ہم نے کہا ''بٹ صاحب، اگر یہ باتیں بری ہیں تو آپ عریانی کو دیکھتے ہی کیوں ہیں؟''

''تو کیا آنکھیں بند کر کے عورتوں سے ٹکراتا پھروں اور تھانے پہنچ جاؤں۔''

''اسلام آنکھیں بند کرنے کو نہیں کہتا ہے۔ اسلام نے کہا ہے کہ مرد اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔''

''یہ بھی بہت مشکل ہے۔ ننگی ٹانگیں تو پھر بھی نظر آئیں گی۔ اور پھر آپ لندن کے فٹ پاتھوں پر آنکھیں نیچی کر کے چلیں گے تو ٹکریں تو پھر بھی ماریں گے۔''

''مطلب یہ کہ لاحول پڑھے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''اور کیا... اور پھر لاحول پڑھنے کا الگ ثواب ہے۔ لاحول سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے۔''

''مگر بٹ صاحب، ہم نے تو کسی شیطان کو بھاگتے نہیں دیکھا۔ سارے شیطان عورتوں کی شکل میں آپ کے آس پاس ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔''

''ارے تم ماڈرن لوگ ہو، تم تو مذہب کو بھی بھول بیٹھے ہو ورنہ ایسی باتیں نہ کرتے۔''

بٹ صاحب کے قصے سنانے بیٹھ جائیں تو ایک علیٰحدہ داستان بن سکتی ہے اسی لیے جب وہ خود بھی کوئی واقعہ سناتے ہیں تو خان صاحب انہیں ٹوک دیتے ہیں ''بٹ صاحب خلاصہ کرو خلاصہ۔''

خلاصہ یہ کہ شوارما کھاتے اور کوک کے ڈبوں سے شغل کرتے ہوئے ہم لوگ ٹریول ایجنٹ کی طرف چل پڑے۔ یہ ایک پاکستانی ٹریول ایجنٹ تھے۔ پکاڈلی سے اگر ٹریفلگر اسکوائر کی طرف جائیں تو ایک گلی نما سڑک پر اس کا دفتر تھا۔ مالک کا نام جلیل صاحب تھا۔ پہلی بار یہ سن کر بٹ صاحب نے احتجاج کیا کہ ہمیں کسی انگریز ٹریول ایجنسی میں جانا چاہیے۔

''انگریز ٹریول ایجنسی میں کیوں؟'' ہم نے پوچھا۔

''آفاقی صاحب، سمجھا کیجیے۔ یورپ میں سفر کرنے کے طریقے انگریز زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

خان صاحب کو غصہ آگیا۔ ''بٹ صاحب ویسے تو آپ بہت بڑے پاکستانی بنتے ہیں اور فائدہ انگریزوں کو پہنچانا چاہتے ہیں۔''

بٹ صاحب لاجواب ہوگئے۔ ہم نے کہا ''بٹ صاحب، ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ یہ ٹریول ایجنسی تو پاکستانی ہے مگر وہاں کام کرنے والے سب انگریز ہیں۔ انگریز لڑکیاں بھی ہیں۔''

بٹ صاحب خوش ہوگئے مگر ظاہر کرنے کے لیے بولے۔ ''وہ عریاں لباس تو نہیں پہنتیں؟''

خان صاحب جل کے بولے ''جی نہیں، وہ برقعے پہن کر بیٹھتی ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ برقع تو لندن میں ملتا ہی نہیں۔''

''یہ لوگ پاکستان سے برقعے سلوا کر لاتے ہیں۔''

''بیوقوف اور فضول خرچ لوگ ہیں۔ ارے بھئی جب چادر سے کام چل سکتا ہے تو اتنے مہنگے برقعے پاکستان سے سلوا کر منگوانے کی کیا ضرورت ہے؟''

جلیل ٹریولز کے دفتر میں داخل ہوتے ہی بٹ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ بہت روشن اور خوبصورت دفتر تھا۔ ایک طرف شیشے کا کیبن تھا جس میں جلیل صاحب بیٹھتے تھے۔ ہال میں دو طرفہ میزیں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر چند انگریز نوجوان لیکن ان سے زیادہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن بٹ صاحب کو لاحول پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی چونکہ لڑکیاں سفید بلاؤز اور نیلے رنگ کے کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔

ان کی ٹانگیں میز کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بٹ صاحب کے لاحول پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایک لڑکی نے مسکرا کر ''گڈ ڈے'' کہا اور پوچھا۔ ''میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟''

بٹ صاحب بولے۔ ''ہمیں آپ کے مالک سے ملنا ہے۔''

اس نے سامنے والے کیبن کی طرف اشارہ کردیا۔

خان صاحب نے آہستگی سے پوچھا۔ ''مالک سے کس لیے؟''

''مالک ہمیں چائے بھی پلائے گا اور اس سے گپ شپ میں آسانی ہوگی۔''

''بٹ صاحب ہم یہاں گپ شپ کرنے نہیں، ٹکٹ خریدنے آئے ہیں۔''

''یار ہمیں پاکستانی بھائی سمجھ کر وہ ہم سے رعایت بھی کردے گا۔''

جلیل صاحب۔ ایک طویل قدوقامت کے خوش پوش جوان آدمی تھے۔ انہوں نے کرسی سے اٹھ کر ہم تینوں سے مصافحہ کیا۔ علیک سلیک کے بعد بولے۔ ''جی فرمائیے؟''

''ہم پاکستان جانا چاہتے ہیں؟'' خان صاحب بول پڑے۔

جلیل صاحب خاصے خوش مزاج آدمی تھے۔ مسکرا کر بولے ''ضرور جائیے۔ اگر ویزا اور ٹکٹ ہے تو کون آپ کو روک سکتا ہے۔ آپ لوگ کب جانا چاہتے ہیں؟''

بٹ صاحب نے انگلیوں پر حساب لگایا اور بولے۔ ''چار دن بعد یعنی منڈے کو۔''

''آپ کو تین اکانومی ٹکٹ چاہئیں؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا یہ بتائیے آپ کیا پئیں گے، چائے یا کافی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر چائے چلے گی۔'' انہوں نے فون اٹھا کر چائے کے لیے کہا۔ پھر بولے ''دیکھئے، کراچی کے لیے کوئی ڈائریکٹ فلائٹ تو ہے نہیں۔ آپ کون سی ائر لائن سے سفر کرنا پسند کریں گے۔''

''پی آئی اے سے۔''

انہوں نے سامنے میز پر رکھا ہوا چارٹ دیکھا۔ ''معاف کیجیے گا منڈے کو پی آئی اے کی فلائٹ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''چانس پر تو ہوگی۔''

''میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ تین افراد ہیں۔ ضروری نہیں کہ چانس پر آپ کو تین سیٹیں مل جائیں۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟''

انہوں نے پھر چارٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''دیکھیے، آپ کو منڈے کو بی او اے سی مل سکتی ہے۔ لفتھہنسا مل سکتی ہے۔ ایئر فرانس مل سکتی ہے۔ آپ کو پیرس اور زیورخ کے علاوہ روم میں اسٹاپ اوور بھی مل جائے گا۔''

کیا ہم ایک دن سے زیادہ وہاں ٹھہر سکیں گے۔''

''یہ تو میں آپ کو معلوم کر کے ہی بتا سکتا ہوں۔''

انہوں نے پھر چارٹ کو دیکھا۔ ''آپ ٹرکش ائر لائن سے کیوں نہیں جاتے۔''

''وہ تو ترکی جائے گی۔''

آپ کو استنبول میں تین چار دن کا اسٹاپ اوور بھی مل سکتا ہے۔''

اتنی دیر میں ایک اسمارٹ خاتون چائے کی ٹرے لے کر داخل ہوئیں۔ ہم سب کو مسکرا کر دیکھا اور چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی، چائے کے ساتھ دو تین قسم کے بسکٹ اور پنیر بھی تھا۔ جلیل صاحب نے ٹرے لانے والی کا شکریہ ادا کیا ''تھینک یو کیٹ۔''

کیٹ مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

''آپ نے تو لڑکی کو بلی بنا دیا۔''

''اس کا نام کیترین ہے مگر سب اس کو کیٹ کہتے ہیں۔''

جلیل صاحب نے بڑی مہارت اور نفاست سے چائے خوبصورت پیالیوں میں ڈالی تو سارا کمرا چائے کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ خدا جانے اب چائے میں مہک باقی کیوں نہیں رہی۔ پلیٹ اٹھا کر انہوں نے بسکٹ اور پنیر پیش کیا مگر ہم سب نے شکریہ ادا کردیا البتہ بٹ صاحب نے پنیر کے دو ٹکڑے اٹھا لیے۔ ''مجھے انگلش پنیر بہت پسند ہے۔''

''تو اور لے لیجیے۔''

''شکریہ، اس سے زیادہ کی پیٹ میں گنجائش نہیں۔''

''تو پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟'' جلیل صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''فیصلہ تو سوچ کر ہی کریں گے۔''

''بہت زیادہ سوچنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں انگلینڈ میں تو منٹوں میں شادی کا فیصلہ بھی ہو جاتا ہے۔''

''اور سیکنڈوں میں طلاق بھی ہو جاتی ہے۔'' خان

صاحب چپ نہ رہ سکے۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ شادی بیاہ کے رشتے یہاں بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ شادی اور طلاق کو یہ لوگ اہمیت نہیں دیتے۔''

ہم لوگ آپس میں کھسر پسر کرنے لگے اور جلیل صاحب ٹیلی فون پر مصروف ہوگئے۔

ہم لوگوں نے آپس میں مشورہ شروع کردیا۔

ہم نے کہا ''دیکھئے بھئی، زیورخ، فرانس اور اٹلی تو ہم دیکھ چکے ہیں کیوں نہ اس بار ٹرکش ائرویز سے چل کر دیکھیں۔ سنا ہے ان کی بہت اچھی سروس ہے۔''

''اور پھر اپنا مسلمان ملک بھی ہے۔'' بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

خان صاحب نے کہا۔ ''آفاقی صاحب، سنا ہے استنبول بہت خوبصورت شہر ہے۔''

''اور پھر اپنا مسلمان ملک بھی ہے۔''

''اور آفاقی صاحب استنبول دنیا کا واحد ملک ہے جو مشرق اور مغرب دونوں براعظم پر پھیلا ہوا ہے۔''

''اور پھر اپنا مسلمان ملک بھی ہے۔''

''اور استنبول دارالخلافہ بھی رہ چکا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''خان صاحب خلیفہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب وہاں سیکولر حکومت ہے۔''

''مگر ہے تو اپنا مسلمان ملک۔'' بٹ صاحب پھر بولے۔

''سنیے بٹ صاحب، اگر آپ کو اسلامی ملک جانے کا شوق ہے تو پھر مکہ مدینہ چلیں۔''

بٹ صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے۔ جھٹ سے بولے ''وہاں تو وہی جاتا ہے جس کا بلاوا آتا ہے۔ جب ہمارا بلاوا آئے گا تو ہم فوراً مکہ مدینہ بھی چلے جائیں گے فی الحال تو استنبول چلیے۔ ہمارے راستے میں ہے اور مفت میں وہاں کی سیر بھی ہو جائے گی اور پھر مشرق اور مغرب بھی ہم ایک ہی جگہ دیکھ لیں گے۔''

ہم نے کہا۔ ''بٹ صاحب۔ جب آپ مشرق اور مغرب الگ الگ دیکھ چکے ہیں تو پھر ایک ساتھ دیکھ کر کیا فرق پڑے گا۔''

''بہت فرق پڑے گا۔ ایک ساتھ دیکھنے اور الگ الگ دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

جلیل صاحب فون پر بات کر چکے تھے۔ ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ ''تو پھر کیا مشورہ کیا آپ لوگوں نے۔''

''جلیل صاحب۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ائرلائن کے خرچے پر استنبول کتنے دن ٹھہر سکیں گے؟''

''دیکھیے۔ ائرلائن تو آپ کو ایک دن ہوٹل میں قیام اور کھانا وغیرہ دے گی۔ باقی دو دن آپ کو اپنے خرچے پر رہنا ہوگا۔''

ہم تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خان صاحب بولے ''تو پھر ٹھیک ہے۔''

''مگر دو دنوں کا ہوٹل کا خرچہ؟'' بٹ صاحب بولے۔

''بٹ صاحب کبھی عقل کی بات بھی کرلیا کرو۔ دو دن ہوٹل کے خرچے میں استنبول کی تین دن کی سیر مفت نہیں تو اور کیا ہوگی؟''

''اگر دل لگ گیا تو ہم کچھ دن اور بھی ٹھہر سکتے ہیں؟''

''معاف کیجیے گا۔ تین دن سے زیادہ آپ نہیں ٹھہر سکیں گے۔''

''چلیے تین دن ہی بہت ہیں۔ اگر پسند آگیا تو پھر استنبول چلے جائیں گے۔''

''تو پھر میں آپ کے ٹکٹ بنوا دوں؟''

''جی ہاں، بالکل بنوا دیجیے۔ کیا ہم لوگ استنبول سے بھی ٹرکش ائرلائن میں جائیں گے۔''

''جی نہیں استنبول سے آپ خلیج ائرلائن میں کراچی جائیں گے۔''

''وہ کیسی ائرلائن ہے جلیل صاحب۔''

''عربوں کی ائرلائن ہے۔ سوچ لیجیے کتنی اچھی ہوگی۔''

''اور پھر مسلم ائرلائن بھی تو ہے۔'' بٹ صاحب بول پڑے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''جلیل صاحب اس عرب ائرلائن میں تو عرب ائرہوسٹس ہوں گی۔''

''جی نہیں، انہوں نے دنیا سے بہترین ائرہوسٹس لڑکیاں بھرتی کی ہیں۔''

یہ سن کر بٹ صاحب کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔

خان صاحب نے کہا ''مگر بٹ صاحب زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یورپین لڑکیاں ہوں گی۔ مسلمان نہیں ہوں گی۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ یہاں انگلینڈ میں بھی تو یورپین خواتین سے ہی ہمارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔''

خان صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ''تھالی کا بینگن''

جلیل صاحب پوچھنے لگے۔ ''جی، کیا کہا آپ نے؟''

''جی میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ تجربہ بہت اچھا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے تو میں آپ لوگوں کے ٹکٹ بنوا دیتا ہوں۔''

ہم ٹریول ایجنسی کے دفتر سے باہر نکلے تو باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اسی گلی میں پاکستان کے سب سے بڑے انٹرنیشنل بینک بی سی سی آئی کا دفتر بھی تھا۔ اس زمانے میں ہر پاکستانی بی سی سی آئی کو اپنا ہی بینک سمجھتا تھا۔ ملک کے اندر ہو یا باہر، اسی بینک میں اپنا پیسا جمع کراتا تھا۔ یہ بھلے دنوں کی باتیں ہیں۔ اس کے بعد بی سی سی آئی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اور یہ بند ہوگیا۔ آج کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ نہ اس کے بانی کے نام سے واقف ہے۔

چار دن کے بعد ہم ٹرکش ائرویز میں سفر کر رہے تھے۔

ٹرکش ائرویز کے ہوائی جہاز اور سروس دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ہنستے مسکراتے ہوئے خوبصورت چہرے، مرد عورتیں سب اسمارٹ۔ سروس اتنی اچھی کہ ادھر گھنٹی پر انگلی رکھی اور ایک مسکراتی ہوئی ائرہوسٹس الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگئی۔ مگر یہ جن بہت خوبصورت تھا بٹ صاحب تو اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ائرہوسٹس سے کام کرانا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کوئی چیز لینی ہوتی تو وہ خود اٹھ کر جاتے تھے مگر ہم لوگوں نے ان کی چھیڑ بنالی تھی کہ انہیں زبردستی روک دیتے تھے۔

مثلاً وہ سیٹ سے اٹھے اور ہم نے پوچھا ''کہاں؟''

''ذرا کافی لینے جا رہا ہوں۔''

''بیٹھ جایئے۔ یہ کام ائرہوسٹس کا ہے۔ اگر کوئی اس سے کام ہی نہیں کرائے گا تو اس بے چاری کی نوکری چلی جائے گی۔''

بٹ صاحب مجبوراً بیٹھ جاتے۔

ایک بار وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے، سیٹ بیلٹ اتار دی اور چل پڑے۔

خان صاحب نے ان کا راستہ روک لیا۔ ''اب کہاں؟''

''ٹوائلٹ جا رہا ہوں۔''

''ارے بیٹھو یار ائرہوسٹس کس لیے ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''کیا مطلب، کیا ان کے بدلے ائرہوسٹس ٹوائلٹ جائے گی۔''

خان صاحب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر ٹوائلٹ جانا ہے تو پھر تو خود آپ کو ہی جانا پڑے گا۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی اکثر لائنز گھاٹے میں چل رہی تھیں مگر ٹرکش ائرلائنز کے مالی حالات بہتر تھے۔

سفر بہت آرام سے گزرا۔ نہ کوئی ائرپاکٹ نہ کوئی جھٹکا۔ یہاں تک کہ جب استنبول ائرپورٹ پر اترے تو بہت ہی آرام سے طیارہ زمین پر اتر گیا۔

اس سے پہلے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''سنو کہیں استنبول کوئی جزیرہ تو نہیں ہے۔ یہاں تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ کیا یہ ہوائی جہاز جیمز بونڈ کے ہوائی جہاز کی طرح سمندر میں اترے گا۔''

خان صاحب نے کہا۔ ''بٹ صاحب کلمہ پڑھ لو۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''

''لاحول ولاقوۃ سے کام نہیں چلے گا۔ آخر وقت میں تو کلمہ ہی پڑھنا ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب'' بٹ صاحب گھبرا گئے۔ ''کیا ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

''مگر یہ سب دوسرے مسافر تو اطمینان سے بیٹھے ہیں۔''

''اس لیے کہ ابھی تک انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر نہیں دیکھا۔''

''خان صاحب، آفاقی صاحب، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ استنبول آنے کی سازش کس نے کی تھی؟''

''آپ نے۔ کیونکہ آپ بھی تو کہہ رہے تھے کہ اپنا اسلامی ملک ہے۔''

''اسلامی ملک تو ہے مگر کیا اسلامی ملک کے سمندر میں ڈوبنا ثواب ہے۔''

''بٹ صاحب، ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ کہیں سچ مچ ہی ڈوبنا نہ پڑ جائے۔''

شکر ہے کہ ہوائی جہاز بخیر وعافیت ائرپورٹ پر اتر گیا۔

استنبول ائرپورٹ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ بے حد خوبصورت شیشے کے آپ ہی آپ کھلنے اور بند ہو جانے والے دروازے۔ اندر رنگ برنگ کے مسافروں کا ہجوم جن میں غیر ملکی سیاحوں کی اکثریت تھی۔ اول تو استنبول پہنچ کر یہ جاننا بھی مشکل تھا کہ کون غیر ملکی سیاح اور کون مقامی ترک ہے۔ گورے، گلابی رنگ، بھورے اور براؤن بال، بھوری آنکھیں .... قد آور، صحت مند اور ہنس مکھ۔ سب ہی لوگ مغربی ملبوسات پہنے ہوئے تھے۔ خواتین اسکرٹ، جینز، بلاؤز، آدھی آستین یا بغیر آستین کا بالائی لباس، سنہرے بال، زبان دونوں کی ہماری سمجھ سے بالاتر۔ جگہ جگہ ترکی زبان میں ہدایات درج تھیں۔ اب بتایئے حقیقت جانیں تو کیسے۔ ہر ایک سے انگریزی میں دریافت کر رہے تھے۔

''یو نو انگلش۔'' مسکرا کر جواب ملتا ''نو انگلش پلیز۔''

اب بات کس سے کریں۔ سوائے داخلے اور باہر جانے کے راستوں کے ہر جگہ ترکی زبان کا راج تھا۔ آخر ایک جگہ امیگریشن لکھا ہوا تھا۔ ہم بھی ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ بے شمار قطاریں تھیں۔ شکر ہے کہ یہاں مختلف قوم کے لوگوں کے لیے مختلف قطاریں نہیں تھیں جیسی کہ لندن اور دوسرے یورپی ملکوں میں ہوتی ہیں۔

قطار آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی، نہ کوئی بے چینی نہ دھکم پیل، نہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے قطاروں کو توڑنا۔ ہر کام نہایت مہذب اور منظم طریقے پر ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کی باری آگئی۔ ہم سب سے آگے تھے اور تینوں پاسپورٹ ہمارے ہاتھ میں تھے۔

سرخ وسفید ترک افسر نے مسکرا کر ہمیں دیکھا اور پھر ہمارے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پاسپورٹوں کو دیکھا۔ سبز پاسپورٹ دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ میں خلوص کی آمیزش ہوگئی۔

''پاکستانی؟'' اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

''یس! وی آر پاکستانی، فرسٹ ٹائم ان استنبول۔''

''یو آر تھری؟''

''یس، ون ٹو تھری۔'' ہم نے باقی ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

کوئی دوسرا سوال دریافت کرنے سے پہلے خان صاحب نے کہا ''وی لو ترکی۔''

اس نے پاسپورٹ پر ٹھپا لگاتے ہوئے کہا۔ ''وی آل سو لو پاکستان، ویری مچ!''

ہم نے کہا۔ ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔''

وہ کوئی خوش مزاج نوجوان تھا۔ ''زبانِ یارِ من اردو و من اردو نمی دانم۔''

اس نے انگریزی میں کہا ''ہمیں ایک دوسرے کی زبان سیکھنی چاہیے تاکہ آپس میں محبت بڑھے۔''

''محبت زبان کی محتاج نہیں ہوتی، یہ تو دلوں کا معاملہ ہے۔''

کہنے لگے ''آپ تو شاعری کرنے لگے، بہرحال، موسٹ ویلکم ہیئر۔ اللہ آپ کا سفر خوشگوار بنائے۔''

''آمین!'' کہہ کر ہم سامنے والے راستے سے باہر نکل گئے کیونکہ ہمارے پیچھے قطار میں کھڑے ہوئے مسافر کچھ بے چین ہو رہے تھے۔

بے شمار مسافروں کے باوجود ہر طرف صفائی نظر آ رہی تھی۔ فرش چمک رہا تھا۔ کیونکہ کئی افراد مسلسل صفائی کرنے میں مصروف تھے۔ پھر ایک نمایاں فرق یہ تھا کہ مسافر انتہائی مہذب اور پُرسکون تھے۔ بہت آہستگی سے بات کر رہے تھے۔ نہ شوروغل نہ بلند آواز میں بات چیت، نہ دھکم پیل، ہر شخص احتیاط سے چل رہا تھا، اگر جلدی اور گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تو بہت اخلاق سے معذرت کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ انگریزی کا لفظ ''سوری'' ایسا لفظ ہے جسے سب سمجھتے ہیں۔ ''سوری'' ہزار مسئلے کا حل اور بڑی سے بڑی بات کو ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔ کم از کم لفظ ''سوری'' کے لیے ساری دنیا کو انگریزوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یوں تو ہر زبان میں ''سوری'' کے مترادف موجود ہیں۔ مثلاً فرانس جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں فرنچ لفظ ''مرسی'' بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ رحم کا خواستگار

نواب آصف الدولہ

(1748-1797)

اردو شاعر اور والیِ اودھ۔ نواب شجاع الدولہ کے بیٹے تھے۔ اصل نام مرزا امانی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد 1775ء میں فیض آباد میں مسند نشین ہوئے۔ بعدازاں لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا۔ تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ ان کی تعمیر کردہ لکھنؤ کی مسجد وامام بارگاہ مشہور عمارتوں میں شمار ہوتی ہیں۔ شعروشاعری اور دیگر علوم وفنون کے قدردان تھے۔ دہلی کے مشہور شعرا مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ اور سید محمد میر سوز بھی ان کے عہدِ حکومت میں لکھنؤ آئے اور دربار سے وابستہ ہوئے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور میر سوز سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا اور اپنے بنائے ہوئے امام بارگاہ میں دفن ہوئے۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے جس میں غزلیں، رباعیاں، مخمس اور ایک مثنوی ہے۔

مرسلہ: احمد خان، ڈی جی خان

ہوں۔ فرانس کے لوگ مرسی کے لیے حلق سے جو آواز نکالتے ہیں وہ سننے میں ”میخ سی“ لگتا ہے لیکن ”سوری“ ان ملکوں میں بھی بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

بٹ صاحب نے رئیسانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور بولے ”لوڈر۔“

ہم نے کہا ”بھائی یہاں لوڈر اور مزدور بہت مہنگا پڑتا ہے اور پھر آپ خود دیکھ لیجیے ہر مسافر خواہ عورت ہو یا مرد اپنا سامان خود اٹھائے پھر رہا ہے۔ اب تو ایسے سوٹ کیس مل جاتے ہیں جن میں پہیے لگے ہوتے ہیں۔ دیکھ لیجیے کتنی آسانی سے سب اپنا سامان اٹھائے جا رہے ہیں۔ بٹ صاحب، آپ کو اب تو علم ہوگیا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں لوگ اپنا کام خود ہی کرتے ہیں۔“

بٹ صاحب ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے مگر ایک یونیفارم میں ملبوس شخص کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک ٹرالی بھی تھی۔ اس کے سینے پر اس کا نام بھی نمایاں نظر آرہا تھا اور یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک لوڈر ہے۔

بٹ صاحب سے آخر نہ رہا گیا۔ وہ اس کے نزدیک جاکر بولے ”السلام علیکم“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”وعلیکم السلام، یو مسلم؟“

”الحمدللہ۔“

”یو عرب؟“

”نو“ آئی ایم پاکستانی۔“

”او، یو پاکستانی۔“ اس نے اپنی ٹرالی وہیں چھوڑ دی اور آگے بڑھ کر بٹ صاحب کو گلے لگا لیا اور ترکی زبان میں کچھ الفاظ کہے۔

”یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ اتنا کہہ کر بٹ صاحب نے ہم دونوں کا تعارف بھی کرایا، وہ بولا ”آئی کریم“

اس میل ملاقات اور تعارف کے بعد بٹ صاحب نے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا پھر باہر جانے کا اشارہ کیا پھر اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا ”ہاؤ مچ؟“

وہ بولا ”ایٹ ہنڈریڈ لیرا“

بٹ صاحب کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ انہوں نے بہ مشکل اپنے ہوش و حواس پر قابو پایا ”ایٹ ہنڈریڈ لیرا؟ آٹھ سو لیرا، یہاں سے ٹرالی پر سامان باہر لے جانے کا کرایہ؟“

وہ کچھ سمجھا یا نہیں سمجھا بس سر ہلاتا رہا۔

خان صاحب نے کہا ”بھائیو، ایک ٹرالی لے آؤ اور اپنا سامان اس میں رکھ لو، جو باقی بچے گا وہ ہم ہاتھوں میں اٹھا لیں گے۔“

اب سوال یہ تھا کہ ٹرالی کہاں تلاش کی جائے، ہر مسافر کے ہاتھ میں ایک ٹرالی تھی۔ آخر خان صاحب ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک ٹرالی لے آئے۔

کریم ہم لوگوں سے کچھ باتیں کرتا رہا، شاید وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے لیے رعایت کر دوں گا یا آپ کا سامان مفت باہر پہنچا دوں گا مگر ہم نے اسے گلے لگا کر خدا حافظ کہا اور باہر کی طرف چل پڑے۔

”ارے آفاقی صاحب، یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے ہیں۔ اتنی مہنگائی، سامان باہر لے جانے کے لیے آٹھ سو لیرا کرایہ، یہاں تو کوئی ارب پتی بھی آئے تو کنگال ہو جائے۔ ہمارے پاس تو تھوڑے سے پونڈ ہی بچے ہیں۔ ایک دن تو ہوٹل کے خرچے پر رہ لیں گے لیکن باقی دو دن کیا کریں گے۔ کہاں رہیں گے، کہاں سے کھائیں گے۔“

خان صاحب بٹ صاحب کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ”آپ ہی بار بار کہہ رہے تھے کہ اپنا مسلم ملک ہے اب تھوڑی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔ فٹ پاتھ پر یا کسی باغ میں سو لیا کریں گے۔ ناشتا کھانا ادھار مانگ لیا کریں گے۔ ہوسکتا ہے ہمیں پاکستانی سمجھ کر ترک ہمیں مفت کھانا کھلا دیں، کوئی نیک دل ترک ہمیں اپنے گیراج میں رہنے کی جگہ دے دے۔“

اچانک بٹ صاحب کو یاد آیا۔ ”کرایہ، ٹیکسی کا کرایہ، سوچیے وہ کتنے لاکھ یا کروڑ میں ہوگا۔“

”بھئی ٹرکش ائرویز کی بس ہمیں مفت میں ہوٹل لے جائے گی۔“

”مگر دو دن بعد تو ہمیں اپنے خرچے پر ائرپورٹ جانا ہوگا پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

”فکر مت کرو، ہم سڑکوں پر پاکستانی فلموں کے گانے گا کر بھیک مانگا کریں گے، جب ترکوں کو پتا چلا کہ یہ لوگ پاکستانی ہیں اور پاکستانی گانے گا رہے ہیں تو وہ دل کھول کر ہمیں بھیک دیں گے۔“

”لاحول ولاقوۃ۔“

ہم دونوں نے سر گھما کر دیکھا کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔

بٹ صاحب بولے ”ارے میں تو لاحول آپ لوگوں

کے پست خیالوں پر پڑھ رہا ہوں۔“

”ہم یہاں استنبول کی سیر کرنے آئے ہیں یا بھیک مانگنے؟“

”بھئی عقلمند وہی کہلاتا ہے جو حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔ بیوقوفی تو ہماری ہے کہ جیب میں پیسے نہیں تھے اور ہم استنبول کی سیر کو چلے آئے۔“

”دیکھو بھئی، اب یہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا، مگر یہ نہ بھولنا کہ ہمیں ترکی میں اپنا اور اپنے ملک کا وقار بہر صورت بلند رکھنا ہے۔ چاہے ہمیں بھوکا ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔“

”بھائی صاحب“ بٹ صاحب بولے ”بھوکے تو رہ لیں گے مگر رہیں گے کہاں؟“

”اللہ مالک ہے، جس نے ہمیں ترکی بھیجا ہے وہی کوئی بندوبست بھی کرے گا۔“

”ماشاءاللہ، خان صاحب آپ تو ترکی پہنچتے ہی اللہ والے ہوگئے۔“ بٹ صاحب بولے ”ہم لوگوں کو چاہیے کہ جب تک ترکی میں رہیں نماز ضرور پڑھیں۔“

ہم نے کہا۔ ”اور یہ عہد کریں کہ اگلی بار یورپ کے بدلے مدینہ جائیں گے، حج نہیں تو عمرہ ضرور کریں گے۔“

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم ائرپورٹ سے باہر پہنچ گئے۔ ہر طرف رونق اور چہل پہل نظر آرہی تھی۔ باہر ہماری ائرلائن کا ایک نمائندہ ہم تینوں کے نام لیے کھڑا تھا اور ہر مسافر کے سامنے وہ پلے کارڈ کر دیتا۔

خان صاحب بولے ”وہ رہا۔“ اور اس کی طرف بڑھے۔ ہم لوگوں نے ہم آواز ہو کر السلام علیکم کہا جواب میں اس ادھیڑ عمر ترک نے وعلیکم السلام رحمتہ اللہ وبرکاتہ کہہ کر دل خوش کر دیا۔ بٹ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ”خواہ مخواہ ڈرا رہے تھے کہ ترکی سیکولر ملک ہے۔“

ہجوم بہت زیادہ تھا۔ مختلف قسم کے لوگ مختلف ملبوسات میں سامان تھامے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ٹیکسی والے خوش لباس تھے اور شکل سے بہت معقول نظر آرہے تھے۔ ہمارے ائرپورٹس کی طرح ٹیکسی والے مسافروں سے جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے سامان چھیننے کی کوشش نہیں کرتے۔ ٹیکسی والے ایک طرف قطار میں ٹیکسیوں کے ساتھ منتظر رہتے ہیں۔ سب سے آگے والا مسافر پہلی ٹیکسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے رخصت ہوتے ہی دوسرا ٹیکسی والا اس کی جگہ آجاتا ہے۔ ایک خاص بات یہ تھی جب مسافر ٹیکسی میں سوار ہوتا ہے تو ٹریفک کا ایک اسمارٹ سپاہی ایک پرچی پر ٹیکسی کا نمبر لکھ کر وہ چٹ مسافر کو دے دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ٹیکسی ڈرائیور زیادہ کرایہ طلب کرے یا مسافر کو تنگ کرے تو چٹ پر درج پولیس والوں کو فون کے ذریعے مطلع کرے۔ اس کے بعد پولیس جانے اور ٹیکسی ڈرائیور۔

ٹیکسی کے رکنے کے بعد خوش لباس ٹیکسی ڈرائیور مسافر کا سامان ٹیکسی میں اٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ اتنے خوش لباس اور معقول آدمی کو سامان اٹھا کر ٹیکسی میں رکھتے ہوئے دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ تعلیم اپنی زبان میں حاصل کرتے ہیں۔ استنبول ائرپورٹ گہما گہمی اور ہماہمی کا مرکز تھا لیکن ہر کام سلیقے سے کیا جا رہا تھا۔ مسافروں کی رہنمائی کے لیے پولیس والے موجود تھے۔

بٹ صاحب اپنا سامان اٹھائے ایک ویگن کی طرف بڑھے جس پر ٹرکش ائرلائنز لکھا ہوا تھا لیکن ہمارے گائیڈ نے فوراً انہیں روک لیا اور ایک بڑی بس کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ چھوٹی گاڑیاں مسافروں کو دوسرے ائرپورٹس کو لے جانے کے لیے تھیں۔ ترکی میں یہ نیا نظام دیکھا کہ استنبول سے ازمیر، اناطیہ اور دوسرے شہروں کو جانے کے لیے چھوٹے چھوٹے ائرپورٹس بنائے گئے ہیں۔ ان شہروں کو جانے والے مسافر استنبول ائرپورٹ پر ہجوم نہیں کرتے بلکہ اپنے لیے مخصوص ہوائی اڈوں پر چلے جاتے ہیں۔ استنبول میں دوسرے شہروں کو بائی ائر جانے والے مسافر استنبول ائرپورٹ کی بجائے سیدھے اپنے مقررہ ائرپورٹس پر جاتے ہیں۔ دوسرے دورۂ ترکی میں خود ہم نے بھی ان ائرپورٹس کا رخ کیا۔ یہ ائرپورٹس ہر اعتبار سے بین الاقوامی معیار کے حامل ہوتے ہیں۔ صرف سائز میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ ہوائی سفر کرنے والوں کے لیے یہ آسانی ہم نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھی جس کی وجہ سے انٹرنیشنل ائرپورٹس پر بے حد ہجوم رہتا ہے۔ پاکستان کے ائرپورٹس ہی کو دیکھ لیجیے۔ ملک کے اندر سفر کرنے والے مسافر بھی انٹرنیشنل ائرپورٹس ہی کو استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ائرپورٹس پر اتنا ہجوم رہتا ہے کہ اب تو ان پر بسوں کے اڈوں کا گمان گزرتا ہے۔ ہم جو اپنے بین الاقوامی ائرپورٹس میں توسیع کرتے رہتے ہیں پھر بھی افراتفری اور مسافروں کا ہجوم کم نہیں ہوتا۔ ترکوں کے اس کامیاب تجربے سے ہم کو بھی کچھ سیکھنا چاہیے۔

ہم لوگ ٹرکش ائر لائنز کی آرام دہ بس میں بیٹھ گئے۔ موسم بہت اچھا تھا لیکن جدید بس میں ہلکا سا ائر کنڈیشن بھی چل رہا تھا جس کی وجہ سے موسم مزید خوشگوار ہوگیا تھا۔

استنبول میں ہوائی جہاز سے باہر نکلتے ہی ہمیں احساس ہوگیا کہ اس ملک میں تہذیب وتمدن اور نظم وضبط کا راج ہے۔ اپنے ملک سے مقابلہ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ٹرکش ائرلائنز اس وقت بھی یورپ کی ایک اچھی ائرلائن سمجھی جاتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوشحالی اور کارکردگی میں بہت نمایاں اضافہ ہوا۔ حال ہی میں 2012ء میں ٹرکش ایئرلائنز کو یورپ کی بہترین ایئرلائن ہونے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یورپ کی اکثر ائر لائنز اس وقت نقصان میں چل رہی ہیں لیکن ٹرکش ائرلائن خوشحالی اور کامیابی سے چل رہی ہے۔

استنبول ائرپورٹ سے شہر کا فاصلہ کافی ہے۔ ایک کشادہ اور جدید سڑک استنبول شہر تک لے جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت شاہراہ ہے۔ سڑک کے ایک طرف سمندر کا نیلا پانی ہے جو سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

بٹ صاحب بولے۔ ''کتنا خوبصورت منظر ہے۔ بالکل سوئٹزرلینڈ کی طرح۔''

ہم نے انہیں یاد دلایا کہ سوئٹزرلینڈ میں کوئی سمندر نہیں ہے۔ وہاں جھیلیں ہوتی ہیں۔''

''وہ بھی تو سمندر کی طرح بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں۔''

خان صاحب بیزاری سے بولے۔ ''بٹ صاحب، سمندر اور جھیل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سمندر سمندر ہوتا ہے اور جھیل چاہے کتنی بڑی ہوجائے وہ جھیل ہی رہتی ہے۔''

اس سڑک کے دائیں جانب سمندر تھا اور بائیں جانب جدید کئی منزلہ عمارتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ سڑک کے درمیان میں سبز گھاس کے بڑے بڑے تختے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سبز رنگ کا قالین تاحدِ نگاہ بچھا ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بہت سے ترک خاندان ان گھاس کے تختوں پر قالین بچھائے پکنک میں مصروف تھے۔ وہ آس پاس کی سڑکوں، عمارتوں اور سمندر سے قطعی بے پروا تھے۔

''یہ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں؟'' بٹ صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔

''دیکھا نہیں پکنک منارہے ہیں۔''

''عجیب لوگ ہیں، انہیں پکنک منانے کے لیے سڑک کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں ملی۔''

''بٹ صاحب، استنبول میں بہت بڑے بڑے باغات اور سمندر کے ساحل ہیں۔ ان کی مرضی ہے، وہ یہاں پکنک منانے آگئے۔ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ ایک طرف سمندر، دوسری طرف عمارتیں، درمیان میں یہ سرسبز سڑک، اور دیکھیے، یہاں تو سڑکوں پر خاک اور مٹی بھی نہیں ہے۔''

''کیوں، یہاں کی خاک اور مٹی کہاں چلی گئی؟''

خان صاحب تنگ آکر بولے۔ ''انہوں نے ایکسپورٹ کردی ہے، شہر بھی صاف رہتا ہے اور اچھی خاصی آمدنی بھی ہوجاتی ہے۔''

''یار، یہ تو بہت اچھا کاروبار ہے، ہمارے ملک میں تو خاک اور مٹی کی کمی نہیں ہے۔ کروڑوں اربوں ڈالر کی خاک اور مٹی ایکسپورٹ کرکے ڈالر کما سکتے ہیں۔''

ڈالر پر ہمیں اپنے پیسے یاد آگئے۔

ہم نے کہا۔ ''دیکھو بھئی... ہم لوگ اس وقت مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ اپنا سارا روپیا اکٹھا کرلیں اور جو بھی پاؤنڈ یا ڈالر ہمارے پاس ہیں وہ سب ملا کر خرچ کریں۔''

''ویری گڈ، آپ نے تو گھریلو عورتوں جیسی سلیقے کی بات کی ہے۔''

ہم سب نے لندن سے روانہ ہوتے ہوئے اپنی رقم ڈالروں میں منتقل کرلی تھی، سب نے اپنی جیبیں کھنگالیں اور سارے نوٹ نکال کر ہمارے سپرد کردیے۔ یہ رقم ساٹھ ستّر ڈالر کے قریب بنتی تھی۔

''یہ تو اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہے جہاں لوڈر آٹھ سو لیرا ..... مانگتا ہو وہاں یہ رقم کس کام آئے گی۔''

''یہ لیجیے، بیس ڈالر کا ایک نوٹ اور نکل آیا ہے'' بٹ صاحب نے خبر دی۔

''کہاں سے نکل آیا ہے؟''

''میں نے تلاشی لینے والوں سے چھپا کر اپنے .... موزے میں رکھ لیا تھا۔''

یہ ان کی چالاکی اور عقلمندی تھی کیونکہ اس زمانے میں غیر ملکی زرمبادلہ ملک سے باہر لے جانے پر سخت پابندی تھی۔ کسٹم والے بہت سختی کرتے تھے اور نہ صرف پیسے ضبط کرلیتے تھے بلکہ کئی بار مسافروں کو ہوائی جہاز سے بھی اتار لیا کرتے تھے۔

(جاری ہے)

جبلّت

صبا شفیق

اس نے شیروں کو سدھانے کی مہارت حاصل کررکھی تھی۔ اس کے اشارے پر جنگلی درندے بھیگی بلّی کی طرح دم ہلاتے تھے مگر وہ غافل تھا کہ درندوں کی جبلّت کبھی کبھی عود کر آتی ہے، انگڑائی لے کر بیدار ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر انتہائی بھیانک انداز میں، پھر بھی اس نے حوصلے کا دامن تھامے رکھا، معذوری کو مجبوری بننے نہیں دیا۔



شیروں کے ایک مشہور ٹرینر کی زندگی کا ایک باب

میراج ہوٹل میں شاندار جشن جاری تھا، آج رائے ہارن کی انسٹھویں سالگرہ تھی۔ پانچ سو سے زائد مہمان مدعو تھے جن میں اس کے دوست، احباب اور سرکس کے باقی بازی گر اور شعبدہ باز بھی شامل تھے۔ یہ جشن اس لیے بھی خاص تھا کہ آج رائے ہارن اور سیگ فرائیڈ کی شاندار رفاقت اور دوستی کو بھی چوالیس سال ہوگئے تھے' انہوں نے جتنی شہرت حاصل کی تھی وہ مشترکہ تھی۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ الگ الگ وہ اس مقام پر کبھی نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ دونوں اکٹھے تیس ہزار سے زائد شو کرچکے تھے۔ سالانہ چار لاکھ سے زائد تماشائی ان کے کرتبوں اور شعبدوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ سیگ فرائیڈ رسّی پر کرتب دکھانے اور جادو کے شعبدوں کا ماہر تھا تو رائے کو جانور سدھانے اور ان کے ساتھ کرتب دکھانے میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کی جانوروں کو سدھانے اور ان سے اپنی مرضی کے کرتب کروانے کی صلاحیت بہترین ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب سی پُراسرار بھی تھی۔ جانوروں کو سدھانے سے زیادہ رائے ان کے ساتھ پیار کا رشتہ قائم کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ رائے کی انگلی کا اشارہ تک سمجھنے لگتے۔ رائے شیر اور چیتے کے بچوں کو پیدائش کے فوری بعد سے اپنے ساتھ سلاتا تھا اور لمحہ لمحہ ان کے ساتھ ہی وقت گزارتا تھا۔ رائے ہارن اور سیگ فرائیڈ تقریباً 100 ایکٹر پر بنے ایک فارم ہاؤس میں رہتے تھے جسے انہوں نے ''جنگل محل'' کا نام دے رکھا تھا۔ یہاں تریسٹھ شیر اور 16 ببر شیر رائے کے بیڈروم، سوئمنگ پول اور پورے فارم پر گھومنے کے لیے آزاد تھے۔ شو کے علاوہ رائے کا سارا وقت ان شیروں سے باتیں کرنے اور انہیں مزید کرتب سکھانے میں صرف ہوتا تھا۔

رائے ہارن اور سیگ فرائیڈ نے یہ کامیابی ایک دن میں حاصل نہیں کی تھی۔ ان دونوں کے باپ شرابی اور جواری تھے مگر انہوں نے اپنا مستقبل خود بنایا تھا اور دولت وشہرت حاصل کرنے اور... اپنے خوابوں کو پانے کے لیے شبانہ روز محنت کی تھی۔ اس کامیابی کا آغاز 1967ء میں امریکی شہر لاس ویگاس سے ہوا تھا جب رائے نے جانوروں کے کرتبوں اور سیگ فرائیڈ نے اپنے

جادواور شعبدوں سے دیگاس کے شہریوں کو مسحور کر ڈالا تھا اور پھر کئی سال دونوں نے شہر کے لوگوں کے دلوں پر راج کیا...... اور آج چوالیس سال بعد اس شاندار جشن کے موقعے پر رائے کے دوست احباب اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ ریٹائرمنٹ کب لے رہا ہے؟ اس پر رائے ہنسنے لگا اور بولا ''تم لوگوں کو لگتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں...... ہاہاہا...... نہیں، نہیں، دوستو! یہ تم لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ رائے کبھی اپنا کام چھوڑے گا...... مجھے تو موت ہی ریٹائر کر سکتی ہے۔'' مگر کون جانتا تھا کہ چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں رائے کی یہ حالت ہو گی کہ اس کی زندگی ہی ختم ہوتی نظر آئے گی۔

یہ 3 اکتوبر کی رات تھی۔ شو شروع ہوئے تقریباً پینتالیس منٹ ہو چکے تھے کہ رائے نے سات سالہ شیر مونٹی کور کے ساتھ کرتبوں کا آغاز کیا۔ پنڈال میں پندرہ ہزار سے زائد تماشائی موجود تھے اور تالیاں بجا کر اور نعرے لگا لگا کر مونٹی اور رائے کو داد دے رہے تھے کہ اچانک نہ جانے کس تماشائی کی کیا حرکت مونٹی کور کو ناگوار گزری اور وہ اپنا روزانہ کا معمول چھوڑ کر تماشائیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ شیر اور تماشائیوں کے درمیان کوئی حفاظتی جنگلا موجود نہیں تھا۔ مونٹی کور کو یوں تماشائیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر رائے کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی اور وہ چھلانگ لگا کر شیر اور تماشائیوں کے درمیان آ گیا اور انگلی کے اشارے سے مونٹی کور کو ''لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ!'' کہنے لگا۔ مگر مونٹی کور آگے بڑھتا رہا، اب تماشائیوں اور شیر کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ رائے غصے سے پھر بولا۔

''لیٹ جاؤ مونٹی کور......! رک جاؤ مونٹی کور......'' مگر شیر نے آگے بڑھ کر اس کی دائیں کلائی اپنے جبڑے میں دبوچ لی۔

رائے کے ہاتھ سے لوہے کی وہ زنجیر چھوٹ گئی جس سے شیر کی گردن کا پٹا بندھا تھا۔ اب رائے دوسرا ہاتھ شیر کے سر پر آہستگی سے مار کر اسے کہنے لگا ''چھوڑو مونٹی کور...... میرا ہاتھ چھوڑ دو......'' وہ پوری قوت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا کہ مونٹی کور نے اچانک اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ سر کے بل پیچھے جا گرا۔ دوسرے ہی لمحے شیر اس کے اوپر تھا اور اس نے اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیے اور 30 فٹ تک گھسیٹتا ہوا اسٹیج سے نیچے لے گیا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح ایک جنگلی شیر ہرن کو مار گراتا ہے۔

سیگ فرائیڈ فوراً رائے کی طرف بڑھا اور رائے کو اس کی گرفت سے نکالنے کے لیے شیر کو ڈرانے لگا مگر بے سود۔ شیر کے دانت ابھی بھی رائے کی گردن میں گڑے تھے۔ باقی عملہ بھی مختلف طریقوں سے شیر کو ڈرانے اور ہٹانے کی کوشش کرنے لگا مگر شیر نے رائے کی گردن نہ چھوڑی۔ آخر کار سیگ فرائیڈ لوہے کا ڈنڈا لے کر آگے بڑھا اور اس کو شیر کے سر پر مارا۔ شیر خوف زدہ ہو کر اپنے پنجرے کی جانب بھاگا۔ رائے کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور سانس اٹک رہی تھی مگر پھر بھی وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا ''مونٹی کور کو گولی مت مارنا۔'' رائے کو فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی بند ہوتی دھڑکن کو ڈاکٹر بے حد کوششوں کے بعد بحال کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شیر نے اس کی غذا کی اور سانس کی نالی چبا ڈالی تھی اور اس کی شہ رگ پر بھی خراشیں تھیں مگر وہ کٹنے سے بچ گئی تھی کیونکہ شاید رائے کی زندگی ابھی باقی تھی۔ رائے کے دماغ کے خلیات کو خون کی عدم دستیابی کی وجہ سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا۔ اس وجہ سے اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور اس کے دماغ کی جھلی انفیکشن کے باعث سوج گئی جس کی وجہ سے اس کے دماغ کا بھی آپریشن کرنا پڑا۔ اس کے دماغ کا آپریشن کرنے والے سرجن کا کہنا تھا کہ رائے کا بچنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ ابتدا میں رائے نہ بول سکتا تھا، نہ کھا سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا مگر حیران کن طور پر چند دن بعد ہی رائے لکھ کر بات کرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت بحال ہونے لگی۔ اس تمام عرصے میں سیگ فرائیڈ ہر لمحہ اس کے ساتھ رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اسے کہا کہ وہ اکیلا شو کر لے مگر سیگ فرائیڈ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ رائے کے بغیر کبھی شو نہیں کرے گا۔ سیگ فرائیڈ نے بھائیوں سے بڑھ کر رائے کا ساتھ دیا تھا یہی وجہ تھی کہ رائے نے اپنی طبیعت سنبھلنے کے بعد جو سب سے پہلے الفاظ لکھے، وہ سیگ فرائیڈ کے لیے تھے ''سیگ فرائیڈ...... میرے دوست! میرے بھائی! اس دنیا میں تمہارے ساتھ سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہے۔''

چار ماہ بعد رائے نے اپنا پہلا لفظ بولا اور پھر وہ سہارے کے ساتھ چلنے لگا۔ رائے کے نیورو سرجن کا کہنا ہے کہ دماغ کو پہنچنے والے ناقابلِ تلافی نقصان کے باعث رائے کی ادراکی اور تخلیقی صلاحیتوں کی پوری طرح سے بحالی ناممکن سی بات ہے، شاید وہ کبھی بغیر سہارے کے چلنے لگے مگر اس پر فالج اور مختلف انفیکشنز کا حملہ بارہا ہوتا رہے گا جبکہ سیگ فرائیڈ کو یقین ہے کہ رائے ایک دن مکمل ٹھیک ہو کر اس کے ساتھ شو کرے گا۔ اس کو یقین ہے کہ رائے کی ہمت اس کو پہلے کی طرح مضبوط اور توانا بنا دے گی اور وہ اسی طرح شیروں اور چیتوں کو اپنی انگلی کے اشارے پر نچا سکے گا۔ سیگ فرائیڈ کو یقین ہے کہ ہمت اور لگن معجزوں کو جنم دیتی ہے...... اور رائے ہارن کی ہمت اور لگن معجزہ ضرور دکھائے گی۔



ماضی تا حال

عائشہ بخاری

لاہور وہ شہر ہے جو اپنے اندر داستانوں کی داستان رکھتا ہے۔ اس شہر نے نشیب وفراز کے ایسے ایسے مناظر دیکھے جو عبرت اثر ہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی شہر لاہور کی تاریخ، ایک جداگانہ انداز میں، یہ اندازوبیان منفرد ہے اس لیے پسند بھی آئے گا۔

زندہ دلان لاہور کے لیے ایک خصوصی تحریر

میں اس وقت انارکلی بازار کے شروع میں کھڑا ہوں۔

میرے پیچھے مسلم مسجد ہے اور سامنے انارکلی بازار۔ مجھے انارکلی بازار کراس کرتے ہوئے نیلے گنبد تک جانا ہے۔

بس یہ میرا انتہائی سفر ہے۔

لیکن یہ سفر دس پندرہ منٹوں میں ایک بازار کو کراس کرنے کا نہیں بلکہ صدیوں کا سفر ہے۔ زمین میرے قدموں تلے ریورس گیئر میں چل رہی ہے۔ اور وقت میرا

ہاتھ تھام کر مجھے پیچھے لے جا رہا ہے۔

سامنے کے مناظر، دکانیں، عمارتیں، آتے جاتے لوگ، خوش شکل مرد خوش نما عورتیں اور وہ لڑکیاں جن کی آنکھیں نقابوں کی آڑ سے زندگی کے خوش گوار ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ وہ سب دھندلاتے جا رہے ہیں۔ چہرے معدوم ہو رہے ہیں۔ دکانیں فیڈ آؤٹ ہو رہی ہیں۔ نئی تعمیر شدہ عمارتیں غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی جگہ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتیں ہیں۔ جن کی ڈیوڑھیاں بلند ہیں۔ اور جن کے چوباروں سے متوالی آنکھوں اور شیریں آوازوں والی لڑکیاں جھانک رہی ہیں۔

یہ وہ لڑکیاں اور عورتیں ہیں جن کے خوبصورت جسموں کو سوائے در و دیوار اور چاند تاروں کے کسی غیر نے نہیں دیکھا ہوگا۔

اس سڑک یا گزرگاہ پر ان گھوڑوں کے دوڑنے کی وجہ سے گرد اڑ رہی ہے جو اپنے اپنے شہسواروں کو اپنی پشت پر لیے کسی انجانی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔

نہ جانے یہ قافلہ کہاں اور کس طرف جا رہا ہوگا۔ شاید دہلی یا اس سے بھی آگے۔ شاید یہ کوئی تاجر ہیں، یا شاہی لشکر میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرنے۔

چوبارے میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی اچانک اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ اس کو عمارت کے سامنے سے ایک گھڑسوار اچھی طرح دیکھ لیتا ہے۔

دونوں کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ لڑکی انارکلی ہے اور گھڑسوار سلیم۔

لیکن یہ وہ انارکلی اور سلیم نہیں ہیں جن کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ کوئی اور ہیں۔ چونکہ یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اس لیے انارکلی اور سلیم ہیں۔ جہاں کہیں بھی محبت پائی جاتی ہے وہاں یہی دو نام ملتے ہیں۔

سلیم ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ اس عمارت سے آگے گزر جاتا ہے۔ انارکلی اسے اس وقت تک دیکھتی رہتی ہے جب تک اس کے گھوڑے کی گرد کی دیوار اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کر دیتی۔

ایک آواز گونجتی ہے۔ ”انارکلی، وہاں کیوں کھڑی ہو۔ آؤ اندر آجاؤ۔“

یہ اس کی ماں کی آواز ہے جو گھر کی ملازمہ کو کھیتوں سے آئے ہوئے اناج کا حساب کتاب بتا رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ انارکلی اس کی مدد کرے۔

انارکلی ماں کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ”اماں، یہ اتنے سارے گھڑسوار کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ ماں سے پوچھتی ہے۔

”چھاؤنی کی طرف جا رہے ہوں گے۔“ ماں جواب دیتی ”تجھے تو معلوم ہے نا۔ پہلے یہاں کتنی بڑی فوجی چھاؤنی ہوا کرتی تھی۔“

”یہ بات تو مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے کی ہے اماں۔“ انارکلی نے کہا۔

”ہاں، لیکن اب انگریز بہادر اس چھاؤنی کو یہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جا رہے ہیں“ (یہ تبدیلی 1849ء میں شروع ہوئی تھی)

”ہاں، چھاؤنی تو اب یہاں سے چلی ہی گئی ہے۔“

”اس لیے ہمارے فوجیوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کسی کو دیکھ لیا ہے کیا؟“ ماں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

انارکلی کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔

آنگن میں دھوپ اتر آئی ہے۔ کچھ کبوتر خوراک کی تلاش میں منڈیر سے اتر کر آنگن میں غٹرغوں کرتے پھر رہے ہیں۔ جاتی ہوئی سردی ہے، دھوپ میں ایک خاص قسم کی غنودگی آمیز راحت ہے۔ انارکلی ماں کے پاس سے کبوتروں کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے۔

ماں ابھی تک ملازمہ کے ساتھ الجھی ہوئی ہے۔ انارکلی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اچانک ایک آواز آتی ہے۔

”راستہ دے دو بھائی۔“

میں چونک جاتا ہوں۔ وہ آنگن، وہ چوبارا، کبوتر، ماں، انارکلی اور ملازمہ سب کے سب ایک گہری دھند کے پیچھے چلے گئے ہیں۔

میں انارکلی بازار میں ہوں۔ یہ آج کی انارکلی ہے۔ بے ہنگم لوگوں کے بے ہنگم آوازوں سے بھری ہوئی دو رویہ دکانیں ہیں۔ گارمنٹس، شوز، کاسمیٹکس، الیکٹرونک کے سامان اور نہ جانے کیا کیا، چلنے کو راستہ نہیں مل رہا۔ میں خود کو اس بازار، اس ہجوم میں تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ میں یہاں کیسے آگیا۔ میں تو کہیں اور تھا۔ وہ زمانہ تو

کوئی اور تھا۔ وہ لوگ تو کوئی اور تھے۔

میں چند قدم آگے بڑھتا ہوں۔ ایک ریڑھی والا ہٹو بچو کی صدائیں بلند کرتا ہوا تیزی سے جا رہا ہے۔ لوگ اس کی آواز سن کر اِدھر اُدھر سمٹ جاتے ہیں۔

ہٹو بچو کی صدا ایک دائرہ بنا رہی ہے۔ بہت بڑا دائرہ۔ وہ دائرہ نگاہوں کے سامنے جمی ہوئی دھند کی دیوار کو صاف کرتا جا رہا ہے۔ اور صاف۔

اور جب دھند صاف ہو جاتی ہے تو کبوتروں کے پاس بیٹھی ہوئی انارکلی اپنے کمرے میں آکر اپنے بستر پر لیٹ جاتی ہے۔

وہ سونا چاہتی ہے۔ نیند تو آرہی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی تک سلیم بسا ہوا ہے۔ جو کچھ دیر پہلے بڑی شان کے ساتھ سفید گھوڑے پر سوار سامنے سے گزرا تھا۔

سلیم اس کے باپ کے دوست اطہر بیگ کا بیٹا ہے۔ یہ خاندان دہلی سے آکر لاہور میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ راستہ اورنگزیب عالم گیر کے زمانے کا ہے۔ سلیم کے پردادا، دادا باپ سب اسی لاہور کے ہو کر رہ گئے۔

لیکن ان میں ابھی تک گنگا جمنی تہذیب کی نشانیاں موجود ہیں۔ اطہر بیگ ہی کی طرف سے انارکلی کے لیے سلیم کا رشتہ آیا تھا۔

انارکلی کے باپ اکبر بٹ نے بغیر کسی تاخیر کے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔ انارکلی نہیں جانتی تھی کہ اس کے باپ نے جس کے ساتھ اسے وابستہ کیا ہے، وہ کیا ہوگا۔

ایک دوسرے کو دیکھنے اور ایک دوسرے سے ملنے کا تصور بھی نہیں تھا۔

”مائی ڈیئر، تم پیزا ہٹ پر آجاؤ نا۔“ کسی کی آواز مجھے پھر چونکا دیتی ہے۔

میں دیکھتا ہوں۔ میں جہاں کھڑا ہوں، وہیں قریب میں ایک نوجوان اپنے موبائل پر کسی کو پیزا ہٹ آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

نہ جانے اس طرف سے کیا جواب ملا ہوگا۔ لیکن اس نوجوان کی مسکراہٹ یہ بتا رہی ہے کہ اس کی انارکلی نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس لیے اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں ایسی چمک ہے جو صرف محبت کے حصول کے بعد ہوتی ہے۔

یہ کیفیت ہی عجیب ہوتی ہے۔ جب محبت مل جائے تو آس پاس کے لوگ بے حقیقت ہوتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ نوجوان ایک بڑے سے ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں داخل ہو گیا ہے۔ شاید اسے اپنی انارکلی کے لیے کوئی تحفہ خریدنا ہے۔ کوئی شال، کوئی سوٹ یا کوئی پرفیوم۔ جو انارکلی کو سلیم کی یاد دلاتا رہے۔

اب سب کچھ کتنا آسان ہو گیا ہے۔

ایک بٹن دبانے کی دیر ہوتی ہے اور انارکلی کی آواز سلیم کے کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ اسے اپنے ہونے کا احساس دلانے لگتی ہے۔

میں دو قدم آگے بڑھ آتا ہوں۔ میرا پیر ایک پتھر سے ٹکراتا ہے۔ میں اپنا پیر تھام لیتا ہوں۔ انگوٹھے میں چوٹ لگی ہے۔

”اِدھر آؤ دیکھو۔“ انارکلی اپنی دوست کو آواز دیتی ہے۔ ”میرے انگوٹھے میں کانٹا چبھ گیا ہے۔“

اس کی سہیلی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آجاتی ہے۔ ”اوہو، دل کے کانٹے کے بعد اب انگوٹھے میں بھی کانٹا چبھا کر بیٹھ گئی ہو۔“

”بے وقوف۔“ انارکلی مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتی ہے۔ ”میں نے دل میں کانٹا نہیں چھپایا ہے۔ پھولوں سے سجایا ہے اپنے دل کو۔“

”اور ان پھولوں کا نام کیا ہے شہزادی۔“ سہیلی انگوٹھے سے کانٹا نکالتی ہوئی پوچھتی ہے۔

”ظاہر ہے سلیم۔“ انارکلی مسکرا کر جواب دیتی ہے۔

اس وقت وہ دونوں ایک باغ کی سیر کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ یہ باغ ان کے مکان سے کچھ فاصلے ہی پر ہے۔ اور خواتین کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

یہ روایت شاید شاہ جہاں کے بعد سے شروع ہوئی تھی۔ جب بیگمات باغ کی سیر کے لیے جایا کرتیں۔ اور باادب ملازمائیں ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتیں۔ اور ان بیگمات کے تیوران کے لیے زندگی اور موت کی نوید ہوا کرتے۔

انارکلی اور اس کی سہیلی ایک گوشے میں آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہاں آموں کے پیڑ ہیں جن کے پتّوں کے درمیان سے ہوائیں سرسراتی ہوئی گزر رہی ہیں۔

انارکلی نہ جانے کیا سوچ کر اپنی سہیلی کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لغزش اور لہجے میں سرشاری ہے۔

”گل آرا۔“ انارکلی اس سے کہتی ہے۔ ”آخر یہ محبت ہوتی کیا ہے؟ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے؟ کسی اور کی طرف دیکھنے، کسی اور کے لیے سوچنے کی مہلت کیوں

نہیں دیتی۔"

انارکلی کی سہیلی جواب دینے کی بجائے سوچنے لگی ہے۔ کیونکہ اس نے بھی محبت کی ہے۔ اس کے محبوب کو انگریز اپنی فوج میں بھرتی کر کے لام پر لے گئے تھے۔ نہ جانے یہ کون سا لام تھا۔

نہ جانے کتنی لڑکیوں کے محبوب اسی طرح لام پر چلے جاتے۔ ان میں سے کچھ تو واپس آجاتے اور بہت سوں کی خبر بھی نہیں ملتی۔ بس ایک یاد رہ جاتی تھی۔

انارکلی کی دوست گل آرا کو بھی اپنا محبوب یاد آنے لگا ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ انارکلی بھی اداس ہو جاتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس آجاتی ہیں۔ آج انارکلی کی ماں نے اس علاقے کی ایک خاص مٹھائی اپنے ہاتھوں سے انارکلی کی سہیلی گل آرا کے لیے بنائی ہے۔ پیٹھے کی یہ مٹھائی گل آرا کو بہت پسند ہے۔

میں سامنے دیکھتا ہوں۔

سامنے مٹھائیوں کی ایک جدید طرز کی دکان ہے۔ شیشے کے شوکیس، جن کے پیچھے سے دکاندار دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ گاہکوں کو مٹھائیاں پیک کر کے دے رہے ہیں۔

میں زیادہ فاصلہ طے نہیں کر پایا ہوں۔ ماضی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ مجھے احساس دلاتا ہوا کہ تم جس راستے پر چل رہے ہو، اس پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔

اچانک میری نگاہ ایک بلڈنگ کے نام پر جاتی ہے۔ "منشی چیمبر"

اس چیمبر کے ساتھ ہی ایک تنگ سا راستہ ایک لڑکی کی قبر تک جاتا ہے۔ یہ ایک فرانسیسی جنرل الارڈ کی اکلوتی بیٹی ازابیلا کی قبر ہے۔

جنرل الارڈ مہاراجا رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔

اسے اپنی بیٹی ازابیلا سے بہت محبت ہے۔ اسی لیے وہ ازابیلا کو اپنے ساتھ ہی ہندوستان لے آیا ہے۔ ازابیلا ہندوستان آکر بہت خوش ہے۔ اس نے یہاں کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ یہ اس کے پُراسرار خوابوں کی سرزمین ہے۔ اس نے یہاں کے جادوگروں، مندروں، پنڈتوں اور تاج محل وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔

ان داستانوں نے اسے اس ماحول کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔

ایک دن فرانس میں رہتے ہوئے اس کی ایک دوست اسے بتاتی ہے کہ وہ ایک ایسی بوڑھی عورت کو جانتی ہے جو ہاتھ دیکھ کر قسمت کے حال بتاتی ہے۔ ازابیلا اس سے کہتی ہے کہ وہ بھی اس عورت سے اپنے خوابوں کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے۔

دوست وعدہ کر لیتی ہے کہ وہ اس عورت کو لے آئے گی۔ اور شام کو وہ بوڑھی عورت ازابیلا کے پاس آجاتی ہے۔ ازابیلا اپنی خوبصورت ہتھیلیاں اس کے سامنے کر دیتی ہے۔ بوڑھی کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد کچھ حساب کتاب کرنے لگتی ہے۔ جو ازابیلا کی سمجھ سے باہر ہے۔

بوڑھی کچھ دیر بعد اس کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔ "لڑکی بھول جا اپنے خوابوں کو۔ یہ سوائے اندھیروں کے اور کچھ نہیں دیں گے۔"

"لیکن ہندوستان جانا تو میری سب سے بڑی آرزو ہے۔" ازابیلا کہتی ہے۔

"آرزو پوری تو ہوگی۔ لیکن اندھیرے تیرے ساتھ ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ۔ اگر ہندوستان جانے کی آرزو نہ کروں تو کیا یہ اندھیرے پیچھا چھوڑ دیں گے؟" ازابیلا پوچھتی ہے۔

اس پر وہ عورت ایک بار پھر اس کا ہاتھ دیکھنے لگتی ہے۔ "نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔ "وہ ساتھ ہی رہیں گے۔"

"تو پھر اپنے آپ کو مارنے کا کیا فائدہ۔" ازابیلا مسکرا کر کہتی ہے۔ "جانے دو مجھے۔"

ازابیلا کا ایک دوست ہے۔ ایک طرح دار بانکا سا نوجوان، منزاں۔ منزاں ایک تاجر ہے۔ یہ تجارت اس کے باپ کی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس نے وہ کاروبار سنبھال لیا ہے۔

ازابیلا اور منزاں کی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ نئے سال کی خوشی میں دی جانے والی یہ پارٹی بہت شاندار تھی اور ازابیلا کی شرکت نے اس پارٹی کا حُسن بڑھا دیا تھا۔

سرتاپا سیاہ رنگ کے لباس میں وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے چاند بادلوں کے درمیان سے جھانک رہا ہو۔ منزاں تو اس کی طرف بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اور جب ڈانس کے لیے میوزک ہونے لگا تو اس نے آگے بڑھ کر ازابیلا سے ڈانس کی درخواست کر دی۔ ازابیلا نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

ہلکی ہلکی دھن اور ہلکورے لیتے ہوئے بازو۔ زندگی اس وقت بہت خوبصورت ہو گئی تھی۔ منزاں نے اسے بتایا کہ وہ اپنا کاروبار شروع کرنے جا رہا ہے۔ "اور تم؟ تمہارا کیا ارادہ ہے۔" اس نے ازابیلا سے پوچھا۔

"میں اپنے پاپا کے ساتھ ہندوستان جانا چاہتی ہوں۔" ازابیلا نے بتایا۔

"وہ کیوں؟"

"یہ تو خود میں بھی نہیں جانتی۔" ازابیلا نے کہا۔ "میرے پاپا مہاراجا رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہونے جا رہے ہیں۔"

"اور تم وہاں جا کر کیا کرو گی۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں نہیں جانتی۔ بس کوئی کشش ہے جو مجھے کھینچ کر اس طرف لے جا رہی ہے۔"

جانتی ہو اس کشش کو کیا کہتے ہیں۔"

"تم بتاؤ۔"

"رومانس! خواب دیکھنے والی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔"

"ہاں۔" ازابیلا نے ایک گہری سانس لی۔ "میں خوابوں کی طاقت سے واقف ہوں۔ یہ انجانی منزلوں کو سامنے لے آتے ہیں۔ اور رات بھر کے لیے ہی سہی۔ زندگی بہت پُراسرار ہو جاتی ہے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارا پیچھا کرتا ہوا وہاں تک آجاؤں۔" منزاں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہتا ہے۔

ازابیلا سرشاری کی کیفیت میں لڑکھڑا جاتی ہے۔ منزاں اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیتا ہے۔ یہ ملاقات کی ابتدا تھی۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ اور جب ایک دن ازابیلا نے بتایا کہ وہ واقعی ہندوستان جا رہی ہے تو منزاں اداس ہو گیا۔ "ہندوستان مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہندوستان کسی لڑکے کا نام ہے اور میں اس سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"جانتا ہوں میں۔" منزاں بے بس ہو کر مسکرا دیا۔

"منزاں اگر میں نے کسی مرد کی طرف قدم بڑھایا تو وہ صرف تم ہی ہو گے۔" ازابیلا بتاتی ہے۔

ازابیلا اپنے باپ جنرل الارڈ کے ساتھ لاہور آجاتی ہے۔ (جہاں اب موجودہ انارکلی ہے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھاؤنی بنائی گئی ہے۔ جنرل الارڈ اور اس کی بیٹی کو اس چھاؤنی کے ایک مکان میں رکھا گیا ہے)

ازابیلا اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ چکی ہے۔

یہاں قدم رکھتے ہی جو اسے پہلا احساس ہوتا ہے وہ زمین کی خوشبو کا ہے۔ سوندھی سوندھی سی خوشبو۔ جسے بارش اور بھی شدید کر کے چاروں طرف پھیلا دیتی ہے۔

وہ کوئلوں کی کوک سنتی ہے۔ آموں کی بہاریں دیکھتی ہے۔ ہر قدم اس کے لیے خوش گوار حیرت کی طرح ہے۔ رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل مسلمان، ہندو اور سکھ فوجی جوان اسے حیرت زدہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ یہاں کا نیلا آسمان اتنا صاف اور شفاف کیوں ہے۔

"نیلے نیلے امبر پر چاند جب آئے۔" کہیں سے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور میں ازابیلا کے زمانے سے آج کے دور میں واپس آجاتا ہوں۔

میرے سامنے ایک آڈیو وڈیو شاپ ہے۔ اس گانے کی آواز وہیں سے آرہی ہے۔ اور وہیں پہ وہ تنگ سا راستہ ہے جو ازابیلا کی قبر تک جاتا ہے۔

ازابیلا اپنے باپ کے ساتھ چلتے ہوئے ایک قبرستان کے پاس آکر اپنا گھوڑا روک لیتی ہے۔ الارڈ بھی اپنا گھوڑا اس کے پاس لے آتا ہے۔ "کیا بات ہے بیٹا، تم یہاں کیوں رک گئیں؟"

"پاپا، میں ان قبروں کو دیکھ رہی ہوں۔" ازابیلا بتاتی ہے۔

"ہاں، یہ مسلمانوں کا قبرستان ہے۔" الارڈ کہتا ہے۔ "یہ لوگ بھی ہماری طرح لاشوں کو دفن کرتے ہیں۔"

"دفن ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے پاپا؟"

"کچھ نہیں۔ اندھیروں کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔"

نہ جانے کیوں ازبیلا کانپ کر رہ گئی ہے۔ اسے وہ بوڑھی عورت یاد آرہی ہے جس نے اس کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ وہ اندھیروں کے سفر پر جا رہی ہے۔

"تو کیا یہ اندھیرے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔" وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ہے۔ اس عورت نے بھی تو یہی کہا تھا کہ اندھیرے اس کے ساتھ رہیں گے۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹی ... تو اسے منزاں بہت یاد آیا۔ وہ بانکا طرح دار نوجوان جو اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

اس رات وہ منزاں کو ایک خط لکھتی ہے۔ بہت طویل

خط۔ جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ منزاں کو بہت یاد کر رہی ہے۔ اسے پیرس کی گلیاں اور باغات بہت یاد آرہے ہیں۔ منزاں ہندوستان آجائے تو وہ اس کے ساتھ مل کر پورے ہندوستان کی سیر کرے گی۔

دوسری صبح وہ اپنے پاپا کو یہ خط دیتی ہے کہ اگلی ڈاک میں یہ خط فرانس بھیج دے۔ اسے یقین ہے کہ منزاں اس کے خط کے جواب میں ہندوستان فوراً آجائے گا۔

اسی رات ازابیلا ایک خواب دیکھتی ہے۔ بہت دکھ دینے والا۔ وہ دیکھتی ہے کہ وہ کہیں سفر کر رہی ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ گہرا اندھیرا۔ اور اسی اندھیرے سفر میں کوئی اسے مارنا شروع کردیتا ہے۔

اس کے پورے بدن پر چوٹ لگ رہی ہے۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹی جارہی ہیں۔ اس کے پورے بدن میں شدید درد ہے۔ وہ چیختی ہے اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس کا باپ جنرل الارڈ دوسرے کمرے سے اس کے پاس آجاتا ہے۔ ازابیلا کا پورا بدن بخار سے پھنک رہا ہے۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے۔

اس دن کے بعد سے ازابیلا کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ اسے اس بوڑھی کی باتیں یاد آرہی کہ وہ اندھیرے کا سفر کرنے جارہی ہے۔ ایسا اندھیرا سفر جس میں کہیں بھی روشنی نہیں ہوتی۔

ایک رات ازابیلا کا بدن اکڑ جاتا ہے۔ اس کے پاس کھڑا ہوا ڈاکٹر اس کی نبض دیکھ کر اس کی موت کا اعلان کردیتا ہے۔

ازابیلا کو دوسرے دن دفن کردیا جاتا ہے۔

میں یہ سمجھا تھا کہ شاید میں بہت سا سفر طے کرچکا ہوں لیکن نہیں۔ میں تو منشی چیمبر کے سامنے ہی کھڑا ہوں۔ وہ چیمبر جس کے ساتھ ایک تنگ سا راستہ ''کڑی باغ'' کی طرف جاتا ہے۔

چونکہ یہاں ازابیلا کی قبر بنائی گئی تھی۔ اور اس کے اردگرد ایک باغ بنادیا گیا تھا۔ ازابیلا کی مناسبت سے اس باغ ہی کو کڑی باغ کہا جاتا تھا۔

قبر پر اس کی تعمیر 1857ء لکھی ہوئی ہے۔

کڑی باغ تو اب نہیں رہا۔ صرف قبر رہ گئی ہے۔ اس کی حالت بھی بہت خستہ ہوچکی ہے۔ پرانی اینٹوں کے ساتھ کچھ نئی اینٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی اس کی مرمت بھی کی گئی ہو۔

سنا ہے کہ تقسیم سے پہلے لاہور کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے اس کی مرمت کروائی تھی۔ یہ قبر گولائی میں کافی بلندی پر واقع ہے۔

پہلے چار سیڑھیاں چڑھ کر ایک چبوترہ آتا ہے۔ جو کہ قبر کے گرد گولائی میں بنا ہے۔ اس کے بعد چودہ سیڑھیاں چڑھ کر اس کی دوسری منزل آتی ہے۔ اس کے بعد چار سیڑھیاں چڑھ کر سنہری اور آخری منزل آتی ہے۔ اور وہ بھی گولائی میں بنی ہوئی ہے۔ اوپر والی منزل کا قطر چھوٹا ہے۔ اس پر قبر بنی ہوئی ہے۔

ایک چھوٹا سا گنبد نما کمرا ہے۔ اس میں لڑکی کی قبر ہے۔ دروازہ مشرق کی سمت کھلتا ہے۔ دروازے پر سنگ مرمر کا ایک کتبہ ہے۔ جس پر فارسی میں لکھا ہے ''یہاں پر جنرل الارڈ کی بیٹی 1827ء میں دفن ہوئی۔'' اس کی تعمیر فرانسیسی طرز کی ہے اور لاہور میں اپنی مثال آپ ہے۔

یہ تاج محل کی طرح شاندار تو نہیں ہے لیکن منزاں کے آنسوؤں نے اس مقام کو بہت قیمتی بنادیا ہے۔ ازابیلا کا خط ملتے ہی وہ ہندوستان کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ لیکن وہ بہت دیر سے پہنچا۔ ازبیلا قبر میں اتاری جاچکی ہے۔

ایک آواز گونجتی ہے۔ ''اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

میں چونک جاتا ہوں۔ یہ قریب کی مسجد میں ہونے والی اذان کی آواز ہے۔ جو یہ بتا رہا ہے کے اللہ بہت بڑا ہے۔ اور یہی ایک ایسی حقیقت ہے جو ازل سے ابد تک کے لیے ہے۔

باقی تو سب فنا ہوجانے والے ہیں۔ میں، آپ، جنرل الارڈ اور اس کی بیٹی۔ اور اس سے پیچھے اپنے گھر کی منڈھیر سے جھانک کر اپنے سلیم کو دیکھتی ہوئی انارکلی۔ سب فنا ہونے کے لیے ہیں۔

اور سب فنا ہوچکے ہیں۔ صرف نام باقی رہ جاتے ہیں۔ (اور وہ بھی صرف چند لوگوں کے) یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ناموں کو خود اللہ باقی رکھنے کے لیے مخصوص کرلیتا ہے۔

میں دو قدم آگے بڑھتا ہوں اور ٹھٹک کر رہ جاتا ہوں۔

ایک شخص بھیک مانگنے کی خاطر اپنا ایک ہاتھ آگے پھیلائے ہوئے کھڑا ہے۔ وہ آواز بھی لگا رہا ہے۔ وہی عام سی آوازیں، خدا کے لیے کچھ دیتے جاؤ۔''

میری جیب میں ایک روپیا کا ایک سکہ پڑا ہوا ہے۔ جس کی آج کے دور میں کوئی اہمیت کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں وہی سکہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔

اور اچانک میرے قدموں تلے بچھی ہوئی زمین پھر الٹے پاؤں چلنے لگتی ہے۔ آج کی دکانیں اور عمارتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

یہ انارکلی بازار اب ایک باغ ہے۔ اور اس باغ کے ایک کونے میں ایک حجرہ بنا ہوا ہے۔ اس حجرے میں حضرت میاں میرؒ قیام کرتے ہیں۔

میاں صاحب کی وجہ سے یہ پورا مقام بہت بابرکت ہوگیا ہے۔ میاں صاحب کا زمانہ 1550ء سے لے کر 1635ء تک کا ہے۔

ایک بادشاہ اس درویش میاں میر سے ملنے آیا ہے۔ وہ اکیلا نہیں آیا۔ اس کے ساتھ پوری ایک رجمنٹ ہے۔ نایاب نسل کے خوبصورت اور تندرست گھوڑے۔ آہنی زرہیں اور خود پہنے ہوئے مستعد جوان۔ جو اپنے بادشاہ کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ آئے ہیں۔

یہ بادشاہ جہانگیر ہے۔ مغلیہ سلطنت کا عظیم الشان بادشاہ۔ جس کے سر پر ہیروں اور سونے کا تاج ہوتا ہے۔ جس کے جلو میں سورج چاند اور ستارے چلتے ہیں۔ لیکن اسے ایک درویش حضرت میاں میرؒ کے حجرے کے دروازے پر روک لیا جاتا ہے۔

''یہ فقیروں کا ڈیرا ہے۔ یہاں بادشاہ بن کر نہیں آیا جاتا۔'' اس سے کہا جاتا ہے۔

''لیکن میں یہاں بادشاہ بن کر نہیں... ایک عام انسان کی طرح آیا ہوں۔'' جہانگیر کہتا ہے۔

کچھ دیر بعد جہانگیر کو اندر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ سامنے حضرت میاں میرؒ تشریف فرماں ہیں۔ پُرجلال اور نورانی چہرہ، اللہ والوں کی پہچان یہی ہوتی ہے۔

جہانگیر ان کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ ''بادرِ درویش دربانِ نابائد۔''

میاں صاحب فرماتے ہیں۔ ''بابائد کہ سگِ دنیا نا آئد۔''

جہانگیر سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے۔ میاں صاحب اس کی طرف دیکھ کر پوچھتے ہیں۔ ''ہم فقیروں کے آستانے پر بادشاہ کی آمد سمجھ میں نہیں آئی۔''

''سرکار آپ سے دعا کروانے آیا ہوں۔'' جہانگیر عرض کرتا ہے۔ ''دکن کی فتح کی دعا کریں۔''

اسی دوران ایک عقیدت مند ایک روپیا حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ ''اس محفل میں جو سب سے غریب ہے اس کو دے دو۔''

وہ آدمی روپیا لے کر ہر درویش کے پاس جاتا ہے۔ لیکن کوئی بھی نہیں لیتا۔ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ اب یہی روپیا اس بادشاہ کو دے دو۔ کیونکہ یہ سب سے زیادہ غریب ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے اس کے باوجود اب دکن کی سلطنت چاہیے۔ اب اس سے زیادہ غریب اور کون ہوگا۔''

داراشکوہ حضرت میاں میرؒ کا عقیدت مند ہے۔ وہ سر جھکائے ان کے دربار میں بیٹھا رہتا ہے۔ داراشکوہ نے اپنی مشہور کتاب سفینۃ الاولیا میں آپ کا ذکر انتہائی عقیدت سے کیا ہے۔

سکھوں کا پانچواں گرو ارجن سنگھ بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا ہے۔

آپ کی وفات بھی اس باغ میں ہوئی جہاں آپ کا حجرہ تھا۔ اور جہاں میں اس وقت کھڑا ہوا ماضی اور حال کے درمیان پنڈولم بنا ہوا ہوں۔

اسی جگہ کے شمال میں ایک کنواں بھی تھا۔ جو اَب نہیں ہے۔ یہاں ایک تہ خانہ بھی ہوا کرتا تھا۔ انارکلی بازار کا دوسرا چوراہا گزر کر کوئی پچاس گز دائیں جانب (موجودہ پنجاب یونیورسٹی کی دیوار سے ملحق) اب پرائیویٹ رہائش گاہیں ہیں۔

اب صرف یادیں ہیں۔ یادیں زیادہ باوفا ہوتی ہیں۔ کیونکہ چہرے اور کردار تو ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لیکن یادیں ساتھ نہیں چھوڑتیں۔

میں سوچتا ہوں۔ اور دیکھتا رہتا ہوں۔

میں ایک لڑکی کو دیکھ رہا ہوں جو بہت حسرت سے دکانوں میں سجے ہوئے قیمتی ملبوسات کو دیکھے جارہی ہے۔ شاید وہ خریدنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔

میں دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اس لڑکی کے پاس آجاتی ہے۔ دونوں کی شکلوں کی مماثلت یہ بتا رہی ہے کہ دونوں شاید ماں اور بیٹی ہیں۔

دونوں کچھ باتیں کرتی ہیں پھر کچھ فیصلہ کرکے دکان میں داخل ہوجاتی ہیں۔

میں وہیں کھڑا رہتا ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں خالی ہاتھ دکان سے باہر آجاتی ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں خریدا۔ دونوں کے چہروں پر تلخیوں اور مایوسیوں کے تاثرات ہیں۔

وہ میرے قریب ہی ہیں۔ اس لیے میں ان کے درمیان ہونے والی باتیں سن سکتا ہوں۔ بیٹی اپنی ماں سے یہ کہہ رہی ہے۔ ''اماں ' ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہم شادی میں بھاری جوڑے نہیں دے سکتے۔ ہماری اتنی حیثیت نہیں ہے۔''

''بیٹا، تجھ کو تو معلوم ہے تیری ہونے والی سسرال کا مزاج کیسا ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ شادی کرنے سے انکار کردیں گے۔ تو کردیں انکار۔ اس ملک میں نہ جانے ایسی کتنی ہی لڑکیاں ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوئیں تو کیا ان کو موت آگئی۔ نہیں، وہ زندہ رہتی ہیں۔ اور میں بھی زندہ رہوں گی۔''

دونوں باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ انسانوں کے درمیان اتنا فرق کیوں ہوتا ہے۔ ایک طرف مرجانے والوں کے لیے انتہائی مہنگے مقبرے بنائے جاتے ہیں اور دوسری طرف پیسے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کی شادی بھی نہیں ہو پاتی۔

اب میرے دائیں ہاتھ پر ایک ایسی گلی ہے جس کو لوگوں نے بند کردیا ہے۔ یہاں رہائش گاہیں تعمیر کردی گئی ہیں۔

پہلے یہاں سے ایک راستہ گھوم کر کڑی باغ کی طرف جاتا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر جین مندر کی جانب ایک تنگ گلی میں ایک اور مزار ہے۔

یہ مزار سید محمد اسماعیل کا ہے۔ آپ مشہور شاعر اور عالم مولانا جامی کے شاگرد تھے اور حضرت داؤد کرمانی شیر گڑھی کے استاد۔

حضرت داؤد کرمانی حضرت عیز الدین شاہ ابو العالی کے چچا اور پیر تھے۔

سید محمد اسماعیل کا مزار کچھ اونچائی پر ہے، نقش کاری کا بہت اچھا کام کیا گیا ہے۔

اس بازار میں تاریخ میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اور میں گزرے ہوئے دنوں کے روشن کرداروں کو اس کی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ اپنے ساتھ ساتھ لیے چل رہا ہوں۔

ایک جھٹکا لگا۔ ایک ٹھیس لگی اور یہ سارے مناظر اوجھل ہوجاتے ہیں۔

سید محمد اسماعیل کا زمانہ تو اور ہے۔ جبکہ میں آج اس بازار میں چلتے ہوئے اور موبائل کی ایک دکان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا ہوں۔

ہر طرح کے اور ہر قیمت کے موبائل سیٹ۔ آج کے انسان کا اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے پیاروں کو صرف اپنی باتوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہماری سوسائٹی میں موبائل انڈسٹری اپنے عروج پر ہے کہ زندگی اور ترقی کی یہی شناخت ہے کہ بدن پر کپڑے ڈھنگ کے نہ ہوں لیکن ہاتھوں میں سیل فون ضرور ہوں۔

میں اپنے اردگرد بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔

کیسے لوگ ہیں یہ۔ یہ اتنے بے چین کیوں ہیں۔ یہ گھبرائے گھبرائے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کون ہے جو ان کے تعاقب میں ہے۔ یہ سامنے ایک بچہ جوتے پالش کی آواز لگاتے ہوئے حسرت بھری نگاہوں سے ہر ایک کی طرف دیکھ رہا ہے۔

شاید آج اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوگا۔ یا اس کی چھوٹی بہن بھوک سے رو رہی ہوگی۔ یا ماں بیمار ہوگی۔

کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ اس لیے تو یہ بچہ بوٹ پالش کا سامان لیے انارکلی بازار کی طرف نکل آیا ہے۔

اس بچے کے ساتھ ساتھ ایک ہیولا چل رہا ہے۔

یہ ہیولا بھی ایک بچے ہی کا ہے۔ جو بوٹ پالش والے بچے کی عمر ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ میری آنکھیں اس بچے کو ہیولے کو دیکھ رہی ہیں۔

وہ شاید کسی اور کو دکھائی نہیں دے رہا۔ بوٹ پالش والا بچہ بھی اسے دیکھنے سے قاصر ہے۔ جبکہ وہ ہیولا اسی کو مخاطب کر رہا ہے۔

جب بوٹ پالش والا بچہ اس ہیولے کی آواز نہیں سن پاتا تو مایوس ہوکر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس ہیولے والے بچے نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے سر پر ایک ٹوپی ہے اور اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کتاب لے رکھی ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس ہیولے بچہ کے چہرے پر بلا کا سکون ہے اور اس کی آنکھوں میں دیے سے روشن ہیں۔ میں نہ جانے کیا سوچ کر اس ہیولے کا تعاقب کرنے لگتا ہوں۔

ایک بے خودی ایک ٹرانس کی کیفیت میں اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ وہ بازار سے نکل کر موجودہ سرکلر روڈ کی طرف آجاتا ہے۔

اب دونوں زمانے میرے ساتھ چل رہے ہیں۔

میرے قدموں کے ساتھ ساتھ سرکلر روڈ ہے۔ جبکہ وہ جہاں جہاں سے گزر رہا ہے وہ علاقہ عکس ماضی بنتا جارہا ہے۔

گرد اڑاتی کچی سڑکیں، گھوڑوں پر سوار لوگ۔ وہ بچہ ان ہی کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک مسجد میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ ایک نیم پختہ سی مسجد ہے۔ کچی مٹی کی بنی ہوئی۔

لیکن نہیں۔ یہ تو ایک خوبصورت مسجد ہے۔ سرخ رنگ کی۔ دو منزلہ۔ اس کے اردگرد بے ہنگم ٹریفک کا بے ہنگم سا شور ہے۔

میں اس بچے کو دیکھ رہا ہوں جو کچی مسجد کے صحن میں قران پڑھ رہا ہے۔ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اور بچے بھی ہیں۔ ایک نورانی صورت بزرگ ان بچوں کو قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں۔

میں اس مسجد کو شاید شناخت کر رہا ہوں، مسجد شہید ہے۔

اس کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے۔ وہ ہیولا بچہ جس شہید مسجد میں قران کی تعلیم لے رہا ہے۔ مسجد کے باہر آس پاس گھاس منڈی ہے۔

اچانک ایک شور سا اٹھتا ہے۔ گھاس منڈی تو برقرار ہے لیکن وہ مسجد اوجھل ہوچکی ہے۔ صرف ایک چبوترہ ہے۔ میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو مسجد کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے بھاگ بھاگ کر آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مختلف چیزیں ہیں۔

اس مسجد کے سامنے ایک مندر ہے۔ جہاں کچھ ہندو لڑے ہوئے بہت حیرت اور غصے سے ان مسلمانوں کو دیکھ رہے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر کا قصہ بہت دل چسپ ہے۔

بہت جھگڑوں کے بعد ڈپٹی کمشنر کے سامنے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہندو سامنے مندر بنالیں اور مسلمان مسجد تعمیر کرلیں۔

مسلمانوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ راتوں رات اس مسجد کو بنالیں گے۔

اس لیے ہر مسلمان اپنی ہمت اور بساط کے مطابق مسجد کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہے۔ اس مسجد کو مسجدِ یک شب کا نام بھی دیا گیا ہے۔

مجھے علامہ اقبال کی نظم یاد آرہی ہے۔

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

میں دو قدم آگے بڑھتا ہوں۔ گھاس منڈی غائب ہوچکی ہے۔ مسجد بھی اب کچی نہیں رہی۔ وہ بچہ ہیولا جو مجھے آج کے دور سے اپنے ساتھ اس ماضی میں لے آیا تھا۔ وہ بھی کہیں معدوم ہوچکا ہے کہ ہم تو معدوم ہی ہونے والے ہیں۔ میں مسجد کو قریب جاکر دیکھتا ہوں۔

نیچے دکانیں ہیں۔ اوپر مسجد ہے۔ مسجد کا گنبد سفید ہے۔ پہلا حصہ سرخ پتھر کا ہے۔ سرخ پتھر ہی سے مسجد کے چاروں طرف جالیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ مسجد کے اندر جانے کا راستہ مشرق کی طرف ہے۔

میں اس بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کا ہیولا مجھے یہاں تک لے آیا تھا۔ لیکن وہ اب کہاں۔ میں دوبارہ اس جگہ آجاتا ہوں جہاں میں نے بوٹ پالش والے بچے کو دیکھا تھا۔

لیکن اب وہ بھی وہاں نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک اور بچہ ہے۔ جو اپنے ماں باپ کے ساتھ آیا ہے۔ اور ایک شوکیس میں رکھے ہوئے قیمتی ڈریس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اسے وہ ڈریس چاہیے۔

اس کے ماں باپ اسے دکان کے اندر لے جاتے ہیں۔ وہ اسے وہ ڈریس دلوانے کی پوزیشن میں ہیں۔ کیونکہ اس کے باپ کے چہرے سے اس کے دولت مند ہونے کا اظہار ہورہا ہے اور اس کی ماں کا چہرہ جگمگا رہا ہے۔ وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہے۔

یہاں تو حسن کی نعمت بھی ہے دولت کی پروردہ
یہ عورت فاقہ کش ہوتی تو بدصورت نظر آتی۔

وہ عورت فاقہ کش نہیں ہے۔ اس لیے خوب صورت ہے۔ یہاں تو دولت مندی کے مزار بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

جبکہ ہم غریب یہ جانتے ہیں کہ اگر ہم مرگئے تو گھر والوں کو قبر بنانے کے لیے کتنی پریشانیاں اٹھانی ہوں گی۔ آج کل قبروں کے لیے زمین بھی کتنی مہنگی ہوا کرتی ہے۔ غالب نے شاید اسی لیے خواہش کی تھی کہ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

اب میں انارکلی بازار کے پہلے چوراہے سے بائیں طرف ایک سڑک پر کھڑا ہوں۔ اس سڑک کا نام ایبک روڈ ہے۔ قطب الدین ایبک۔

اچانک میرے چاروں طرف گرد اڑنے لگتی ہے۔ یہ گرد مستعد جوانوں کے چاق و چوبند جفاکش گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھ رہی ہے۔

یہ بہت بڑی فوج ہے۔ جو افغانستان کے بلند پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ یہ سلطان شہاب

الدین غوری کی فوج ہے۔
قطب الدین ایبک اسی فوج میں شامل ہے۔
وہ شہاب الدین محمد غوری کا چہیتا غلام ہے۔ اس نے اپنی صلاحیتوں سے شہاب الدین کے دل میں اپنی جگہ بنالی ہے۔
شہاب الدین اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات آج کی نہیں ہے۔ اب سے بہت پہلے جب وہ صرف دس یا بارہ سال کا تھا تو اسے نیشاپور کے ایک چوراہے پر فروخت کرنے کے لیے کھڑا کردیا گیا تھا۔
ایک خوبصورت ساترکی النسل بچہ۔ جس کی آنکھیں روشن ہیں۔ جس کا ماتھا فراخ ہے۔ اور یہ احساس ہونے کے باوجود کہ وہ فروخت ہونے کے لیے ہے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا شاہانہ جلال دکھائی دیتا ہے۔
اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔
اسے فروخت کرنے والے زور وشور سے اس کی قیمت کا اعلان کررہے ہیں۔ ''ہے کوئی قدر دان، جو اس نایاب ہیرے کو خرید سکے۔ ہے کوئی جو اس کی اصل قیمت ادا کرسکے۔ ارے لوگو۔ یہ بدخشاں کا لعل اور اصفہان کا موتی ہے، دیکھو اسے۔ ہے کوئی۔''
بچہ ان سب سے بے نیاز ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ کسی اور کے لیے ہورہا ہو۔ اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ اس کی بے نیازی دیکھنے والوں کو حیران کیے دے رہی ہے۔
بھیڑ میں موجود ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے۔ ''دیکھ لینا' یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا آدمی بنے گا۔''
''تم نے کیسے اندازہ لگایا۔''
''اس کے تیور دیکھ کر۔ ایسے تیور عام نہیں ہوتے۔''
وہ دونوں باتیں کررہے ہیں کہ بھیڑ میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ چند گھڑسوار آکر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ان میں نیشاپور کا سب سے بڑا قاضی بھی ہے۔
وہ اس بچے کو بہت دل چسپی اور پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ بچے کو فروخت کرنے والا قاضی کو پہچان کر اس کے گھوڑے کے سامنے آکر ادب سے جھک جاتا ہے۔
''کیا قیمت لگائی ہے اس بچے کی؟'' قاضی سوال کرتا ہے۔
''سرکار ہیرے کی قدر جوہری ہی جان سکتا ہے۔''
''ہوشیار تاجر معلوم ہوتا ہے۔'' قاضی مسکراتا ہے۔
''ٹھیک ہے۔ اس کی جو بھی قیمت ہو، ہم اسے خرید رہے ہیں۔'' اس طرح وہ بچہ قطب الدین نیشاپور کے قاضی کے گھر پہنچ جاتا ہے۔
اس نے اپنی صلاحیتوں اور اپنی باتوں سے قاضی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ قاضی اس سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگا ہے۔
قاضی کے اپنے چار بیٹے ہیں۔ ان کے لیے یہ ناقابل برداشت ہے کہ کوئی غلام زادہ اس طرح آکر ان کے گھر میں راج کرنے لگے۔ لیکن وہ باپ کے سامنے مجبور ہیں۔
قاضی قطب الدین کو مروجہ تعلیم سے آراستہ کردیتا ہے۔ قطب الدین کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ قاضی کے بیٹے موقع کے منتظر ہیں۔ اور یہ موقع انہیں قاضی کی اچانک موت سے مل جاتا ہے۔
وہ قطب الدین کو پھر فروخت ہونے کے لیے بازار میں لاکر کھڑا کردیتے ہیں۔
لیکن قدرت نے تو قطب الدین کے لیے کوئی فیصلہ کرلیا ہے۔ قدرت اسے عروج پر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ اس کے لیے راستے ہموار کرتی جارہی ہے۔
اور اس بار اس بچے کو خریدنے والا مہتاب الدین محمد غوری ہے۔
قطب الدین ایبک نے مہتاب الدین غوری کے پاس آکر بہت تیزی سے ترقی کی ہے۔ اور اب وہ اس کا داہنا ہاتھ بن گیا ہے۔
اس کی کشادہ پیشانی اور روشن آنکھیں یہ بتا رہی ہیں کہ اسے ابھی اور سفر کرنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے۔ اور ہوتا بھی یہی ہے۔
وہ غلام بچہ بڑا ہوکر دہلی کا سلطان بن جاتا ہے۔ خاندانِ غلاماں کا بانی، دراصل قطب الدین ہی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی ہے۔
وہ بے پناہ خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کی ایک بے مثال خوبی اس کی بے مثال فیاضی ہے۔ اس لیے اسے لاکھ بخش بھی کہا جاتا ہے۔
اس نے صرف چار سال تک حکومت کی۔ 1206ء سے 1210ء تک۔ صرف چار سال۔ لیکن ان چار برسوں میں اس نے ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھ دی ہے۔
وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا

معتقد ہے۔ اور ان ہی کے نام پر اس نے دہلی کا قطب مینار بنوایا ہے۔
اس کی تعمیرات میں قطب مینار کے علاوہ مسجد قوت الاسلام اور اجمیر میں اڑھائی دن کا جھونپڑا بھی بہت مشہور ہیں۔
اس کا انتقال لاہور ہی میں چوگان کھیلتے ہوئے ہوا ہے۔
اردگرد اڑتی ہوئی ماضی کی دھول ایک بار پھر سمٹ جاتی ہے۔ میں ایبک روڈ پر قطب الدین کے مزار کے پاس کھڑا ہوں۔
تاریخ بتاتی ہے کہ اس قبر پر سنگ مرمر کا ایک گنبد بھی تھا۔ اور ایسا خوش نما کہ پورے لاہور میں اس کی اور کوئی مثال نہیں تھی۔
مہاراجا رنجیت سنگھ نے سب مسمار کرکے سارا سامان امرتسر بھجوا دیا تھا۔
قطب الدین کے مزار کی حالت بہت خستہ تھی۔ ایک دفعہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے حبیبہ ہال میں ایک جلسے کی صدارت فرما رہے تھے کہ شاعر پاکستان مرحوم حفیظ جالندھری نے ایک نظم پڑھی۔'' اس میں صدر مملکت کی طرف اشارہ تھا۔ آج تیری حکومت میں اس کے مزار کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تو روزِ محشر کیا جواب دے گا۔''
فوراً ہی صدر ایوب اس مقبرے کی تعمیر کا حکم دیتے ہیں۔ اردگرد کے مکانات ختم کرکے سلطان کا مقبرہ تعمیر کردیا گیا ہے۔
چھت سنگِ مرمر کی ہے۔ سنگِ مرمر ہی کا گنبد ہے۔ دروازوں پر سنگِ مرمر کے کام سے سورہ فاتحہ لکھا ہوا ہے۔ مزار کے سرہانے کلمہ طیبہ ہے۔ مشرقی اور جنوبی دیوار پر قطب مینار بنے ہوئے ہیں۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوکر فاتحہ پڑھ رہا ہوں کہ ہم اور کچھ نہیں تو کم سے کم اتنا تو کرہی سکتے ہیں۔
مزار کے سامنے جدید طرز کی دکانیں ہیں۔
دو تین فاسٹ فوڈز کے چھوٹے ہوٹلز بھی ہیں۔ فاسٹ فوڈز کہ جن کا تصور مغرب سے ہمارے یہاں آیا ہے۔ بس دوڑتے جاؤ اور کھاتے جاؤ۔ کیونکہ مشینوں کے معاشرے نے تمہیں بھی مشین بنادیا ہے۔ اگر تمہاری مشین دو منٹ بھی لیٹ ہوئی تو تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔
اس لیے کھاتے رہو اور دوڑتے رہو۔ کہ اس کو

شاہد کریم اللہ

پاک بحریہ کے سربراہ۔ تقرری 2002ء میں ہوئی، صدر مملکت نے اسی روز وائس ایڈمرل کے عہدے سے ترقی دے کر ایڈمرل کے عہدے پر فائز کردیا۔ انہوں نے پاکستان نیوی میں 1965 میں کمیشن حاصل کیا۔ امریکا کے وار کالج اور نیشنل ڈیفنس کالج سے گریجویشن کی۔ وہ ساحل سمندر پر اور بحری بیڑوں پر متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے دو تباہ کن بیڑوں (25 تباہ کن اسکواڈرن اور فلیٹ) کی قیادت کی۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں گن بوٹ پر بطور کمانڈر خدمات انجام دیں۔ اس دوران شدید زخمی بھی ہوئے اور غیر معمولی جرأت اور نمایاں خدمات کے اعتراف پر حکومت نے انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا۔
وہ وزاتِ دفاع میں ایڈیشنل سیکریٹری ڈپٹی چیف آف نیول اسٹاف (آپریشن) اور نیول ہیڈکوارٹرز میں ڈائریکٹر سگنل بھی رہے۔ نیز کمانڈر پاکستان فلیٹ کے چیف آف اسٹاف آفیسر اور نیشنل ڈیفنس کالج ڈائریکٹنگ اسٹاف کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ تقرری سے قبل وہ وائس ایڈمرل کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں ستارۂ جرأت کے علاوہ ستارۂ امتیاز (ملٹری) اور ہلالِ امتیاز (ملٹری) بھی مل چکا ہے۔
مرسلہ: احمد ہلال پاشا، کراچی

فاسٹ فوڈ کہتے ہیں۔ جو اَب ہمارے یہاں ایک فیشن یا اسٹیٹس سیمبل بن گیا ہے۔
نوجوان فاسٹ فوڈز کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔ مغرب نے جہاں بہت سی اصطلاحیں عطا کی ہیں۔ ان میں سے ایک فاسٹ فوڈ ہے اور دوسری ہے Dates۔ نوجوانوں کا پسندیدہ لفظ، پسندیدہ تفریح۔ نہ جانے کتنے سلیم اور کتنی انارکلی ایک دوسرے کو Dates دیتے ہیں۔ فاسٹ فوڈز کھاتے ہیں۔ اور محبت کی باتیں کرکے کا ایک دوسرے کو اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

یہی تو زندگی کا حُسن اور زندگی کے رنگ ہیں۔ ان کے علاوہ اور رکھا کیا ہے۔ ہمارے اردگرد مناظر تو غائب ہوتے جارہے ہیں۔ تتلیاں، پھول، پہاڑ، آب شار، دھنک، جھولے، لوریاں، دادی اماں کی کہانیاں یہ سب تو خواب ہوکر رہ گئی ہیں۔

اب تو صرف سیاست دانوں، بدمعاشوں، وڈیروں جاگیرداروں کے مکروہ چہرے ہیں۔ اور ان کی دہشت زدہ باتیں۔

کیا رہ گیا ہے ہماری زندگی میں۔ لاشیں، ہلاکت، خودکشی، کرپشن، دہشت گردی، مذہب اور ملک کے نام پر استحصال۔

تم چونکہ دوسرے مسلک اور دوسرے مذہب کے ہو۔ اور فلاں آدمی دوسرے مسلک اور مذہب کا ہے۔ اسی لیے جاؤ ماردو اس کو۔ کسی طرح بھی ہو ماردو۔ وہ چونکہ مزاروں کی تعظیم کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو ماردو۔ اور وہ مزاروں کی تعظیم نہیں کرتا۔ اس لیے اس کو بھی ماردو۔

اس کی زبان مختلف ہے۔ اس لیے اس کو بھی ماردو۔ وہ سرحد پار کا ہے۔ اس لیے اس کے لیے بھی موت ہے۔ ہر طرف موت۔ ہرطرف موت۔ فضاؤں میں بارود کی بُو کے سوا اور ہے کیا۔

رنگینی صرف خون کے رنگ سے منسوب ہوکر رہ گئی ہے۔ خون، خون، ہرطرف خون، راہ چلتے ہوئے، گاڑیوں سے کچل کر مرجانے والے، بوریوں میں بند لاشیں، سرحدوں پر گولیوں کی زد میں آئے ہوئے لوگ، خودکش دھماکوں میں ہلاک ہوجانے والے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ موت اتنی سستی ہوکر رہ گئی ہے۔

محبت کرنے والے کہاں چلے گئے۔ کہاں کھوگئے۔ تتلیاں ساکت ہوگئیں۔ پھول بے رنگ کیوں ہوگئے۔ اب محبت کرنے والے صرف فاسٹ فوڈز سینٹر تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔

اب مائیں اپنے بیٹوں کو لوریاں نہیں سناتیں۔ مختلف چینلز پر ہونے والے ٹاک شوز دکھاتی ہیں۔ جن میں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

اب دادیاں اور نانیاں کہانیاں بھول گئی ہیں۔

کہانیاں تو سکون کی فضاؤں میں جنم لیتی اور آزادی کی ہواؤں میں اپنا اظہار کرتی ہیں۔

وہ دادی کہانی کس طرح سنائے جس کا جوان پوتا ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آیا ہے۔ سوطرح کے خدشات، سوطرح کے اندیشے، اسی لیے دادیوں کے لب خشک ہوچکے ہیں۔ اور چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتے ہوئے ان کی زبانیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔

میں بوجھل قدموں ایک روڈ سے پھر انارکلی آجاتا ہوں۔

ماضی میرے ساتھ میری پرچھائیں بنا ہوا چل رہا ہے۔

میرا پہلا قدم مجھے کہیں بہت پیچھے لے جاتا ہے۔ اور دوسرا قدم آج واپس لے آتا ہے۔ نہ جانے اتنی دوربینی مجھ میں کہاں سے آگئی ہے۔

یہاں زندگی کبھی بہت تیز رفتار ہوجاتی ہے اور کبھی سست رفتار۔ ذہن اور یادداشت کی اسکرین پر مناظر بھی سلو موشن میں گزرتے ہیں اور کبھی فاسٹ ہوکر۔ میں رکنا چاہتا ہوں۔ بیتے ایام کو ذرا سکون اور اطمینان سے دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن میں رک نہیں پاتا۔

میں اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔

اب میں اس مقام پر ہوں۔ جسے نیلا گنبد کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مارکیٹ ہے، سائیکلوں کی۔ بچے بڑے سائیکلز خریدنے کے لیے آتے ہیں۔

اس مارکیٹ کے سامنے پہلا کالج آف کامرس بھی ہے۔ اور سائیکلوں کے درمیان سے ایک راستہ اندر مسجد کی طرف جاتا ہے۔

یہ عبدالرزاق سبزواریؒ کا مقبرہ ہے۔

یہ دور ہمایوں کا ہے۔ ہمایوں غزنی میں مقیم ہے۔ وہیں اس نے عبدالرزاق سبزواری کی شہرت سنی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ اللہ والے لوگ وقت کی لگام اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا ہے۔

ہمایوں ان کی مجلس میں ایک طرف آکر خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر حضرت کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ وہ مدعا دریافت کرتے ہیں۔

"سرکار، ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ میرے ساتھ ہندوستان چلیں۔" ہمایوں درخواست کرتا ہے۔

"وہ کیوں بابا۔ ہم تو یہیں خوش ہیں۔"

"سرکار! ہندوستان دارالحرب ہے، وہاں آپ کی ضرورت ہے۔"

عبدالرزاق سبزواری، ایک لمحے سوچنے کے بعد ہندوستان جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ لاہور انہیں پسند آجاتا

ہے۔ وہ لاہور ہی میں سکونت اختیار کرلیتے ہیں۔

انسان کو جہاں خاک ہونا ہوتا ہے، اس مٹی کی کشش اسے وہیں کھینچ لاتی ہے۔ ہم شاید زندگی بھر اپنی آخری قیام گاہ ہی کی تلاش میں بھٹکا کرتے ہیں۔

اور جب مقام کا تعین ہوجاتا ہے تو ہم اپنے آپ کو اس مقام کے آگے سرینڈر کرجاتے ہیں۔ آپ کا انتقال بھی لاہور ہی میں ہوا ہے۔

غزنی کے درویش کو لاہور کی مٹی پسند آگئی ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے مریدین آپ کا مزار بنوادیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی بن جاتی ہے۔ آپ کی قبر کا گنبد حضرت موج دریا بخاریؒ نے بنوایا تھا۔

سکھوں نے اس مقام پر اپنی فوجی چھاؤنی بنوائی تھی۔ جبکہ انگریزوں نے یہاں ایک لنگر خانہ بنوادیا تھا۔ آخر کار 1856ء میں مسلمانوں نے مزار اور مسجد کی تعمیر کروائی۔

میں مسجد سے باہر آکر ساتھ بنی ہوئی مٹھائی کی دکان میں بیٹھ جاتا ہوں۔

یہاں کے حلوے بہت مشہور ہیں۔ دال کا حلوہ، گاجر کا حلوہ اور پیٹھے کا حلوہ، میں بھی ایک پلیٹ لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہوں۔

دو عورتیں داخل ہوتی ہیں۔ ایک جوان لڑکی ہے اور دوسری ایک خرانٹ چہرے والی ادھیڑ عمر عورت۔ وہ دونوں چونکہ میرے قریب ہی بیٹھی ہیں۔ اسی لیے میں ان کی باتیں سن سکتا ہوں۔

لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی باتیں کچھ ایسی ہیں کہ میں دل چسپی لینے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔

"یہ تو بہت بڑا شہر ہے خالہ۔" لڑکی حیران ہوکر کہہ رہی ہے۔ "کتنی گاڑیاں ہیں یہاں۔"

"فکر نہ کر، کچھ دنوں کے بعد تیرے پاس بھی گاڑی ہوگی۔ تو بھی شان سے چلایا کرے گی۔"

"تم مجھے فلم والوں کے پاس کب لے جاؤ گی۔" لڑکی پوچھتی ہے۔

"بس، دو چار دنوں میں لے جاؤں گی۔ جب تک تو یہاں کی اچھی طرح سیر کرلے۔" عورت کہتی ہے۔

"یہ رشید کون ہے خالہ۔" لڑکی پوچھتی ہے۔ "اس کی نگاہیں بہت گندی ہیں۔"

"ارے تو اس کی فکر مت کر، وہ اپنا ہی بندہ ہے۔ اور جب اس لائن میں آرہی ہے تو یہ فکر چھوڑ دے کہ کس کی نگاہیں کیسی ہیں، یہاں سب چلتا ہے۔"

پھر وہ عورت دھیرے دھیرے کچھ بولنے لگتی ہے۔

اب ان کی آوازیں تو مجھ تک نہیں آرہیں لیکن میں سب سمجھ گیا ہوں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ جاؤ بھاگ جاؤ۔ اپنے گاؤں واپس چلی جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے سوائے ذلت کے اور کچھ نہیں رکھا۔

یہ عورت تمہیں بیچ دے گی اور تم دن رات دھجیاں ہوتی رہوگی۔ مرجاؤ گی تم۔

لیکن مجھے کسی کو کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں بوجھل دل اور قدموں سے دکان سے باہر آجاتا ہوں۔ اب میرے سامنے ایک چرچ ہے۔ نیلے گنبد کے ٹھیک سامنے بہت پرانا۔

اس وقت تو یہ بند ہے لیکن آباد بھی ہوتا رہتا ہے۔

اُن دنوں تو یہ اور بھی آباد تھا جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مائیکل اور ماریا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سروس کے لیے آیا کرتے تھے۔

اب تو سب خواب وخیال ہوچکے ہیں۔

چرچ کے برابر میں مشہور پاک ٹی ہاؤس ہے جو اَب بند ہوچکا ہے۔ یہاں کی میزیں آباد ہوا کرتی تھیں اور بڑے بڑے دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کی آوازوں سے پاک ٹی ہاؤس بھرا رہتا تھا۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں ہے۔

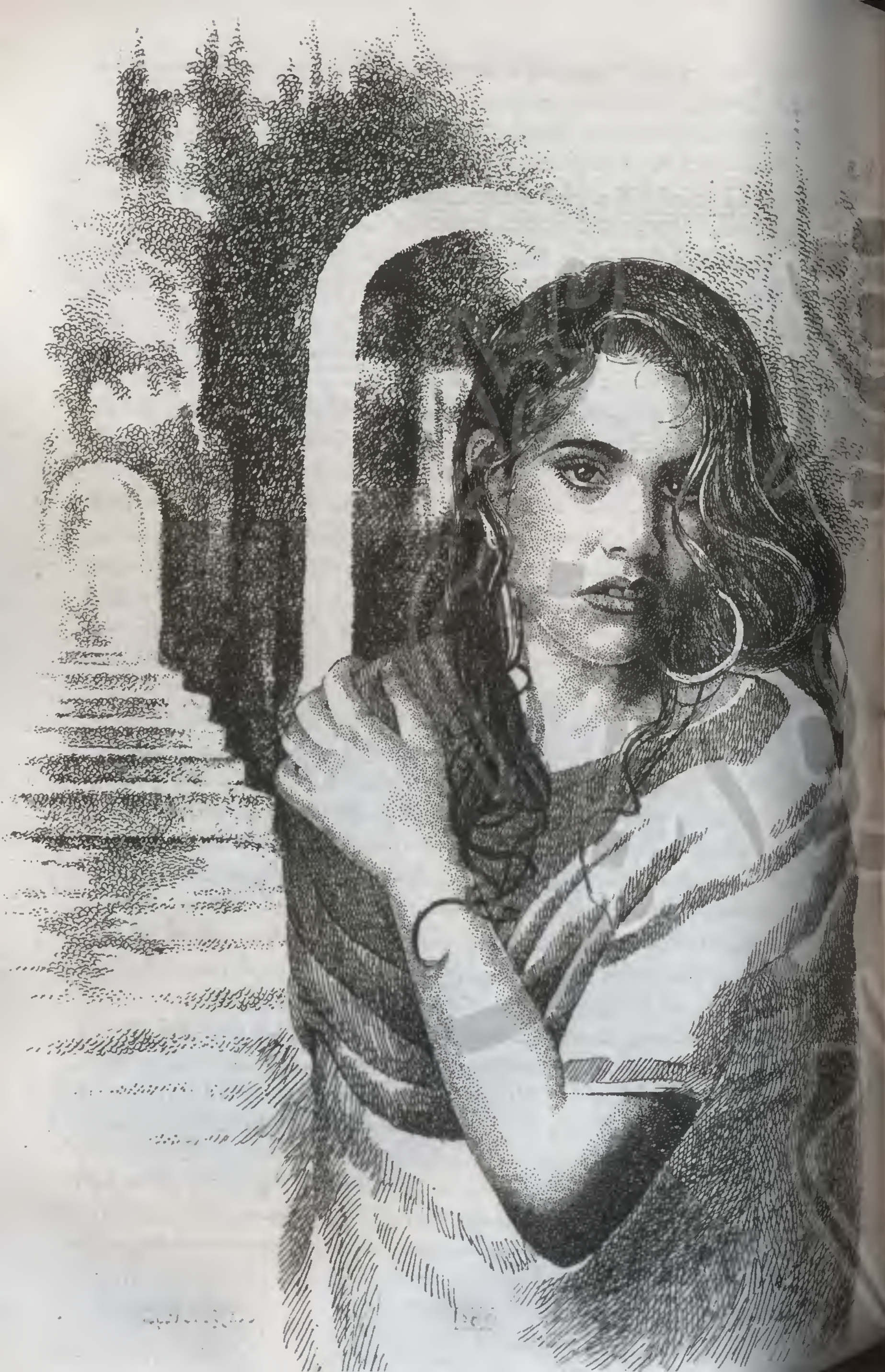
یہاں آنے والے بہت سے مرچکے۔ لاہور کی مٹی نے انہیں اپنی آغوش میں لے کر گم کردیا ہے۔ بہت سے اِدھر اُدھر ہوگئے ہیں۔

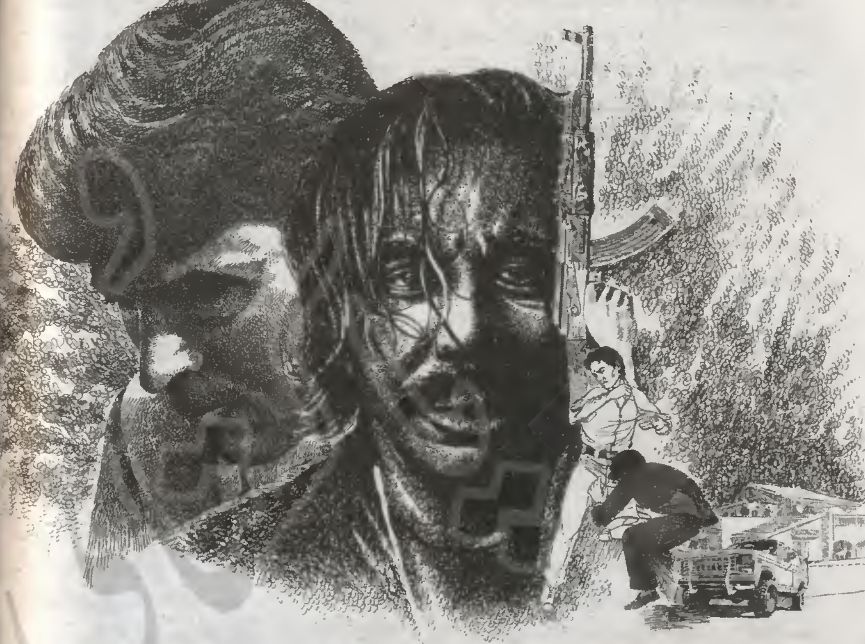
اور میں ٹی ہاؤس کے سامنے کھڑا خود کو سمیٹنے کی کوشش کررہا ہوں۔

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے گئی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

میرا انارکلی بازار کا سفر ختم ہوچکا ہے۔

چند منٹوں کا یہ سفر صدیوں تک پھیل گیا تھا۔ اب پھر سمٹ کر آج کے ایک ایسے لمحے میں آگیا ہے جب بے ہنگم ٹریفک کا بے ہنگم شور ہے۔ اور ہم ہیں دوستو۔





سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

72:

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومتِ چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بھی بلوا لیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرودسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ زخمی فتح خان اور زرودسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی آفیسر زرودسکی کو ملٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہو گیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ مجھے انٹیلی جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ اخبار میں ایک اشتہار نظروں سے گزرا جس میں فرنشڈ مکان کرائے پر دینے کی بات کی گئی تھی۔ ہم پتے پر جا پہنچے۔ مکان پسند آیا اور اسے دس لاکھ ایڈوانس دے کر لے لیا۔ مگر اگلے دن سے مکان مالک افنان احمد نظر نہیں آیا۔ اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ نے ایک آدمی کو لگا دیا۔ پھر خود بھی رات میں وہاں پہنچا۔ تبھی اندر سے ایک آدمی بھاگتا ہوا نکلا تھا کہ افنان احمد نے اس پر فائر کر دیا پھر اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ دبے قدموں میں بھی اندر آ گیا۔ ایک کمرے میں تہ خانہ نظر آیا میں اندر جھانک رہا تھا کہ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا۔ شعلہ لائٹر کا تھا۔ مالک مکان افنان احمد نے مجھ پر گولی چلائی۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا مگر وہ ہوش میں آتے ہی مجھے جیپ سے کچلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے خود کو بچا لیا اور جنگل میں بھاگتا چلا گیا۔ وہ میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی، میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کو فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس"۔

(اب آگے پڑھیں)

پولیس کا سن کر ہم سب ہی اچھل پڑے تھے۔ وسیم اس کمرے کی طرف لپکا جہاں کیمروں کے مانیٹرز تھے۔ اس کے آدمی بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور اپنے ہتھیار اٹھا رہے تھے۔ کنٹرول روم میں چھ عدد مانیٹرز تھے جو یہاں لگے درجن بھر کیمروں کی مدد سے حویلی کے اطراف دور تک دکھا سکتے تھے۔ پولیس سامنے کی طرف سے آئی تھی اور اس وقت حویلی کے سامنے والے حصے میں پھیل رہی تھی۔ کم سے کم دو پولیس موبائلز سامنے تھیں اور ان سے اتر اتر کر مسلح سپاہی درختوں اور پتھروں کے پیچھے پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ "عقبی حصے میں دیکھو۔"

وسیم نے عقبی حصے کے کیمروں کی طرف توجہ دی۔ مگر یہاں فی الحال پولیس نہیں پہنچی تھی۔ میں نے کہا۔ "فوری نکلو اس سے پہلے کہ پولیس یہاں بھی پہنچ جائے، اپنے آدمیوں سے کہو چھت سے فائرنگ کر کے پولیس کو اس طرف آنے سے روکیں۔"

وسیم ہدایت دینے لگا۔ اس نے دو افراد کو پہلے ہی چھت پر بھیج دیا تھا انہی کو پولیس پر فائرنگ کا حکم دیا لیکن انہیں براہِ راست نشانہ لینے سے منع کیا تھا۔ پہلے فائر کے ساتھ ہی پھیلتے ہوئے پولیس والے اپنی جگہ دبک گئے تھے۔ اس دوران میں دو موبائلز مزید سائرن بجاتی آ گئی تھیں۔ اب وہاں چار عدد موبائلز اور کم سے کم دو درجن مسلح پولیس والے موجود تھے۔ یہاں حویلی میں چار عدد گاڑیاں تھیں ان میں کمیونیکیشن وین شامل نہیں تھی۔ میں نے وین کا پوچھا تو وسیم نے کہا۔ "اس کے انجن میں کچھ مسئلہ ہو رہا تھا۔ اسے ایک قریبی ورکشاپ بھیج دیا ہے۔"

پولیس والوں کی اچانک آمد غیر متوقع تھی اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں باقاعدہ خبر ہے کہ یہاں ان کا مقابلہ کن لوگوں سے ہے اور وہ اسی لحاظ سے تیاری کر کے آئے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ انہیں ہمارے بارے میں پتا کیسے چلا؟ اگر وہ اکرم چشتی کے لیے آئے تھے تو چوبیس گھنٹے پہلے کیوں نہیں آئے۔ انہیں کیسے پتا چلا کہ اکرم چشتی کہاں ہے؟ پولیس والوں کی جانب سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وسیم کے آدمی نکلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ سامان یعنی اسلحہ اور ضروری چیزیں گاڑیوں میں رکھی جا رہی تھیں۔ اب کنٹرول روم میں، میں اور وسیم تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے عبداللہ کو کال کی۔ کال ریسیو کرتے ہی اسے صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا کیونکہ فائرنگ کی آواز اس کمرے تک بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟"

"پولیس نے حویلی پر ریڈ کیا ہے، وہ سامنے موجود ہیں اور ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں، اب تم میں سے کوئی اس طرف کا رخ نہ کرے۔"

"آپ کہاں جائیں گے؟"

"یہ تو یہاں سے نکلنے کے بعد پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "سنو ہم نادر کو یہیں چھوڑ کر جائیں گے اور پولیس اسے یقیناً اسپتال لے جائے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے پنڈی لے جایا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تم اپنے آدمیوں کے ساتھ نادر کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، امید ہے ایمبولینس کے ساتھ ایک دو سپاہی ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا لیکن اس کے لیے مجھے اپنے آدمیوں سمیت حویلی والی سڑک پر آنا پڑے گا۔ وہیں کہیں گھات لگا کر ایمبولینس کو روکا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اپنی واپسی کا خیال بھی رکھنا۔ راستہ اتنا طویل نہ ہو کہ پولیس کو پیچھا کرنے یا ناکا بندی کرنے کا موقع مل جائے۔"

وسیم میری گفتگو سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ہم نادر کو ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ بوجھ بن جاتا اور فرار میں رکاوٹ ثابت ہوتا۔ اسے اس طرح آسانی سے دوبارہ اپنے قبضے میں لیا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے بات مکمل کی اس نے اکرم چشتی کے بارے میں پوچھا۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہی جو طے ہوا تھا، اپنے کسی آدمی کو اس بارے میں کہہ دو، یہاں نکلنے سے پہلے یہ کام ہو جانا چاہیے۔"

وسیم نے واکی ٹاکی پر اپنے کسی آدمی کو حکم دیا۔ میں مانیٹرز کی طرف متوجہ تھا۔ حویلی کی طرف سے فائرنگ کے بعد پولیس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی اور اب ان کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس فائرنگ میں وہ دور مار رائفلوں کے ساتھ خودکار رائفلیں بھی استعمال کر رہے تھے حالانکہ تین چار سو گز کی دوری سے یہ رائفلیں غیر موثر تھیں۔ البتہ دور مار رائفلوں سے خطرہ تھا۔ مگر وسیم کے آدمی مہارت سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے پولیس والوں کو الجھائے ہوئے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ "ہم پیچھے کی طرف سے نکلیں گے یہاں کے راستوں کے بارے میں علم ہے۔"

وسیم مسکرایا۔ ''اچھی طرح جناب.... فارغ وقت میں میں اور میرے ساتھی یہاں آس پاس گھومتے رہے ہیں اور ہم نے پہلے سے کئی ایسے راستے دیکھ لیے ہیں جن سے ہنگامی صورت میں فرار ہو سکتے ہیں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا اب ایسا کرو کہ وہ تمام جگہیں جو تمہارے استعمال میں رہی ہیں ان میں آگ والے بم لگادو تاکہ پولیس کو کوئی نشان نہ مل سکے۔''

وسیم نے سوچا اور خبردار کیا۔ ''اس صورت میں نادر اور اکرم کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔''

میں نے سوچ کر کہا۔ ''تب انہیں باہر نکال دو لیکن حویلی میں ایسی کوئی چیز مت چھوڑنا جس سے پولیس کو سراغ مل سکے۔''

ابتدائی سراسیمگی کے بعد ہم نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔ پندرہ منٹ ہونے کو آئے تھے لیکن اس دوران میں اچھا خاصا کام کرلیا گیا تھا۔ اب وسیم خود کمروں میں آگ لگانے والے بم رکھ رہا تھا۔ یہ ریموٹ سے اڑائے جاسکتے تھے۔ حویلی سے نکلنے کے بعد صرف ایک بٹن دبانا پڑتا۔ اس کا طریقہ بہت آسان تھا۔ بم کو ایکٹو کرنا پڑتا تھا اور ریموٹ کا بٹن دباتے ہی جتنے بم ایکٹو ہوتے تھے وہ سب بلاسٹ ہو جاتے کیونکہ فریکوئنسی ایک ہی تھی۔ جو بم ان ایکٹو ہوتے وہ ایسے ہی پڑے رہتے۔ اگرچہ اس کا خطرہ تھا کہ پولیس حویلی کے عقب میں بھی آچکی ہو اور کہیں جھاڑیوں اور ٹیلوں میں روپوش ہو تاکہ ہم فرار کی کوشش کریں تو وہ حرکت میں آجائے۔ لیکن یہ خدشہ موہوم تھا۔ اول تو پولیس اس طرح گھات لگا کر کسی کا راستہ نہیں روکتی ہے دوسرے ہماری پولیس میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے۔

میں باہر آیا تو وسیم کے آدمی نادر اور اکرم چشتی دونوں کو باہر لے آئے تھے۔ وہ بے ہوش تھے، اس نازک موقع پر انہیں کسی دخل اندازی سے روکنے کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اکرم چشتی کے بارے میں جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل بھی ہو گئی تھی۔ یعنی اس کی آنکھوں اور کان میں سلوشن ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، اس کی آنکھیں جڑ گئی تھیں اور اگر وہ ہوش میں ہوتا تو اس وقت سخت اذیت میں ہوتا۔ اسے دیکھتے ہوئے میرا دھیان اس کے تعویذ کی طرف گیا۔ پہلی بار میں نے اس پر غور کیا تھا۔ یہ سائز میں عام تعویذ سے خاصا بڑا اور چاندی جیسی کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔ میں نے ڈوری کھینچ کر اسے اکرم چشتی کی گردن سے اتارا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ غیر معمولی وزنی بھی تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ٹھوس چاندی کا بنا ہو۔ اگر اس کے اندر کوئی تعویذ ہوتا تو یہ اتنا وزنی نہ ہوتا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس میں کچھ اور تھا۔ اسے کھول کر دیکھنا ضروری تھا لیکن یہ چاروں طرف سے بند تھا۔

میں نے وسیم کے ایک آدمی سے چاقو طلب کیا اس کے پاس نہیں تھا لیکن اس نے لادیا۔ میں نے اس کی نوک سے تعویذ کے کناروں کو کھرچا اور پھر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ چاندی نرم دھات ہوتی ہے اس لیے وہ اسٹیل بلیڈ کا مقابلہ نہ کرسکی اور تعویذ کھل گیا۔ پھر جو چیز سامنے آئی اس نے مجھے اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ایک سیاہ دھاتی آلہ تھا جو نصف اخروٹ کے برابر اور تقریباً ایسی ہی صورت کا تھا اور یقیناً یہ سگنل دینے والا آلہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ پولیس کس طرح حویلی تک چلی آئی تھی۔ اکرم چشتی کو یقیناً ہم سے خطرہ لاحق تھا تبھی اس نے اتنی حفاظتی تدابیر کی تھیں۔ اس کی حفاظت پر کئی گارڈز تھے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ ہم اسے پھر بھی اٹھا سکتے ہیں اس لیے اس نے ایسی کسی صورت حال کے یہ آلہ تعویذ بنا کر گلے میں پہنا ہوا تھا۔ لیکن اس کے سگنل محدود علاقے میں کام کرتے تھے اسی وجہ سے پولیس کو یہاں تک آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اگر ہم اسے شہر میں رکھتے تو پولیس کل ہی اسے تلاش کر چکی ہوتی۔ میں نے وسیم کو آلہ دکھایا۔ اس نے سرد آہ بھری۔

''بس اسی بے احتیاطی نے مروا دیا میرے پاس سگنل ڈی ٹیکٹر ہے اگر میں اس سے اکرم چشتی کو چیک کر لیتا تو یہ آلہ پکڑا جاتا۔''

''کوئی بات نہیں یار جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''یہاں سے ٹھکانا اٹھ گیا ہے بس اب نکلنے کی کرو۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم پہلے خبردار ہو گئے۔''

پولیس کو آئے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور اب یہاں سے نکل جانا لازمی تھا۔ اس دوران میں وسیم کے آدمیوں نے ایک کام اور کیا تھا۔ انہوں نے دور مار طاقت ور رائفل کی مدد سے تمام موبائل گاڑیوں کے دکھائی دینے والے ٹائر اڑا دیے تھے۔ اب کم سے کم پولیس اس قابل نہیں رہی تھی کہ گاڑیوں پر ہمارا پیچھا کرتی۔ اکرم چشتی کے پاس سے برآمد ہونے والے تعویذ سے مجھے اطمینان ہوا کہ پولیس ہماری کسی غلطی کی وجہ سے خاص طور سے ہمارے

لیے نہیں آئی تھی بلکہ وہ اکرم چشتی کو تلاش کر رہی تھی۔ تمام ضروری سامان گاڑیوں میں رکھ دیا گیا تھا۔ ہم تقریباً ڈیڑھ درجن افراد تھے جو آرام سے ان چار گاڑیوں میں آگئے تھے۔ اشارہ پاتے ہی اوپر موجود ساتھی بھی نیچے آگئے۔ حویلی کا عقبی گیٹ کھل گیا تھا اور گاڑیاں باہر نکلنے لگیں۔ اگرچہ اس طرف پولیس نہیں تھی لیکن ہم پوری طرح تیار تھے۔ حویلی کے گیٹ پر اپنی گاڑی روک کر وسیم نے جیب سے ایک چھوٹا سا ریموٹ کنٹرول نکالا اور اس کا بٹن دبایا۔ اندر سے دبے دبے دھماکوں کی آواز کے ساتھ ہی شعلے نمودار ہونے لگے۔ وسیم نے گاڑی آگے بڑھادی۔

''حویلی میں لکڑی کا کام بہت زیادہ ہے ممکن ہے آگ ساری حویلی کو چاٹ جائے۔''

''یہ اور بھی اچھا ہوگا۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''کیا کیمرے اتار لیے تھے؟''

''اس کا موقع نہیں تھا لیکن وہ سسٹم لے آئے ہیں جو کیمروں اور مانیٹرز کو کنٹرول کرتا ہے یہی اصل چیز ہے باقی کیمرے اور مانیٹرز تو بازار میں بہت مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ اسلحہ اور رقم والا سوٹ کیس ہے۔''

ہم عقب میں میدان عبور کر کے جھاڑیوں اور ٹیلوں میں داخل ہوئے۔ یہ سارا پوٹھوہار کا مخصوص علاقہ تھا جہاں ہموار زمین کم ہے۔ مسلسل بارش زمین کی زرخیزی بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ علاقہ کاشت کاری کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے اور صرف وہی زمین کاشت کی جاتی ہے جو پانی کی زد میں نہ ہو۔ ورنہ یہ اصل میں چرواہوں کا علاقہ ہے۔ ہم کچھ دور گئے تھے کہ جانور اور ان کے رکھوالے نظر آنے لگے تھے۔ گاڑیاں ان کے لیے اجنبی تھیں اس لیے وہ متجسس نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے تھے مگر کسی نے راستے میں آنے یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم حویلی سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ وسیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پولیس والے بس پہنچے تھے اور ابھی انہیں موقع نہیں ملا تھا کہ حویلی کو گھیر سکتے۔''

''ہمیں حویلی کے سامنے اور عقب میں موجود ہموار میدان نے بچالیا اسی وجہ سے پولیس والے زیادہ نزدیک نہیں آسکے تھے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا۔'' وسیم نے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ اب تک حویلی میں داخل ہو چکے ہوں گے اور انہیں نادر اور ڈی ایس پی صاحب مل گئے ہوں گے۔''

میں ہنسا۔ ''لگتا ہے اکرم چشتی پر تمہاری بھڑاس نکلی نہیں ہے؟''

''درست فرمایا آپ نے .... میں نے کئی پلان بنا رکھے تھے افسوس کہ وہ دل میں رہ گئے۔''

''تمہارے آدمی نے اپنا کام اچھی طرح کیا ہے میرا خیال ہے اس کی بینائی اور سماعت دونوں بیکار ہو چکی ہیں۔''

''ہاں یہ نہایت خطرناک سلوشن ہے انسانی جسم کا تو یہ حشر کر دیتا ہے۔''

وسیم نے یہ سارا علاقہ دیکھا ہوا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کہاں کہاں آبادی تھی۔ وہ اس سے بچ کر گزر رہا تھا۔ یہاں اِکّا دُکّا چھوٹے گاؤں تھے جو مقامی کاشت کاروں اور چرواہوں کے تھے۔ ایک جگہ ہم ایک درگاہ کے پاس سے گزرے، اس کے باہر درختوں تلے پڑے ملنگ بتا رہے تھے کہ یہاں بھی لوگوں کو بے وقوف بنانے کا کاروبار پورے زور و شور سے جاری ہے۔ ہم درگاہ سے دور سے گزرے تھے اس کے باوجود وہاں موجود لوگوں نے یقیناً گاڑیوں کو دیکھا ہوگا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''پولیس لازمی پیچھے آئے گی۔ ان کے پاس وائرلیس ہے اور وہ ہمارے فرار کے روٹ کا اندازہ کر کے اس سارے علاقے کی پولیس کو خبردار کر سکتے ہیں۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہم کہاں ہیں؟''

وسیم نے گاڑی روک لی، ہمیں رکتے دیکھ کر باقی لوگ بھی رک گئے۔ وسیم نے ایک بڑا نقشہ نکال کر اسے اسٹیرنگ پر پھیلایا۔ یہ راولپنڈی ڈویژن اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا تفصیلی نقشہ تھا اور اس میں معمولی سے معمولی چیز کی بھی نشان دہی کی گئی تھی۔ وسیم نے جی پی ایس پر اپنی لوکیشن دیکھی اور اسے نقشے سے ملانے لگا۔ پھر اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''ہم اس وقت یہاں ہیں.... اور یہ جگہ جی ٹی روڈ سے کوئی بارہ میل دور ہے۔''

''اگر جی ٹی روڈ قریب ہے تو اس تک جانے کے لیے کوئی نہ کوئی لنک روڈ بھی ہوگی۔''

وسیم نے لنک روڈ تلاش کر لی۔ ''یہ ہے.... یہاں سے کوئی دو ڈھائی میل شمال میں ہے۔''

''بس تو ہمیں پہلے لنک روڈ تک پہنچنا ہے اور اس کے بعد ہمیں جی ٹی روڈ تک پہنچ کر الگ الگ کر سفر کرنا

ہوگا۔"

"الگ الگ۔" وسیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں ہمیں اب بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنا ہوگا۔"

"گاڑیاں اور اسلحے کا کیا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں گاڑیاں اور اسلحہ چھوڑنا ہوگا کیونکہ جی ٹی روڈ پر پولیس چیکنگ کر رہی ہوگی اور اس صورت میں پکڑے جانے کا بہت زیادہ امکان ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک تجویز اور ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جی ٹی روڈ سے ایک راستہ نکلتا ہے جو گھومتا ہوا شمال کی طرف مانسہرہ جا نکلتا ہے۔" وسیم نے کہا اور نقشے پر اس راستے کو واضح کیا۔ "یہ مشکل ہے مگر محفوظ ہے۔"

"ہم نے مانسہرہ نہیں پنڈی جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"پنڈی صرف ہم جائیں گے۔ گاڑیاں اور اسلحہ مانسہرہ جائے گا اس طرف کوئی چیکنگ نہیں ہو رہی ہے۔ بعد میں یہ واپس آسکتے ہیں۔"

"مانسہرہ یہ کس کے پاس جائیں گے؟"

"وہاں ایک جاننے والا ہے ملک شفقت اللہ۔ وہ کچھ دن میرے آدمیوں اور گاڑیوں کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔"

"اعتماد کا آدمی ہے۔"

"ہاں ہے تو۔" وسیم نے جھجک کر کہا۔ "میرا پانچ سال سے اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔"

مجھے یہ بات درست نہیں لگی تھی۔ "تب وہ تمہارے آدمیوں کو کیسے پناہ دے گا۔"

"یہ وہاں پہنچ کر اس کی مجھ سے بات کرا دیں گے۔"

درحقیقت ہم گاڑیوں اور اسلحے کے حوالے سے بہت مشکل میں پڑ گئے تھے ان کے ساتھ جی ٹی روڈ پر جانا خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف ہم یہ گاڑیاں اور اسلحہ چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے جب تک ایسا کرنا ناگزیر نہ ہو جائے۔ فیصلہ کرتے ہی وسیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستے میں اس نے ایک ریڑھا لے جانے والے لڑکے سے تصدیق کی لنک روڈ کچھ دور تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم وہاں تھے۔ یہاں رک کر وسیم نے اپنے پلان پر مزید غور کیا۔ سوائے ہم دونوں کے باقی سب کو مانسہرہ جانا تھا۔ اپنے آدمیوں کو اچھی طرح بریف کرنے کے بعد وسیم نے روانگی اختیار کی۔ ہمیں جی ٹی روڈ سے کچھ پہلے اتر جانا تھا۔ ہمیں بس یا ویگن میں سفر کرنا تھا۔ میں کچھ سوچ رہا تھا کہ اس طرح سفر کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کم سے کم اس وقت پنڈی کی طرف جانے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ "کیا حرج ہے کہ ہم آج رک جائیں۔"

"کہاں رک جائیں؟"

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔" میں نے آس پاس اشارہ کیا۔ "میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ آج جی ٹی روڈ پر جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اتفاق سے میری چھٹی حس اس بار بھی آپ کی تائید کر رہی ہے۔" وہ خوش دلی سے ہنسا۔ "معاملہ ایک ڈی ایس پی کا ہے اس لیے پولیس بہت مستعد ہوگی اور اکرم چشتی کے بیان کے بعد وہ زیادہ سرگرمی سے آپ کو تلاش کرے گی۔"

"اس لیے ہمیں پنڈی سے دور رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ویسے کیا حرج ہے اگر ہم بھی مانسہرہ چلیں۔"

وسیم نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ "خیال تو برا نہیں ہے اور آج کل وہاں موسم بھی شاندار ہوگا۔ اگر ملک شفقت اللہ پہلے جیسا ہوا تو چند دن بڑے مزے سے گزر سکتے ہیں۔"

"بس تو پھر ہم وہیں جا رہے ہیں۔" میں نے فیصلہ کر لیا۔ "ملک صاحب اگر میزبانی پر آمادہ نہ ہوئے تو ہمارے پاس متبادل طریقے بھی ہیں۔"

وسیم خوش نظر آنے لگا۔ "یہ اچھی بات ہے آپ ہوں گے تو مجھے پرانے تعلق کا خیال بھی نہیں کرنا پڑے گا۔"

جی ٹی روڈ کراس کرنے سے پہلے ہم نے ایک جگہ رک کر دوبارہ نقشے کا بہ غور معائنہ کیا اور طے کیا کہ کہاں سے ہمیں سڑک سے اترنا ہوگا۔ ویسے وہ سڑک خاصی دور تھی لیکن اس تک جانے کے لیے ہم جی ٹی روڈ کراس کر کے کچھ دیر ایک کچے راستے پر سفر کرتے۔ یہ ظاہر ہے سڑک کی نسبت مشکل تھا لیکن محفوظ بھی تھا۔ جب ہم نے سڑک عبور کی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ خاصی دیر سے مسلسل سفر میں تھے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک پیٹرول پمپ بھی تھا اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے ہم نے اپنی تمام گاڑیوں کے ٹینک فل کرا لیے۔ پلاسٹک کے ڈرموں میں فاضل ایندھن تھا لیکن اسے ہم نے راستے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یہیں وسیم نے اپنے دس ساتھیوں کو چھٹی دے دی کہ وہ ابھی اپنے گھر جائیں اور آیندہ کال کا انتظار کریں۔ ظاہر ہے اس نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔ اب ہمارے ساتھ چھ آدمی تھے اور یہ سب وسیم کے انتہائی بھروسے کے تھے۔ وہ خاصے

عرصے سے اس کے ساتھ تھے اور آزمودہ کار تھے۔ اب ہر گاڑی میں دو دو آدمی تھے۔ خوش قسمتی سے یہاں موبائل سگنل موجود تھے۔ میں نے عبداللہ کو کال کی اس نے میری آواز سنتے ہی چہک کر کہا۔ "جناب بٹیر پکڑ لیا ہے اب پنجرے میں لے جا رہے ہیں۔"

یہ اشارہ تھا کہ نادر آسانی سے ان کے ہاتھ آگیا تھا لیکن میں نے پھر بھی پوچھ لیا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا کسی ماے نے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، سب صفائی سے ہو گیا۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"مانسہرہ کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ تمہاری طرف آنا مشکل ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا، یہاں ہر طرف کُتّے پھر رہے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

"بٹیر کا خیال رکھنا وہ بیمار بھی ہے۔"

"فکر نہ کریں اس کے لیے میں نے باہر سے خاص دوا بھی منگوا لی ہے جو اسے بالکل ٹھیک کر دے گی۔" عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"وہی دوا جو میرے لیے بھی منگوائی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی وہی۔" عبداللہ ہنسا۔ "دو دن میں آجائے گی۔"

اس دوران میں ہم روانہ ہو رہے تھے اس لیے میں نے عبداللہ کو خدا حافظ کہا۔ تقریباً دو کلومیٹرز کے بعد ہم سڑک سے اتر کر اس کچے راستے پر آگئے۔ بھوک سب کو لگ رہی تھی لیکن کھانے کے لیے رکنے کا موقع نہیں تھا اس لیے سب نے چلتی گاڑیوں میں کھانے کو جو تھا اس سے پیٹ پوجا کر لی۔ وسیم کے آدمیوں نے کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کچھ چیزیں پیٹرول پمپ کے ریفریشمنٹ شاپ سے لی تھیں۔ یہاں کچے راستے پر دھول مٹی بے حساب تھی اس لیے سب نے گاڑیوں کے شیشے چڑھا لیے تھے۔ موسم ابھی اتنا گرم نہیں تھا کہ اے سی چلانے کی ضرورت پیش آتی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم مانسہرہ جانے والی سڑک پر تھے۔ یہ کسی ہائی وے کی طرح ہموار اور کشادہ تو نہیں تھی لیکن... بہرحال پکی سڑک تھی اور اس کچے راستے سے خاصی بہتر تھی جس پر اب تک سفر کرتے رہے تھے۔ یہاں ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی۔ وسیم گزشتہ کئی گھنٹے سے مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وسیم نے ایک بار پھر نقشہ نکال کر دیکھا اور بولا۔ "مشکل لگ رہا ہے آج ہم مانسہرہ نہیں پہنچ سکتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے سورج ڈوبنے کے بعد ہمیں کہیں نہ کہیں رکنا پڑے گا۔"

"اتنی گاڑیوں اور اسلحے کے ساتھ۔"

"ہاں اگر کوئی مناسب جگہ مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ کھلے میں بھی گزارہ کر سکتے ہیں۔"

"کھانے کا کیا ہوگا؟"

"اس سڑک پر کہیں نہ کہیں کچھ تو ملے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

پانی ختم ہونے والا تھا لیکن ایک جگہ کھیتوں کے کنارے ہی رہٹ مل گیا جس سے تازہ پانی نکل کر کھیتوں میں جا رہا تھا۔ ہم نے جی بھر کر یہ پانی پیا اور اپنی بوتلوں میں بھر لیا۔ یہیں گاڑیوں کو آرام کا موقع دیا۔ مسلسل سفر سے ان کے انجن گرم ہو گئے تھے۔ آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد دوبارہ روانہ ہوئے تو سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ وسیم حویلی کا ٹھکانا چھننے پر اداس تھا۔ "اچھی جگہ تھی وہاں دل بھی لگ گیا تھا۔ شام کو ہم فٹ بال یا والی بال بھی کھیلتے تھے۔"

"یار اچھا ہی ہوا ہمیں خانہ بدوش بن کر رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ خانہ بدوشوں کے خیموں کے پاس گھاس اونچی نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ دیر کسی جگہ رکنا دشمن کو متوجہ کرنے کے برابر ہے۔ بزرگ بھی کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔"

وسیم نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن بزرگ یہ نہیں بتاتے کہ حرکت کس سمت میں کی جائے تو اس میں برکت ہوگی۔"

"کچھ کام ہمیں خود بھی کرنا چاہیے۔"

میرا خیال تھا کہ اس سڑک پر کہیں نہ کہیں کوئی جھگی ہوٹل مل جائے گا جہاں کھانا بھی مل سکے گا۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ شام بلکہ رات ہو گئی اور صرف ایک ہوٹل ملا جس کا باورچی اپنے ماموں کی میت میں گیا تھا اس لیے وہاں صرف چائے اور باسی بسکٹ دستیاب تھے۔ اس کے بعد مانسہرہ کے پہاڑوں کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر یہ سڑک مزید تنگ اور خراب ہو گئی تھی۔ وسیم کے نقشے کے مطابق اب ہم اپنی منزل سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھے۔ اس لیے بہتر سمجھا کہ کہیں رکنے کی کوشش کی بجائے سفر جاری رکھا جائے۔ بے شک رفتار کم ہو جائے۔ میں نے وسیم سے اتفاق کیا کہ ہمیں منزل پر پہنچنا چاہیے اس کے بعد حالات دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔ رات آٹھ بجے ایک طویل ترین اور نہایت تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم ملک شفقت

اللہ کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ یہاں شدت کی سردی تھی کیونکہ یہ جگہ سطح سمندر سے کوئی پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ حویلی سڑک سے زیادہ دور نہیں تھی اور اس کے پیچھے ڈھلان پر دور تک کھیت اور ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے گھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں بجلی تھی اس لیے روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سردی اور دیہات ہونے کی وجہ سے رات کے اس پہر وہاں سناٹا ہونا چاہیے تھا اس لیے جہاں تک نظر جاتی تھی نہ بندہ نہ بندے کی ذات تھی۔ مگر جیسے ہی ہماری گاڑیاں حویلی کے بلند و بالا پھاٹک کے سامنے پہنچیں اندر کھلبلی سی مچی تھی۔ گیٹ کے نیچے سے کئی افراد کے بے چین پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے پہلے ہم میں سے کوئی نیچے اترتا کسی نے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور للکارنے والے انداز میں کہا۔

''کون ہے؟''

وسیم نے شیشہ نیچے کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''ہم ملک صاحب سے ملنے آئے ہیں۔''

''کون ہو سامنے آ کر شناخت کراؤ۔'' بولنے والے نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''بکو مت۔'' وسیم گرم ہو گیا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو، جا کر ملک صاحب کو بلاؤ۔''

جواب میں ایک فائر ہوا اور گولی گاڑی کے سامنے زمین پر لگی۔ ''اگلی گولی گاڑی پر لگے گی۔ اس سے پہلے نیچے اتر آؤ اور اپنی شناخت کراؤ۔''

میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے وسیم سے کہا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے ورنہ اس طرح اپنے دروازے پر آئے آدمی کا استقبال کوئی نہیں کرتا ہے۔''

''میرا خیال ہے مجھے نیچے اتر کر بات کرنی چاہیے۔'' وسیم بولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے نیچے اتر گیا۔ وہ گیٹ کی کھڑکی کے پاس گیا۔ ''کیا بات ہے اس سے پہلے کبھی یہاں میرا استقبال گولی سے نہیں ہوا ملک شفقت اللہ کہاں ہے؟''

''ملک صاحب اندر ہیں' اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ اتنی گاڑیوں کے ساتھ اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟''

''لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہو۔'' وسیم نے طنز کیا۔ ''نام اور یہاں کیوں آیا ہوں یہ میں صرف ملک شفقت اللہ کو بتاؤں گا اور ہاں اب گولی چلانے سے پہلے سوچ لینا اسلحہ ہمارے پاس بھی ہے۔''

اس بار اندر سے کوئی جواب نہیں آیا اور جو کھڑکی کھلی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ وسیم ذرا پیچھے ہٹ کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے معمول کا لباس پہن رکھا تھا اور یہاں خاصی سردی تھی۔ اس طرح کھل کر کھڑے ہونے سے اسے یقیناً زیادہ سردی لگ رہی ہوگی لیکن وہ برداشت کر رہا تھا۔ جس وقت وسیم گاڑی سے اترا تھا میں نے پیروں کے پاس موجود خودکار رائفل ہاتھ میں لے لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وسیم کے ساتھی بھی پوری طرح تیار ہوں گے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد کھڑکی دوبارہ کھلی اور ایک اجنبی آواز آئی۔ ''کون ہو تم اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''ملک شفقت اللہ تمہاری حویلی پر آج سے پہلے میرا اس طرح استقبال نہیں ہوا۔'' وسیم نے ذرا آگے جا کر کہا۔ ''اگر تمہاری آنکھوں میں اب بھی مروت باقی ہے تو مجھے پہچان لو۔''

''وسیم...!'' اس نے حیرت سے کہا۔

''شکر ہے۔'' وسیم ہنسا۔ ''تمہاری آنکھوں میں اتنی مروت تو ہے اب یہ بتاؤ کہ میرا اس طرح استقبال کیوں ہوا ہے؟''

''ایک منٹ۔'' ملک شفقت اللہ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''میرے ساتھی ہیں' ہم ایک کام سے آئے تھے اس طرف سے گزرتے ہوئے رات ہو گئی، میں نے سوچا تمہیں ایک رات کے لیے زحمت دوں مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔''

''بس.... بس مجھے افسوس ہے۔'' ملک شفقت اللہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم پانچ سال بعد آئے ہو اور میرے آدمیوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہیں پہچان سکے۔''

وسیم نے ظاہر کیا کہ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی ہے اور وہ بادلِ ناخواستہ ملک کی معذرت قبول کر رہا ہے۔ گیٹ کھل گیا اور ہماری گاڑیاں حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ یہاں بڑا سا صحن تھا جو سرخ پکی اینٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں پہلے سے تین عدد بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن اس کے باوجود خاصی جگہ تھی۔ ہماری چاروں گاڑیاں بھی آرام سے پارک ہو گئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی ملک شفقت اللہ نے لپک کر وسیم کو گلے لگایا اور پھر وسیم نے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ شہباز صاحب ہیں، میرے دوست اور بہت اچھے ساتھی ہیں۔''

ملک نے مجھے بھی گلے لگایا۔ وہ تقریباً چالیس بیالیس برس کا گھٹے ہوئے جسم کا کسی قدر پستہ قد شخص تھا۔ اس نے

جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اگر اس وقت میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو وہ بھی مل جاتا۔''

وسیم نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ''ملک صاحب خیریت ہے' میں تمہارے لہجے میں پریشانی محسوس کر رہا ہوں۔''

''بتاتا ہوں لیکن پہلے تم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ۔''

وسیم نے سب کا مختصر تعارف کرایا اور جہاندیدہ ملک شفقت اللہ سمجھ گیا کہ اس کے مرتبے کے مطابق صرف میں اور وسیم تھے اس نے ہمارے ساتھیوں کو اپنے ملازموں کے حوالے کیا اور خود ہمیں اندر لے آیا۔ مردانے میں ایک شاندار انداز میں سجی ہوئی نشست گاہ تھی جہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کھانے کا پوچھا اور ہم نے بلاتکلف اقرار کیا کہ ہم سب ہی بھوکے ہیں۔ اس نے ایک ملازم کو بلا کر اسے کھانے کا کہہ کر فوری طور پر خشک میوے اور قہوہ حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وسیم نے اسے ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی کہ ہم کہاں سے آ رہے تھے اور کس لیے آئے تھے۔ وہ اسے ایسا تاثر دے رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اسی دھندے میں ہے۔ قہوہ اور خشک میوے چند منٹ میں آ گئے۔ یہ بہترین قسم کا خوشبودار قہوہ تھا اور خشک میوے بھی اعلیٰ درجے کے تھے اس لیے میں نے ان سے انصاف میں کوتاہی نہیں کی۔ وسیم نے کچھ دیر بعد ملک شفقت اللہ سے پوچھا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے ؟''

اس نے بلاتکلف اپنی بات کہہ دی۔ ''میں سخت مشکل میں ہوں اور مجھے مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مشکل ہے اور میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''مشکل ایک لڑکی ہے گوجر خانہ بدوشوں کی اور اسے میرے بیٹے نے حویلی میں پناہ دے دی ہے۔ اب وہ اپنی لڑکی واپس مانگ رہے ہیں لیکن میرا بیٹا اس کے چکر میں آ گیا ہے اور وہ کسی صورت اس لڑکی کو واپس کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ ملک شفقت اللہ کا بیٹا کتنا بڑا تھا جو ابھی سے لڑکیوں کے معاملے میں اپنے باپ سے مقابلے بازی پر اتر آیا تھا۔ ملک شفقت اللہ اپنے لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دو دن پہلے حویلی پر حملہ ہوا اور میرا ایک آدمی مارا گیا دوسرا زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔''

''تم نے پولیس میں رپورٹ نہیں لکھوائی؟'' وسیم نے حیرت سے کہا۔ ''تم یہاں کے بااثر آدمی ہو۔''

''میں نے رپورٹ لکھوائی ہے اور میں ان حرامزادوں کو بھی دیکھ لیتا لیکن ملک ریاض ان کی مدد پر اتر آیا۔ تم جانتے ہو ہمارے درمیان پرانی مخاصمت ہے۔''

''ملک ریاض کیوں ان کی مدد کر رہا ہے؟''

''اس کے پاس موقع ہے، آنے والے انتخاب سے پہلے وہ مجھے جو نقصان پہنچا سکتا ہے پہنچا دے۔ اس نے پانچ سال میں علاقے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے اور اب کوئی اسے ووٹ نہیں دے گا۔''

یہ کہتے ہوئے ملک شفقت کے لہجے میں امید آ گئی تھی کہ شاید عوام اب اسے ووٹ دیں گے حالانکہ ایم این اے یا ایم پی اے بن کر ملک صاحب نے وہی کرنا تھا جو اُن کا حریف کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے کیونکہ ہم مزید کسی چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ کچھ دیر میں کھانا آ گیا تھا۔ یہ خاص دیہاتی طرز کا مرغن اور بھنا ہوا کھانا تھا۔ ملک شفقت اپنی داستان سنا کر چپ ہو گیا تھا اور وسیم نے بھی سوائے ہمدردی کے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا تھا جس پر وہ بجھ گیا تھا لیکن میرا اندازہ تھا وہ وسیم سے بات ضرور کرے گا۔ کھانے کے بعد ملک کا ملازم ہمیں کمرے دکھانے آیا۔ مہمان خانے میں ہمیں الگ الگ کمرے ملے تھے۔ یہ بہت پُرتعیش تو نہیں تھے لیکن دیہات کے لحاظ سے اچھے کمرے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہاں سردی سے بچاؤ کا انتظام تھا۔ کچھ دیر بعد وسیم میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''مجھے ملک نے بلایا ہے' میرا خیال ہے وہ اس معاملے میں مجھ سے مدد کا طالب ہوگا۔''

''تم جانتے ہو ہمیں فی الحال اپنی مدد آپ کی ضرورت ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس لیے تم مناسب انداز میں اسے ٹال دو۔ ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔'' وسیم نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''آپ آرام کریں اگر کوئی معاملہ ہوا تو میں دیکھ لوں گا۔''

میں نے جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہاں ایک شاندار غیر ملکی کمبل موجود تھا۔ سارے دن

کی بھاگ دوڑ کے بعد اب ذرا سکون کا موقع ملا تھا۔ حویلی والا ٹھکانا ہاتھ سے گیا تھا لیکن ہم نے اکرم چشتی جیسے زہریلے سانپ کا زہر ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا اور نادر دوبارہ ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا وہ نہایت اہم مہرہ تھا اور اس کی وجہ سے مرشد میرے سامنے مجبور ہو رہا تھا اس کی مجبوری بھائی سے محبت نہیں تھی۔ نادر کی گم شدگی کا ذمے دار اسے قرار دیا جا رہا تھا اور اسے اپنی پوزیشن بچانی تھی۔ اس لیے وہ میرے مقدمات ختم کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اگرچہ مجھے اب بھی شک تھا کہ مرشد اتنی آسانی سے میرے خلاف مقدمات ختم نہیں کرائے گا۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں بھی موبائل سگنل نہیں تھے ورنہ میں ندیم سے تصدیق کر لیتا کہ مرشد کے وکیل نے اس سے رابطہ کیا تھا یا نہیں۔

وسیم کی واپسی نہ جانے کب ہوئی تھی مجھے نہیں پتا کیونکہ میں سو گیا اور پھر میری آنکھ شور سے کھلی تھی۔ باہر سے کچھ افراد کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر فائر ہوا۔ اس کے بعد تو ایسا لگا جیسے محاذِ جنگ کھل گیا ہے۔ ہمارے بڑے ہتھیار گاڑیوں میں تھے لیکن میں اور وسیم پستولوں سے مسلح تھے۔ میں اٹھا تھا کہ وسیم اندر آیا۔ ''میرا خیال ہے خانہ بدوشوں یا ملک ریاض کے آدمیوں نے پھر حملہ کیا ہے؟''

''ملک ریاض کون ہے؟''

''ایک مقامی جاگیردار ہے لیکن ملک شفقت کے مقابلے میں زیادہ زمینوں اور زیادہ اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ پھر ایم پی اے بھی ہے اور حکومتی پارٹی کا حصہ ہے اس لیے ملک شفقت اس سے دبتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری بھی کر رہا ہے۔''

''اتنا تعارف کافی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب ذرا معلوم کرو کہ باہر کیا صورت حال ہے۔''

''صورتِ حال اچھی نہیں ہے۔'' وسیم نے کہا اور باہر چلا گیا۔ اس کا کہنا درست تھا۔ صورتِ حال صرف ملک شفقت کی نہیں ہمارے لیے بھی اچھی نہیں تھی۔ اگر دشمن نے باہر گھیرا ڈال لیا تھا تو ہم بھی اندر گھر گئے تھے اور اگر وہ کسی طرح نکل جاتے تب ان سے بڑی مصیبت پولیس کی صورت میں نازل ہو جاتی۔ بہر حال میں اتنا مایوس نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ صورتِ حال اتنی خراب نہ ہو جتنی اس وقت بہ ظاہر تھی۔ وسیم رپورٹ لے کر آتا اس کے بعد ہی درست اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اگر ہم لڑ بھڑ کر یہاں سے نکل سکتے تب بھی غنیمت تھا۔ یہ پولیس کا سامنا کرنے سے بہتر ہی ہوتا۔ ابتدائی اندھا دھند فائرنگ کے بعد اس میں بتدریج کمی آنے لگی۔ مگر دس منٹ بعد وسیم اندر آیا تو اس کی صورت سے اندازہ ہو گیا کہ صورتِ حال تقریباً اتنی ہی خراب ہے جتنی کہ نظر آ رہی ہے۔

''گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' وسیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''باہر کم سے کم پچیس تیس مسلح آدمی موجود ہیں اور انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔''

''رات کو تم نے ملک شفقت سے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ فی الحال میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا مجھے فوری واپس جانا ہے۔ اس کا موڈ خراب ہوا تھا لیکن میں نے پروا نہیں کی تھی۔''

''لیکن اب شاید یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔ اس دوران میں فائرنگ رک گئی تھی مگر یہ عارضی وقفہ تھا باہر موجود افراد نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور اب وہ اندر والوں کے ردِعمل کا انتظار کر رہے تھے۔ ''ملک شفقت نے پولیس کو اطلاع دی؟''

وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں ایک فون ہے اور وہ بھی باہر سے کاٹا جا چکا ہے۔ موبائل کے سگنل نہیں ہیں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہم ایک اور مصیبت میں پھنس جاتے۔''

''لیکن ہمارے پاس ایک ذریعہ ہے۔'' وسیم نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ سیٹلائٹ فون بھول رہے ہیں۔''

''ملک شفقت کو اس کی ہوا بھی مت لگنے دینا۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ''یہاں حویلی میں بندوں اور اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟''

''ملک شفقت کے ساتھ ایک درجن آدمی ہیں۔ اسلحے کی پوزیشن بھی ٹھیک ہے۔ ان کے پاس جدید ترین خود کار اسلحہ ہے اور ایمونیشن بھی ٹھیک ٹھاک ہے مگر یہ محصور ہیں اور حملہ آور آزاد ہیں۔ اگر انہوں نے کوئی حربہ استعمال کیا تو ہم چوہوں کی طرح مارے جا سکتے ہیں۔''

''آگ یا گیس؟'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

''بالکل دونوں صورتوں میں یہاں موجود افراد ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے ایسا وقت آنے سے پہلے ہمیں کچھ کر گزرنا چاہیے۔''

''کیا کر گزرنا چاہیے؟''

''سب سے پہلے ہمیں یہاں کا مکمل جائزہ لینا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں اور ہمارے آدمیوں کو مکمل آزادی ہونی چاہیے اس کے بعد ہی ہم صورتِ حال کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔''

ملک شفقت سخت سردی کے باوجود حویلی کے سامنے والے کھلے حصے میں موجود تھا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دے رہا تھا ایک بیس بائیس سال کا لیکن ہٹا کٹا نوجوان جس نے بڑی کٹاری دار مونچھیں رکھی تھیں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ شاید وہ اس کا وہی برخوردار تھا جس کی وجہ سے یہ آفت نازل ہوئی تھی۔ میں نے ملک شفقت سے کہا۔ ''ملک صاحب یہ کیا چکر ہے، اگر ایسا کوئی خطرہ تھا تو رات کو ہی بتا دیتے۔''

''تم کیا کرتے؟'' ملک کے بجائے نوجوان نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''ہم اسی وقت کوئی فیصلہ کر لیتے اب تو ہم بھی پھنس گئے ہیں۔''

''تو ہم نے کہا تھا آنے کو۔'' نوجوان کا لہجہ مزید تیز ہو گیا۔

وسیم نے اسے گھورا۔ ''آرام سے بات کرو۔''

''رفاقت تو چپ کر۔'' ملک نے اسے گھورا۔ ''ساری مصیبت تیری لائی ہوئی ہے۔''

ملک شفقت کو احساس تھا کہ اس مشکل وقت میں ہم اس کے کام آ سکتے تھے اس لیے وہ نرم بلکہ کسی حد تک جھکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ حالانکہ میں نے خاصے اکھڑ انداز میں بات کی تھی اور رفاقت کا ردِعمل بالکل درست تھا مگر جواب میں اسے باپ سے جھاڑ کھانے کو ملی تھی۔ وہ پیچھے ہو کر ہمیں گھورنے لگا تھا۔ ملک نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز صاحب مجھے افسوس ہے لیکن مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنی دلیری دکھائیں گے۔''

''حالانکہ وہ ایک بار پہلے بھی دلیری دکھا چکے ہیں اور تمہارا ایک بندہ مار چکے ہیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''قصور بھی تمہارا ہے، یہ خانہ بدوش اپنی عورتوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔''

اس بار ملک شفقت نے قہر آلود نظروں سے اپنے لختِ جگر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ اس لڑکی سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔''

''بابا اب وہ میری پناہ میں ہے۔'' رفاقت نے بھڑک کر کہا۔ ''اگر اس کو نکالا تو میں بھی باہر چلا جاؤں گا۔''

ملک رفاقت کم عمری کے جذبات سے بھڑک رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے نہ صرف اپنے باپ اور حویلی کے لوگوں کو کتنی بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا بلکہ اس کی وجہ سے ہم بھی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ میں ان خانہ بدوشوں کو بھگت چکا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا یہ کتنے خطرناک اور ضدی ہوتے ہیں اگر وہ لڑکی کو لینے کا عزم لے کر آئے تھے تو اسے لیے بغیر واپس نہیں جاتے۔ میں نے ملک سے پوچھا۔ ''انہوں نے کوئی بات کی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایک آدمی ذرا آگے آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر لڑکی کو حوالے نہیں کیا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''آپ کی کیا پوزیشن ہے؟''

''میرے پاس ایک درجن آدمی ہیں لیکن باہر تین گنا زیادہ لوگ ہیں اور وہ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔''

میں ملک کو ایک طرف لے آیا۔ ''ملک صاحب، میں ان خانہ بدوشوں کو بھگت چکا ہوں، یہ نہایت خطرناک اور مرنے مارنے والے لوگ ہیں۔ پھر نہایت ضدی ہوتے ہیں جو ایک بار طے کر لیں اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ اسلحے کے بغیر بھی خطرناک ہو سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ آتش زنی کے ماہر ہوتے ہیں، باہر سے آپ کی حویلی کو آگ لگا سکتے ہیں اور آپ خود سوچ سکتے ہیں یہاں آگ لگ گئی تو ہمارے پاس باہر نکلنے کے سوا اور کیا راستہ ہو گا اور باہر وہ خود بیٹھے ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کی فیملی بھی یہاں موجود ہے؟''

ملک شفقت کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ''ہاں میری دونوں بیویاں اور بچے ہیں یہاں۔''

حویلی دو منزلہ تھی۔ اس کے سامنے کا نچلا حصہ سارے کا سارا مردانے پر مشتمل تھا۔ زنانہ اوپر تھا۔ فائرنگ کا آغاز ہوتے ہی تمام عورتوں اور بچوں کو درمیان میں ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں گولی کی رسائی نہیں تھی۔ میں نے ملک سے کئی سوالات اور کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ باہر سے کسی مدد کی امید نہیں تھی۔ نیچے گاؤں میں سارے غریب غربا تھے جو ملک شفقت کی زمینوں پر کام کر کے بس اتنا حاصل کرتے تھے کہ دو وقت پیٹ بھر کر کھا سکیں، ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی اور طریقے سے ملک شفقت کی مدد کر سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے مزارعوں کے ساتھ ملک شفقت کا

سلوک اچھا نہیں تھا اس لیے وہ ان سے پُرامید بھی نہیں تھا۔ درحقیقت مجھے ملک شفقت اور اس کے آدمی بھی بودے لگ رہے تھے۔ وہ صرف کمزوروں پر اکڑنے والے لوگ تھے اور جب اپنے ہم پلہ لوگوں سے واسطہ پڑا تھا تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''سامان میں نائٹ ویژن ہیں ذرا وہ نکالنا۔''

وسیم ایک گاڑی سے نائٹ ویژن دوربین اور دو عدد نائٹ گلاسز نکال لایا۔ ملک شفقت کے ساتھ ہم اوپر آئے۔ اس کی عورتیں ایک طرف تھیں اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ کر بھی نہیں سکتا تھا، ہم اس کی مدد کر رہے تھے۔ یہاں سے منظر اتنا واضح نہیں تھا اس لیے ہم چھت پر نکل آئے یہاں بلا کی سردی تھی اور ہم گرم کپڑوں میں نہیں تھے۔ ملک شفقت نے ہمارے لیے سیاہ گرم چادریں منگوادیں۔ یہ ہمیں سردی سے بچانے کے ساتھ کیمو فلاج بھی کر رہی تھی۔ چھت سے باہر کا منظر واضح تھا۔ حویلی کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان اور پھر سڑک تھی۔ سڑک نیچی تھی اور اس کے ساتھ پتھروں کی دیوار تھی۔ محاصرہ کرنے والے اسی دیوار کے پیچھے تھے۔ نائٹ ویژن سے ان کے ہیولے صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ سامنے درجن سے زیادہ افراد تھے۔ دائیں بائیں ڈھلان کے ساتھ باغات اور ان سے نیچے کھیت تھے۔ باغوں کی چار دیواری تھی اور دائیں بائیں موجود حملہ آور ان دیواروں کی اوٹ میں تھے۔ عقب میں حویلی کے ساتھ بہت ترچھی ڈھلان تھی۔ دراصل حویلی کا پچھلا حصہ بڑھایا گیا تھا اور اس نے ڈھلان کو گھیر لیا تھا نتیجے میں یہ ڈھلان بہت زیادہ ترچھی ہوگئی تھی اور مٹی کو روکنے کے لیے اسے پتھر سیمنٹ کی مدد سے لگا کر پختہ کر دیا گیا تھا۔ یہ ڈھلان والا حصہ دائیں بائیں موجود حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ اول تو یہاں سے کوئی جا نہیں سکتا تھا اور اگر وہ جانے کی کوشش کرتا تو لازمی محاصرہ کرنے والوں کی نظر میں آ جاتا اس کے بعد اس کا بچنا محال تھا۔ گاؤں کوئی دو سو گز نیچے تھا اور اب وہاں بیشتر گھروں میں روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔ محاصرہ کرنے والوں کی تعداد اندازے سے زیادہ تھی۔ وہ کم سے کم چالیس تھے۔ میں نے ملک سے پوچھا۔

''ان کی دی ہوئی مہلت میں کتنا وقت باقی ہے؟''

''بیس منٹ۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔ وہ چھت پر ہمارے ساتھ ہی دبکا ہوا تھا۔ آسمان پر چاند تھا اور کبھی کبھی بادلوں سے نکل آتا تھا اس لیے ہمیں محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ گویا خانہ بدوش نصف رات کے بعد کسی وقت یہاں آئے تھے۔

''باغات میں آدمی نہیں ہوتے ہیں؟''

''ہاں لیکن دو بندے ہوتے ہیں۔'' ملک نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ تو آرام سے ان کے ہاتھ لگ گئے ہوں گے۔''

پچھلی بار حملہ اسی طرح رات کو ہوا تھا۔ خانہ بدوش خاموشی سے حویلی کے پاس آ گئے تھے لیکن ایک محافظ نے بر وقت دیکھ لیا اس نے للکارا تو خانہ بدوشوں نے فائر کھول دیا اور محافظ مارا گیا۔ جوابی فائرنگ کے بعد حملہ آور بھاگ گئے لیکن بھاگتے بھاگتے بھی ملک شفقت کا ایک اور آدمی زخمی کر گئے تھے۔ خانہ بدوشوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس روز وہ شاید بے خبری میں حملہ کرنا چاہتے تھے مگر آج وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے ملک ریاض ان کی مدد کر رہا ہے۔''

''ان کو اس طرح دیکھ کر بھی پوچھ رہے ہو؟'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔ تو میں نے اتفاق کیا۔ خانہ بدوش خطرناک ہوتے ہیں لیکن وہ مارو اور بھاگ جاؤ کی حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہیں اس طرح باقاعدہ محاصرہ کر کے بیٹھ جانا ان کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ وہ پاؤں تلے زمین نہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہوتے ہیں۔ خانہ بدوشی ان کی طاقت بھی ہے کہ وہ کام کر کے نکل جاتے ہیں مگر اس لحاظ سے کمزوری بھی ہے کہ وہ کہیں جم کر کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس وقت ان کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں کسی طاقت ور کی مدد حاصل ہے اور وہ طاقتور ملک ریاض ہی ہو سکتا تھا۔ یہ دو سیاست دانوں کی جنگ تھی۔ ملک ریاض کی خوش قسمتی کہ اس کے ہاتھ اپنے مستقبل کے حریف کی کمزوری آ گئی تھی اور وہ اس کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ملک رفاقت کی عاشق مزاجی اس کے باپ کو مہنگی پڑنے والی تھی۔ ابھی تک میں خود کو ملک شفقت کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔ یہ ہماری لڑائی نہیں تھی اور ہم اس میں شامل ہو کر بلاوجہ ایک دشمن کا اور اضافہ کر لیتے...... میں وسیم کو ایک طرف لے گیا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں ان سے بات کرنی چاہیے۔''

وسیم نے میری بات پر غور کیا۔ ''ہم کیا بات کر سکتے ہیں؟''

''دیکھو اس معاملے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اگر ہم یہاں سے جانا چاہیں۔''

''بات کر لیتے ہیں لیکن اگلا بندہ کیا فیصلہ کرتا ہے یہ وہی بتا سکے گا۔''

میں واپس ملک شفقت کے پاس آیا۔ ''میں خانہ بدوشوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کر لیں۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''مجھے امید نہیں ہے کہ یہ بات مانیں گے۔''

''آپ کو ان سے نہیں اپنے بیٹے سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے سمجھائیں اگر لڑکی واپس نہیں کی تو حویلی کے دوسرے لوگ بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔''

''وہ بہت ضدی ہے میں اسے ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔''

''تب اس کے ساتھ ضدی بچوں والا سلوک کریں۔'' میں نے کہا۔ ''میں بات کرتا ہوں لیکن مجھے اس معاملے کا یہی ایک حل نظر آ رہا ہے جس میں سب کی بچت ہے۔''

میں نیچے آیا۔ خانہ بدوشوں کے دیے وقت میں سے صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ پولیس سے بچنے کے لیے ہم نے مانسہرہ کا رخ کیا تھا جیسے گیدڑ شامت سے بچنے کے لیے شہر کا رخ کرتا ہے اور شامت وہیں اس کی منتظر ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا تھا۔ گیٹ کے ساتھ والی چھوٹی کھڑکی کھول کر میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''سامنے آؤ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کون ہے؟'' سڑک کی طرف سے آواز آئی۔ سڑک یہاں سے کوئی بیس پچیس گز کی دوری پر تھی۔

''میں ملک شفقت کا ایک مہمان ہوں اور تمہارے سردار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں بات کر رہا ہوں۔'' وہ آدمی بولا میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ سردار ہوگا کیونکہ ان میں پروٹوکول کے مطابق صرف سردار ہی بات کر سکتا تھا۔

''سردار ہم کل رات یہاں آئے تھے اور صبح ہمیں چلے جانا ہے ہمارا اس معاملے سے تعلق نہیں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ ہمیں یہاں سے جانے دیا جائے۔'' میں نے مطلب کی بات کی۔

''ٹھیک ہے۔'' سردار نے جواب دیا۔ ''تم میں سے جو مہمان ہے وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے ہم اطمینان کر لیں کہ وہ واقعی مہمان ہے تو اسے جانے کی اجازت مل جائے گی۔''

''یہ دھوکا دے رہا ہے۔'' میرے پاس کھڑے وسیم نے سرگوشی کی۔

''مجھے بھی معلوم ہے یار، میں دیکھنا چاہ رہا ہوں کہ یہ کیا کہتے ہیں۔''

''وقت پورا ہونے والا ہے۔'' سردار نے پکار کر کہا۔ ''ملک سے کہو کہ جواب دے تاکہ پھر ہم اسے جواب دیں۔''

ملک بھی گیٹ کے پاس آ گیا تھا۔ سردار کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ برہم ہو گیا اور اس نے چلّا کر کہا۔ ''تم لوگ ملک ریاض کی مدد پر اکڑ رہے ہو ورنہ ہمارے جوتے چاٹنے والوں میں سے ہو۔''

''ہاں ہم تمہارے جوتے چاٹتے تھے لیکن اب وہ دور گزر گیا ہے اور اگر ہماری لڑکی واپس نہ ملی تو تم دیکھو گے ہم کیا کرتے ہیں۔''

''کیا کر لو گے تم؟'' ملک شفقت جو ویسے تو متحمل مزاج اور کسی قدر ڈرا ہوا تھا مگر اس وقت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''بس ایک منٹ رہ گیا ہے۔'' سردار نے کہا۔ ''پھر تم دیکھ لو گے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔''

مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ سردار کا لہجہ بتا رہا تھا اس کے پاس ہمارے لیے کوئی سرپرائز تھا۔ حویلی فائرنگ سے محفوظ تھی اس کی دیواریں دس سے بارہ فٹ بلند اور خاصی موٹی پتھروں سے بنی تھیں۔ اوپری منزل بھی محفوظ تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''اپنے آدمیوں سے کہو گاڑیوں سے گولہ بارود نکال کر اندر لے جائیں۔''

''گولہ بارود۔'' ملک شفقت چونکا۔

''ملک صاحب ہم سبزی کے آڑھتی نہیں ہیں جو آلو پیاز لے کر گھومیں۔'' وسیم نے ہنس کر کہا۔ ''ہمارے پاس تو اسی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔''

اسی لمحے کوئی چیز شوں سے ہمارے سروں سے گزری اور صحن میں کھڑی ملک شفقت کی جیپ پر جا گری۔ فوراً ہی اس میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ وہاں افراتفری پھیل گئی اور ملک کے آدمی آگ بجھانے کے لیے دوڑے تھے۔ صحن میں ایک طرف پانی کی موٹر لگی تھی۔ اسے چلایا گیا اور ابھی پائپ سے جلتی جیپ پر پانی پھینکا جا رہا تھا کہ باہر سے برسٹ چلنے کی آواز آئی۔ روشنیاں مدھم ہوئیں اور لائٹ غائب ہو گئی۔ خانہ بدوشوں نے فائرنگ کر کے حویلی تک آنے والی بجلی کی لائن اڑا دی تھی۔ موٹر رک گئی اور لائٹس بند ہونے سے جلتی جیپ کی روشنی اور نمایاں ہو رہی تھی۔ جیپ کا پچھلا کیبن کینوس کا بنا ہوا تھا اور آگ اسی میں لگی تھی۔ ملک کے آدمی جلنے کی پروا کیے بغیر جیپ کا کینوس اتار رہے تھے اور بالآخر

وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہے۔

اس دوران میں وسیم کے آدمی اپنی گاڑیوں سے اسلحہ اور دوسرا سامان اندر منتقل کر رہے تھے۔ یہ گاڑیاں کھلے میں تھیں اور نہایت غیر محفوظ تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خانہ بدوش کیا کر سکتے ہیں لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ایسا ہی خدشہ تھا۔ خانہ بدوشوں نے جو چیز پھینکی تھی وہ مٹی کی بوتل تھی جس میں مٹی کا تیل بھرا تھا اور اس کے منہ پر بندھے کپڑے میں آگ لگی تھی۔ بوتل گرتے ہی ٹوٹ گئی تھی اور اس میں بھرے مٹی کے تیل نے آس پاس آگ لگا دی تھی۔ اسے یقیناً کسی بڑی غلیل کی مدد سے پھینکا گیا تھا۔ خانہ بدوش اس حربے کے ماہر لگ رہے تھے۔ چند منٹ کی افراتفری کے بعد آگ پر قابو پا لیا گیا تھا اور کسی نے اندر موجود جنریٹر بھی اسٹارٹ کر دیا تھا۔ بند ہو جانے والی روشنیاں دوبارہ آن ہو گئیں۔ وسیم کے آدمی اپنا کام پھرتی سے مکمل کر چکے تھے۔ میں ملک شفقت کی طرف آیا جو افسوس سے اپنی جل جانے والی جیپ دیکھ رہا تھا۔ ”ملک صاحب.... آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کس قدر خطرناک لوگ ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان حرامیوں کو چھوڑوں گا نہیں۔“

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ملک صاحب ہوش میں آئیں، ایسی ایک درجن بوتلیں اور آ کر گریں تو یہ حویلی راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔ جو آگ سے بچ گئے وہ گولیوں سے مارے جائیں گے۔ یہ خودکشی ہوگی، کوئی عقل کا فیصلہ کریں۔“

ملک شفقت نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم کون ہوتے ہو میری حویلی میں مجھ پر حکم چلانے والے۔“

”میرا خیال ہے تمہارا دماغ قابو میں نہیں ہے۔“ میں نے برہمی میں ادب و آداب بالائے طاق رکھ دیے۔ ”تم دیکھ نہیں رہے ہو وہ کیا کرنے والے ہیں۔“

جواب میں ملک شفقت نے خانہ بدوشوں کے خلاف گالیوں کا دریا بہا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس حملے نے اس کی دماغی حالت کو متاثر کیا تھا اس کی بک بک سن کر اس کا فرزند ارجمند دوڑا آیا۔ ”کیا ہوا بابا؟“

ملک شفقت نے دہاڑ کر حکم دیا۔ ”اوئے ان لوگوں کی....“ آگے کی گفتگو ناقابلِ بیان تھی اور اس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ خانہ بدوشوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے۔

میں چلایا۔ ”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

”بکواس نہ کر۔“ ملک رفاقت نے اچانک پستول نکال کر میری طرف سیدھا کیا۔ ”تو بھی ان کا ساتھی ہے پہلے تجھ سے نمٹتے ہیں۔“

اس موقع پر مجھے لگا کہ اب مجھے اور میرے ساتھیوں کو حرکت میں آ جانا چاہیے۔ میں نے ملک رفاقت کا پستول والا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ ایک فائر ہوا، گولی دروازے پر لگی اور دوسرا فائر کرنے سے پہلے میں نے اسے گھما کر اس کی گردن بازو میں جکڑتے ہوئے اس سے پستول چھین کر اسی کے سر سے لگا دیا۔ لڑکے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شوٹ کرنے والا تھا اور اگر میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو شاید وہ گولی چلا بھی دیتا۔ میرے فوری فیصلے نے میری جان بچالی تھی۔ اس سے پہلے ملک شفقت اور اس کے آدمی کچھ کرتے میں نے انہیں خبردار کیا۔ ”کوئی حرکت نہ کرے ورنہ یہ مارا جائے گا۔“

ملک شفقت کا ہاتھ جیب کی طرف جاتے جاتے رک گیا اور اس کے آدمیوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ وسیم کچھ دور تھا اس نے اپنا پستول ملک شفقت کی طرف سیدھا کر دیا۔ دونوں باپ بیٹے زد میں آئے تو ان کے آدمیوں کے ارادے کمزور پڑ گئے۔ وسیم کے آدمی بھی حرکت میں آ گئے تھے اور انہوں نے اپنا اسلحہ نکال لیا تھا۔ میں نے ملک شفقت سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔“

”رفاقت ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ ملک شفقت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم ان لوگوں سے ملے ہوئے ہو۔“

”ہم کسی سے نہیں ملے ہوئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم تمہیں صرف خودکشی سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم ان خانہ بدوشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔“

”تو کیا ہتھیار ڈال دیں؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”ان کی لڑکی واپس کر دو۔“ میں نے کہا۔

رفاقت میری گرفت میں تڑپ گیا تھا۔ وہ صرف دیکھنے میں تنومند لگتا تھا اور اس میں کسی قدر جان بھی تھی لیکن جسم نرم ہی تھا۔ وہ ایک اچھا پلا ہوا دنبہ تھا۔ اس نے گھٹی آواز میں کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”یہ ہوگا۔“ میں نے پیار سے کہا۔ ”ملک شفقت میں صرف تین تک گنوں گا اور اس کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔ اس کے بعد تم سے اور تمہارے آدمیوں سے بھی نمٹ سکتے ہیں اس لیے اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔“

اس دوران میں وسیم نے ملک شفقت کو کور کر لیا تھا اور اس کے آدمی اپنے جدید ترین ہتھیار نکال کر لے آئے

تھے۔ مجبوراً ملک شفقت نے اپنے آدمیوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ ملک رفاقت میری گرفت میں تڑپ رہا تھا اور اب گالیاں دینے پر اتر آیا تھا۔ لیکن میں نے پستول کی نال اس کے سر ماری تو اس کی زبان رک گئی تھی۔ ضرب ہلکی تھی لیکن اس ناز و نعم میں پلے لڑکے کے لیے اچھی خاصی تھی، اسے یقیناً چکر آ گیا تھا۔ ملک شفقت نے تڑپ کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں ہلکا سا سبق دیا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اب یہ اپنی زبان قابو میں رکھے گا۔“

ملک شفقت کے تمام آدمی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ جو پیچھے کی طرف اور اوپری منزل پر تھے انہیں بھی بلوا لیا گیا تھا۔ وسیم کے آدمی اب ان کی تلاشی لے رہے تھے۔ بعض کے پاس سے چھوٹے ہتھیار برآمد ہوئے تھے۔ ان سب کی تلاشی لے کر انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ان کی جگہ اب وسیم کے آدمیوں نے سنبھال لی تھی میں اور وسیم ان باپ بیٹے کو اندر لائے۔ ملک شفقت نے وسیم سے کہا۔ ”تمہارے آدمی نے اچھا نہیں کیا ہے، آج سے ہمارے پرانے تعلقات ختم ہو گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وسیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میری کون سی تمہارے ساتھ رشتے داری کی تھی اس سے پہلے بھی غرض کا رشتہ تھا۔“

”تم کچھ بھی کر لو یہ خانہ بدوش تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ ملک رفاقت نے کہا۔ سر کی چوٹ سے سنبھل کر اس کی زبان دوبارہ کھل گئی تھی۔

”نہیں جب ہم ان کی لڑکی ان کے حوالے کریں گے تو وہ خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ رفاقت بولا۔ ”وہ اسے مار دیں گے۔“

”ممکن ہے لیکن اتنے لوگوں کی موت کے مقابلے میں ایک آدمی کی موت بہتر ہی ہوگی۔“ وسیم نے طنز کیا۔ ”تم شاید بھول رہے ہو یہاں تمہاری ماں بہنیں اور بھائی بھی ہیں۔ اگر خانہ بدوشوں کو لڑکی واپس نہ ملی تو وہ حویلی پر حملہ کر کے سب کو مار دیں گے۔“

ملک شفقت اب اپنے جوش پر قابو پا چکا تھا اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں.... ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میں بھی اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔“

”تمہیں ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تمہارے آدمی فائرنگ شروع کر دیتے تو ان کا کچھ نہیں بگڑتا اور وہ اسی طرح آگ برسا کر پوری حویلی کو جلا چکے ہوتے۔“

”اس کا خطرہ تو اب بھی ہے۔“ وسیم بولا۔ ”اس سے پہلے وہ پھر کوئی کارروائی کریں ہمیں لڑکی کو واپس کرنا ہوگا۔“

رفاقت تڑپنے لگا تھا اور اس کی تڑپن کو قابو میں رکھنے کے لیے ہمیں اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے پڑے تھے۔ ملک شفقت دل پر پتھر رکھ کر حالات سے سمجھوتا کر چکا تھا اور اب ہمارے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ ہم اس کے ساتھ اوپر والی منزل پر آئے کیونکہ میں نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ”معاف کرنا، تم جذباتی آدمی ہو اگر اوپر جا کر تمہارے دماغ میں کوئی فتور آ گیا تو تم خود بھی مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔“

ملک شفقت نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا لیکن میں اس پر اعتبار کرنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اس نے ذرا اکڑ دکھانے کی کوشش کی تو میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے ملک صاحب کو بھی بیٹے کے ساتھ ہی باندھ دو باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے.... لیکن وہاں میری عورتیں ہیں ہر کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔“

”ایک تو یہ کہ ہمیں تمہارے حرم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے دوسرے ہم ہر کوئی نہیں ہیں یہ بات تم اچھی طرح جان گئے ہو۔“

بادلِ ناخواستہ وہ ہمیں اوپر لایا۔ خانہ بدوش لڑکی وہیں تھی۔ اس نے ایک خالی کمرے میں آ کر اپنی زوجہ نمبر ون کو آواز دی۔ ”رفاقت کی ماں.... اس لڑکی کو باہر بھیج.... جلدی۔“

اندر کچھ کھلبلی مچی تھی مگر ایک منٹ بعد ایک لڑکی کو تقریباً زبردستی اس کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ وسیم تو نارمل رہا تھا کیونکہ اس نے لڑکی کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں دم بخود رہ گیا تھا۔ جب وسیم نے مانسہرہ جانے کا فیصلہ کیا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ قدرت مجھے کس طرف لے جا رہی ہے اور یہاں میری ملاقات کس سے ہوگی۔ میں اسے دیکھ کر جتنا حیران ہوا تھا اتنا ہی وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ پھر اچانک دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ کر رونے

لگی۔ میں بوکھلا گیا۔ وسیم دم بہ خود تھا اور ملک شفقت کا صدمے سے برا حال تھا کہ جو خاتون کل تک اس کے الو بیٹے کو الو بناتی رہی تھی آج وہ اس کے سامنے ایک غیر مرد سے چمٹ کر رو رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینے لگا۔ ''آرام سے ....آرام سے....مہرو۔''

اس بار ملک شفقت دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ''تم....تم اسے جانتے ہو۔''

''اچھی طرح۔'' میں نے کہا۔ ''وسیم تم ذرا ملک صاحب کے ساتھ یہیں رکو۔''

اس سے پہلے ملک شفقت کوئی اعتراض کرتا میں مہرو کا ہاتھ تھام کر نیچے آگیا۔ مہرو کے سامنے آتے ہی صورتِ حال یک دم بدل گئی تھی۔ اس حویلی کے باہر خانہ بدوشوں کی موجودگی کے باوجود مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ یہاں موجود لڑکی اصل میں مہرو ہو گی۔ وہ جس طرح مجھ سے چمٹ کر روئی تھی اس سے لگ رہا تھا وہ مشکل میں تھی اور مجھے اپنا ہمدرد سمجھ رہی تھی۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تب بھی اسے خانہ بدوشوں کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے میں مہرو سے کوئی بات کرتا باہر سے لگا تار فائرز کی آواز آئی اور یہ فائر سنگل شاٹ تھے جو کسی رائفل سے کیے گئے تھے۔ میں باہر آیا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وسیم کے ایک آدمی نے کہا۔ ''انہوں نے آگ والی بوتل پھینکی تھی لیکن ہم نے راستے میں اڑا دی۔''

میں نے گیٹ سے باہر جھانکا۔ درمیانی خالی جگہ زمین پر آگ بھڑک رہی تھی جو تیزی کے ساتھ سرد پڑ رہی تھی کیونکہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو آگ پکڑتی۔ میں نے نائٹ ویژن لگائی اور ایک طرف دیوار سے ذرا نکلے ہوئے شخص کا پستول سے نشانہ لے کر لگا تار کئی فائر کیے۔ وہ تاریکی کی وجہ سے مطمئن تھا کہ اسے حویلی سے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ دیوار سے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ غائب ہو گیا اور ساتھ ہی اس کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے پستول اندر کر لیا اور چلّا کر کہا۔ ''سردار تم میری آواز سن رہے ہو۔''

''ہاں، یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ جواباً چلّایا۔

''جو تم چاہ رہے تھے۔ میں ملک شفقت کو سمجھا رہا ہوں کہ وہ لڑکی تمہارے حوالے کر دے اور تم اشتعال انگیزی کر رہے ہو۔ یہ اس کا جواب ہے۔ ہمیں کمزور مت سمجھو....تمہارا ایک ایک آدمی ہماری نظر میں ہے اور ہم چاہتے تو اب تک کئی کو جہنم رسید کر چکے ہوتے لیکن ہم معاملے کو پُرامن طریقے سے سلجھانا چاہتے ہیں۔ اب اگر تمہاری طرف سے کوئی کارروائی ہوئی تو اسے اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا۔''

میری دھمکی سے زیادہ اپنے آدمی کے نشانہ بننے سے سردار نے سبق حاصل کیا تھا اور اب وہ بولا تو اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ ''ٹھیک ہے اب ہماری طرف سے ایک گھنٹے تک کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ لیکن تم نے میرے آدمی کو زخمی کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''اس کا ہرجانہ دے دیا جائے گا۔'' میں نے اس کے مطلب کی بات کی۔ ''لیکن تم لوگ بھی اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ وقت سے پہلے معاملہ بگاڑنے کی کوشش نہ کرو۔''

سردار سے بات کرنے اور اس کی طرف سے یقین دہانی حاصل کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا۔ اول تو یہ خانہ بدوش ہی ناقابلِ اعتبار تھے پھر ان کے پیچھے ملک ریاض تھا اور وہ اس لیے ان کی مدد نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی لے کر ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے چلے جائیں۔ وہ جھگڑے کو بڑھانا چاہتا تھا اور اسے وہاں تک لے جانا چاہتا تھا جہاں ملک شفقت کو جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ اس لیے مجھے یہ معاملہ پُرامن طریقے سے سلجھتا نظر نہیں آرہا تھا مگر میں نے ایک گھنٹے کی مہلت حاصل کر لی تھی کہ مہرو سے بات کر کے صورتِ حال سمجھ سکوں۔ مہرو بھی میرے ساتھ باہر نکل آئی تھی اور اس نے ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔ ''شہباز تم مجھے ان درندوں کے حوالے کر دو گے؟....میں کسی صورت ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

''یہ تمہارے لوگ ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ میرے لوگ نہیں ہیں، تم جانتے ہو میرے اپنے قبیلے والے میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور اگر میں ان کے ہاتھ لگتی تو میرا سابق شوہر مجھے ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیتا۔ قبیلے سے بھاگ جانے والی عورت کو یہی سزا دی جاتی ہے اور سب کے سامنے دی جاتی ہے۔''

میں اسے کمرے میں لے آیا۔ ''پھر یہ کون ہیں وہی لوگ جن کے قبیلے میں شامل ہو کر تم بریف کیس کی تلاش میں گئی تھیں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں بریف کیس کے بارے میں معلوم ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''میں اپنی ہی چیز کے بارے میں نہیں جانوں گا کیا۔ تمہیں فتح خان نے دھوکے باز کرنل زریسکی کی مدد سے بے وقوف بنایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف بنا رہے تھے نتیجے میں ان میں شدید دشمنی ہو گئی۔''

مہرو نے گہری سانس لی۔ ''اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کرنل مجھے کس طرح سے بے وقوف بنا رہا ہے...درحقیقت وہ اسی بریف کیس کے چکر میں پاکستان آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اس بریف کیس کی منہ مانگی قیمت مل سکتی ہے۔ یہاں آکر اس نے کسی طرح راجا صاحب کے ہاں ملازمت حاصل کی اور پھر اسے میں ملی تو اس کی لاٹری کھل گئی۔ کیونکہ بریف کیس میرے قبیلے والوں کے پاس تھا۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے متاثر ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی۔ میں سمجھی کہ وہ سچ مچ مخلص ہے اور مسلمان ہو کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اس نے تمہیں تمہارے قبیلے کے پیچھے روانہ کر دیا۔'' میں نے کہا۔ ''آخری بار میں نے تمہیں خانہ بدوشوں کے دوسرے قبیلے میں دیکھا تھا اور تم میری جھلک دیکھتے ہی غائب ہو گئی تھیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں حیران تھی کہ تم یہاں کہاں سے آگئے، میں نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اچھے نہیں ہو اس لیے وہ جارحانہ انداز میں تمہاری طرف بڑھے اور تم لوگوں نے نکل جانا مناسب سمجھا۔''

''تمہارا قبیلہ بریف کیس لے کر کہاں چلا گیا تھا؟''

''وہ سرحد پار کر کے کشمیر چلا گیا تھا۔''

''لیکن میں نے سنا ہے کہ سرحد کی سخت نگرانی ہوتی ہے اور کسی کے لیے کنٹرول لائن پار کرنا ممکن نہیں ہے۔''

''عام لوگوں کے لیے نہیں ہے لیکن ہم لوگ تو سالوں سے آر پار آتے جاتے رہے ہیں۔ اگر دونوں طرف کے فوجی دیکھ لیتے ہیں تو روکتے نہیں ہیں البتہ حالات خراب ہو تو روک لیتے ہیں۔ میرا قبیلہ سرحد پار کر کے چلا گیا تھا۔''

''اسے بریف کیس کے بارے میں نہیں پتا تھا کہ اس کی کیا اہمیت ہے؟''

''نہیں میرا خیال ہے کہ کسی عام آدمی نے بریف کیس اٹھایا تھا وہ سمجھا کہ اس میں قیمتی چیز یا رقم ہو گی لیکن بعد میں سردار کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے اسے چھین لیا۔ سردار نے اسے کھولنے کی کوشش کی تھی۔''

میں چونکا۔ ''اس نے کھول لیا تھا؟''

''نہیں وہ ناکام رہا، اس نے اسے توڑنے یا کاٹنے کی کوشش بھی نہیں کی۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''یعنی وہ محفوظ رہا؟''

مہرو نے سر ہلایا۔ میں دوسرے قبیلے کے ساتھ سرحد پار پہنچی تھی۔ یہ بہت مشکل اور تکلیف دہ سفر تھا۔ اکثر ہمیں سولہ سترہ ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑوں سے گزرنا پڑا تھا لیکن ہم اس سفر کے عادی ہیں۔ وادی میں داخل ہو کر ہمیں پتا چلا کہ میرا قبیلہ ایک جگہ موجود ہے۔''

''ایک منٹ یہ بتاؤ کہ تم دوسرے قبیلے کے ساتھ کس حیثیت سے سفر کر رہی تھیں۔''

''یہ کام فتح خان نے کرایا تھا۔ اس نے سردار سے معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے میرے قبیلے تک پہنچائے گا اور پھر واپس لے کر آئے گا۔''

''اس کے پاس کیا ضمانت تھی کہ سردار تمہیں واپس لے کر آتا اور اگر تم بریف کیس واپس حاصل کر لیتیں تب بھی اسے لے کر واپس کیسے آتیں۔''

مہرو نے گہری سانس لی۔ ''فتح خان نہایت شاطر آدمی ہے اس نے سردار سے وہ ضمانت حاصل کر لی تھی جسے وہ مسترد کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سردار کے نوجوان بیٹے کو اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔ میں واپس جاؤں گی تو اسے رہائی ملے گی۔''

''تب ہی یہ لوگ تمہارے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔''

''میرے لیے نہیں اس بریف کیس کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔'' مہرو نے تلخی سے کہا۔ میں چونک اٹھا تھا۔

''بریف کیس؟''

جواب میں اس نے ایک ایک بات بتا دی۔

☆☆☆

مہرو کرنل کے ساتھ ہی راجا عمر دراز کے محل سے نکل گئی تھی۔ اسے راجا یا کسی دوسرے سے غرض نہیں تھی کیونکہ اب اس کی دنیا کرنل تھا۔ ایک طاقتور اور دولت مند شخص، جو اسے وہ سب دے سکتا تھا جس کی مہرو یا کوئی بھی عورت خواہش کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے خوابوں کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب فتح خان اس کے سامنے آیا۔ کرنل اسے سوات کے ایک پہاڑی بنگلے میں لایا تھا اور یہ جگہ درحقیقت فتح خان کی ملکیت تھی۔ مہرو فتح خان سے شدید نفرت کرتی تھی اور جب کرنل نے اسے بتایا کہ اب اس نے فتح خان

سے صلح کر لی ہے تو وہ اس سے الجھ پڑی تھی۔ مگر کرنل نرمی اور رسانیت سے اسے سمجھاتا رہا کہ یہ ضروری ہے تاکہ اس کا مشن مکمل ہو سکے۔

''تمہارا مشن کیا ہے؟''

''میں ایک چیز لینے پاکستان آیا ہوں لیکن مجھے یہاں تم بھی مل گئی ہو۔ بہرحال وہ چیز بہت اہم اور قیمتی ہے، اگر ہم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم بہت دولت مند ہو جائیں گے۔''

''راجا عمر دراز سے بھی زیادہ؟'' مہرو نے تعجب سے کہا۔

''راجا عمر دراز۔'' کرنل ہنسا۔ ''وہ بے چارہ اتنا دولت مند کہاں ہے یوں سمجھ لو کہ ہم مغربی پیمانے کے مطابق دولت مند ہو جائیں گے ڈالرز میں کروڑ پتی ہوں گے۔ میں تمہیں یوکرائن لے جاؤں گا وہاں ہم بلیک سی کے کنارے محل بنا کر اس میں رہیں گے۔''

مہرو کو معلوم نہیں تھا کہ یوکرائن کہاں تھا اور بلیک سی کے کنارے محل بنا کر رہنا کیسا ہو سکتا تھا لیکن کرنل کے خواب اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے اور وہ اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''وہ چیز کہاں ہے اور اسے کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔''

''تم جانتی ہو کہ وہ چیز کہاں ہے اور تم ہی اسے حاصل کر سکتی ہو۔'' کرنل نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں نہیں جانتی۔''

''جانتی ہو تمہیں وہ جگہ یاد ہے جہاں تمہارے قبیلے والوں نے فتح خان کے ٹھکانے پر حملہ کیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔''

''وہ وہاں سے ایک بریف کیس لے گئے تھے اور میں وہی بریف کیس لینے آیا ہوں۔''

مہرو حیران ہوئی تھی۔ ''مجھے نہیں معلوم ہے اور میں اسے کیسے حاصل کر سکتی ہوں۔''

''تم اپنے قبیلے سے اچھی طرح واقف ہو اس لیے تم ہی اسے حاصل کر سکتی ہو۔''

مہرو کانپ گئی۔ ''نہیں، میں نے اپنے قبیلے میں قدم بھی رکھا تو وہ مجھے مار دیں گے۔''

''تم فکر مت کرو تمہاری حفاظت کی جائے گی اور تم بریف کیس بھی نکال لاؤ گی۔''

مہرو پریشان ہو گئی وہ کرنل کو سمجھانے لگی کہ اس کے قبیلے والے کیسے خوفناک لوگ تھے اور وہ اس کے بھی دشمن بن جائیں گے مگر کرنل نے اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ وہ پُراعتماد تھا لیکن اس وقت وہ پُراعتماد نہیں رہا جب فتح خان نے اسے اطلاع دی کہ مذکورہ قبیلہ کنٹرول لائن کے دوسری طرف چلا گیا ہے۔ خاصے غور و خوض کے بعد انہوں نے پلان بنایا کہ مہرو اسی قسم کے خانہ بدوشوں کے دوسرے قبیلے کے ساتھ سفر کرے گی اور اپنے قبیلے تک پہنچ کر وہ بریف کیس حاصل کر کے واپس آئے گی۔ یہ کام وہ کیسے کرتی اس کا سارا پلان کرنل نے مہرو کو بنا کر دیا اور پھر اس کی تربیت شروع کر دی۔ وہ اسے ہتھیار چلانے اور خالی ہاتھ سے اپنے دفاع کی تربیت دے رہا تھا۔ مختصر عرصے میں اس نے مہرو کو خاصی حد تک ٹرینڈ کر دیا۔ اس سے مہرو نے اور بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ دوسری طرف فتح خان اس کے سفر کا انتظام کر رہا تھا۔

اب تک مہرو یہی سمجھ رہی تھی کرنل اسے سچ مچ پسند کرنے لگا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ کرنل... درحقیقت اسے استعمال کر رہا ہے اور شاید شروع سے اس کا مقصد یہی تھا۔ وہ فتح خان اور کرنل کے ساتھ اسلام آباد آئی، یہاں فتح خان نے ایک دوسرا قبیلہ تلاش کر لیا۔ پہلے اس نے لالچ دے کر سردار کو اس کام پر آمادہ کیا اور جب وہ آمادہ ہو گیا تو فتح خان نے اس کے نوجوان بیٹے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور سردار سے کہا کہ جب وہ مہرو کو صحیح سلامت ان کی مطلوبہ چیز سمیت واپس لے آئے گا تو اس کا بیٹا اسے مل جائے گا۔ اگر سردار کی نیت میں کوئی خرابی تھی تو فتح خان کی اس حرکت کے بعد وہ بالکل تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ وہ مہرو کو لے کر روانہ ہوا۔ انہوں نے جوکھم سے بھرے راستوں پر سفر کیا اور مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ اس سفر میں حسبِ معمول کئی بوڑھے اور بچے سردی کے ہاتھوں زندگی ہار گئے تھے لیکن ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

جلد وہ اس جگہ جا پہنچے جہاں مہرو کا قبیلہ موجود تھا۔ انہوں نے اس کے قریب ہی پڑاؤ ڈالا تھا۔ دونوں آپس میں ایک ہی نسل اور رسم و رواج سے تعلق رکھنے والے قبیلے تھے اس لیے ان میں میل جول بھی تھا۔ مہرو نے حلیہ بدلا اور اپنے قبیلے گئی۔ کئی دوسری عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اگر بریف کیس قبیلے میں ہوا تو وہ سردار کے قبضے میں ہوگا اور سردار کے پاس ایک بڑا سا دھاتی ٹرنک تھا وہ اپنی تمام قیمتی چیزیں اسی میں رکھتا تھا۔ اس ٹرنک پر ایک

نہایت مضبوط قسم کا تالا ہوتا تھا۔ لیکن کرنل نے مہرو کو قفل شکنی کی تربیت اور ضروری آلات فراہم کیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کرنل نے اسے بالکل ویسا ہی ایک بریف کیس بھی دیا تھا۔ مہرو کو اسے رکھ کر دوسرا بریف کیس لانا تھا۔ کام آسان نہیں تھا لیکن مہرو نے کسی طرح سردار کا ٹرنک کھول کر یہ کام کر لیا۔ اس نے بریف کیس اتنی مہارت سے تبدیل کیا کہ سردار کو احساس بھی نہیں ہوا تھا اور نہ کسی نے اسے بدلے ہوئے حلیے میں پہچانا۔ آواز چھپانے کے لیے وہ گونگی بن گئی تھی۔ اس طرح ایک سنسنی خیز مہم انجام کو پہنچی۔

اب واپسی کا سفر تھا لیکن اس دوران میں دوسرے قبیلے میں ایک چکر شروع ہو گیا تھا۔ مہرو کو اس کی خبر نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کرنل اور فتح خان کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ جس وقت فتح خان سردار سے گٹھ جوڑ کر رہا تھا اور پھر اسے اپنے شکنجے میں کس رہا تھا اس وقت کرنل نے سردار کے نائب اور دست راست سے معاملہ کر لیا تھا۔ یہ اصل میں سردار کا سپہ سالار اور اس کے اقتدار کی اصل طاقت تھا۔ کیونکہ سردار کا لڑکا ابھی چھوٹا تھا۔ کرنل پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ بریف کیس کے حصول کے بعد فتح خان کا پتا صاف کر دے گا۔ اسی لیے اس نے نائب سے سودا کیا اور اب نائب اس فکر میں تھا کہ کسی طرح سے بریف کیس پہلے حاصل کر لے۔ اسے دو فائدے ہوتے۔ اول کرنل اسے رقم ادا کرتا دوسرے فتح خان سردار زادے کو وعدہ خلافی پر مار دیتا اور نائب کا راستہ خود بہ خود صاف ہو جاتا۔

مہرو اس جھگڑے سے بے خبر تھی جو نائب اور سردار کے درمیان جاری تھا۔ نائب کا مطالبہ تھا کہ بریف کیس اپنے قبضے میں کر لیا جائے اور منہ مانگی قیمت کے بدلے فتح خان کے حوالے کیا جائے جب کہ سردار اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ نائب کا کہنا تھا کہ انہوں نے اتنا طویل اور مشکل ترین سفر بلاوجہ تو کیا نہیں انہیں اس کا کچھ معاوضہ تو ملنا چاہیے۔ فتح خان نے سودا پانچ لاکھ میں کیا تھا اور پیشگی ایک لاکھ دے کر سردار زادے کو قبضے میں لے لیا تھا۔ ظاہر ہے وہ باقی رقم ادا نہیں کرتا۔ کنٹرول لائن عبور کرنے تک یہ جھگڑا دبا رہا تھا مگر جب وہ سرحد عبور کر کے اس طرف آئے تو جھگڑا کھل کر سامنے آ گیا۔ نائب نے معاملہ سارے قبیلے کے سامنے رکھا اور سردار پر الزام لگایا کہ وہ صرف اپنے بیٹے کی خاطر سارے قبیلے کے مفاد کو نظرانداز کر رہا ہے۔ معاملہ رقم کا تھا اس لیے اکثر لوگ نائب کی حمایت کرنے لگے، خاص طور سے وہ لوگ جن کے گھر کے فرد اس سفر میں موسم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ زیادہ شور مچا رہے تھے۔

معاملے کو ملتوی رکھنے کے لیے سردار نے روٹ تبدیل کر دیا اور وہ آزاد کشمیر سے پنجاب آنے کی بجائے سرحد میں داخل ہو گئے۔ وہ یہاں بھی آتے تھے مگر کئی سال بعد۔ ہزارہ کے اس علاقے میں انہوں نے ڈیرا ڈالا اور اپنا جھگڑا سلجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ سردار کسی صورت اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے لوگوں کو بھی مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ نتیجہ شدید جھگڑے کی صورت میں برآمد ہوا اور دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ فائرنگ میں سردار زخمی ہوا اور اس کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اب معاملات نائب کے ہاتھ میں تھے۔ لیکن اس دوران میں مہرو نے حالات دیکھتے ہوئے چالاکی سے کام لیا اور بریف کیس ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ جب نائب نے اس سے بریف کیس مانگا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ غضب ناک ہو کر تشدد پر اتر آیا تھا لیکن اتفاق سے اسی وقت ملک رفاقت اپنے آدمیوں کے ہمراہ وہاں سے گزرا اور اس نے مہرو کو دیکھا۔ کیونکہ یہ ان کا علاقہ تھا اس لیے ملک رفاقت نے دخل اندازی کی اس پر مہرو نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شور مچایا اور الزام لگایا کہ اس کا اس قبیلے سے تعلق نہیں ہے اور وہ اس کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے۔

ایک خوب صورت عورت کی فریاد نے نوجوان ملک رفاقت کو متاثر کیا تھا اور وہ اس کی حمایت کرنے لگا۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ ملک رفاقت نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ملک رفاقت اور اس کے مسلح ساتھی خانہ بدوشوں کے لیے مسئلہ نہیں تھے لیکن یہ ان کا علاقہ تھا اور وہ جھگڑا کر کے یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ اس لیے وہ دب گئے اور ملک رفاقت مہرو کو حویلی لے آیا۔ مگر اب خانہ بدوش ملک ریاض کی حمایت پا کر شیر ہو رہے تھے اور انہوں نے حویلی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس دوران میں ہم بھی یہاں آ کر پھنس گئے تھے اور اب تک یہاں سے نکلنے کی فکر کر رہے تھے مگر مہرو کے سامنے آنے کے بعد صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اگر وہ عورت مہرو نہ ہوتی تو ہمارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل نہیں تھا مگر مہرو کو ہم کسی صورت خانہ بدوشوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

میں نے غور سے مہرو کو دیکھا۔ ”وہ بریف کیس کہاں ہے؟“
”میں نے ایک جگہ زمین میں دبا دیا تھا۔“
”کیا وہ جگہ محفوظ ہے مطلب یہ کہ کوئی وہاں اتفاق سے نہ پہنچ جائے۔“
”نہیں میں نے خیال رکھا ہے۔“ مہرو بولی۔ ”لیکن اس مصیبت سے جان چھوٹے تو میں بریف کیس نکال سکتی ہوں۔“
”یہ مصیبت اتنی آسانی سے ٹلتی نظر نہیں آرہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے چھوٹے ملک سے کیا کہا تھا۔“
مہرو کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”وہ اصل میں میرے چکر میں پڑ گیا ہے۔“
”اسے نہیں معلوم کہ تم شادی شدہ ہو؟“
”میں نے اسے نہیں بتایا.... مجھے خطرہ تھا اس صورت میں اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی اور وہ مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دے گا۔“
ملک رفاقت یقیناً ایسا ہی کرتا۔ مہرو دیکھنے میں لڑکی جیسی لگتی تھی۔ حالانکہ اس نے دو شوہروں کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے اس کی جسامت خاصی مضبوط تھی اور اس میں نسوانیت کا عنصر بھی اس مضبوطی کے تاثر کو زائل نہیں کر پاتا تھا لیکن اب وہ نازک اندام ہو گئی تھی اور مضبوطی والی بات محسوس نہیں ہوتی تھی شاید اسی لیے ملک رفاقت اسے لڑکی سمجھا تھا۔ اس نے مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا یہ خانہ بدوشوں کے لباس سے خاصا مختلف تھا، اس نے اپنی کہانی خاصی تفصیل سے سنائی تھی اور اس میں تقریباً گھنٹا گزر گیا تھا۔ خانہ بدوشوں کا دیا ہوا وقت ختم ہونے کو تھا اور وہ اس کے بعد حملہ کر سکتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور پھر وہ اپنے آگ والے حربے کی وجہ سے سامنے آنے کا خطرہ مول لیے بغیر ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ہماری جوابی کارروائی بہت زیادہ جانی نقصان کا باعث بن سکتی تھی اور اس سے نئے مسئلے کھڑے ہو جاتے۔ ملک ریاض جیسے سیاست دان بلاوجہ ہمارے دشمن بن جاتے۔
”اب تم کیا کرو گے؟“ مہرو نے پوچھا وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔
”میں چاہتا ہوں کہ معاملہ پُرامن طریقے سے نمٹ جائے۔“
”اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔“ اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”میری قربانی دے دو۔“
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں سمجھا تھا کہ تم سچ مچ اسی قبیلے کی لڑکی ہو اور اسی لیے میں تمہیں ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن اب معاملہ مختلف ہے۔ اگر تم مہرو نہ ہوتیں تب بھی میں تمہیں ان کے حوالے نہ کرتا۔“
”تمہارے لیے بریف کیس بھی تو اہم ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔
”اہم ہے لیکن کسی انسان کی جان سے زیادہ اہم نہیں ہے۔“
میں نے وسیم کو بلا لیا۔ ملک شفقت کو اوپر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے وسیم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ”اب بولو اب کیا کرنا چاہیے؟“
”مہرو کو ان کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
”جنگ ناگزیر ہوگی۔“
”میرا خیال ہے پہل ہمیں کرنی چاہیے اور ان کو دہشت زدہ کر کے فرار پر مجبور کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“
”ملک شفقت کا کیا ہوگا؟“
”یہ اپنے مسائل سے خود نمٹتا رہے گا۔“ وسیم نے شانے اچکائے۔
”ٹھیک ہے تب فوری کارروائی کرو ہمیں صبح سے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں اب پانچ بج رہے تھے۔ ”ان کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے والی ہے۔“
اپنے آدمیوں کو چوکس کرتے ہوئے ہم چھت پر آئے۔ مشرق کی طرف ہلکی سی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ ہم نے نائٹ ویژن دوربین اور چشموں سے آس پاس کا جائزہ لیا اور میں نے محسوس کیا کہ شروع کے مقابلے میں اب افراد کی تعداد کم تھی۔ سامنے اور دائیں بائیں اب تیس بتیس افراد تھے۔ وہ مختلف جگہوں پر دبکے ہوئے تھے اور ان کے ہیولے اتنے روشن نہیں تھے۔ ایک آدمی کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہمارے پاس تاریکی میں دیکھنے والے آلات ہیں اس لیے وہ سامنے آنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ ذرا پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔ ”ہمارے پاس راکٹ لانچر ہیں؟“
”بالکل ہیں جناب! چار عدد لانچر اور دو درجن سے زیادہ گرنیڈز ہیں۔“
”ٹھیک ہے چاروں لانچر بیک وقت استعمال کرنے ہیں۔ نشانہ دیواروں کو بنانا ہے۔ دیواریں تباہ ہوں گی تو ان کے پیچھے موجود افراد دہشت زدہ ہو کر بھاگیں گے۔“
”لوگوں کو نشانہ نہیں بنانا ہے؟“
”نہیں۔“ میں نے انکار کیا۔ ”اصل مقصد انہیں بھگانا ہے۔ دو راکٹ سامنے فائر کرنا اور ایک ایک دائیں بائیں۔ سامنے والے حصے کو صاف کرنا اصل کام ہے تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔“
وسیم نیچے روانہ ہو گیا تاکہ آدمی اور ہتھیار لا سکے۔ میں بدستور دوربین سے نیچے کا معائنہ کرتا رہا۔ خانہ بدوش زیادہ محتاط بھی نہیں تھے۔ وہ بار بار اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید سردی بھی ہو سکتی تھی جو صبح کے قریب مزاج پوچھ رہی تھی۔ ان کی یہ نقل و حرکت ہمارے لیے مشکل پیدا کر سکتی تھی کیونکہ اگر وہ عین گرنیڈ فائر کرتے وقت اپنی جگہ سے حرکت کرتے تو ہماری احتیاط کے باوجود نشانہ بن سکتے تھے۔ کچھ دیر میں وسیم اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ راکٹ لانچر لے آیا تھا۔ گرنیڈز ایک باکس ٹائپ ڈبے میں بند تھے۔ گرنیڈ ان چاروں نے فائر کرنے تھے۔ وسیم دھیمی آواز میں انہیں بریفنگ دے رہا تھا۔ پھر وہ چاروں تیار ہو گئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ راکٹ ایک ساتھ فائر کیے جائیں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ وہ چاروں ایک ایک کر کے فائر کرتے تو اس کا اثر الگ ہوتا کیونکہ الگ الگ چار دھماکے محاصرہ کرنے والوں کے ہوش اُڑا سکتے تھے۔
پہلے وسیم نے راکٹ سامنے والی دیوار کی طرف فائر کیا۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ راکٹ ٹھیک نشانے پر لگا اور دیوار کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ فوراً ہی آگ کی گیند نمودار ہوئی اور دھماکے کے بعد چیخیں سنائی دی تھیں۔ راکٹ نے تقریباً پندرہ فٹ کی دیوار صاف کر دی تھی۔ یہ میرے اندازے سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ دیوار جس طرح اُڑی تھی اس کے پیچھے کسی کا صحیح سلامت ہونا مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں سے ہٹا لی تھی کیونکہ وہاں اتنی حرارت ہو گئی تھی کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”احتیاط سے فائر کرو یہ بہت تباہ کن ہتھیار ہے۔“
”نشانے سے ذرا پیچھے مارو۔“ وسیم نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور انہوں نے یکے بعد دیگرے تینوں راکٹ فائر کیے۔ چند سیکنڈ بعد میں نے نائٹ ویژن لگا کر دیکھا۔ بچنے والے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائر بھی کرتے جا رہے تھے لیکن ان کے قدم نہیں رک رہے تھے۔ چار راکٹوں نے یقیناً ان کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”تم نیچے جاؤ اور روانگی کی تیاری کرو، دو آدمی یہیں چھوڑ جاؤ اگر کسی طرف سے مزاحمت ہوئی تو ہم پھر راکٹ ماریں گے۔“
وسیم ایک آدمی کے ساتھ نیچے چلا گیا۔ میں مستقل چاروں طرف نائٹ ویژن سے دیکھ رہا تھا۔ ابتدائی مورچوں سے تو سب ہی پسپا ہو گئے تھے لیکن کچھ فاصلے پر وہ دوبارہ جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک ساتھی کو جگہ سمجھا کر راکٹ مارنے کا کہا اس نے ٹھیک اسی جگہ نشانہ لیا۔ یہ جگہ باغ میں تھی اور دھماکے کے ساتھ کئی درخت بھی ہوا میں بلند ہوئے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر موجود لوگوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگے تھے۔ اس طرح کا ایک گرنیڈ فائر بائیں طرف کیا تو وہاں موجود رہنے والے خانہ بدوش بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سامنے والا حصہ انہوں نے پہلے ہی خالی کر دیا تھا۔ وسیم نیچے سے بھاری مشین گن لے آیا تھا۔ اس نے دونوں طرف اس سے کئی برسٹ مارے تاکہ اگر کوئی موجود ہو بھی تو پھر رکنے کی جرأت نہ کرے۔ خانہ بدوشوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس اتنے خطرناک ہتھیار بھی ہو سکتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہو گیا تھا۔
”میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“
”اتنی عجلت نہیں۔“ میں نے نیچے جاتے ہوئے کہا۔ ”آس پاس نظر رکھو اور اگر وہ پاس آنے کی کوشش کریں تو مناسب کارروائی کرنا۔“
میں نیچے آیا تو وسیم کے آدمی مستعد تھے۔ انہوں نے ملک شفقت کو بھی بیٹے کے ساتھ ایک جگہ بند کر دیا تھا۔ مہرو بے چین تھی مجھے دیکھتے ہی وہ پاس آئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“
”ان کو بھگا رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بتاؤ بریف کیس کہاں دفن کیا ہے ہم کچھ دیر میں یہاں سے نکلیں گے اور بریف کیس حاصل کر کے اس علاقے سے نکل جائیں گے۔“
”بریف کیس اس جگہ سے کچھ دور چھپایا ہے جہاں

قبیلے والے رکے ہوئے ہیں اور وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ میں تو کہتی ہوں یہاں سے نکل چلو بریف کیس بعد میں حاصل کرتے رہنا۔"

"نہیں بڑی مشکل سے تو بریف کیس سامنے آیا ہے اب میں اسے بہر صورت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے انکار کیا۔ "تم اندازے سے سمجھاؤ کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔"

مہرو نے پین سے کاغذ پر نقشہ بنا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ بریف کیس والی جگہ کس طرف اور کتنی دور تھی۔ فاصلوں کا اسے خود ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگانے کی بجائے ملک رفاقت سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ وہ بے بس بندھا پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور پوچھا۔ "وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں... خانہ بدوش ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو اور باہر کیا ہو رہا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں لیکن پہلے میرے سوال کا جواب دو۔"

"شمال کی طرف کوئی دو میل دور ہے اسی سڑک کے ساتھ جانا ہوگا۔"

"ہم نے فی الحال خانہ بدوشوں کو بھگا دیا ہے اور اب یہاں سے جا رہے ہیں تم لوگ اپنی حویلی کی حفاظت کی ذمے داری سنبھال لو۔"

ملک رفاقت کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تم نے کیسے بھگا دیا اور یہ دھماکے کیسے تھے؟"

"ان ہی دھماکوں کی وجہ سے وہ بھاگے ہیں ممکن ہے ان کے کچھ آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے ہوں۔"

وسیم کے آدمیوں نے سامان دوبارہ گاڑیوں پر لاد دیا تھا۔ وسیم نے اطلاع دی کہ فی الحال تو آس پاس کوئی فرد نظر نہیں آ رہا ہے۔ صبح ہونے والی تھی میرا ارادہ تھا کہ روشنی ہونے پر یہاں سے نکلیں تا کہ کوئی تاریکی میں گھات لگا کر ہمیں نہ روک سکے۔ ہم نے ملک شفقت اور ملک رفاقت کو آزاد کرا دیا تھا لیکن ان کے آدمی قید تھے اور اسلحہ بھی نہیں دیا تھا۔ ملک رفاقت یہ سن کر تڑپ گیا کہ مہرو ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ "اسے کیوں لے جا رہے ہو؟"

میں نے نرمی سے کہا۔ "برخوردار تم اس کے بارے میں شاید کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو، وہ لڑکی نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہے اور اس کا شوہر بھی موجود ہے۔"

رفاقت نے ناقابلِ یقین نظروں سے مہرو کی طرف دیکھا۔ "یہ.... یہ سچ ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔" مہرو نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں نے تم سے یہ بات چھپائی تھی۔"

اپنے فرزند ارجمند کی حماقت سامنے آنے پر ملک شفقت نے اسے گھورا اور مجھ سے کہا۔ "شہباز صاحب میں آپ کا شکر گزار ہوں جو اس عورت اور خانہ بدوشوں نے میرا پیچھا چھڑوایا ہے۔"

"اسے تو میں لے جا رہا ہوں لیکن خانہ بدوشوں کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، عین ممکن ہے وہ دوبارہ پلٹ کر اس طرف آئیں۔"

"اب میں انہیں دیکھ لوں گا۔" ملک شفقت نے حوصلے سے کہا۔

ہم چاروں گاڑیوں کے ہمراہ وہاں سے نکلے اور اوپر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج ابھی مشرق سے سر اٹھا رہا تھا لیکن پہاڑوں پر روشنی پھیل چکی تھی۔ ہم اپنے ہتھیاروں کے ساتھ پوری طرح ہوشیار تھے۔ وسیم ڈرائیو کر رہا تھا اور میں نے رائفل سنبھال رکھی تھی۔ دس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں خانہ بدوش مقیم تھے لیکن اب وہ جگہ خالی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں سے پڑاؤ اٹھا لیا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر مہرو کی طرف دیکھا۔ "وہ اسی جگہ تھے؟"

"ہاں لیکن ایسا لگ رہا ہے وہ یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔"

"ممکن ہے ملک ریاض نے انہیں کہیں اور منتقل کر دیا ہو۔ یہ بتاؤ بریف کیس کس جگہ ہے۔"

مہرو نے ایک بلند چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ جو اوپر گھنے درخت نظر آ رہے ہیں ان کے نیچے ایک جگہ چھپایا ہے۔"

وہاں تک پیدل ہی جانا ممکن تھا میں نے وسیم اور تین ساتھیوں کو گاڑیوں کے پاس چھوڑا۔ وسیم ساتھ چلنے پر اصرار کر رہا تھا لیکن میں نے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا، یہاں بھی کوئی فیصلہ کرنے والا موجود ہونا چاہیے تھا۔ میں تین ساتھیوں اور مہرو کو لے کر پہاڑ کی طرف بڑھا۔ ہم ممکنہ حد تک درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور ایسی جگہوں سے گریز کر رہے تھے جہاں دور سے نظر آ جائیں۔ مجھے شبہ تھا کہ یہاں سے کچھ افراد نگرانی کر رہے ہوں گے۔ خانہ بدوشوں کی غیر موجودگی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ جگہ ملک ریاض کی زمینوں کے پاس تھی

شاید بعد میں کسی الزام سے بچنے کے لیے ملک ریاض نے انہیں یہاں سے اٹھا دیا تھا البتہ اس نے یہاں اپنے کچھ افراد کو چھوڑا ہوگا۔ مگر ہمیں کسی نے نہیں روکا اور ہم آرام سے پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے۔ یہ جگہ سڑک سے کوئی پانچ چھ سو فٹ بلند تھی اور جب میں نے پلٹ کر گاڑیوں کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کھلونوں جیسی لگی تھیں۔ مہرو بے تابی سے درختوں میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟"

وہ خوف زدہ ہو گئی۔ "کیا اندر کوئی ہے؟"

"ہو سکتا ہے ہمیں ہر صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" میں نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ پھیل کر مختلف سمتوں سے درختوں میں داخل ہونے لگے۔ اگر راستہ صاف تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہاں بھی کوئی نہ ہوتا۔ گھات لگانے کے لیے یہ سب سے اچھی جگہ تھی بہ شرط کہ دشمن کو پتا ہوتا کہ ہم یہیں آئیں گے۔ تین ساتھیوں کے بعد میں بھی اندر داخل ہوا اور ہم خاموشی سے سن گن لے رہے تھے۔ مہرو میرے پیچھے چل رہی تھی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم نے سارا جھنڈ دیکھ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو باہر کی سمتوں پر متعین کیا اور مہرو سے کہا۔ "اب بتاؤ بریف کیس کہاں ہے؟"

مہرو ایک طرف بڑھی۔ "وہ یہاں ہے۔"

مہرو دو درختوں کے درمیان والی جگہ داخل ہوئی اور جھٹکے سے رک گئی۔ "یہ کیا....؟" اس کے منہ سے نکلا۔ میں تیزی سے آگے آیا تو میں بھی رک گیا۔ یہاں زمین پر پتھریوں بکھرے تھے جیسے انہیں ہٹا دیا ہو۔ ان کے ہٹانے سے ایک گڑھا بن گیا تھا اور اس میں ایک کاغذ رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھایا وہ انگریزی میں تھا۔ "ڈیئر مہرو بہت شکریے اور پیار کے ساتھ.... امید ہے اب تم سے ملاقات نہیں ہوگی.... صرف تمہارا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کرنل یہاں کام دکھا گیا تھا۔ وہ پہلے ہی آ کر بریف کیس نکال گیا تھا۔ پرچہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ہاتھ دکھا گیا ہے لیکن یہ پرچہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ کام کس نے دکھایا ہے۔ مہرو بھی صدمے میں تھی پھر اس نے کاغذ کے بارے میں پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"دیکھ لو۔" میں نے اس کی طرف بڑھایا پھر مجھے خیال آیا کہ اسے پڑھنا کہاں آتا ہے اردو انگریزی کا سوال تو بعد میں آتا تھا۔ "یہ کرنل کی طرف سے ہے تمہارے لیے۔"

"کرنل وہ کہاں سے آ گیا؟" مہرو نے اضطراری انداز میں کاغذ مجھ سے لے لیا۔ "کیا لکھا ہے اس میں؟"

میں نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھ کر سنایا اور پھر اس کا ترجمہ پیش کیا۔ مہرو کا چہرہ تاریک ہو گیا اس نے زیرِ لب کہا۔ "تو وہ یہاں بھی آ گیا تھا۔"

"وہ بہت ذہین آدمی ہے میرا خیال ہے تمہارے نکلنے کے بعد وہ خانہ بدوشوں تک پہنچا ہوگا انہیں تمہارے پیچھے لگا کر اس نے آرام سے بریف کیس تلاش کیا ہوگا اور یہاں.... یہ پرچہ رکھ کر رخصت ہو گیا۔"

"لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ میں نے بریف کیس یہاں چھپایا ہے۔"

"بہت آسانی سے.... اس پہاڑی کے آس پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں انسان بلاخوف و خطر کوئی چیز چھپا سکے۔ سوائے اس پہاڑی اور اس جھنڈ کے، کیونکہ یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا اور یہاں چھپائی چیز کو تلاش کرنے کا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کرنل سیدھا یہیں آیا ہوگا اور اسے کچھ دیر لگی ہوگی لیکن اس نے بالآخر بریف کیس تلاش کر لیا ہوگا۔"

مہرو کا منہ لٹک گیا تھا۔ "اس کا مطلب ہے وہ بریف کیس ہاتھ سے گیا۔"

"سامنے کی بات ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "اب یہاں سے نکلو اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے۔"

ہم باہر آئے اور نیچے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کامیابی بالکل پاس آئی مگر ناکامی ایک بار پھر میرا منہ چڑا گئی تھی اور ایسا بریف کیس کے معاملے میں ہوتا آیا تھا۔ جب اسے حاصل کرنے کا موقع نظر آتا وہ ہاتھوں میں آ کر پھسل جاتا تھا اور اب وہ کرنل کے پاس جا چکا تھا جو اس کا سودا کسی بڑی طاقت سے کرنے کا اہل بھی تھا۔ گویا بریف کیس تقریباً میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کرنل صرف اسی کے چکر میں پاکستان آیا تھا اور اب اپنا مقصد پورا کر کے وہ یہاں سے جا رہا ہوگا یا شاید جا چکا ہوگا۔ اگر وہ کوئی ہیلی کاپٹر ہائر کرتا تو چند گھنٹوں میں سرحد پار کر سکتا تھا۔ وسیم مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر سمجھ گیا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ "بریف کیس نہیں ملا؟"

"اسے کرنل زریسکی لے اڑا۔" میں نے کاغذ اسے تھمایا۔ "میرا خیال ہے خانہ بدوشوں کے حملے کے پیچھے وہی تھا۔"

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وسیم فکر مند ہو گیا۔''اگر ملک ریاض اس معاملے میں شامل نہیں تھا تو جلد یہاں پولیس آنے والی ہوگی اور ہمیں اس سے پہلے اس علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں بس مہرو ہاتھ آئی تھی اور وہ ہمارے کسی کام کی نہیں تھی بلکہ اس کی صورت میں ایک اضافی ذمے داری ہمارے سر آگئی تھی۔ کرنل کے بارے میں سن کر اور اس کی تحریر کے بارے میں جان کر وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ بے شک کرنل دھوکے باز تھا لیکن وہ بہر حال اس کا شوہر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔''مہرو اب تم کیا کرو گی اور کہاں جاؤ گی اس بارے میں سوچا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ میری جیسی بے سہارا عورتوں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔'' اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔''اگر تم میری وجہ سے پریشان ہو تو مجھے کسی بھی شہر میں اتار دینا۔''

''ہم اتنے سفاک نہیں ہیں کہ تمہیں یوں بے سہارا چھوڑ دیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔''تم جانتی ہو ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں اس میں ہمہ وقت خطرات ہوتے ہیں۔''

اس نے گہری سانس لی۔''اب تو میں بھی خطرات کی عادی ہو گئی ہوں لیکن میں تم لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔''

''تمہارا مسئلہ بعد میں دیکھیں گے۔'' وسیم نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔''فی الحال تمہارے اس نام نہاد شوہر کا مسئلہ ہے۔''

''وہ سچ مچ میرا شوہر ہے۔'' مہرو نے تیز لہجے میں کہا۔''نکاح پڑھایا تھا اگر اس کے دل میں کھوٹ تھا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔''

''اوکے ....اوکے۔'' وسیم نے کہا اور مجھ سے بولا۔''جناب وہ ابھی راستے میں ہوگا۔ کیا ہم تیزی سے سفر کر کے اسے نہیں روک سکتے ہیں؟''

وسیم کی بات نے مجھے راستہ دکھایا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کاغذ کا معائنہ کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بالکل تازہ تھا یعنی اسے پتھروں میں رکھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ کیونکہ رات کو یہاں اوس پڑتی ہے اور کاغذ پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر اسے رات کے وقت رکھا گیا ہوتا تو اس پر لازمی کچھ نہ کچھ نمی کا اثر ہوتا۔ ہم بھی بالکل صبح سویرے وہاں پہنچے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ کاغذ ہماری آمد سے کچھ پہلے ہی وہاں رکھا گیا تھا اور اس صورت میں کرنل یہاں سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ مگر اس کا پیچھا کرنے میں دو [مسئلے] تھیں۔ اول وہ کس راستے سے گیا تھا اور دوسرے وہ [...] پر گیا تھا اگر اس کے پاس کوئی طاقتور فور وہیل ڈرائیو [...] اس کا تعاقب کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے وسیم [سے] کہا۔''میرا اندازہ ہے وہ کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے [...] گا۔ کاغذ بالکل صاف ہے۔''

''اسی وجہ سے میں نے آپ سے کہا ہے۔''

''یہاں سے جانے کے کتنے راستے ہیں۔''

''ویسے تو کئی راستے ہیں۔'' وسیم نے کہا اور گاڑی ایک طرف روک لی ہم ملک شفقت کی حویلی سے آگے نکل آئے تھے۔ اس نے نقشہ نکالا۔''یہ دیکھیں ....یہ سڑک بھی اسلام آباد پنڈی کی طرف جاتی ہے اور یہ سڑک بھی [جا] رہی ہے۔''

''تم لوگ غلط سمت میں دیکھ رہے ہو۔'' مہرو نے مداخلت کی۔

وسیم نے اسے گھورا۔''کیا مطلب؟''

''وہ پنڈی اسلام آباد نہیں بلکہ شمالی علاقے کی طرف گیا ہوگا اسے ان ہی روٹس پر تلاش کرو۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے وہ شمالی علاقے کی طرف گیا ہوگا۔'' میں نے کہا تو وسیم نے نئے سرے سے نقشہ دیکھنا شروع کیا اور اس بار اس نے زیادہ آسانی سے روٹ تلاش کر لیا۔''اگر اس کا رخ سوات کی طرف ہوگا تو وہ لازمی اس راستے سے گزرے گا کیونکہ یہی سب سے آسان اور بہتر ہے۔''

''ہمیں اس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔''لیکن زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے صرف دو گاڑیاں اور دو آدمی ساتھ لے لو....باقی گاڑیاں واپس بھیج دو۔''

وسیم تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے دو جاندار.... گاڑیاں منتخب کیں اور ان میں ضروری اسلحہ منتقل کیا۔ باقی اسلحہ دو گاڑیوں میں منتقل کر کے ان کے ساتھ باقی چار کو واپس جانے کا حکم دیا۔ انہیں عبداللہ کا نمبر دے دیا کہ وہ پنڈی کے پاس پہنچ کر اسے کال کریں اور پھر وہ جو کہے وہی کریں۔ یہ دو گاڑیاں وہیں سے واپس چلی گئیں۔ دوسری گاڑی میں وسیم کے دو آدمی تھے جب کہ ہم تین پہلی گاڑی میں تھے۔ یہ طاقتور انجن والی ڈبل کیبن جیپ تھی جو پہاڑی راستوں پر بھی بہترین کارکردگی دکھاتی ہے۔ مختلف لنک

سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم دو گھنٹے بعد سوات جانے والی سڑک پر آ گئے تھے۔ یہ پہاڑی سڑک بہت اچھی حالت میں تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اس قابل تھی کہ اس پر تیز رفتاری سے ڈرائیو کی جا سکتی تھی۔ موسم بہترین تھا اور سورج نکلا ہوا تھا اس لیے وسیم نے اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھائے۔ بعض اوقات تو وہ خطرناک حد تک رفتار تیز کر لیتا تھا اور مہرو کے ساتھ میرا سانس بھی رک جاتا تھا۔ مگر یہ ٹوکنے کا موقع نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کرنل بھی آندھی طوفان کی طرح گیا ہو گا۔ سب نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ ہمارے ہاں نوے فیصد گاڑیوں میں سیٹ بیلٹ نہیں ہوتی ہے اور حادثات میں نوے فیصد اموات اسی لیے ہوتی ہیں کہ ان میں سیٹ بیلٹ نہیں ہوتی۔ اس لیے بعض اوقات معمولی سا حادثہ بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک .... روڈ اور ڈرائیو سیفٹی کے اصولوں پر اکثر عمل کرتے ہیں اس لیے وہاں شدید حادثوں میں لوگ بچ جاتے ہیں۔

دوپہر تک ویسے تو صحیح سلامت رہے تھے لیکن بھوک سے جان لبوں پر آ گئی تھی اس لیے مجبوراً ایک جھگی ہوٹل کے سامنے رکے جہاں ٹرک ڈرائیور لنچ تناول فرما رہے تھے اور ڈیک پر اونچی آواز میں پشتو گانے چل رہے تھے۔ مہرو کے ساتھ یہاں لنچ کرنا تماشا بن جانے کے برابر ہوتا اور ہمارے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے وسیم کے آدمی لنچ پیک کروا لائے۔ انہوں نے بھنا ہوا دنبے کا گوشت اور تندوری نان لیے تھے۔ انہیں سفر کے دوران بھی آسانی سے کھایا جا سکتا تھا۔ ایک بڑا کین پانی کا لے لیا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ پہلے میں نے اور مہرو نے لنچ کیا اور پھر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وسیم نے لنچ کیا تھا۔ اسی طرح دوسری گاڑی میں موجود تین افراد نے لنچ کیا تھا۔ وسیم خاصی دیر سے ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے اس بار ڈرائیونگ میں نے سنبھالے رکھی۔ تین بجے موسم بدلنے لگا تھا۔ آسمان پر گھنے بادل نمودار ہوئے اور پھر کچھ دیر بعد بارش ہونے لگی۔ جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے بارش کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل ہم بارش کے ریجن میں داخل ہو گئے تھے۔ اب سفر مشکل اور خطرناک ہو گیا تھا۔ سورج نکلا ہوا تھا لیکن بادلوں کے پیچھے روپوش تھا اس لیے ماحول تاریک اور دھواں دھار ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں ایک خاص حد سے زیادہ رفتار خطرناک ہو سکتی تھی۔ بارش کے ساتھ رہ رہ کر بادل بھی گرج رہے تھے اس لیے جب وسیم نے کہا۔

''جناب کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔''

تو میں نے جواب دیا۔ ''بادل گرج رہے ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں یہ فائرنگ کی آواز ہے۔''

اسی لمحے میں نے بھی آواز سن لی اور پھر ایک ... کاٹتے ہی منظر بھی سامنے آ گیا۔ ایک بڑی فور وہیل ڈ... سڑک کے وسط میں رکی ہوئی تھی اور ذرا آگے موڑ ... افراد اس پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وسیم نے اسی جگہ ... روک لی اور پیچھے آنے والی گاڑی بھی رک گئی۔ پھر ہم ... ریورس میں آئے کیونکہ اس جگہ تک گولیاں آ ... تھیں۔ محفوظ مقام پر آتے ہی میں اور وسیم نیچے اتر آئے۔ بارش نے فوراً ہی مزاج پوچھا تھا۔ پانی کے قطرے ... سیدھے کسی فریزر سے آ رہے تھے۔ وسیم نے دور مار اسنائپر رائفل نکالی اور میری طرف دیکھا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں ان افراد کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں جو فور وہیل پر گولیاں برسا رہے ہیں۔''

''سنو تم اس معاملے میں کیوں دخل دے رہے ہو۔'' مہرو نے گاڑی سے جھانک کر کہا۔

''کیونکہ ہمیں دخل دینے کی عادت ہے۔'' میں نے جواب دیا اور رائفل لے کر موڑ کی طرف بڑھ گیا۔ میں وسیم کی حکمتِ عملی سمجھ گیا تھا وہ اوپر سے ان لوگوں کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا جو خودکار رائفلوں سے گولیوں کا مینہ برسا رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ فور وہیل ڈرائیو میں موجود ہر ذی روح کو مار دینا چاہتے ہوں۔ ان سے نمٹنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو ان کا یہی قاتلانہ موڈ تھا اور دوسرے وہ ہمارے راستے میں حائل تھے۔ ظاہر ہے وہ شرافت سے ہمیں آگے جانے کی اجازت کہاں دیتے؟ اس لیے ان سے نمٹنا ہی تھا۔ پچھلی گاڑی سے بھی دو افراد اتر کر آ گئے۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے۔ ایک کو انہوں نے گاڑی میں چھوڑ دیا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن دوربین لی۔ ویسے تو یہ رات میں کام آتی تھی لیکن اس وقت بھی تقریباً رات جیسا سماں تھا۔ موڑ تک آ کر میں نے دوربین سے جائزہ لیا فوراً ہی مجھے فور وہیل ڈرائیو میں ایک دھبا دکھائی دیا یعنی اس میں کوئی زندہ فرد موجود تھا۔ نائٹ ویژن دوربین انفرا ریڈ کی مدد سے دکھاتی ہے اور یہ لہریں اگر طاقتور ہوں ... دیکھنے والی دوربین طاقتور ہو تو چیزوں کے آر پار بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے گاڑی میں دبکا ہوا آدمی بھی نظر آ گیا تھا۔ پھر میں نے دوربین کو موڑ پر چھپے افراد پر فو...

کیا۔ وہاں تین افراد تھے اور ان کے ہاتھوں میں موجود خودکار رائفلیں رہ رہ کر شعلے اگل رہی تھیں جو اس دوربین سے بہت واضح دکھائی دے رہے تھے۔ گولیاں فور وہیل سے ٹکرانے کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ اسی لمحے اسنائپر رائفل چلنے کی آواز آئی اور تین میں سے ایک گر گیا۔ وہ گرتے ہی ساکت ہو گیا تھا یعنی گولی اسے کسی نازک جگہ لگی تھی اور شاید وہ مر چکا تھا۔ باقی دو نے گھبرا کر فائرنگ روک دی اور آس پاس دیکھنے لگے۔ اس بار وسیم نے ایک کے نچلے دھڑ کا نشانہ لیا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ دوسرے نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اب موقع تھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے ان دونوں سے کہا اور جھک کر فور وہیل ڈرائیو کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دونوں میرے پیچھے تھے۔ فور وہیل کوئی سو گز دور کھڑی تھی اس تک پہنچ کر میں نے دوبارہ دوربین سے اگلے موڑ کا معائنہ کیا لیکن اب وہاں کوئی روشن ہیولا نہیں تھا۔ اگر پہلا والا بچ گیا تھا تو اس کے ساتھی اسے بھی اٹھا کر لے گئے۔ میں نے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ موڑ کی طرف جانے لگا۔ میں نے فور وہیل کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر جھانکا ایک شخص اسٹیرنگ وہیل کے ساتھ والی خالی جگہ دبکا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ پر حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ زخمی تھا اس لیے بس ہل کر رہ گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہم دشمن نہیں ہیں، تم پر فائرنگ کرنے والوں کو مار بھگایا ہے۔''

وہ کراہا میں نے اس بار فور وہیل کا اگلا دروازہ کھولا اور زخمی کو سیدھا کیا اور دم بخود رہ گیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے شاید میری حیرت کے لیے مخصوص تھے۔ پہلے غیر متوقع طور پر مہرو مل گئی اور اس نے بریف کیس کا بھی بتا دیا۔ پھر بریف کیس کرنل زریسکی عرف عبدالرحمٰن لے بھاگا تھا اور اب وہی کرنل میرے سامنے زخمی حالت میں موجود تھا۔ اس کی جیکٹ سینے اور پیٹ والی جگہ سے سرخ ہو رہی تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے احتیاط سے اسے کھینچ کر برابر والی نشست پر ڈالا اور نشست کو ممکن حد تک پیچھے کر دیا تب ہی مجھے دونوں سیٹوں کے درمیان چیزیں رکھنے والی مخصوص جگہ چینی بریف کیس نظر آ گیا۔ لیکن ... فی الحال کرنل میری توجہ کا زیادہ مستحق تھا، بہرحال کرنل اور بریف کیس دیکھتے ہی مجھے ان لوگوں پر فائرنگ کا جو تھوڑا بہت افسوس تھا وہ خوشی میں بدل گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''ہوشیار رہنا اور اگر کوئی مداخلت کرے تو بے دریغ فائر کرنا یہ دشمن ہیں۔''

''میں ہوشیار ہوں جناب۔'' اس نے مستعدی سے کہا۔

میں نے کرنل کی جیکٹ کھولی۔ اسے سینے اور پیٹ پر دو گولیاں لگی تھیں۔ سینے پر گولی دائیں طرف تھی یعنی دل کو نقصان نہیں ہوا تھا لیکن پھیپھڑا متاثر ہوا تھا اور پیٹ والی گولی شاید آنتوں کو نقصان کرتی نکل گئی تھی۔ کسی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اس کا خون خاصا بہہ چکا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے وہاں نشستوں اور نیچے موجود خون کی مقدار سے ہوا تھا۔ کرنل کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے زخموں سے اب بھی رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو وہیں رکنے کو کہا اور واپس گاڑی کی طرف بھاگا۔ اس میں طبی امداد کی کٹ موجود تھی۔ وسیم نیچے آ گیا تھا میں نے اسے کرنل کے بارے میں بتایا تو وہ دنگ رہ گیا تھا اور مہرو تڑپ کر گاڑی سے باہر آ گئی۔ ''عبدالرحمٰن .... وہ یہاں ہے۔''

''وہ کرنل زریسکی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''وہ زخمی ہے میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ فتح خان بھی کہیں آس پاس موجود ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں نے ایک کو شوٹ کر کے ٹھیک کیا۔ بہرحال وہ بھاگ گئے ہیں۔''

میں نے میڈیکل کٹ نکالی اور وسیم کے ساتھ فور وہیل تک آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے حصے سے اندر آ کر میں نے کٹ سے خون روکنے والے پیڈ نکال کر زخموں پر رکھے اور مضبوطی سے چپکنے والے ٹیپ سے انہیں باندھ دیا۔ وسیم میرے ساتھ تھا اس نے زخم دیکھے اور بولا۔ ''اسے فوری کسی اسپتال پہنچانا ہو گا ورنہ یہ زیادہ خون بہنے سے مر جائے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے تم گاڑی یہاں لاؤ اور اپنے آدمیوں کو الرٹ کر دو۔ مجھے تمہارا خیال درست لگ رہا ہے فتح خان آس پاس موجود ہے یہ اسی کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں واپس جانا ہو گا۔''

وسیم بریف کیس نکال کر لے گیا۔ اس دوران میں مہرو منع کرنے کے باوجود گاڑی سے اتر کر بھیگتی ہوئی وہاں آ گئی تھی۔ کرنل کو اس حالت میں دیکھ کر وہ رونے لگی۔

میرے خیال میں وہ جذباتی ہو رہی تھی کیونکہ کرنل اس سے کام نکل جانے کے بعد اسے اپنی زندگی سے خارج کر چکا تھا۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا اس لیے میں نے اسے منع نہیں کیا۔ وسیم گاڑی لے آیا اور ہم نے کرنل کو پچھلی نشست پر منتقل کیا۔ مہرو اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ جب میں نے کرنل کو دیکھا تو اس وقت وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا لیکن اب وہ مکمل بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ بریف کیس حاصل کر کے واپس جا رہا تھا کہ اس پر حملہ ہوا اور وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ گاڑی میں ایک خودکار رائفل موجود تھی۔ کرنل اس سے اپنا دفاع کرتا رہا تھا مگر حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کی فائرنگ سے وہ زخمی ہوا تھا اور اگر ہم وہاں نہ پہنچتے تو حملہ کرنے والے یقیناً اسے مار چکے ہوتے۔ وہ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس علاقے میں سب سے بڑا شہر ایبٹ آباد تھا اور وہاں کرنل کو طبی امداد مل سکتی تھی۔ میں نے نقشہ پھیلا کر دیکھا۔ ایبٹ آباد یہاں سے کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ لیکن اس موسم میں گاڑی ایک حد سے زیادہ رفتار پر نہیں چلائی جا سکتی تھی ورنہ اس کا بھی امکان تھا کہ سب ہی اسپتال پہنچ جاتے یا اسپتال پہنچنے کے قابل بھی نہ رہتے۔ مہرو ہر تھوڑی دیر بعد رفتار بڑھانے کو کہتی تھی اور وسیم ہر بار اسے بتاتا کہ اس سے زیادہ رفتار سے گاڑی نہیں چل سکتی ہے۔ ایک بار اس نے تنگ آ کر کہا۔ ''تم کیوں رو دھو رہی ہو ..... یہ تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''مگر میں کیا کروں، میں عورت ہوں اور یہ جیسا بھی ہے میرا شوہر ہے۔''

''فکر نہ کرو اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے مہرو کو تسلی دی۔ ''کرنل سخت جان فوجی رہا ہے اور گولیوں کا زخم اس کے لیے اجنبی نہیں ہے، کچھ عرصے پہلے اس کے شانے پر بھی گولی لگی تھی لیکن تم دیکھو اس کا زخم مندمل ہو چکا ہے۔''

میں نے پچھلی گاڑی والوں کو کہا تھا کہ وہ عقب کی طرف سے ہوشیار رہیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ فتح خان اس شکست کے باوجود پیچھا کر سکتا تھا۔ اس کے نزدیک آدمیوں کی اہمیت نہیں تھی اوراگر کوئی مر جاتا یا زخمی ہوتا تو وہ اس کی جگہ دوسرا لے آتا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے مفاد کی زیادہ اہمیت تھی۔ سب بارش میں بھیگ گئے تھے اس لیے گاڑیوں کے ہیٹر آن کر لیے گئے تھے۔ اس سے کچھ دیر میں کپڑے سوکھنے لگے ورنہ کم سے کم مجھے خاصی سردی لگ رہی تھی۔ میں نے ہلکی جیکٹ اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر ڈال دی تھی تاکہ اندر کی شرٹ ٹھیک سے خشک ہو جائے۔ گرمائش سے کرنل کو بھی فائدہ ہوا تھا اور اس کی سانس کی رفتار بہتر ہوئی تھی اور چہرے کی رنگت بحال ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے ایبٹ آباد قریب آ رہا تھا ہمارے ذہنوں میں دوسرے مسائل ابھر رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ پولیس کا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''اگر اسے چھوڑنے اسپتال تک گئے تو وہاں پولیس ہمیں نہیں چھوڑے گی۔''

''درست فرمایا آپ نے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟''

''اسے اس طرح اسپتال پہنچانا ہے کہ ہم سامنے نہ آئیں۔''

''میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''ہم شہر میں رضاکار ایمبولینس کے سینٹر پر کرنل کو چھوڑ دیں گے اور وہ خود اسے مناسب اسپتال تک پہنچا دیں گے۔''

''نہیں۔'' مہرو نے تڑپ کر کہا۔ ''تم اسے بے یار و مددگار چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔''

''یہ ہمارا رشتہ دار نہیں ہے۔'' وسیم نے بھنا کر جواب دیا۔ ''اگر تمہیں اتنا خیال آ رہا ہے تو تم اس کے ساتھ اتر جانا لیکن ہمارا اسپتال تک جانا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تم مجھے اس کے ساتھ اتار دینا۔'' وہ بولی۔ ''لیکن مجھے کچھ رقم چاہیے ہوگی میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔''

''ہم تمہیں رقم دے سکتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''لیکن میرا خیال ہے کرنل خالی جیب نہیں ہوگا تم دیکھو ذرا اسے۔''

مہرو نے اس کی تلاشی لی تو اس کے پرس میں اچھی خاصی رقم پائی گئی تھی۔ پانچ ہزار والے اور ہزار کے خاصے نوٹ تھے۔ پھر اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب سے پانچ ہزار والی دو عدد گڈیاں نکلی تھیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم بلاوجہ پریشان ہو رہی تھیں۔ تمہارا شوہر کروڑپتی ہے اور کبھی خالی جیب نہیں ہوتا۔ تمہیں معلوم ہے اس نے بھارتیوں سے میرا سودا بیس لاکھ ڈالرز میں کیا تھا۔ اس نے مجھے بھارتیوں کے حوالے کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی کیا تھا کہ میں بھارتیوں کی قید میں نہ رہوں۔''

''نہیں یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے، میں بھی کرنل کے لیے تم سے کوئی رعایت طلب نہیں کروں گی۔'' اس نے آنسو صاف کیے۔ ''ٹھیک ہے تم مجھے ایمبولینس سینٹر پر اتار دینا میں خود اسے کسی اسپتال لے جاؤں گی۔''

شہر شروع ہو گیا تھا اور موسم بھی اچھا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اب شام ہو رہی تھی اور تاریکی چھانے کو تھی لیکن بارش والا موسم نہیں تھا۔ تاریکی اچھی ثابت ہوئی تھی ورنہ آس پاس سے گزرنے والے کرنل کو دیکھ سکتے تھے۔ بالآخر ہم ایمبولینس سینٹر پہنچے اور وہاں مہرو خود اتر کر ایمبولینس کے لیے بات کرنے گئی تھی۔ اس نے پتا نہیں کیا داستان سنائی کہ اندر سے فوراً ہی دو عدد رضاکار آئے۔ انہوں نے ایک ایمبولینس سے اسٹریچر اتارا اور کرنل کو اس پر منتقل کرنے لگے۔ انہیں سنانے کے لیے مہرو نے ہم سے کہا۔ ''بھائیو... میں آپ لوگوں کی بہت شکر گزار ہوں جو آپ نے میرے زخمی شوہر کو یہاں تک پہنچایا۔''

''یہ تو ہمارا فرض تھا۔'' میں نے رسمی انداز میں کہا اور فوراً رخصت ہو گئے۔ جیسے بس اپنا فرض ہی پورا کر رہے تھے ہمارے جانے کے دوران ہی ایمبولینس حرکت میں آ گئی تھی کیونکہ کرنل کی حالت سچ مچ نازک تھی۔ مہرو اس کے ساتھ ہی ایمبولینس میں موجود تھی۔ انہیں خدا اور حالات کے حوالے کر کے ہم فوری ہی آگے بڑھ گئے تھے۔ شہر میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ عین ممکن تھا کرنل کی وجہ سے پولیس حرکت میں آ جاتی اور ہوٹلوں میں تلاش کرتی تو ہم بہ آسانی بازیافت ہو جاتے۔ ڈنر ہم نے شہر سے باہر ایک اچھے ریستوران میں کیا۔ مگر گاڑیاں اکیلے نہ چھوڑنے کے خیال سے اس میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم نے دو بار میں ڈنر مکمل کیا۔

رات نو بجے پنڈی کی طرف روانہ ہوئے تو تھکن سے سب کا برا حال تھا کیونکہ کل کا سارا دن بھی سفر میں گزرا تھا اور یہ دن بھی سفر میں گزر رہا تھا، رات میں سونے کا موقع بھی کم ملا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے مری والا راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ شارٹ بھی پڑتا اور مری ہائی وے سے ہم سیدھا عبداللہ کے نئے ٹھکانے پہنچ سکتے تھے۔ مگر مشکلیں ابھی تمام نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی ہم مری سے بھی دور تھے کہ ایک جگہ روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ بھی کوئی اچھا سیاحتی مقام تھا کیونکہ سڑک کے ساتھ کئی ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز دکھائی دے رہے تھے۔ دکانیں اور شاپنگ کے مراکز بھی تھے۔ یہاں سے دن میں خاصا ٹریفک گزرتا تھا لیکن اس وقت وہاں بہت گاڑیاں تھیں۔ جیسے ہی ہم ایک جگہ سے مڑے نیچے گاڑیاں رکی دکھائی دیں اور ان میں پولیس کی گاڑیاں بھی تھیں جن کے اوپر روشنیاں گھوم رہی تھیں۔ وسیم نے بے ساختہ گاڑی روک دی۔ ''پولیس.....''

''نہیں یار یہ کوئی اور چکر ہے۔'' میں نے غور کیا۔ ''گاڑیاں رکی ہوئی ہیں شاید آگے کچھ ہوا ہے۔''

''اس صورت میں آگے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وسیم نے کہا اور گاڑی کو ریورس میں لے جانے لگا۔ ایک مناسب جگہ اس نے گاڑی گھما کر اس کا رخ دوسری طرف کر دیا۔ دوسری گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ تھی۔ وسیم نے اس میں سے ایک آدمی کو طلب کیا۔ ''نیچے جا کر دیکھو کیا ہوا ہے، ٹریفک کیوں جام ہے؟''

''عام طور سے اس کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے اور وہ لینڈ سلائیڈنگ ہے۔'' میں نے کہا۔

''بعض اوقات کوئی بڑی گاڑی الٹ جاتی ہے اور اس سے بھی سڑک بند ہو جاتی ہے۔'' وسیم نے کہا۔ دس منٹ بعد وسیم کا آدمی واپس آ گیا اور اس نے میرے اندیشے کی تصدیق کر دی۔

''جناب یہاں لینڈ سلائیڈنگ ہو گئی ہے۔ ابھی ٹریکٹر بھی نہیں آئے ہیں جو سڑک صاف کریں وہاں موجود لوگوں کا کہنا ہے کہ صبح سے پہلے سڑک کلیئر نہیں ہوگی۔''

''لگتا ہے آج رات یہیں کہیں رکنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''واپس چلو.... اس سے پہلے دوسرے لوگ بھی آ جائیں اور ہوٹلوں میں جگہ بھی نہ رہے۔''

وسیم نے اتفاق کیا اور ہم واپس اسی راستے پر چل پڑے مگر مقصد واپسی نہیں تھا۔ اتنا طویل فاصلہ طے کر کے کسی دوسرے راستے سے پنڈی تک جانے میں ویسے ہی صبح ہو جاتی۔ اس لیے اب کسی جگہ رکنا مجبوری تھی۔ وسیم نے نظر آنے والے پہلے گیسٹ ہاؤس کے ساتھ سڑک پر گاڑی روک لی۔ وہ خود اتر کر اوپر گیا اور فوراً واپس آ گیا۔ ''یہاں تو لان تک بک ہو گئے ہیں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایسا لگ رہا ہے آگے بھی کچھ ایسا ہی ٹریفک جام ملے گا۔''

میرا یہ خدشہ بھی درست ثابت ہوا تھا۔ لینڈ سلائیڈنگ سرِ شام ہی ہو گئی تھی اور اس راستے سے گزر کر جانے والے اب اگلی صبح تک ٹھہرنے پر مجبور تھے اس لیے ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز جو اس سیزن میں ویسے ہی فل...

ہوتے ہیں اب ہاؤس فل ہو چکے تھے اور کہیں جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک کمرا ملا جس میں تین سے زیادہ افراد کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وسیم کے آدمیوں نے کہا کہ وہ رات گاڑیوں میں گزار لیں گے۔ ان میں سے کوئی ہمارے ساتھ رکنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ گاڑیوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ان میں اچھا خاصا اسلحہ تھا اور اسے ہوٹل میں بھی نہیں لا سکتے تھے۔ ہوٹل کسی قدر بلندی پر تھا اور جب ہم کمرے میں آئے تو خوش قسمتی سے یہاں میرے موبائل پر سگنل آ گئے تھے۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ میری آواز سن کر وہ خوش ہو گیا۔ ”شکر ہے آپ لوگوں کی آواز سنائی دی.... ہاں وہ آ گئے ہیں.... لیکن آپ کہاں ہیں؟“

”فی الحال راستے میں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے رات یہیں رکنے پر مجبور ہیں ممکن ہے صبح تک سڑک کلیئر ہو جائے تو ہم ڈیڑھ گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ باقی دو گاڑیاں اور بندے پہنچ گئے؟“

”جی وہ آ گئے ہیں۔ سب اوکے ہے۔“

آواز مشکل سے اور کٹ کر آ رہی تھی اس لیے زیادہ دیر بات نہیں ہو سکی تھی۔ وسیم گاڑی سے بریف کیس اور رقم والا سوٹ کیس لے آیا تھا۔ یہ ہمارے پاس ہی تھا۔ اس میں اب بھی ڈیڑھ کروڑ کے قریب رقم موجود تھی۔ مرشد کے دیے اس تحفے سے ہم نے اب تک بہت فائدے اٹھائے تھے۔ اس کے باوجود اس میں سے ایک چوتھائی سے زیادہ رقم خرچ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چینی بریف کیس کا معائنہ کیا۔ یہ وہی بریف کیس تھا اور کسی نے اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ یہ اب تک اپنے اندر موجود رازوں سمیت فنا ہو چکا ہوتا۔ پچھلے دنوں میں ایک امریکی چینل پر چین کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے بارے میں ایک رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ اس رپورٹ میں اگرچہ مبالغے کا عنصر موجود تھا۔ مگر اس میں اس حد تک حقیقت کا عنصر بھی شامل تھا کہ چین آنے والی دو دہائیوں میں نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت بلکہ سب سے بڑی فوجی قوت بھی بن جائے گا۔ اس وقت تک موجودہ سپر پاور ترقی معکوس کرتی ہوئی چین سے نیچے آ جائے گی اور یہ چیز بھی چین کو اوپر جانے میں مدد دے گی۔ مگر میرے خیال میں مغرب کو اصل خطرہ چین کی فوجی قوت سے نہیں ہے بلکہ اس کی ان معاشی بین الاقوامی پالیسیوں سے ہے۔ جن کی مدد سے چین نے دنیا کے بہت سارے ایسے ممالک کو اپنے حلیفوں میں شامل کر لیا ہے جو مغرب کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے اور چین اب ان کے معدنی اور زرعی وسائل سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے چین نے پہلے ان ملکوں کی مدد کی۔ وہاں ترقیاتی کام کرائے اور لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ وہ اس کا پھل کھا رہا تھا۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کام مغرب اپنی ہیبت ناک جنگی قوت سے نہیں کر سکا وہ چین نے اپنی مفاہمانہ نرم پالیسی سے ممکن کر لیا۔

اس بین الاقوامی سیاسی صورت حال میں اس بریف کیس کی حیثیت مسلّم تھی۔ قسمت نے اسے میرے ذمے ڈال دیا تھا جب ہیلی کاپٹر کریش ہونے کے بعد تمام چینی اہلکار اور افسران مارے گئے تھے اور صرف میں اور بیٹو بچے تھے۔ تب یہ بریف کیس ہماری ذمے داری بن گیا تھا اور اسے ساتھ لیے لیے ہم پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں یہ غائب ہوا اور اب دوبارہ ہمارے ہاتھ آ گیا تھا۔ اگر ہم اسے کسی اہل چینی سفارت کار تک پہنچا دیتے تو ہماری ذمے داری ختم ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ایک اہم مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ ہم شہر کے پاس آ چکے تھے لیکن لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے اس جگہ قید ہو کر رہ گئے تھے۔ وسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو سامنے آئے بغیر بریف کیس چینی سفارت خانے بھجوا دینا چاہیے۔“

”وجہ؟“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”وجہ سامنے ہے، آپ چینیوں کے نزدیک ویسے ہی مشکوک ہیں اور وہ آپ کی تصویر بھی پاکستانی حکام کو دے چکے ہیں اس صورت میں بعد میں کوئی خرابی سامنے آتی ہے تو چینی حکام آپ کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کا ان کے سامنے آنا کسی صورت مناسب نہیں ہے۔“

وسیم نے درست تجزیہ کیا تھا۔ اگرچہ ہم نے بریف کیس حاصل کر لیا تھا اور نیک نیتی سے اسے چین کو واپس بھی کرنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ بالکل سامنے تھا کہ اگر بعد میں کوئی مسئلہ ہوا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ وسیم سے گفتگو کے دوران اچانک مجھے میجر آدم کا خیال آیا۔ وہ فوج کی انٹیلی جنس میں تھا اور اس نے میرا فیور کیا تھا۔ اگر میں یہ بریف کیس میجر آدم کے حوالے کر دیتا اور وہ اسے فوج یا حکومت کے توسط سے چین کو واپس کرتا تو ہم اس سے

کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا سکتے تھے یا کم سے کم چین کو خوش کر سکتے تھے جو مغرب کے رویّے اور دھمکیوں کے خلاف ہمارا واحد قابلِ اعتماد دوست تھا۔ وہ ہر مشکل وقت میں ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا تھا اور مستقبل کی اس سپر پاور کا ہمارا دوست رہنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ میں نے وسیم سے اس بارے میں مشورہ کیا تو اس نے کہا۔

”آپ دیکھ لیں ویسے مجھے بھی یہ خیال اچھا لگا ہے لیکن آپ اس سے رابطہ کیسے کریں گے جب کہ آپ اس کا اصل نام بھی نہیں جانتے۔“

یہ درست تھا میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی مجھے اس سینٹر کے بارے میں علم تھا جہاں تفتیش کی غرض سے مجھے رکھا گیا تھا۔ میں کس طرح اس سے رابطہ کر سکتا تھا۔ پھر مجھے مری آرمی ریسٹ ہاؤس کا خیال آیا جہاں میں نے ایک رات گزاری تھی اور وہاں یقیناً میرے لیے کچھ نہ کچھ اندراج کیا گیا ہوگا کہ میں کس کے توسط سے وہاں رکا تھا اگر میں کوشش کرتا تو شاید وہاں سے مجھے میجر آدم کا کوئی رابطہ نمبر مل جاتا۔ مری ریسٹ ہاؤس یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن وہاں تک جانے کے لیے اسی سڑک سے گزرنا تھا اور جب تک یہ سڑک کھل نہیں جاتی ہم آگے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک ذرا سی لینڈ سلائیڈنگ نے کتنے معاملات الجھا دیے تھے۔ مجھے اصل خطرہ فتح خان سے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پیچھے ہوگا۔ وسیم نے چائے منگوائی تھی اور اب غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“

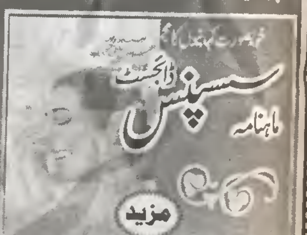
میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں کیونکہ واسطہ فتح خان سے ہے اور وہ نہایت شاطر آدمی ہے، ہمیشہ وہاں سے وار کرتا ہے جہاں سے آدمی نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔“

”آپ کا خیال ہے وہ ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں بھی آ سکتا ہے؟“

”بالکل کیونکہ یہ بریف کیس اس کے لیے نہایت اہم ہے اور وہ اس کی خاطر مجھے قتل کرنے تک کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا کہ وہ بریف کیس کے چکر میں ہے۔ اسے معلوم تھا میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اس لیے اس نے پہلے میرا پتّا صاف کرنے کا سوچا تھا۔ وہ تو کرنل نے عین موقع پر مداخلت کی۔“

وسیم مسکرایا۔ ”آپ کی کہانیاں بعض اوقات الف لیلہ کی طرح ناقابلِ یقین لگتی ہیں۔ اکثر قسمت آپ پر مہربان رہتی ہے۔“

اپریل 2013ء کی قوسِ قزح



مزید

کاشف زبیر، مریم کے خان،
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، ضیا تسنیم بلگرامی،
ڈاکٹر شیر شاہ سید اور محمد الیاس کی
دلچسپ کاوشیں آپ کی منتظر

شکستہ گڑیا

کون اپنا، پرایا ہے...... یہی وقت نے بتایا ہے۔ چاہتوں کے میزان پر پورا اترنے والے ایک سچے عاشق کی دلگداز روداد۔ آخری صفحات پر **ایچ اقبال** کا ایک حسین تحفہ

پسِ پردہ

تاریخ کے جھروکے سے چونکاتے واقعات پر مشتمل ایک عبرت اثر داستان۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کی عرق ریزی

مسافر

ناصر ملک کے قلم سے کہیں جذبات میں ہلچل مچاتی، کہیں لہو سے رنگین کرتی ایک سنگین داستان

اس کے علاوہ

حقیقت کا تعاقب...... **ملک صفدر حیات** کی تفتیش،
محفل شعر وسخن اور **آپ کے خط**۔

کشکول
انوار صدیقی
کا سنسنی خیز سلسلہ

”اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ مثبت انداز میں سوچتا ہوں۔ کبھی جان بوجھ کر کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں بلکہ بعض اوقات تو آپ ماتما بدھ بن جاتے ہیں اور آپ کی اہنسا کی پالیسی ہمیں تکلیف دیتی ہے لیکن اس پالیسی کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ آپ کے دشمن آپ کے لیے پریشانی کا باعث تو بنتے ہیں لیکن بالآخر وہ خود اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور آپ کو ان کے خون کا داغ اپنے دامن پر نہیں لینا پڑتا ہے۔“

”شاید تمہارا اشارہ شہلا کی طرف ہے۔“

”ہاں، میں اسے بار بار چھوٹ دینے کے خلاف تھا۔ میرے نزدیک وہ زہریلی ناگن تھی جس کا سر پہلی فرصت میں کچل دینا چاہیے تھا لیکن جب وہ اپنے انجام کو پہنچی تو اسے دیکھ کر مجھے بھی ترس آنے لگا تھا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”دیکھا جائے تو ایک ایک کر کے ہمارے سارے دشمن مکافاتِ عمل کا شکار ہو رہے ہیں۔ فاضلی زندگی و موت کی کشمکش میں ہے۔ نادر ناکارہ ہو گیا ہے اور اسی کی مدد سے مجھے مقدمات سے نجات ملے گی۔“

”آپ نے ندیم سے بات کی کہ مرشد کے وکیل نے اس سے رابطہ کیا ہے؟“

”نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے ندیم کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن اب سگنل نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے بیل بھی نہیں جا رہی تھی۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد میں نے موبائل رکھ دیا۔ چائے آگئی تھی۔ وسیم نے کپ تیار کر کے میری طرف بڑھایا۔ ”حویلی تو ہاتھ سے گئی اب کوئی نیا ٹھکانا دیکھنا پڑے گا۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہتر ہو گا اسی طرح شہر سے نزدیک لیکن غیر آباد علاقے میں کوئی جگہ دیکھو۔“

”ہاں پنڈی کے آس پاس کئی جگہیں ہیں جو شہر کے پاس بھی ہیں اور وہاں آبادی نہیں ہے۔ چک لالا کے پاس بھی ایسی جگہیں ہیں۔“

”نہیں وہ ہائی سیکورٹی کا علاقہ ہے میرا تو خیال ہے کہ تلہ گنگ یا خان پور کے آس پاس دیکھو۔“

کمرے میں ٹی وی تھا لیکن کیبل بند تھی اس لیے بیکار تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اکرم چشتی کے ساتھ کیا گزری اور کل کی ریڈ پر پولیس اور انتظامیہ کا کیا نقطہ نظر تھا۔ روم سروس کو کال کی۔ ”آج کا اخبار مل سکتا ہے بے شک استعمال شدہ ہو۔“

”میں کوشش کرتا ہوں سر۔“ کلرک نے جواب [illegible] لیکن اس نے کچھ دیر بعد آج کے کئی اخبارات کا ایک پلندہ بھیج دیا تھا۔ یہ یقیناً لاؤنج کے اخبارات تھے کیونکہ ان میں سے کئی صفحے غائب تھے بہر حال کام کی خبر مل گئی تھی۔ پولیس نے ڈی ایس پی اکرم چشتی کی تلاش میں ایک ویران حویلی پر چھاپا مارا جہاں دہشت گردوں نے ڈی ایس پی کو ایک اور شخص کے ساتھ یرغمال بنا رکھا تھا۔ پولیس مقابلے کے بعد دہشت گرد حویلی کو آگ لگا کر فرار ہو گئے اور پولیس نے دونوں مغویوں کو آزاد کرا لیا۔ لیکن دہشت گردوں نے ڈی ایس پی کی آنکھوں اور کانوں میں مہلک صنعتی سلوشن ڈال دیا تھا اور اسپتال میں ڈاکٹر اس کی بینائی اور سماعت بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے مغوی کو نامعلوم افراد راستے میں ایمبولینس روک کر اپنے ساتھ لے گئے جب اسے اسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔ رپورٹر نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ مغوی کے دوبارہ اغوا میں پولیس ملوث تھی اور وہ اصل میں معروف سیاسی اور مذہبی شخصیت مرشد علی کا بھائی نادر علی تھا۔ اس کے بعد بھی رپورٹ خاصی طویل تھی۔ اس میں رپورٹر نے حاشیہ آرائی کی تھی اور اپنے انداز سے وہ مرشد کا مخالف لگ رہا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ نادر کی پُراسرار گم شدگی میں مرشد کا ہاتھ تھا۔

”میرا خیال ہے اکرم چشتی تو گیا۔“ وسیم نے خوش ہو کر کہا۔ ”وہ سلوشن بہت خطرناک تھا۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے ممکن ہے ڈاکٹر کسی طریقے سے اس کی بینائی اور سماعت بچا لیں۔ اس صورت میں اس سے دوبارہ نمٹنا پڑے گا۔“

”کوئی بات نہیں ایک بار بچ گیا تو سلوشن دوبارہ بھی ڈال سکتے ہیں، سو روپے کی ٹیوب آتی ہے۔“ وسیم نے خوشدلی سے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ واپس آیا تو میں نے واش روم کا رخ کیا۔ پانی اچھا خاصا سرد تھا اور یہاں پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں واپس آیا تو سونے سے پہلے وسیم نے ایک چکر نیچے پارکنگ کا لگایا جہاں ہماری گاڑیاں تھیں۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ہوشیار رہیں اور سب سونے سے گریز کریں۔ وسیم آیا تو میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تھکن اور نیند کی کمی تھی اس لیے نیند آنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ جس وقت میں حکیم قادس کے زیرِ علاج تھا اور وہ مجھے مخصوص دوائیں استعمال کراتا تھا تو ان سے میری قوتِ ارادی بھی مضبوط ہو گئی تھی کہ میں

جب چاہتا اور جتنی دیر کے لیے چاہتا سو جاتا تھا اور پھر ٹھیک وقت پر خود بہ خود میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا دواؤں کا اثر ختم ہوتا گیا تو قوتِ ارادی بھی کمزور پڑ گئی اور اب مجھے نیند کے لیے ذرا انتظار کرنا پڑتا تھا اور سونے کے بعد میں اسی وقت اٹھتا تھا جب کوئی مجبوری ہوتی یا نیند پوری ہو جاتی تھی۔

وسیم مجھ سے پہلے اٹھ گیا تھا وہ تیار ہو کر باہر گیا تاکہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر آئے۔ وہ واپس آیا تو بوکھلایا ہوا تھا اور اس نے مجھے ہلا کر بیدار کیا۔ ”شہباز صاحب اٹھ جائیں.... مصیبت آگئی ہے۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب.... فتح خان۔“ اس نے ایک لفافہ پکڑا دیا اور خود کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ ”کوئی ہمارے کمرے کے نمبر سے نیچے کلرک کو دے گیا تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو ہمارے آدمی اور گاڑیاں غائب ہیں۔“

”میرے خدا....!“ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک رقعہ تھا۔ اس پر تحریر تھا۔

”شہباز خانا تمہارا آدمی میرے پاس ہے اور ابھی خیریت سے ہے اگر صبح دس بجے تک تم بریف کیس لے کر نہیں آیا تو ایک ایک کر کے سب کو ذبح کر دے گا۔ تم راضی ہے تو باہر ایک نیلا کرولا کھڑا ہے نمبر ایل اے بارہ سترہ ہے۔ اس میں آجاؤ تم کو مزید ہدایت مل جائے گا۔“

میں نے رقعہ پڑھ کر گہری سانس لی۔ ”میری چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ فتح خان اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس نے ہمارا سراغ لگا لیا۔“

”ابھی سات بجے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”راستے کا کیا ہوا؟“

”ایک گھنٹے میں کلیئر ہو جائے گا۔“

”تب تم کسی بھی طرح سے رقم والا سوٹ کیس لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“

”اور آپ؟“

”میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔“

”میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

”احمقانہ باتیں مت کرو تم کچھ نہیں کر سکتے اس لیے نکل جاؤ اور پیچھے رہ کر تم میری مدد کر سکو گے۔ دوسرے فتح خان مجھ سے رعایت کرتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے وہ میرے ساتھیوں سے بھی رعایت کرے، تم اس کے ہاتھ آئے تو میری ایک اور کمزوری اس کے پاس آجائے گی۔ ابھی ان چار آدمیوں پر تو میں رسک لے سکتا ہوں۔“

”اگر فتح خان اڑ گیا تو....؟“

”تب مجبوری ہو گی .... یہ بریف کیس بہر حال ہمارے ساتھیوں کی جان سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ لیکن ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور ہم سوچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ فتح خان نے نہ جانے کیسے ان چاروں کو قابو کر لیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ورنہ کوئی دیکھتا یا شور ہوتا تو اب تک سارے ہوٹل کو پتا چل چکا ہوتا۔ ہم تیار ہو کر نیچے آئے جہاں ناشتا لگنے لگا تھا۔ میں اور وسیم ناشتے کے ساتھ آنے والے مسائل پر بات کرنے لگے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میری واپسی کا کچھ پتا نہیں ہے.... میرا مطلب ہے دیر سویر بھی ہو سکتی ہے اس لیے تم لوگ نادر کا معاملہ ہینڈل کرنا.... مرشد سے مذاکرات کرتے رہنا.... دوسرے اکرم چشتی اور فاضلی پر نظر رکھنا ان دونوں میں سے کوئی دوبارہ ایکٹو ہونے لگے تو اسے واپس بسترِ علالت یا قبر میں پہنچانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن آپ اس طرح بے دریغ فتح خان کے بچھائے دام میں جا رہے ہیں۔“

”نہیں میں کوشش کروں گا کہ براہِ راست سامنے نہ آؤں اور کوئی متبادل طریقہ اختیار کروں۔ بہر حال ابھی تو ہمیں فتح خان کی ہدایت پر عمل کرنا ہے ورنہ وہ سچ مچ ان چاروں کو ذبح کر دے گا۔“

”اب مجھے مہر و اور کرنل کی فکر بھی لاحق ہو گئی ہے۔“ وسیم بولا۔

”میرا خیال ہے وہ محفوظ ہوں گے، فتح خان ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا اور بدقسمتی سے لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے اسے موقع مل گیا ورنہ اب تک ہم پنڈی پہنچ چکے ہوتے اور اس کی دسترس سے نکل جاتے۔“

”بس چند گھنٹے کی تاخیر نے ہمیں پھنسا دیا۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”ورنہ ہم اب تک نکل چکے ہوتے۔“

”یعنی اس نے خوش قسمتی سے ہمیں پا لیا۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”لگتا ہے اب اس کا وقت آگیا ورنہ کرنل جیسا آدمی اس کے سامنے یوں بے بس نہ ہو جاتا۔“

ناشتے کے دوران ہی وسیم نے ایک گاڑی والے سے بات کر لی تھی وہ وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس کار تھی اور اس نے پنڈی تک پہنچانے کے پندرہ سو روپے طلب کیے۔ وہ

اصل میں پنڈی سے ہی آیا تھا اور اب اسے واپس جانا تھا۔ وسیم نے بھاؤ تاؤ کیا اور نو سو میں سودا ہو گیا۔ وسیم رکنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے فوری جانے پر مجبور کر دیا۔ ''تم آدمی لے کر واپس آؤ گے اور یہاں کسی ایسی جگہ رکنا جہاں موبائل سگنل ہوں' ممکن ہے میں ایک دو دن میں کسی وقت رابطہ کروں دو دن سے زیادہ مت رکنا۔''

میرے پاس پندرہ ہزار کے قریب رقم تھی اس لیے میں نے مزید رقم کی پیشکش مسترد کر دی۔ اسلحے میں میرے پاس ایک پستول اور اس کے دو فاضل میگزین تھے۔ وسیم نے اپنا پستول اور ایمونیشن بھی میرے حوالے کر دیا۔ وہ باہر گیا اور کچھ دیر بعد دوبارہ آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا وہ اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''ایک شخص جیکٹ اور گرم ٹراؤزر بیچ رہا تھا میں نے آپ کے لیے لیے ہیں' میرا خیال ہے فٹ ہوں گے۔''

ہمارے پاس ہلکے کپڑے تھے اور اس دوران میں ہم زیادہ تر ٹھٹھرتے ہی رہے تھے۔ وسیم نے یہ اچھا کام کیا تھا وہ چلا گیا۔ میں نے ناشتے کا بل ادا کیا' کمرے کا کرایہ ہم پہلے ہی ادا کر چکے تھے اس لیے یہاں سے روانگی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں باہر آیا ہوٹل کے ساتھ سڑک کے کنارے ایک مقامی لڑکا چھتریاں اور مختلف سائز کے بیگز بیچ رہا تھا' مجھے خیال آیا اور میں نے ایک پشت پر باندھنے والا بیگ لے کر بریف کیس اور کپڑوں کا شاپر اس میں ڈال لیا۔ مجھے نیلی کرولا کی تلاش تھی۔ وہ ہوٹل کی پارکنگ میں نہیں تھی۔ وہ ہوٹل سے کچھ دور سڑک کے ساتھ کھڑی ملی۔ میں نے اندر جھانکا چابیاں اگنیشن میں نہیں تھیں۔ کار کے دروازے بھی لاک تھے میں نے اگلے اور پچھلے حصے میں... مڈگارڈ کے اندر ہاتھ پھیرا۔ چابیاں پچھلے مڈگارڈ سے چپکی مل گئیں۔ ان میں طاقت ور مقناطیسی ڈسک تھی۔

انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے احتیاطاً بونٹ کھول کر انجن چیک کیا۔ ممکن ہے بیٹری کے ساتھ کوئی بم منسلک ہوتا اور چابی گھماتے ہی فرشتۂ اجل سے ملاقات ہو جاتی۔ مگر انجن اور بیٹری کے تاروں کے ساتھ ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پوری گاڑی چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اندر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ڈیش بورڈ چیک کیا۔ حسبِ توقع وہاں بھی ایک رقعہ ملا۔ فتح خان نے حکم دیا تھا۔ ''ایبٹ آباد والے راستے پر آؤ میرے آدمی تمہیں کہیں بھی روک لیں گے۔ بریف کیس ان کے حوالے کر دینا میں تمہارے آدمیوں کو چھوڑ دوں گا۔''

اس بار فتح خان چالاکی سے کام لے رہا تھا وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا کہ میں اس سے بات کر سکوں یا اپنی بات منوا سکوں۔ وہ رقعوں سے کام چلا رہا تھا اور وہ جانتا تھا میں اس کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ میں نے کلمۂ شہادت پڑھ کر کار اسٹارٹ کی۔ جب واسطہ فتح خان جیسے آدمی سے ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے خبردار کیا تھا کہ اب وہ میرے راستے میں آیا یا میرے کسی کام میں ٹانگ اڑائی تو یہ کھلی دشمنی ہو گی اور پھر میں اسے کوئی رعایت نہیں دے سکوں گا۔ مگر فتح خان نہایت ڈھیٹ آدمی تھا اس نے میری وارننگ کا کوئی اثر نہیں لیا اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ پھر سامنے آ گیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ ڈرائیو کے دوران میں عقب میں دیکھ رہا تھا لیکن دس منٹ تک جب کوئی گاڑی تعاقب میں نظر نہیں آئی تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے راستے میں آنے والے پہلے ہوٹل کے سامنے کار روکی اور اتر کر اندر آیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں فون ہے۔ میں نے استقبالیہ پر موجود آدمی سے مخصوص انداز میں کہا۔

''میجر شہباز ملک..... مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔''

حسبِ توقع میجر کا سنتے ہی کلرک کا دل پسیج گیا تھا اور اس نے ادب اور مستعدی کے ساتھ فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پہلے انفارمیشن کا نمبر ملایا اور مری آرمی ریسٹ ہاؤس کے نمبر مانگے۔ نمبرز میں نے ایک پیڈ پر نوٹ کر لیے۔ پھر باری باری ان نمبروں کو ملانا شروع کیا۔ تیسرے نمبر پر کال ریسیو ہو گئی۔ ''میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کن انکھیوں سے کلرک کی طرف دیکھا اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں نے میجر کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔

''جی سر میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔'' دوسری طرف سے مہذب لہجے میں کہا گیا۔ میں نے تاریخ اور کمرا نمبر کا حوالہ دیا۔

''اس رات کو میں اس کمرے میں ٹھہرا تھا۔ میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں کن صاحب نے مجھے ٹھہرایا تھا۔''

''یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔''

''میں انہیں میجر آدم کے نام سے جانتا ہوں لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ ان کا اصل نام نہیں ہے۔ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے یوں سمجھ لیں کہ میرے پاس ان کے لیے ایک امانت موجود ہے اور اس کا تعلق قومی سلامتی سے ہے۔''

آپریٹر ہوشیار آدمی تھا۔ ''ایک منٹ سر! میں آپ کی بات ریسٹ ہاؤس کے منتظم کرنل خواجہ سے کراتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور کلرک کی طرف دیکھا تو وہ اشارہ سمجھ کر کاؤنٹر کے آخری سرے کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی مخالف سمت میں ہو گیا تھا۔ چند لمحے بعد کرنل خواجہ لائن پر تھا اس نے میری بات سنی اور پوچھا۔

''آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟''

''میں اس وقت مری سے کچھ دور ایک ہوٹل سے بات کر رہا ہوں اور میرے پاس وقت کم ہے' پلیز اگر آپ میجر آدم کا کوئی کونٹیکٹ نمبر دے سکتے ہیں تو.....''

''نمبر نہیں دے سکتا آپ آدھے گھنٹے اسی جگہ انتظار کریں میں رِنگ بیک کراتا ہوں۔'' کرنل نے کہا اور لائن کٹ گئی۔ میرے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں سوا آٹھ بجے ہوٹل سے نکل آیا تھا اور اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ فتح خان نے مجھے دس بجے تک کا وقت دیا تھا اس کا مطلب تھا اس کے آدمی کسی ایسی جگہ میرے منتظر تھے جہاں میں دس بجے تک پہنچ سکتا تھا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں آدھا گھنٹا یہاں رکتا مگر اب مجبوری تھی۔ ممکن ہے کرنل خواجہ جلد میجر آدم کو تلاش کر لے اور اس سے میرا رابطہ کرا دے۔ میں کلرک کو کال کے بارے میں بتا کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ یہ ہوٹل بھی اعلیٰ درجے کا تھا اس لیے میں نے کافی منگوانے میں حرج نہیں سمجھا۔ ابھی میں کافی پی رہا تھا کہ فون کی بیل بجی اور کلرک نے میری طرف دیکھا میں پیالی سمیت کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف میجر آدم تھا۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''شہباز ملک.....''

''ہاں' میں بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کلرک کو اشارہ کیا جو انجان بن کر میری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا وہ بادلِ ناخواستہ دور چلا گیا۔ ''میجر تم نے دورانِ تفتیش ایک چینی معاملے کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں۔''

''مجھے اس بریف کیس کا کچھ کلیو ملا ہے۔'' میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

''ایک منٹ کیا یہ لائن محفوظ ہے؟''

''میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہ ایک ہوٹل کی لائن ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''میرے پاس وقت بھی نہیں ہے میرے کچھ ساتھی ان لوگوں کی قید میں ہیں جن کے پاس وہ چیز ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں اپنے

مایوس لاعلاج اور خوف زدہ حضرات کیلئے عظیم سرمایہ طاقت
نسخہ سپر پاور ہیرے والا
جسمانی اعصابی اور خاص کمزوری شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان
مریض زندگی میں ایک بار اسے ضرور استعمال کریں اور تمام عمر فٹ رہیں
ایسی خواتین کیلئے بھی مفید ہے، جو شوگر کی وجہ سے
دماغی جسمانی اور اعصابی
کمزوری محسوس کرتی ہیں۔
پنڈلیوں جوڑوں اور پٹھوں کے درد سے مکمل نجات دلاتا ہے
کورس 15 دن صرف 2500 روپے
نوٹ نسخہ سپر پاور ہیرے والا سونے، چاندی یاقوت، زمرد، عقیق
مرجان اور ہیرے جواہرات کا مرکب ہے جو کہ بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے لہٰذا یہ بازار سے نہیں ملتا
صرف ہمارے ہاں ہی دستیاب ہے۔ آپ خود ملیں یا گھر بیٹھے فون کر کے وی پی پارسل منگوالیں
No Side Effect
پتھری گردہ مثانہ یا پتہ میں ہو انشاء اللہ ریت بن کر نکل جائے گی۔
کورس 20 دن صرف 1500 روپے
موٹاپا بڑھا ہوا پیٹ ڈھلکا ہوا پیٹ قد سے زائد وزن جسم کی فالتو چربی پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی
کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے
گیس ٹربل سینے کی جلن تیزابیت، دائمی قبض، پیٹ سخت ہونا معدے کے زخم اور انتڑیوں کے زخم کا کامیاب علاج
کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے
طب یونانی کے مایہ ناز حکیم عالم شیر کھرل
بلھے شاہ روڈ نزد اڈا اللیانی قصور شہر
0345-6397367,0300-4280816

ساتھی بھی چھڑا سکتا ہوں اور ظاہر ہے تمہاری مدد بھی ہو جائے گی۔''

''تم اسی جگہ رکو۔''

''نہیں میں یہاں سے نکل رہا ہوں مجھے اپنا کوئی نمبر دو میں آگے کہیں تم سے رابطہ کروں گا۔مجھے دھمکی ملی ہے کہ میں دس بجے تک ان تک نہیں پہنچا تو وہ میرے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے ماردیں گے۔''

''تب میں تمہیں کیسے تلاش کروں گا یا تمہاری مدد کروں گا۔'' اس نے کہا اور مجھے ایک نمبر لکھوایا۔''تم اس پر کسی وقت بھی مجھ سے بات کر سکتے ہو۔''

''میں تم سے کسی وقت بھی کونٹیکٹ کردں گا۔'' میں نے کہا اور پیالی اور کافی کی قیمت کاؤنٹر پر رکھ کر باہر کا رخ کیا۔اب میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔اس کا بھی امکان تھا کہ میجر آدم کے آدمی یہاں کے لیے روانہ ہو چکے ہوں۔میں بریف کیس فتح خان کے قبضے میں جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اگر معاملہ میرے چار ساتھیوں کی جان پر آجاتا تو میری ترجیح یقیناً وہی ہوتے۔مگر میجر کی ترجیح یقیناً پہلے ملک کا مفاد ہوتا۔ہماری ترجیحات میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا لیکن یہ معمولی فرق بھی چار آدمیوں کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔میں نے رفتار معمول سے تیز رکھی تھی۔جو وقت ضائع ہوا تھا میں اس کی تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔فتح خان نہایت سفاک آدمی تھا اگر اس نے دھمکی دی تھی تو وہ اس پر عمل بھی کر سکتا تھا۔ساڑھے نو بجے میں ایبٹ آباد والی روڈ پر تھا۔یہاں میں نے میجر آدم کو کال کر کے دوبارہ اپنی لوکیشن بتائی۔اس نے کہا۔

''اگر تم مجھے اپنی گاڑی کے بارے میں بتا دو تو میں اس کی فضائی نگرانی کروا سکتا ہوں۔''

میں نے سوچا اور میجر آدم کو اپنی گاڑی کے بارے میں بتا دیا۔''لیکن ابھی تک ان مجرموں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔''

''تم فکر مت کرو ایک بار وہ ہمارے سامنے آگئے تو بچ کر نہیں جا سکیں گے۔'' میجر آدم نے کہا۔میں نے کال منقطع کر دی اور یہاں سے بھی آگے روانہ ہو گیا۔دس بجے میں ایک سنسان علاقے سے گزر رہا تھا یہاں پہاڑوں پر جنگل تھے اور ان میں کہیں کہیں چھوٹی بستیاں نظر آ رہی تھیں۔کناروں پر بستیاں اور دکانیں نہیں تھیں۔ابھی تک مجھے کسی نے نہیں روکا تھا۔میں نے ایک جگہ گاڑی روکی اور بریف کیس لے کر نیچے آیا۔ذرا اوپر آنے پر مجھے مطلوبہ جگہ مل گئی۔یہاں دو درختوں کے درمیان ایک چٹان آگئی تھی اور ایک درخت کا تنا چٹان سے یوں مل رہا تھا کہ اس کے درمیان میں خلا سے بن گیا تھا۔میں نے ایک شاخ کی مدد سے اس نظر نہ آنے والے خلا کی گہرائی ناپی اور اسے مناسب پا کر بریف کیس اس میں رکھ دیا۔اب میں اسے ہاتھ بڑھا کر اٹھا سکتا تھا لیکن یہ باہر سے کسی کو نظر نہ آتا۔آس پاس کوئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ اس جگہ کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔یہ ضروری تھا ورنہ یہاں تمام جگہیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔

میں آگے روانہ ہوا تھا اور تقریباً ایک میل دور گیا ہوں گا کہ اچانک کچھ آگے دو افراد پہاڑ سے اتر کر سڑک پر آگئے۔وہ مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔انہوں نے کلاشنکوف رائفلیں اٹھا بلکہ گاڑی کی طرف تان رکھی تھیں۔میں نے ان کے پاس پہنچ کر گاڑی روک دی۔وہ دائیں بائیں سے آئے اور ایک نے مجھے حکم دیا۔''نیچے اتر آؤ۔''

میں نیچے اتر آیا۔''میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے ہاں کچھ رقم ہے وہ چاہیے تو لے لو۔''

''بکواس بند کرو۔'' میری طرف والے نے غرا کر کہا۔وہ پوری طرح چوکس تھا۔اگر وہ فتح خان کے آدمی تھے اس نے انہیں پوری طرح بریف کر دیا تھا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔دوسرا گاڑی کا معائنہ کر رہا تھا اس نے پہلے والے سے کہا۔''یہاں کوئی بریف کیس نہیں ہے۔''

''بریف کیس کہاں ہے؟'' پہلے والا اس بار زیادہ غرایا۔

''کون سا بریف کیس؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔''میں بریف کیس ساتھ نہیں رکھتا۔''

''میں اس بریف کیس کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے پاس ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔''جسے دینے کے لیے تم یہاں آئے ہو تا کہ تمہارے چار ساتھیوں کی جان بچ سکے۔''

''اوہ اچھا تم فتح خان کے آدمی ہو۔''

''تم ٹھیک سمجھے وہ بریف کیس اب ہمارے حوالے کر دو۔''

''بریف کیس تو میرے پاس نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے۔'' وہ چوکنا ہو گیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر رائفل مجھ پر تان لی۔''جلدی بتاؤ ورنہ میں گولی ماردوں گا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو کیا فتح خان نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا ہے۔بریف کیس میں ایک جگہ رکھ کر آیا ہوں۔پہلے تم میرے ساتھی دکھاؤ اگر میں مطمئن ہوا تو بریف کیس تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' وہ بولا اور اس نے میرے نزدیک آنے کی کوشش کی۔شاید وہ رائفل کی نال میرے سر پر مارنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے رائفل بلند کر لی تھی اور یہ اس کی غلطی تھی میں نے آگے ہو کر اس کا رائفل والا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور رائفل چھینتے ہوئے اسے اٹھا کر گاڑی کے دوسری طرف پھینک دیا۔وہ چھت سے پھسلتا ہوا اپنے ساتھی پر جا گرا اور اس سے پہلے وہ اٹھتے میں ان پر رائفل تان چکا تھا۔

''بس اب حرکت مت کرنا...میرے ساتھی کہاں ہیں؟''

''تمہارے ساتھی یہاں ہیں۔'' عقب سے فتح خان کی آواز آئی۔''شہباز خانا رائفل پھینک دو۔یہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔''

میں نے رائفل پھینک دی اور گھوم کر دیکھا۔فتح خان ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔میں نے افسوس سے سر ہلایا۔''اس بار تمہارے ساتھی اناڑی ہیں۔''

''اناڑی تو نہیں ہے۔'' فتح خان مکارانہ انداز میں بولا۔''دیکھا نہیں تمہارے چار ساتھی کو کیسے اٹھایا خود ان کو بھی پتا نہیں چلا....پر تمہارے مقابلے میں اناڑی ہے۔''

فتح خان کے دونوں ساتھی کھڑے ہو گئے تھے اور اب شرمندہ نظر آ رہے تھے۔میں نے کہا۔''فتح خان وہ چاروں کہاں ہیں؟''

''پہلے تم بریف کیس دو گے تب ان چاروں کو دیکھ سکو گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''تم نے مجھے کچھ زیادہ ہی سادہ لوح سمجھ لیا ہے جو تمہاری باتوں میں آتا رہے گا اور تمہیں چھوٹ دیتا رہے گا لیکن میں بتا دوں اب حد آگئی ہے۔بہر حال ابھی میں ان چاروں کو لینے آیا ہوں' ان کو دیکھے بغیر بریف کیس تمہارے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

فتح خان نیچے آگیا۔اس کے آدمی نے اپنی کلاشنکوف واپس اٹھا لی تھی۔فتح خان نے جیب سے ایک سیٹی نکالی اور منہ سے لگا کر بجائی۔یہ خاصی سمع خراش آواز والی سیٹی تھی اور جب فتح خان نے سیٹی بجانا بند کی تو بھی اس کی آواز پہاڑوں میں گونجتی رہی۔فتح خان بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا اور اس کے پاؤں میں جو گولی لگی تھی اس کا زخم یقیناً بھر گیا تھا ورنہ وہ پہاڑوں میں اتنے آرام سے نہ گھوم رہا ہوتا۔گونج

سرگزشت کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص شمارہ

بینا نابینا نمبر

بے بصارتی کے اندھیرے میں روشن ستارہ بن کر چمکنے والوں کی داستانیں۔وہ نابینا تھا لیکن مظاہر فطرت کی تصاویر ایسے بناتا ہے کہ دیکھنے والے ادنگ رہ جاتے ہیں۔وہ اندھا ضرور تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہندو پاک میں مقبولیت پاتیں۔وہ پیدائشی نابینا ہیں لیکن ان سے امریکا بھی ڈرتا ہے۔ایسے بہت سارے دل کو دکھا دینے والے قصے' سچ بیتیاں' حقیقی واقعات

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر رکھیں گے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ بک کرائیں

بھی ختم ہوگئی تو فتح خان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "کچھ دیر میں تمہارا ساتھی تمہارے سامنے ہوگا۔"

"فتح خان ..... تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ کرنل بریف کیس لینے کے لیے اس طرف آیا ہے۔"

"میں بے وقوف نہیں ہے۔" فتح خان نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں جانتا تھا وہ حرامی کس چکر میں ہے۔"

"اس چکر میں تو تم بھی ہو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "تم بریف کیس کسی کارِ خیر کے لیے حاصل نہیں کرنا چاہتے ہو۔"

"ہاں میں اسے بیچے گا اور بہت بڑی قیمت پر بیچے گا۔"

"کیسے! اب کرنل تو درمیان میں ہے نہیں جو سودا کرائے گا۔"

"کرنل جائے جہنم میں..... میں خود اس کا سودا کرسکتا ہے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بین الاقوامی سیاست ہے اور بہت خطرناک سیاست ہے تمہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں... اس طرح میں اس کا تجربہ بھی حاصل کر لے گا۔" فتح خان نے اطمینان سے کہا۔ "شہباز خانا تم بیکار میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ میں سمجھنے والا ہوتا تو میرا باپ کا جوتا کافی تھا۔"

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ تمہیں بریف کیس کے بدلے اذیت ناک موت ملے۔"

"پر اس کا امکان بھی تو ہے کہ مجھے بہت سارا دولت مل جائے۔"

"ہاں یوں سمجھ لو دس فیصد امکان ہے۔"

"دس فیصد بہت ہے، میں اس سے بھی کم امکان پر کام کرتا رہا ہے۔" اس نے جواب دیا اور اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ کدھر رہ گیا ہے؟"

سیٹی بجا کر اس نے یقیناً اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا تھا کہ وہ میرے چاروں ساتھیوں کو لے آئیں۔ دس منٹ گزر گئے تھے اگر وہ ایک میل کے فاصلے پر تھے تو انہیں اب تک آجانا چاہیے۔ فتح خان نے دوبارہ سیٹی منہ سے لگائی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ سیٹی بجاتا مخالف سمت سے ایک ڈیزل پک اپ نمودار ہوئی۔ فتح خان سیٹی نکالتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا اور جیسے ہی پک اپ پاس رکی وہ پشتو میں ان پر برس پڑا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے گالیوں کا دریا بہا دیا تھا مگر اس کے ساتھی بے مزہ نہیں ہوئے تھے ایک نے دانت نکال کر کہا۔ "خان جب تم نے سیٹی بجائی تو ہم پک اپ کا پہیہ بدل رہے تھے۔"

"اسے کیا ہوا؟"

"پتا نہیں اچانک پھس ہوگیا۔" آدمی نے سادگی سے کہا۔ اس پر فتح خان نے مزید کچھ سنائیں اور چاروں کے بارے میں پوچھا۔

"وہ پیچھے ہیں۔"

فتح خان نے عقب میں دیکھا اور اشارے سے مجھے بلایا۔ اس کے گرگے اب میرے دائیں بائیں تھے۔ کسی نے میری تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ فتح خان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں مسلح ہوں گا۔ مگر اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے اسلحے کے استعمال سے باز رکھ سکتا ہے۔ میں نے پک اپ کے پچھلے حصے میں دیکھا جہاں وسیم کے چاروں آدمی بے بسی سے بندھے پڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا شرمندگی سے برا حال ہوگیا۔ ان میں سے ایک بولا۔ "شہباز صاحب میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، مجھے بالکل نہیں پتا چلا کہ میں کس طرح سو گیا۔"

فتح خان ہنسا۔ "تم سویا نہیں تھا بلکہ میرا ایک آدمی تم لوگوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ایسی گیس چھوڑ گیا تھا جس کا بو نہیں ہوتا اور تم سب سو گیا۔"

"فکر مت کرو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی اور فتح خان کی طرف دیکھا۔ "انہیں میرے حوالے کردو میں تمہیں بریف کیس کا پتا بتا دیتا ہوں۔"

وہ ہنسا۔ "ابھی تم کہہ رہا تھا کہ تم اتنا سادہ لوح نہیں ہے پر لگتا ہے تم نے مجھے سادہ لوح سمجھا ہے۔ شہباز خانا اس ہاتھ بریف کیس دو اور اس ہاتھ اپنے آدمی لے جاؤ۔"

اب تک میں پُرامید تھا کہ میجر آدم کے آدمی فضا سے یا کسی اور طریقے سے ہماری نگرانی کر رہے ہوں گے یا کم سے کم آس پاس ہوں گے مگر آسمان بالکل صاف تھا اور نہ ہی مجھے زمین پر کوئی ایسے آثار نظر آئے تھے کہ میجر کے آدمی آس پاس ہیں۔ شاید وہ اب تک نہیں پہنچ سکے تھے اور اب وقت نہیں تھا۔ اگر انہوں نے میری کار تلاش کرلی ہوتی تو یہ سب سے مناسب موقع تھا فتح خان کو اس کے آدمیوں سمیت ہینڈز اپ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور گہری سانس لی "ٹھیک ہے میں تمہیں اس جگہ لے جاؤں گا جہاں میں نے بریف کیس چھپایا ہے۔ اس کے بعد تم مجھے میرے ساتھیوں

سمیت جانے دو گے؟"

"بالکل..." فتح خان نے عقب سے کہا اور اچانک میرے سر سے کسی ہتھیار کی نال لگا دی۔ "میں تم کو بالکل جانے کی اجازت دے گا لیکن ابھی اپنا تمام ہتھیار میرے حوالے کردو۔"

اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور اس کے ایک آدمی نے تلاشی لے کر میرے دونوں پستول اور فاضل میگزین نکال لیے تھے۔ میں نے سکون سے پوچھا۔ "تم نے پہلے تلاشی کیوں نہیں لی؟"

"شہباز خانا جتنا میں تم کو جانتا ہے اتنا کوئی نہیں جانتا ہے۔ مجھے معلوم تھا تم اس وقت تک کوئی حرکت نہیں کرے گا جب تک اپنے آدمیوں کو نہ دیکھ لے گا۔ اب تم نے دیکھ لیا ہے اور تم کو بریف کیس دینا ہے اس لیے اب تم حرکت کرسکتا ہے۔"

"تم جانتے ہو حرکت کرنے کے لیے مجھے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں ہے، میں اس کے بغیر بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہا ہے پر تم ہتھیار کے ساتھ اس سے زیادہ کرسکتا ہے جتنا ہتھیار کے بغیر کرسکتا ہے۔" فتح خان نے عیاری سے کہا۔ "پر ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے کچھ کیا تو میرا ایک آدمی بغیر حکم کے تمہارے چاروں آدمیوں کو چھلنی کر دے گا۔" اس نے پک اپ میں بیٹھے مشین گن بردار کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کو بتا دیا ہے۔"

فتح خان نے نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے ہر طرح سے جکڑ لیا تھا۔ اب بریف کیس اس کے حوالے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں گاڑی میں پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اور میرے دائیں بائیں فتح خان کے آدمی تھے۔ اس کے ساتھ مسلح افراد کی تعداد پانچ تھی اور یہ سب خطرناک اسلحے سے لیس تھے۔ وہ خود آگے ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا اور اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ میں نے کہا۔ "میں اور میرے ساتھی واپس کیسے جائیں گے؟"

"پیدل۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ویسے یہ گاڑی بھی ہے پر یہ چوری کا ہے اگر تم تھانے جانا چاہتا ہے تو اسے لے جانا۔"

میں دنگ رہ گیا۔ "تم نے میرے لیے گاڑی چرائی۔"

"ہاں یہاں کہاں سے گاڑی لاتا۔ پر فکر مت کرو کام کر کے گاڑی اسی جگہ چھوڑ دے گا جہاں سے لی تھی۔"

مجھے گاڑی کی نہیں بلکہ بریف کیس اور اس حوالے سے میجر آدم کے آدمیوں کی فکر تھی، اگر وہ نہ آتے تو مجھے بریف کیس فتح خان کے حوالے کرنا ہی پڑتا۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ "تم نے بریف کیس کہاں چھپایا ہے؟"

"تم چلتے رہو جب وہ جگہ آئے گی تو میں بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے پر شہباز خانا یاد رکھنا کہ غلط بولا تو تمہارے ساتھ چار بندوں کا لاش جائے گا۔"

"دھمکیاں مت دو اگر ایسا ہوتا تو میں سرے سے یہاں آتا ہی نہیں اور تم ان لوگوں کے ساتھ جو چاہے کرتے۔"

"میں جانتا ہے، تم اپنے آدمیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔" فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اس کے برعکس تم انہیں کُتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو اس لیے کہ ایک مر جائے تو اس کی جگہ دوسرا آجاتا ہے۔" میں نے دائیں بائیں بیٹھے گرگوں کی طرف دیکھا تو ان کے تیور بگڑ گئے تھے۔

"تم ٹھیک بولا.... فتح خان روگ پالنے والا آدمی نہیں ہے ادھر آدمیوں کی منڈی میں بہت مال ہے، پیسا پھینکو اور اپنی پسند کا آدمی اٹھالو۔"

"ہاں تمہیں بیچنے اور خریدنے کا بہت تجربہ ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "دو دن پہلے تمہارے آقا سے بات ہوئی تھی۔"

"تم ڈیوڈ شا کا بات کر رہا ہے، وہ میرا آقا تھا اب نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے، اگر وہ آج بھی تمہیں بلائے تو تمہیں انہی لوگوں کی طرح دم ہلاتے ہوئے جانا پڑے گا۔ تم ایک بار بک چکے ہو اس لیے انکار نہیں کرسکتے۔"

فتح خان کا موڈ خراب ہوگیا۔ "تم بہت بڑھ بڑھ کر بولنے لگا ہے۔"

"ہاں مجھے یہ جرأت میری آزادی نے دی ہے، میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔"

"راجا عمر دراز کا بھی نہیں۔" فتح خان نے طنز کیا۔

"نہیں.... تم اسے زیادہ سے زیادہ میرا ہمدرد کہہ سکتے ہو، خود سے کہہ کر میں نے اس کا بھی احسان نہیں لیا اگرچہ اس نے میرے لیے جو کیا ہے اسے میں احسان ہی سمجھتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم اس تعلق کا موازنہ اپنے اور ڈیوڈ شا کے تعلق سے مت کرو جس کی نوعیت تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم عام لوگوں کو کُتا کہہ رہے ہو کیونکہ وہ بک رہے ہیں تو اس لحاظ سے تم میں اور ان میں بس نسل کا...."

"تم نے بہت بک بک کر لیا۔" فتح خان کا صبر جواب

دے گیا اس نے گاڑی روک لی تھی۔ ”بریف کیس کدھر ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک جگہ گاڑی روکی ہے، اب مجھے اترنے کی اجازت دو تاکہ میں تمہیں بتا سکوں کہ بریف کیس کہاں ہے۔“

”اسے ہوشیاری سے لاؤ۔“ فتح خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اگر یہ کوئی گڑبڑ کرے تو اس کا پیر میں گولی مارنا۔“

پہلے ایک اترا اور اس نے مجھے نشانے پر لے کر نیچے اترنے کا حکم دیا۔ میں شرافت سے نیچے اتر آیا۔ فی الحال شرافت کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ فتح خان کے یہ دونوں آدمی اب بہت زیادہ مستعد تھے اور ان کی انگلیاں رائفلوں کی لبلبی پر تھیں' ذرا سی حرکت سے گولی چل سکتی تھی اس لیے میں نے انہیں اشتعال دلانے والی حرکت سے گریز کیا۔ میں آہستہ سے باہر آیا اور فتح خان کی طرف دیکھا جو پہلے ہی میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس نشانی کو دیکھا جس کی سیدھ میں اوپر جا کر مجھے وہ دو درخت مل جاتے جن کے ساتھ چٹان کی جڑ میں بریف کیس چھپایا تھا۔ میں آگے بڑھا اور فتح خان تینوں ساتھیوں کے ہمراہ میرے پیچھے آنے لگا۔ اس نے مجھے پھر وارننگ دی۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ میرا آدمی کوئی رعایت نہیں کرے گا۔“

”میں بالکل ٹھیک حرکت کروں گا۔“ میں نے خوشدلی سے کہا۔ ”یہ دو درختوں کے درمیان چٹان دیکھ رہے ہو بریف کیس دائیں درخت کے ساتھ لگی چٹان اور تنے کے درمیانی خلا میں ہے۔ تمہارا آدمی ہاتھ بڑھا کر نکال سکتا ہے۔“

فتح خان نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھا۔ میں نے اس کی رہنمائی کی اور اس نے خلا میں ہاتھ ڈالا' پھر مزید ہاتھ ڈالا۔ اس کا قد مجھ سے کم تھا اسی لحاظ سے ہاتھوں کی لمبائی بھی کم تھی اس لیے اسے بریف کیس تک پہنچنے کے لیے زیادہ تگ و دو کرنا پڑ رہی تھی۔ مگر اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے بریف کیس تک پہنچنے میں ناکامی ہو رہی تھی۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”کسی دراز قد کو بھیجو' میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر بریف کیس خاصا اندر کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا ہے۔“

”حفیظ کا ماں اور تقدم کیا؟“ فتح خان کنفیوژ ہو گیا۔

”احتیاطاً۔“ میں نے وضاحت کی۔ فتح خان نے اپنے سب سے لمبے آدمی کو طلب کیا اور اسے خلا سے بریف کیس نکالنے کا حکم دیا۔ آدمی نے ڈرتے ڈرتے خلا میں ہاتھ ڈالا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اندر کوئی سانپ یا اسی قبیل کا زہریلا جانور موجود تھا جو ہاتھ ڈالتے ہی اسے ڈس لے گا۔ اس لیے وہ پورا ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ فتح خان نے اس کی جھجک محسوس کر لی اور دہاڑ کر اسے پورا ہاتھ اندر ڈال کر بریف کیس نکالنے کا حکم دیا۔ بادلِ ناخواستہ آدمی نے حکم کی تعمیل کی اور اپنا دراز ہاتھ خلا میں ڈال کر بریف کیس پکڑنے کی کوشش کی اور پھر ہانپتے ہوئے بولا۔

”یہاں کچھ نہیں ہے۔“

میں نے بریف کیس جتنا اندر کیا تھا اس آدمی کا ہاتھ لازمی اس تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ”شہباز.... بریف کیس کہاں ہے؟“

”میں قسم نہیں کھاتا لیکن اگر تمہاری تسلی قسم سے ہوتی ہے تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں' میں نے بریف کیس یہیں رکھا ہے میرا خیال ہے تمہارے آدمی ٹھیک سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔“

اس نے پستول لہرایا۔ ”ٹھیک ہے تم آ کر ٹھیک سے دیکھ لو پر اب فتح خان قسم کھاتا ہے اگر تمہارا ہاتھ خالی واپس آیا تو تمہارے سر میں سوراخ کر دے گا۔“ اس کا لہجہ نہایت خوفناک اور سنجیدہ تھا۔ میں آگے آیا اور خلا میں ہاتھ داخل کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ بریف کیس اسی جگہ رکھا تھا۔ لیکن اب وہاں خلا تھا اور میرا ہاتھ اس میں لہرا رہا تھا۔ اگر بریف کیس وہاں ہوتا تو لازمی میرے ہاتھ میں آ جاتا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے بریف کیس سرک کر آگے چلا گیا ہے تم اجازت دو تو میں لکڑی کی مدد سے ٹٹولوں؟“

”یہ بھی کر لو۔“ وہ پیچھے ہو گیا۔ ”شہباز خانا آج تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ جو کرنا ہے کر لو بلکہ چاہو تو کلمہ شریف پڑھ کر اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لو۔“

میں نے وہی لکڑی اٹھائی جس کی مدد سے میں نے اس خلا کی پیمائش کی تھی۔ میں نے اسے خلا میں داخل کیا اور آخر تک چیک کیا۔ ایک لمحے کو میرا دل رک گیا تھا' خلا بالکل خالی تھا بریف کیس وہاں نہیں تھا۔ عقب سے فتح خان نے کہا۔ ”شہباز خانا افسوس تم نے موقع گنوا دیا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”فتح خان میری بات سنو....“

”تم نے دھوکا کیا اب کیا سنے گا تم گولی کا آواز سنو۔“

میرا جسم تن گیا تھا متوقع گولی کے انتظار میں۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(محمد عقیل چٹھہ حافظ آباد کا جواب)

نصرت جاوید.........اسلام آباد

اپنے ہی شعلۂ رنگیں سے جلا دامنِ گل
اپنی ہی شاخِ تبسم پہ کلی مرجھائی

اسلم ظفر سعید.........لاہور

اب تک تو یہ ہوا ہے کہ توڑے جس نے دل
ٹوٹے ہوئے دلوں کا وہی آسرا ہوا

عارفہ یاسین خان.........کراچی

اب سمٹنے سے سمٹتا ہی نہیں میرا وجود
اس طرح سے تو کوئی شخص نہ بکھرا ہوگا

نگہت نسیم.........لاہور

اشک بہتے ہیں کبھی اور دل تڑپتا ہے کبھی
حوصلہ دے کے مرے دکھ کو بڑھا جاتے ہیں آپ

نعمان سرمد.........کراچی

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

(سعید قاسمی ڈلوال کا جواب)

عفیفہ یاسمین.........لاہور

آؤ ہم اس دورِ نفرت میں قمر
پیار کا نعرہ لگائیں چار سو

نہال اصغر.........سکھر

آج اُس نے درد بھی اپنے علیحدہ کر لیے
آج میں رویا تو میرے ساتھ وہ رویا نہیں

تنویر رفیق.........لانڈھی کراچی

آپ کے دل پر نامِ محبت
نقش ہے لیکن دھندلا سا ہے

مدیحہ التمش فاروقی.........کوئٹہ

آئے بہار بن کے' صبا بن کے چل دیے
اچھا صلہ دیا ہے ہمیں انتظار کا

زیب حسن.........لطیف آباد

اپنی گلی کے موڑ پہ جو فیصلے کیے
ان کی گلی کے موڑ پر جا کر ہوا ہوئے

امتیاز گل.........کوٹ ادو

یوں ہیں حالات کے دریاؤں میں طغیانی سی
جیسے مقسوم میں اب کوئی کنارہ بھی نہیں

نزہت مقصود......پشاور

یہ کہاں کی دوستی ہے جو بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

(نازنین ناز زاہدان (ایران) کا جواب)

کونین فاطمہ.........کراچی

یاد آتے ہیں تم کو ہم شاید
پھیکا پھیکا ہے رنگ کاجل کا

نیاز حسن.........مظفر گڑھ

یہ سرد مہر اجالی یہ جیتی جاگتی رات
ترے خیال سے تصویرِ ماہ جلتی ہے

(مظہر بخاری سکھر کا جواب)

فصیح الدین.........حیدر آباد

میرے معبود مگر کون سی مخلوق ہوں میں
جس کو بیٹی نہ کوئی بیوی نہ ماں کہتا ہے

(سلیم کامریڈ کھاٹاں کا جواب)

ذیشان تبسم.........لاہور

یہ جو ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں رات کو
رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

نگار احمد.........سکرنڈ

یہ دردِ محبت تلخ سہی ظالم ہی سہی قاتل ہی سہی
اک جہدِ مسلسل کی خاطر ہم اس کو گوارا کرتے ہیں

عنایت مسیح.........جہلم

یہ وہمِ سماعت ہے اپنا یا جذبِ محبت کا ہے اثر
وہ ہم سے مخاطب ہیں بھی نہیں، پر ذکر ہمارا کرتے ہیں

(مجاہد علی، الیس نبی، ڈگری کا جواب)

گڑیا.........کراچی

گھٹا دیکھ کر خوش ہوئی لڑکیاں
چھتوں پر کھلے پھول برسات کے

فہیم الرحمٰن..........میانوالی
گرمئی انجمن کی بات کریں
آؤ اہل سخن کی بات کریں

نوازش کریم.........پشاور
گرچہ نازک ہوں بظاہر پر مرا عزمِ صمیم
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتی ہوں میں
(حمیرا کریم پشاور کا جواب)

عباس ملتانی.........ملتان
نہ کرنا دولت وحشمت پہ ناز جیتے جی
مریں تو جانے کفن بھی کسے کہاں کا ملے

ذیشان احمد خان..........شیخوپورہ
نگار ان کے دل میں نہ جانے ہے کیا کیا
چلو ان سے پوچھیں کہ کیا چاہتے ہو
(تنویر رفیق لانڈھی کا جواب)

نازش ممتاز.....حیدرآباد
نشانِ راہ ستاروں کو وہ دکھا بھی گیا
وطن کی آن پر مرنا ہمیں سکھا بھی گیا
(اسماعیل رند ملتان کا جواب)

اظہار ارتضٰی.........منڈی بہاؤالدین
اے نازِ غم نہیں جو فرشتہ نہ بن سکا
کیوں اہرمن کے روپ میں انسان ڈھل گیا

نیناں قیصرانی.........کوٹ قیصرانی
انساں کو چاہیے کہ خودی کو رکھے بلند
ہر بات میں خیال ہو حفظِ وقار کا

میمونہ عباسی.........حیدرآباد
اس سے پہلے تو کڑے کوس کے سناٹے تھے
زیست کے ساز پر اک سوز سنا ہے اب کے

شمع احمد..........کراچی
اس سے تو حکایتِ جنوں اور بڑھے گی
چپ کیوں ہو کوئی بات بتا کیوں نہیں دیتے

علی شاہ.........گلگت
اپنی آنکھوں میں نہ آنے دیں کسی کی صورت
اپنی مژگاں کو نگاہوں کا نگہباں رکھیے

نوشین ملک..........سکھر
اس جہاں میں ہنسی کا نام نہیں
ساری خوشیاں غموں کے سائے ہیں
(قندیل احمد منڈی بہاؤالدین کا جواب)

رانا محمد.........چنیوٹ
انجام شب سحر ہے یہ جانتی ہوں لیکن
کب آئے گی سحر وہ، راتوں سے پوچھتی ہوں

عبدالحکیم.........لاہور
اک احتیاطِ شوق فراواں لیے ہوئے
اب تک ہیں کچھ گہر سرِ مژگاں لیے ہوئے

نیاز حیدر.........فیصل آباد
اس انقلابِ گردشِ دوراں کو کیا کہیں
اے ماہ ہم ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے
(مدیحہ سلطان سکرنڈ کا جواب)

سعید اسرار علی.........لاہور
یادِ محبوب ایک عداوت ہے
ذکر بھی بندگی میں شامل ہے

سلطان فتح محمد.........سکھر
یوں بلا وجہ دھڑکتا نہیں دل
آپ نے پیار سے دیکھا ہوگا
(جویریہ ابراہیم سرگودھا کا جواب)

محمد سعید قاسمی.........ڈلوال
وہ ایک شخص جو سب کو سنبھالے رکھتا تھا
تمہیں خبر ہی نہیں ہے بکھر گیا کب کا
(فہیم الرحمٰن میانوالی کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی
ابھی تو ضد ہے اسے راستہ بدلنے کی
کبھی وہ روئے گا خود میری چاہتوں کے لیے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 90

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماهنامه سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماهنامه پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 اپریل 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1896 کو بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی پھر اسی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ کافی عرصہ تک اسی یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ طنز نگاری میں بڑا نام کمایا۔ **1977** میں انتقال کیا۔

علمی آزمائش 88 کا جواب

بیگم سلمیٰ تصدق حسین نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی اور **1936** میں سیاست میں آگئیں۔ **1937** میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ **1946**ء میں لاہور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیت لیا۔ **1946**ء میں بہار میں ہندو مسلم فساد برپا ہوا تو آپ نے پورے بہار کا دورہ کیا۔ **1948**ء میں ریلیف سیکریٹری مقرر ہوئیں اور دہلی کا دورہ کیا۔ **1982**ء تا **1985**ء مجلسِ شوریٰ کی رکن رہیں، **1995**ء میں انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1-امتیاز احسن فاروقی 'کراچی -2نادر مرزا' راولپنڈی -3ظہیر شاہ 'چنوٹ

4-طلعت عامر 'لاہور -5زاھد کاظمی 'کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے شاہد آفتاب، نصرت حیدر' شمیم احمد، سمیہ عزیز، ذوالفقار احمد خان' ارہم اقبال رضوی، محمد علی مشاہد، فرزانہ پروین، انصار حسین، لعیق احمد، سرور احسن صدیقی، عطیہ نورین، نیاز خانجی، بختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عنایت مسیح علی احمد، رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، فہیم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نوازش علی شاہ، نغمہ اقبال رضوی، ناصر افروز، ممتاز الحسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ فہمی، منور علی، ملک سرفراز گل، کاشف حیدر، جاوید علی، مظفر محسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، خالد

سلیم کامریڈ، کھاناں۔ لاہور سے نعمان حیدر' کاشف عزیز' فرحت بتول' ایم پی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر خان۔ فاروق، کاوش نسیم' کاشان صدیقی، الہ ڈینو آرائیں، گل زیب، پروین ضیائی، نثار اختر، ارشاد علی، احمد علی مشرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان اشرف، خالد فاروقی' ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الدعلی، احمد بشیر بٹ، فہیم مرزا، حدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، نازش خان، ہما جبیں، حمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نازش حسین تابش اطہر۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، شیراز ملک، ڈاکٹر غلم یاسین، ناصر جاہ، تسنیم فاروق آرکلی، صادق حسن، نرجس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زویا بخاری، سید محمد نقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ سید احسن محمود، اوکاڑہ۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، ردا ممتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد متین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلی خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ۔ جھنگ سے فرحت بیگ۔ گوجرانوالہ سے نسیم شاہ۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے ابرار شاہ۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارٹ، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جنوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ مرزا ہادی بیگ، ابتہال سلیم۔ میر پور خاص سے مجاہد علی ایس بنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے زاہد علی خان۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ بہاؤ لنگر سے امتیاز شیخ۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ اٹک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ثنا جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ ثنا، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازخ بغاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میر پور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ میانوالی سے احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، ۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منکیرا، زبیر شاہ، تقی بنگش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھکیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، خالد خان، ناصر انعم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ لیہ سیفا روق اعظم۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، ایم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، ثنا وقار، منہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شہ نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، نزرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے نصیر خان۔ ممالک غیر سے علاقہ خان' احمد انصاری (جرمنی) عارف خان (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)۔۔ فہد فاروق (ٹوکیو جاپان)

تیرے جانے کے بعد

عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں نے اپنی سرگزشت لکھ تو لی ہے لیکن ڈرتے ڈرتے بھیج رہی ہوں، کیونکہ میں رائٹر نہیں ہوں، پلیز اس کی نوک پلک سنوار کر کہانی کا انداز دے لیں۔ میری زندگی ایسے مصائب سے گزری ہے کہ اسے بیان کرتے ہوئے میں بار بار آنسو پونچھتی رہی ہوں، اگر پسند آئے تو ضرور شائع کریں۔
آسیہ
(لاہور)

میرے شوہر انتہائی لالچی اور کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے والے محاورے پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان میں کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً وہ وہمی اور شکی مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ کانوں کے بھی بہت کچے ہیں اور دوسروں کی بات پر بہت جلد یقین کر لیتے ہیں۔ میں کبھی یہ نہ جان سکی کہ ابو کو ان میں ایسی کیا خوبی نظر آئی کہ مجھے ان کے پلّے باندھ دیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابو نے ان کے بارے میں کوئی خاص چھان بین نہیں کی ورنہ بہت سی باتوں کا شادی سے پہلے ہی پتا چل جاتا۔ پہلا جھوٹ تو میاں نے اپنی تعلیم کے بارے میں بولا اور اپنے آپ کو انجینئر ظاہر کیا۔ یہ تو مجھے شادی کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے پاس انجینئرنگ کی ڈگری نہیں بلکہ ڈپلوما تھا اور وہ کسی سرکاری محکمے میں سب انجینئر کے عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی ارشد یعنی میرے شوہر اور ان کے گھر والوں کی اصلیت معلوم ہو گئی اگر یہ سب باتیں پہلے ہی معلوم ہو جاتیں تو میرے گھر والے کبھی اس رشتے پر راضی نہ ہوتے۔

میں نے بچپن سے ہی ناز و نعم میں پرورش پائی۔ ہم صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ رضوان مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ ابو کی بینک میں بہت اچھی جاب تھی۔ انہوں نے اچھے دنوں میں نارتھ ناظم آباد میں چار سو گز کا پلاٹ سستے داموں خرید لیا تھا اور بینک سے قرض لے کر مکان بھی تعمیر کر لیا۔ ابو کی معقول تنخواہ تھی۔ اس لیے گھر میں خوش حالی تھی ویسے بھی امی اور ابو ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی کے قائل تھے۔ ہم اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے۔ ہمارے گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی لیکن فضول خرچی کا چلن نہیں تھا۔ امی اور ابو کبھی بھی بلا ضرورت پیسے خرچ نہیں کرتے تھے اور اسی وجہ سے ابو کا بینک اکاؤنٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ امی بھی گھر کے خرچ میں سے کچھ بچا کر جوڑ جمع کرتی رہتی تھیں۔ جس سے فالتو اخراجات بآسانی پورے ہو جاتے تھے۔

اس کے برعکس میری سسرال کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ شادی سے پہلے ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کیا گیا' اس سے تو یہی نظر آتا تھا کہ یہ لوگ بڑے پیسے والے ہیں۔ شادی بھی ان لوگوں نے دھوم دھام سے کی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب دکھاوا تھا۔ اندر سے یہ لوگ بالکل کھوکھلے ہیں۔ سسر جی کی پلازہ پر اسپیئر پارٹس کی دکان تھی جس کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلتا تھا جبکہ ارشد کے ذمّے بلوں کی ادائیگی اور دیگر اخراجات تھے۔ ارشد سے چھوٹا بھائی امجد یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور امریکا

جانے کے خواب دیکھ رہا تھا جبکہ دونوں چھوٹی بہنوں نجمہ اور سعیدہ نے بھی کالج میں داخلہ لے رکھا تھا لیکن انہیں پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ محض وقت گزاری اور گھر کے کام کاج سے بچنے کے لیے کالج جاتی ہیں۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ کمرا بند کر کے سو جاتیں یا میوزک سنتی رہتیں۔ شام کا وقت ٹی وی دیکھنے میں گزر جاتا۔ گھر کے کام کی ساری ذمّے داریاں مجھ پر تھیں۔ ساس صاحبہ دکھانے کے لیے میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتیں لیکن ان کا اصل مقصد محض میرے کام کی نگرانی اور بے جا مداخلت ہوتا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ساس بہو نہیں بلکہ سپروائزر اور کارکن کا رشتہ تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے حکم چلاتی رہتیں اور میں ایک معمول کی طرح ان کا ہر حکم بجا لانے پر مجبور تھی۔



شادی کے چند روز بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس گھر کا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اور اگر اصلاح احوال کی کوئی صورت نہ نکالی گئی تو جھوٹی شان و شوکت کا یہ محل کسی روز دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی کہ میری ساس کو اپنی بیٹیوں کی شادی کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں نے کبھی اس بارے میں ان کی زبان سے کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی انہیں جہیز کے نام پر کچھ جمع کرتے دیکھا۔ ایک دن وہ اچھے موڈ میں تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جان کر یہ ذکر چھیڑ دیا اور جاننا چاہا کہ انہوں نے بیٹیوں کے لیے کتنا جہیز بنایا ہے۔ اس پر وہ تنک کر بولیں۔ ''اے بہو، میرے ہاتھ میں آتا ہی کیا ہے جو کچھ جوڑ جمع کروں۔ تمہارے سسر جو مہینے کا خرچ دیتے ہیں وہ تو پندرہ دن بھی نہیں چلتا۔ بقیہ دن ادھار پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔''

''ادھار کا چکر تو بہت خراب ہوتا ہے۔ اس طرح تو آپ کبھی بھی کچھ نہیں کر سکیں گی۔'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''آپ ابا جی سے پیسے بڑھانے کی بات کریں ورنہ گھر کے اخراجات میں کمی کریں تا کہ ادھار سے نجات مل جائے۔''

''کئی دفعہ پیسے بڑھانے کا تقاضا کر چکی ہوں لیکن وہ ہمیشہ ٹکا سا جواب دے دیتے ہیں کہ دکان کی آمدنی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور وہ اس سے زیادہ گھر میں نہیں دے سکتے۔ ارشد کی تنخواہ بھی اتنی زیادہ نہیں ہے ویسے بھی وہ شادی پر کافی زیر بار ہو چکا ہے اور اسے قرض اتارنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ میں نے کہا تھا کہ وہ بھاری بھرکم بری لے کر آئیں۔ دھوم دھام سے ولیمہ کریں اور ایک کی جگہ دس لٹائیں۔ شام کو جب ارشد گھر آئے تو میں ان سے الجھ پڑی۔

''کیا ضرورت تھی شادی کے موقع پر ادھار کرنے کی؟''

''تم سے کس نے کہا؟'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولے۔

''اب میں اس گھر کا ایک فرد ہوں اور مجھے یہاں کے معاملات کے بارے میں جاننے کا پورا حق ہے۔ ویسے بائی دی وے کتنا ادھار لیا تھا؟''

''ایک لاکھ۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''کیا اس کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی تھی؟'' میں نے طنزاً کہا۔

''کیسی بچوں جیسی باتیں کررہی ہو۔ دنیا دکھاوے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اگر بری میں ذرا بھی کمی رہ جاتی تو تمہارے گھر والے طعنے دے دے کر ہمارا جینا محال کر دیتے اور ولیمے میں بھی اس سے کم لوگ نہیں بلائے جاسکتے تھے کیونکہ ہم بھی کئی گھروں میں شادی کا کھانا کھا چکے ہیں۔''

''اس جھوٹی شان وشوکت کے بدلے آپ کو کیا ملا...... قرض کا بوجھ۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے لیکن یہ اندازہ کرسکتی ہوں کہ اس قرض کی ادائیگی آپ کے لیے کافی مشکل ہورہی ہوگی۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔ واقعی میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟''

''اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ گھر کے اخراجات میں زبردست کمی کی جائے۔ ایک دو چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں ڈالی جائیں اور اس قرض کی ادائیگی یکمشت کردی جائے۔''

''تمہاری تجویز مناسب ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اس گھر کے اخراجات بڑھ سکتے ہیں لیکن کم نہیں ہوسکتے۔''

''دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ اپنی آمدنی میں اضافے کی کوئی ترکیب کریں تاکہ جلد از جلد قرض ادا ہوسکے۔''

''بہت مشکل ہے۔'' وہ مایوسی سے سرہلاتے ہوئے بولے۔ ''آج کل نوکریوں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ اس لیے کوئی بہتر ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کوشش جاری رکھیں۔ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ایک حل ہے میرے پاس لیکن اس کے لیے سب لوگوں کو کچھ نہ کچھ قربانی دینا ہوگی۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''یہی کہ ملک سے باہر چلا جاؤں۔ وہاں رہ کر دو سال میں ہی اتنا کمالوں گا کہ قرض اتارنے کے علاوہ کچھ پس انداز بھی کرسکوں گا۔''

''اور میرا کیا ہوگا، میں یہاں اکیلی رہوں گی؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تمہیں زیادہ عرصہ میرے بغیر نہیں رہنا پڑے گا۔ حالات سازگار ہوتے ہی میں اپنے پاس بلالوں گا۔ اگر تم یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہو تو میں کوشش شروع کروں؟''

وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اس خیال کی مخالف کروں گی لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھی تھیں۔ ان کے لہجے سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ باہر جانے کا مصمم ارادہ کرچکے تھے اور میرے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا پھر میں مخالفت کرکے کیوں برائی مول لیتی لہٰذا مصلحت آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہمارے مسائل حل ہوجائیں گے تو میں یہ عارضی جدائی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولے۔ ''لیکن ابھی اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔ جب سارے انتظامات ہوجائیں گے تو میں خود ہی بتادوں گا۔''

اس کے بعد انہوں نے چپکے چپکے بیرون ملک ملازمت کے حصول کی کوشش شروع کردی۔ ان کے بچپن کا ایک دوست کسی ریکروٹنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ان کے مطلب کی جاب آئی وہ انہیں باہر بجھوا دے گا۔ ارشد کی لگن سچی تھی یا میری دعائیں رنگ لائیں کہ تین مہینے کے اندر ہی انہیں دوبئی میں سپروائزر کی ملازمت مل گئی۔ معقول تنخواہ کے ساتھ رہائش اور میڈیکل کی سہولت بھی موجود تھی۔ ارشد اس پیکج کو دیکھ کر اتنا خوش ہوئے کہ انہوں نے بقیہ شرائط پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور اپنا پاسپورٹ ویزے کے لیے ایجنسی میں جمع کروادیا۔ جب یہ خبر گھر والوں کو ملی تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑی لاٹری نکل آئی ہو۔ سب اپنے اپنے منصوبے اور پروگرام ترتیب دینے لگے۔ پہلا اعلان سسر صاحب نے فرمایا۔

''بس بھئی بہت ہوگیا۔ اب مجھ سے یہ خواری نہیں ہوتی۔ ویسے بھی اب کاروبار میں کچھ نہیں رکھا۔ ارشد وہاں سیٹ ہوجائے تو میں بھی دکان بیچ کر مسجد میں ٹھکانا بنالوں۔''

امجد چہچہاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اپلائی کردیتا ہوں۔ اس کے بغیر امریکا جانا مشکل ہے۔''

دونوں بہنیں یہ سوچ کر نہال ہورہی تھیں کہ بھائی ہر سال چھٹیوں میں ان کے لیے قیمتی ملبوسات، جیولری اور میک اپ کا سامان لے کر آئیں گے اور اس طرح وہ بھی اپنی سہیلیوں پر امپورٹیڈ مال کا رعب جھاڑ سکیں گی۔ سب اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے تھے لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ میں ارشد کے بغیر کیسے رہ سکوں گی۔ سسرال میں شوہر ہی عورت کا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ وہ اپنا ہر دکھ، تکلیف اور ضرورت اس سے بیان کرسکتی ہے۔ ارشد کے جانے کے بعد میں مکمل طور پر ان لوگوں کی محتاج ہوجاؤں گی جنہیں مجھ سے کوئی انسیت نہیں تھی۔ آیندہ چند ماہ میں مجھے تخلیق کے عمل سے بھی گزرنا تھا اور میں یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوئی جارہی تھی کہ ارشد کی غیر موجودگی میں یہ مرحلہ کیسے سرکرپاؤں گی۔

ارشد تو اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے دوبئی چلے گئے اور مجھے ایسے لق ودق صحرا میں تنہا چھوڑ دیا جہاں دور دور تک کوئی سایہ نہ تھا اور میں کھلے آسمان تلے تپتی دھوپ میں آبلہ پائی پر مجبور تھی۔ میری زچگی میں تین مہینے رہ گئے تو امی نے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ ان کا خیال تھا کہ میکے میں میری زیادہ اچھی دیکھ بھال ہوسکے گی لیکن ساس نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ ہمارے یہاں پہلی زچگی سسرال میں ہوتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے۔ دراصل وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں میکے جاؤں کیونکہ اس طرح ان کی نازک اندام بیٹیوں کو گھر کا کام کرنا پڑجاتا۔ جس سے ان کے نرم وملائم ہاتھ خراب ہوسکتے تھے۔

میں نے بیٹے کو جنم دیا تو دونوں گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ساس، سسر دونوں ہی پوتے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔ میرے سسر نے اس کا نام نوید رکھا اور کسی نے مجھ سے یا ارشد سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنی اولاد پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ میں تو ان لوگوں کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی اس لیے مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا لیکن امی میری حالت دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔ انہوں نے مجھے کئی بار مشورہ دیا کہ خط لکھ کر ارشد کو تمام حالات سے آگاہ کردوں (اس زمانے میں ٹیلی فون اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے خطوں پر ہی گزارہ تھا) لیکن میں جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ارشد سوفی صد ماماز بوائے تھے اور اپنی ماں بہنوں کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ الٹا میں ہی ان کی نظروں میں بری بن جاتی۔

ساس دل کی بری نہیں تھیں لیکن میری نندیں انہیں بھڑکاتی رہتی تھیں۔ نہ جانے وہ میری دشمن کیوں بن گئی تھیں۔ شاید کالج میں کسی لڑکی نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھادی تھی کہ میرے آنے سے ان کی حق تلفی ہوئی اور بھائی نے انہیں پوچھنا چھوڑ دیا ہے چنانچہ وہ ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں اور ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ سب کے سامنے کسی نہ کسی بہانے مجھ پر تنقید کرتی رہیں تاکہ گھر والوں بالخصوص ساس اور سسر کی نظروں میں میری پوزیشن خراب ہوجائے اور وہ بھی میرا خیال کرنا چھوڑ دیں۔ ارشد کی موجودگی میں ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میرے کسی کام میں نقص نکال سکیں۔ ارشد کے جانے بعد ان دونوں کا رویہ مزید جارحانہ ہوگیا۔ ویسے تو وہ دونوں ہی بہت تیز تھیں لیکن نجمہ کو مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتی جبکہ اس کے برعکس سعیدہ ٹھنڈے مزاج اور خاموش طبیعت تھی گو کہ اس نے بھی کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی لیکن نجمہ کی طرح اس کی زبان قینچی کی طرح نہیں چلتی تھی اور نہ ہی اس کا پارا چڑھا رہتا تھا۔

میرے لیے یہ صورتِ حال بڑی پریشان کن تھی۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بھلا ساس، سسر اپنی بیٹیوں کے خلاف کوئی بات کیسے سن سکتے تھے۔ اس لیے خود ہی اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کرتی رہی پھر ایک آئیڈیا میرے ذہن میں آہی گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر نجمہ کی شادی کروادی جائے تو اس کے جانے کے بعد میں خاصی پُرسکون ہوسکتی ہوں کیونکہ اس کی رخصتی کے بعد سعیدہ اکیلی رہ جاتی اور ویسے بھی اس میں اتنی تیزی وطراری نہ تھی کہ وہ میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرسکتی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ساس اور سسر کو اس کام کے لیے کیسے راضی کیا جائے کیونکہ انہوں نے تو ابھی تک بیٹیوں کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ساس صاحبہ کے ذہن میں کسی طرح یہ بات بٹھادی جائے کہ اب

ان لڑکیوں کی شادی ہو جانی چاہیے تو وہ ضرور اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں گی لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ بات انہیں کون سمجھائے۔ جب میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو میرا ذہن فوراً خالہ زیبن کی طرف چلا گیا۔ ان کا پورا نام تو زیب النسا تھا لیکن سب لوگ انہیں خالہ زیبن کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کی انہوں نے شادی کر دی اور خود سلائی کر کے گزارہ کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے رشتے کروانے کا کام بھی شروع کر رکھا تھا اور اس میں اتنی کامیاب رہیں کہ دور دور سے لوگ اپنے بچوں کے رشتوں کے لیے ان کے پاس آنے لگے۔ وہ یہ کام بلا معاوضہ کرتی تھیں اور اس کے لیے انہوں نے کوئی فیس مقرر نہیں کر رکھی تھی۔ کوئی اپنی خوشی سے کچھ دے دے تو انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔ محلے کے لڑکے ان سے چھپتے پھرتے تھے کیونکہ مشہور تھا کہ اگر ان کی نظر کسی پر پڑ جائے تو وہ اس کی شادی کروا کر ہی دم لیتی تھیں۔

میں ایک دن کپڑوں کی سلائی کے بہانے..... ان کے گھر گئی اور نندوں کی شادی کے سلسلے میں ان سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ارشد بھی اس بارے میں بہت پریشان ہیں لیکن میری ساس نہ جانے کس دن کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ نجمہ کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کریں لیکن میری ساس کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئیں اور بولیں۔ ”تم بالکل فکر نہ کرو ایسا رشتہ لے کر آؤں گی کہ تمہاری ساس کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔“

انہوں نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ فرید کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ وہ پڑھے لکھے اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ نارتھ ناظم آباد میں چار سو گز پر بنا ہوا ذاتی مکان تھا جس میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور بڑا بھائی امریکا میں بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میری ساس نے پہلے تو خالہ زیبن کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے صاف انکار بھی نہیں کیا اور یہ کہہ کر خالہ زیبن کو ٹالنے کی کوشش کی کہ وہ سوچ کر جواب دیں گی۔ خالہ زیبن بھی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ انہوں نے چادر اٹھائی اور اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے بولیں۔ ”ہاں بہن، اچھی طرح سوچ لیکن انہیں جلدی جواب چاہیے کیونکہ بیٹیوں کی شادی کے بعد بڑی بی تنہا ہو گئی ہیں اور انہیں بہو کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے لیکن غیر ضروری تاخیر نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے۔“

خالہ زیبن کے جانے کے بعد میری ساس کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ میں نے انہیں پہلی بار لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت نجمہ اور سعیدہ کالج گئی ہوئی تھیں۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ ابا جان سے مشورہ کر کے ان لوگوں کو چائے پر بلا لیں۔ اسی بہانے نجمہ بھی لڑکے کو دیکھ لے گی اور آپ لوگ بھی اپنا اطمینان کر لیں۔“

”اے بہو، تم نے تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا شروع کر دیا۔“ وہ تڑخ کر بولیں۔ ”مجھے کچھ سوچنے دو ویسے بھی نجمہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی عمر ہی کیا ہے جو اسے گھرداری کے بکھیڑوں میں جھونک دوں۔“

”امی جان! شادی کی یہی عمر ہوتی ہے ورنہ بعد میں اچھے رشتے آنا بند ہو جاتے ہیں۔ اگر تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کریں گی تو شادی کی عمر نکل جائے گی۔“

”یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ”پہلے میں تمہارے سسر سے مشورہ کر لوں لیکن شادی کا انتظام کیسے ہوگا۔ ہمارے پاس تو جہیز کے نام پر ایک چھلا بھی نہیں ہے۔“

”پہلے آپ رشتہ طے کر لیں باقی انتظام بھی ہو جائے گا۔“

نجمہ اور فرید کا رشتہ آسمانوں پر طے ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی شادی میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ ساس صاحبہ نے سسر جی سے مشورہ کر کے خالہ زیبن سے کہہ دیا کہ وہ فرید اور اس کی ماں کو چائے پر بلا لیں۔ میں نے اس روز خاص اہتمام کیا۔ پہلے اپنی نگرانی میں پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کروائی۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کو نئی ترتیب سے آراستہ کیا۔ صوفوں کے کشن اور کھڑکیوں کے پردے تبدیل کیے۔ ناشتے کے لیے اپنے ہاتھ سے کئی چیزیں تیار کیں البتہ مٹھائی، پھل اور سموسے بازار سے منگوائے اور اس کے بعد پہلے نجمہ کو تیار کیا اور پھر خود بننے سنورنے میں مصروف ہو گئی۔ اس روز میں نے اپنے لیے ہلکے کام والی پنک ساڑی کا انتخاب کیا۔ ارشد کو یہ لباس بہت پسند تھا اور وہ ہر وقت مجھے ساڑی میں دیکھنا

چاہتے تھے۔ میں ہر طرح سے مہمانوں کو متاثر کرنا چاہ رہی تھی تاکہ یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

وہ لوگ مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔ خالہ زیبن بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ فرید کی ماں دیکھنے میں سیدھی سادی اور بے ضرر سی عورت لگ رہی تھیں لیکن فرید کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور تیزی نظر آئی۔ ویسے تو خاصا مہذب نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ اندر سے کچھ مختلف ہے۔ وہ خاصا نظر باز معلوم ہو رہا تھا اور بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا جیسے میرے جسم کا ایکسرے کر رہا ہو۔ میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی آئی جہاں نجمہ ناشتے کی ٹرالی سجائے بلاوے کی منتظر تھی۔ میری ساس نے سعیدہ کو مہمانوں کے سامنے آنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکے والے بڑی کی بجائے چھوٹی بہن کو پسند کر لیتے ہیں۔ میں نے نجمہ کو ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے کہا تو وہ بولی۔ ”آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

میں اس کے ساتھ چلی تو گئی لیکن ایک بار پھر اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جس سے پہلے گزر چکی تھی۔ فرید کی نظریں نجمہ کی بجائے ایک بار پھر مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ میں ایک بار پھر بہانہ کر کے وہاں سے چلی آئی اور دوبارہ اس کے سامنے نہیں گئی۔

سب گھر والے اس رشتے پر راضی تھے۔ میری ساس نے خط لکھ کر ارشد کو فرید کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ لوگ جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ ارشد نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ لوگ مطمئن ہیں تو ہاں کر دیں۔ اس طرح نجمہ اور فرید کی بات پکی ہو گئی۔ فرید کی ماں تو فوراً ہی نکاح کرنا چاہ رہی تھیں لیکن میری ساس اس پر تیار نہیں ہوئیں اور کہا کہ انہیں شادی کی تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جہیز اور شادی کے اخراجات کے لیے یکمشت رقم کا انتظام کیسے ہو۔ ارشد کو گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس دوران انہوں نے جو کچھ بھیجا وہ گھر میں ہی خرچ ہوتا رہا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شادی کا پورا خرچ برداشت کر سکتے۔ انہوں نے ابا جان کو دکان بیچنے کا مشورہ دیا کہ اس طرح اچھی خاصی رقم ہاتھ آ جائے گی۔ نجمہ کی شادی کے بعد جو پیسے بچ جائیں انہیں بینک میں رکھوا دیا جائے تاکہ بعد میں سعیدہ کے کام آ سکیں۔

نجمہ اور فرید کی شادی ہوئی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نجمہ کے جانے کے بعد سعیدہ تنہا ہو گئی تھی لہٰذا اس نے مجھ سے پنگا لینے کی کوشش نہیں کی اور مجھ سے دور دور رہنے لگی لیکن میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی کیونکہ شادی کے بعد بھی نجمہ کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ جب بھی آتی تو کوئی نہ کوئی شوشہ ضرور چھوڑ دیتی۔ میرے ہر کام میں کیڑے نکالنا اور جا بے جا تنقید کرنا اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔ شادی کے بعد لڑکیاں عموماً سسرال کے جھمیلوں میں گھر جاتی ہیں اور انہیں میکے آنے کا کم کم موقع ملتا ہے لیکن نجمہ ہر دوسرے تیسرے روز فرید کے ساتھ آ جاتی اور رات کا کھانا کھائے بغیر نہ ٹلتی۔ اس دوران فرید کی نظریں مستقل میرا تعاقب کرتی رہتیں۔ وہ مجھ سے دھیرے دھیرے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور کبھی کبھی چپکے سے کوئی ایسا جملہ کہہ دیتا کہ میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ میرے بس میں ہوتا تو اس کا منہ نوچ لیتی لیکن وہ میرا نندوئی اور اس گھر داماد تھا جس کی عزت کرنا ہمارا فرض بنتا تھا کیونکہ اس معاشرے میں ہر داماد یہی سمجھتا ہے کہ اس نے شادی کر کے سسرال والوں پر احسانِ عظیم کیا ہے جس کا بدلہ صرف اسی صورت ممکن ہے کہ سسرال والے اس کے بے دام غلام بن کر رہیں اور اس کے ہر حکم پر سر جھکاتے رہیں۔

وہ میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ سسر جی دکان بیچنے کے بعد گھر بیٹھ گئے تھے۔ اب انہیں اخبار پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ دن بھر ان کا فرمائشی پروگرام چلتا رہتا۔ صبح ناشتا، گیارہ بجے چائے، دوپہر کا کھانا شام کی چائے، رات کا کھانا اور سونے سے پہلے دودھ کا گلاس۔ یہ سب میرے فرائض میں شامل تھا۔ ساس صاحبہ کو گھٹنوں کے درد کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دشواری ہونے لگی تھی لہٰذا وہ بستر پر ہی ناشتا، کھانا اور چائے وغیرہ منگوا لیا کرتی تھیں۔ انہیں وقت پر دوا دینا بھی میری ڈیوٹی میں شامل تھا پھر مجھے اپنے بچے کو بھی دیکھنا ہوتا تھا۔ اوپر سے نجمہ اور فرید کی خاطر داری نے مجھے ہلکان کر دیا تھا۔ میں ہر خط میں ارشد سے یہی مطالبہ کرتی کہ وہ مجھے جلد از جلد اپنے پاس بلانے کی کوشش کریں لیکن ان کا جواب یہی ہوتا کہ وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں جب تک ان کی ترقی نہیں ہو جاتی وہ مجھے نہیں بلا سکتے۔

میں اس امید پر صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی کہ کبھی تو

حالات بدلیں گے لیکن ابھی مجھے کچھ اور امتحانوں سے گزرنا تھا۔ نجمہ کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ میرے سسر کو دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے۔ ارشد ان کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے لیکن سوم پر آ گئے۔ انہیں صرف ایک ہفتے کی چھٹی ملی تھی۔ اس دوران نجمہ اور فرید نے مستقل ہمارے گھر میں ڈیرا ڈالے رکھا لیکن ارشد کی موجودگی میں فرید خاصا محتاط رہا البتہ اس نے ارشد کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے گرویدہ بنا لیا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا قصیدہ پڑھنے لگے۔ جاتے ہوئے انہوں نے فرید کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑی لجاجت سے کہا۔ ”فرید بھائی، آپ نے اس مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ امید ہے کہ میری غیر موجودگی میں بھی ان لوگوں کا خیال رکھیں گے کیونکہ امجد ابھی چھوٹا ہے۔ اسے بہت سی باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو ہی سب کچھ دیکھنا ہوگا۔“

فرید نے انہیں یقین دلایا کہ وہ روزانہ ہمارے گھر کا ایک چکر ضرور لگائے گا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کا داماد نہیں بلکہ بیٹا سمجھتا ہے۔ ارشد تو مطمئن ہو کر چلے گئے لیکن مجھ پر ایک نیا عذاب مسلط کر گئے۔ فرید اب روزانہ دفتر سے واپسی پر ہمارے گھر آنے لگا۔ نجمہ کبھی اس کے ساتھ آتی اور کبھی نہیں لیکن وہ یہی جتاتی رہتی کہ فرید اپنے گھر کے سارے کام چھوڑ کر یہاں آتا ہے لہٰذا ہمارا بھی فرض ہے کہ اس کی اچھی خاطر داری کریں۔ اب فرید نے بری طرح میرا پیچھا لے لیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے چائے کی فرمائش ہوتی پھر ستانے کے بہانے وہ میرے کمرے میں جا کر لیٹ جاتا اور جب بھی میں کسی کام سے وہاں جاتی تو وہ کوئی نہ کوئی معنی خیز جملہ کہہ دیتا۔ وہ پہلے سے زیادہ بے باک اور منہ پھٹ ہو گیا تھا اور بعض اوقات ایسے جملے کہہ دیتا جو کوئی بھی شریف عورت نہیں سن سکتی تھی لیکن میں یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی کیونکہ بہرحال وہ اس گھر کا داماد تھا اور اسے سب کچھ کہنے یا کرنے کی آزادی تھی۔ ویسے بھی ارشد نے اسے ہمارا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔

زندگی ایک کے بعد دوسرا امتحان لے رہی تھی۔ ارشد کو واپس گئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے ہوں گے کہ امجد نے بھی امریکا جانے کا اعلان کر دیا۔ اس کا وہاں کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تھا اور اب وہ ویزا لگوانے اسلام آباد جا رہا تھا۔ ساس صاحبہ نے دبی زبان سے اس کے جانے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر وہ بھی پردیس چلا گیا تو گھر میں صرف تین عورتیں رہ جائیں گی لیکن امجد نے صاف کہہ دیا کہ وہ گھر کی چوکیداری کی خاطر اپنا مستقبل برباد نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ سے ہی خودسر، بدتمیز اور منہ پھٹ واقع ہوا تھا لہٰذا میں اس سے دور ہی رہتی تھی اور جب اس نے ماں کی بات نہیں مانی تو وہ میری کیا سنتا۔ البتہ امریکا جانے سے پہلے اس نے ازراہِ ہمدردی مجھ سے اتنا ضرور کہا۔ ”بھابی آپ جلد از جلد ارشد بھائی کے پاس جانے کی کوشش کریں۔ کل کو سعیدہ کی بھی شادی ہو جائے گی تب آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی۔ اماں کو تو نجمہ بھی سنبھال سکتی ہے لیکن آپ بچے کے ساتھ کس طرح یہاں کی ذمے داریاں نبھائیں گی۔“

مجھے اس کی خودغرضی پر بڑی حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا اسے صرف اپنا مستقبل عزیز تھا۔ ماں، بہن اور بھاوج کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس گھر میں ہر کوئی اپنے بارے میں سوچتا ہے تو میں کیوں فرماں بردار بہو اور تابعدار بیوی بن کر رہوں۔ مجھے بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا چاہیے چنانچہ جوش میں آ کر ارشد کو خط لکھ دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ مجھے اپنے پاس بلا لیں کیونکہ امجد کے چلے جانے کے بعد گھر کی تمام تر ذمے داری مجھ پر آن پڑی ہے اور میں تنہا یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی اور اگر وہ مجھے نہیں بلا سکتے تو خود واپس آ جائیں ویسے بھی اس گھر کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔

ارشد نے جواب میں لکھا کہ دونوں ہی صورتیں ناممکن ہیں۔ جب تک ان کی پروموشن نہ ہو جائے وہ مجھے نہیں بلا سکتے اور ان کے واپس آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نجمہ کی شادی اور امجد کے داخلے کی وجہ سے ان پر کافی قرض چڑھ گیا ہے اور اسے اتارنے کے لیے ان کا بیرونِ ملک ملازمت کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ قرض اتر جانے کے بعد وہ مکان کے پیسے جمع کریں گے۔ پاکستان واپس آنے سے پہلے ان کے بینک اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہونے چاہئیں کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکیں۔ انہوں نے سختی سے تاکید کی کہ آئندہ اس طرح کے مطالبات کر کے انہیں ڈسٹرب نہ کروں۔ اماں کا خیال رکھوں اور کوئی مسئلہ ہو تو فرید سے کہہ دوں۔

یہ بیس سالہ منصوبہ تھا اور ارشد کے عزائم جان لینے کے بعد یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے بلانا ہی نہیں چاہتے۔ ان کے دل میں پیسے کی محبت جڑ پکڑ چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ

اگر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تو دو گھروں کا خرچ برداشت کرنا ہوگا اور وہ کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکیں گے اور اب میں اسی صورت میں ان کے پاس جا سکتی تھی کہ سعیدہ کی بھی شادی ہو جائے اور ساس صاحبہ اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔ سعیدہ کی شادی کے لیے تو کوشش کی جا سکتی تھی لیکن ساسوماں کی رخصتی کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ انہیں گھٹنوں کی تکلیف کے علاوہ کوئی اور بیماری نہیں تھی اور بالکل صحت مند تھیں چنانچہ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اس روز نوید کی سالگرہ تھی لیکن ہمارے گھر میں کسی کو اس کا خیال بھی نہیں تھا۔ سعیدہ تو صبح اٹھ کر اپنے معمول کے مطابق کالج چلی گئی۔ ساس صاحبہ بھی گھر میں نہیں تھیں۔ محلے میں کسی کے یہاں موت ہو گئی تھی وہ وہاں تعزیت کے لیے چلی گئی تھیں۔ ارشد نے فرمائش کی تھی کہ سالگرہ والے دن نوید کے ساتھ اپنی نئی تصویر کھچوا کر بھیجوں۔ اس زمانے میں ڈیجیٹل کیمرے اور کمپیوٹر وغیرہ نہیں تھے، ... لہٰذا تصویر بنوانے کے لیے فوٹوگرافر کے پاس ہی جانا پڑتا تھا۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ ساس صاحبہ اور سعیدہ گھر آ جائیں تو میں نوید کو لے کر تصویر بنوانے چلی جاؤں۔ جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ ارشد کو ساڑی بہت پسند تھی لہٰذا میں نے اس موقع کے لیے جارجٹ کی گلابی ساڑی نکالی اور نہانے چلی گئی پھر میں نے بڑے اسٹائلش طریقے سے ساڑی باندھی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال خشک کرنے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ ارشد اس ساڑی میں مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے۔ انہی خیالوں میں گم تھی کہ ڈور بیل کی آواز سن کر چونک پڑی۔ اس وقت کون آ گیا۔ اماں جی اور سعیدہ کے تو اتنی جلدی آنے کا امکان نہیں تھا۔ بادلِ ناخواستہ دروازہ کھولنے گئی تو فرید اپنا مکروہ چہرہ لیے ..... کھڑا تھا۔ جی میں آیا... کہہ دوں کہ اس وقت میں گھر میں کوئی نہیں لہٰذا آپ بعد میں تشریف لائیے لیکن اس کی شان میں اتنی بڑی گستاخی کرنے کی ہمت نہ تھی لہٰذا بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”فرید بھائی آپ اس وقت؟“

”ہاں۔“ وہ بے تکلفی سے اندر آتے ہوئے بولا۔ ”اس طرف سے گزر رہا تھا کہ سوچا یہاں کا بھی ایک چکر لگا لوں۔ اس گھر کے مرد تو باہر جا کر بیٹھ گئے۔ اب مجھے ہی سب دیکھنا ہے۔“

مجھے اس کے بڑبولے پن پر ہنسی آئی اور غصہ بھی۔ کتنی ڈھٹائی سے وہ احسان جتا رہا تھا جو اس نے کیا ہی نہیں۔ اس کی آمدورفت محض دکھاوا تھی۔ وہ صرف باتیں بنانے اور مجھے تنگ کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ گھر کے سارے کاموں کی ذمے داری حسبِ سابق مجھ پر ہی تھی اور دیور کے جانے کے بعد باہر کے کاموں کا بوجھ بھی مجھ پر آ گیا تھا۔ سودا سلف کے علاوہ بل جمع کروانا اور ساس صاحبہ کی دوائیں لانا بھی میری ذمے داریوں میں شامل تھا۔ اس پر وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے ہی سب دیکھنا ہے۔ اس سے بڑا ڈھیٹ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ اس مصیبت سے کیسے جان

آغاخان، شہزادہ صدرالدین:
(1933ء)

ایران کے شہری۔ سر آغا خان سوم کے چھوٹے صاحبزادے۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکا) میں تعلیم پائی۔ 1958ء میں یونیسکو کے مشیر مقرر ہوئے۔ 60-1959ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے تارکینِ وطن کے مشیر رہے۔ 1961ء میں نوبیا (Nubia) کی قدیم یادگاروں کے تحفظ کی بین الاقوامی ایکشن کمیٹی کے سیکریٹری اور 65-1962ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے تارکینِ وطن کے ڈپٹی مقرر کیے گئے۔ 1965ء میں ہائی کمشنر بنا دیے گئے۔ ہارورڈ اسلامک ایسوسی ایشن کے بانی اور سیکریٹری اور کونسل آف اسلامک افیئرز نیویارک کے صدر رہے۔

آغاخان یونیورسٹی

پاکستان کی پہلی نجی یونیورسٹی۔ اس کا قیام کراچی میں 16 مارچ 1983ء کو عمل میں آیا۔ اسی روز صدرِ پاکستان نے اسے منشور (charter) عطا کیا۔ یہاں سب سے پہلے طب کا شعبہ قائم کیا گیا جہاں ایم بی بی ایس کا پانچ سالہ کورس کرایا جاتا ہے۔ نرسنگ کا شعبہ بھی اسی یونیورسٹی سے منسلک ہے۔ اس سے ملحق آغا خان اسپتال میں 654 بستروں کی گنجائش موجود ہے۔ یونیورسٹی کی عمارات جدید طرز کی ہیں۔

مرسلہ: ذہیب نعیم، لاہور

چھڑاؤں کیونکہ اس وقت گھر میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور تنہائی میں تو شریف سے شریف مرد کو شیطان بنتے دیر نہیں لگتی۔ وہ بے باک نگاہوں سے میرے جسم کا ایکسرے کررہا تھا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی اور بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر بلاؤز کو گیلا کررہے تھے جس کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کی تپش محسوس کرتے ہی ساڑی کا پلو اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور بولی۔

''فرید بھائی! سعیدہ کالج گئی ہوئی ہے اور اماں بھی گھر پر نہیں ہیں۔''

''پھر کیا ہوا، تم تو ہو۔ ویسے بھی میں تم سے ملنے کے لیے آتا ہوں۔ تمہاری کمپنی میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

میرا چہرہ غصے سے لال ہوگیا اور میں تیز آواز میں بولی۔ ''معاف کیجیے، مجھے یہ بے تکلفی پسند نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی بیوی کو کمپنی دیں۔ اس کے ساتھ آپ کا وقت زیادہ اچھا گزرے گا۔''

''دفع کرو، تم بھی کس کا ذکر لے بیٹھیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتی ہے اس لیے گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا ہوں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ چینج چاہیے۔''

''فرید بھائی، دراصل مجھے بھی ایک کام سے باہر جانا تھا اس لیے......''

''اچھا، اچھا سمجھ گیا۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تم یہی کہنا چاہ رہی ہو نا کہ میں اس وقت چلا جاؤں۔ ٹھیک ہے تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ بس ایک پیالی چائے بنادو، میں تمہارے کمرے میں کچھ دیر ستالوں پھر چلا جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر میرے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جلدی سے چائے بنا کر اس مصیبت سے جان چھڑاؤں۔ اس وقت گھر میں بسکٹ یا پھل وغیرہ کچھ نہ تھے لہٰذا میں نے چائے کی پیالی ٹرے میں رکھی اور دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ بے شرم بڑی بے تکلفی سے میرے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے ٹرے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فرید بھائی، چائے لے لیجیے۔''

''یہاں رکھ دو۔'' اس نے سائڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں ٹرے رکھنے کے لیے جھکی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''اس لباس میں تو غضب ڈھا رہی ہو۔''

میں اس کی بے باکی پر سٹپٹا کر رہ گئی اور بولی۔ ''آپ ہوش میں تو ہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑیں۔''

وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے۔ کیا تمہیں ابھی تک میری چاہت کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ میں تو عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ میں ہاتھ چھوڑ دوں۔ کیا مجھے بالکل احمق سمجھ رکھا ہے۔''

میں نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ''خبردار! اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا ورنہ میں چلا چلا کر پورے محلے کو اکٹھا کرلوں گی۔''

اس کشمکش کے دوران میری ساڑی کا پلو ڈھلک کر نیچے گر گیا اور اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالتی سعیدہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بھابی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کمرے کے دروازے پر آگئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی فرید پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کیا کررہی ہیں بھابی۔ آپ کو کیا ہوگیا ہے میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔''

میں اس کی مکاری پر حیران رہ گئی۔ اس نے عین وقت پر گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلا تھا اور ناسمجھ سعیدہ اس کے جھانسے میں آگئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور پھر فرید سے بولی۔ ''آپ اس وقت یہاں کیسے آگئے؟''

''یہ سوال تم اپنی بھابی سے کرو۔ انہوں نے ہی فون کرکے مجھے بلایا تھا۔ میں سمجھا کہ کوئی ضروری کام ہوگا اس لیے چلا آیا لیکن یہاں تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو۔''

اس کے بعد کی داستان بڑی دلخراش ہے۔ فرید کی بات پر سب نے اعتبار کرلیا۔ میری کسی نے ایک نہیں سنی۔ نجمہ کو تو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اسے اس سے اچھا موقع اور کب مل سکتا تھا حالانکہ ساس صاحبہ نے ان دونوں بہنوں کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ انہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ محض اپنی بدنامی کے ڈر سے ایسا کررہی تھیں۔ انہوں نے مجھے اسی وقت میکے جانے کا حکم دے دیا اور کہا کہ وہ مجھ جیسی بدکردار عورت کو گھر میں نہیں رکھ سکتیں کیونکہ میں نے ان کے داماد کو ورغلانے اور ان کی بیٹی کا گھر برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے گھر میں رکھنے کے

لیے تیار نہیں تھیں۔

میں روتی دھوتی اپنے میکے چلی آئی۔ جانتی تھی کہ نجمہ، ارشد کے کان بھرنے سے باز نہیں آئے گی۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ارشد کو فون کرکے خود ہی سارا قصہ سنادوں لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ ان دنوں ارشد جس سائٹ پر کام کررہے تھے وہ ان کے دفتر سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور میرے پاس صرف ان کے دفتر کا فون نمبر تھا۔ جس کے لیے ارشد نے تاکید کررکھی تھی کہ صرف ہنگامی صورتِ حال میں اس نمبر پر فون کیا جائے ورنہ عام حالات میں ہم لوگ خطوط کا ہی سہارا لیا کرتے تھے جب ارشد سے ٹیلی فون پر رابطہ نہ ہوسکا تو میں نے خط کے ذریعے انہیں پورا واقعہ لکھ کر بھیج دیا لیکن مجھے دیر ہوچکی تھی۔ نجمہ نے اس سے پہلے ہی اپنا کام دکھا دیا اور نمک مرچ لگا کر پورا قصہ بھائی کو لکھ بھیجا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر سعیدہ عین وقت پر نہ پہنچ جاتی تو ہمارے گھر کی عزت کا جنازہ نکل جاتا اور ہم لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

میں اپنی طرف سے خط بھیج کر مطمئن ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ ارشد میرا خط پڑھنے کے بعد فوراً مجھے اپنے پاس بلانے کا بندوبست کریں گے۔ اس واقعے کے بعد ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ عزت بچانے کے لیے اپنے گزشتہ فیصلے کو بدلنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ اب مجھے شدت سے ان کے خط کا انتظار تھا۔ اس بار یہ انتظار کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا ورنہ عام طور پر ایک ہفتے میں ان کا جواب آجاتا تھا۔ ہرحال پندرہ دن بعد خط کی بجائے مجھے ایک رجسٹرڈ لفافہ موصول ہوا۔ میں سمجھی کہ شاید انہوں نے ویزا بھیج دیا ہے لیکن ابھی تو میرا اور منے کا پاسپورٹ بھی نہیں بنا تھا پھر ویزا کیسے آسکتا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ اس میں رکھا ہوا کاغذ دیکھتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ طلاق نامہ تھا۔ ارشد نے مجھے تحریری طور پر تین بار طلاق دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مختصر سا خط بھی تھا جس میں لکھا تھا کہ انہیں مجھ سے ایسی بے وفائی اور گھٹیا حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے ان کی بہن کے سہاگ پر ڈاکا ڈالوں گی۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اپنے خط میں مجھے انتہائی غلیظ اور بے ہودہ القابات سے نوازا تھا۔ جن کا ذکر کرنا فضول ہے۔ وہ پوری طرح اپنی ماں اور بہنوں کے بہکاوے میں آچکے تھے۔ انہوں نے جذبات میں آکر یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ اگر میں بدکردار یا... بدچلن تھی تب بھی فرید میرے بلاوے پر کیوں دوڑا چلا آیا۔ وہ معمول کے مطابق شام کو دفتر سے واپسی پر بھی گھر آسکتا تھا۔ اس نے ایسے وقت کا انتخاب کیوں کیا جب سعیدہ گھر پر نہیں ہوتی تھی اور اماں جی گھٹنوں کی تکلیف کے سبب اپنے کمرے تک محدود تھیں اس لیے اگر وہ گھر میں بھی ہوتیں تو ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

ارشد کے اس اقدام پر خاندان بھر میں ایک بھونچال آگیا۔ سب سے زیادہ سخت ردِعمل امجد نے ظاہر کیا۔ اسے شکایت تھی کہ بھائی نے بھابی کی بات سنے بغیر اشتعال میں آکر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ وہ یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھا کہ میں بدکردار ہوسکتی ہوں۔ وہ میری اور فرید کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور جان گیا تھا کہ فرید نے اپنی کوشش میں ناکام ہوکر مجھ پر بہتان تراشا تھا۔ ناسمجھ سعیدہ اس کی چال میں آگئی اور یہی سمجھی کہ بھابی نے ہی فرید بھائی کو فون کرکے بلایا ہوگا۔ امجد اپنے گھر والوں سے اتنا برگشتہ ہوگیا کہ اس نے عمر بھر واپس نہ آنے کی قسم کھالی اور مجھے خط میں لکھا کہ اس کے گھر والوں نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے اور وہ ظالموں کا ساتھ نہیں دے سکتا لہٰذا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے قطع تعلق کررہا ہے۔ امجد کی ہمدردی سے مجھے کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا اسی طرح مرد کی زبان سے نکلے ہوئے تین لفظ عورت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محرومیوں کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں تاہم میرے دل کے اندر پیدا ہونے والے انتقامی جذبے کو اس خبر سے تھوڑی بہت تسکین ضرور ہوئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ امجد اپنی کہی ہوئی بات پر کب تک قائم رہتا ہے اگر یہ وقتی ردِعمل تھا تب بھی اس کی وجہ سے میری ساس، نندوں کو تھوڑی بہت پریشانی ضرور ہوئی ہوگی۔

میں نے سینے پر صبر کی سل رکھ لی اور اپنا مقدمہ رب کی عدالت میں پیش کردیا۔ مجھے پورا بھروسا تھا کہ میرے ساتھ انصاف ضرور ہوگا۔ میں بے گناہ اور معصوم تھی۔ مجھ پر ظلم ہوا تھا۔ اس لیے جانتی تھی کہ میرا رب مظلوموں کی فریاد سنتا ہے اور ان کی دادرسی کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے کسی کو بددعا نہیں دی۔ کسی سے شکوہ نہیں کیا بس خاموشی سے بیٹے کو لے کر ایک کمرے تک محدود ہوگئی۔ اب بیٹا ہی میری امیدوں کا محور تھا اور مجھے اس کے سہارے ہی زندگی گزارنا تھی۔

بعض اوقات مجھے ڈر لگتا کہ ارشد اور اس کے گھر والے مُنّے کی حوالگی کا مطالبہ نہ کردیں لیکن اس موقع پر ابو اور بھائی نے میری ہمت بندھائی اور کہا کہ اگر ان کی جانب سے ایسا کوئی مطالبہ ہوا تو ہم قانون کا سہارا لیں گے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی عدالت میں بھی جانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ ارشد سے مجھے ایسی امید نہیں تھی کیونکہ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے اور انہیں پیسے جمع کرنے کے علاوہ کسی بات سے غرض نہیں تھی۔ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ نجمہ سے تھا۔ وہ مجھے پریشان کرنے کی خاطر یہ شوشہ چھوڑ سکتی تھی لیکن ابو اور بھائی کے ہمت بندھانے کے بعد میں کسی حد تک مطمئن ہوگئی۔

میکے میں خوش حالی تھی۔ ابو اور بھائی ٹھیک ٹھاک کمارہے تھے۔ گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے باوجود میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رکھا تھا لیکن فائنل امتحان کے فوراً بعد ہی شادی ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے ملازمت نہ کرسکی۔ اب میں نے اس ڈگری کو کام میں لانے کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ ذرا سی کوشش سے کسی بڑے اخبار یا میگزین میں جاب مل سکتی تھی لیکن ابو اس کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھے ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے لیکن میں بھی انہی کی بیٹی تھی جو سوچ لیتی اس پر عمل کرکے ہی چین آتا تھا چنانچہ میں اپنے دلائل سے انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ معاشی خودمختاری ایک عورت کے لیے کتنی اہم ہے۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ میں اپنی اور مُنّے کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے ان کی جانب دیکھوں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں اپنی ضد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں تو بادلِ ناخواستہ انہوں نے مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔

میری پہلی ملازمت ایک روزنامہ اخبار میں تھی جہاں میں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ صحافت کا عملی تجربہ نہ ہونے کے سبب مجھے ابتدا میں تھوڑی سی دشواری ہوئی لیکن رفتہ رفتہ کام پر عبور حاصل کرتی گئی۔ میں اس اخبار کے خواتین ایڈیشن کے لیے کام کررہی تھی اور اس میں مجھے کافی مزہ آرہا تھا۔ میگزین سیکشن کے انچارج ایک سینئر صحافی تھے۔ میں انہی کے ماتحت کام کررہی تھی۔ وہ سارا دن ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے۔ انہیں اس بات پر بڑا زعم تھا کہ ان کے کئی شاگرد اس وقت مختلف اخبارات میں اچھی پوسٹوں پر کام کررہے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے کیبن میں بلایا اور بولے۔

''کام تو تم ٹھیک ٹھاک کرلیتی ہو لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ آخر کب تک اس طرح کنویں کا مینڈک بن کر رہو گی؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سر؟'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں رپورٹنگ کی طرف جانا چاہیے تاکہ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے۔''

''آپ کا کہنا بجا لیکن رپورٹنگ میں وقت بہت دینا پڑتا ہے اور میری گھریلو ذمّے داریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ جتنا کام کررہی ہوں میرے لیے یہی بہت ہے۔''

''او کے، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔'' وہ بڑی شائستگی سے بولے۔ ''لیکن میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ کبھی کبھی فیلڈ میں چلی جایا کرو۔ اگر تم مختلف شعبوں میں کام کرنے والی خواتین کے انٹرویوز کرو تو کیسا رہے گا۔ اس طرح تعلقات بڑھتے ہیں اور بعض اوقات اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔''

اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ انچارج صاحب نے میری کافی مدد کی۔ انہوں نے شہر کی نامور خواتین کی ایک فہرست بنائی اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اس کے بعد انہوں نے باری باری ان سے ٹیلی فون پر ہی انٹرویو کے لیے وقت مانگ لیا اور مجھے یہ سہولت دے دی کہ... جب کبھی انٹرویو کے لیے جانا ہو تو میں دفتر کی گاڑی استعمال کرسکتی ہوں۔ یہ تجربہ واقعی کامیاب رہا۔ شاہین صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس طرح مجھے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔ اس سے پہلے تو میں نے اپنے میکے اور سسرال کے علاوہ کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کیسے کیسے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ اس دوران میں نے بے شمار خواتین کے انٹرویوز کیے۔ ان میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتیں شامل تھیں۔ بینکر، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز بددماغ آفیسرز، لیڈی ڈاکٹرز، پروفیسرز، وکیل، سماجی کارکن اور فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں تک کے انٹرویوز کیے۔ میں نے تو گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں اور زنانہ پولیس کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس طرح میرے تعلقات وسیع ہوتے گئے اور میری ڈائری فون نمبروں سے بھر گئی۔ میں کبھی کبھار کسی بااثر عورت کو فون کرکے ہائے ہیلو کرتی تو وہ مجھ سے بڑے خلوص اور گرم جوشی سے پیش آتیں۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ چھاپتی رہوں بلکہ چند ایک نے تو مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس خدمت کے عوض معاوضے کی بھی پیشکش کی۔ جب میں نے شاہین صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے۔

''یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اوپر سے نیچے تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ تم چاہو تو بہتی گنگا میں ہاتھ دھوسکتی ہو۔''

''اگر میں نے اس طرح لوگوں سے پیسے لینا شروع کردیے تو ان کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جائے گی اور اس کے بدلے میں ان کی ہر جائز و ناجائز بات ماننے پر مجبور ہوجاؤں گی۔ نو سر، میں ایسا نہیں کرسکتی۔ مجھے اپنی عزت اور وقار ہر حال میں عزیز ہے۔''

''مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی لیکن دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا بھی ٹھیک نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم پیسے لیے بغیر ہی ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی رہو۔ اس طرح یہ عورتیں تمہاری احسان مند رہیں گی اور وقت پڑنے پر تم ان سے اپنا کوئی کام بھی کرواسکتی ہو۔''

میری یہ روش بہت سی عورتوں کے لیے حیران کن تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اس زمانے میں لفافے کے بغیر بھی کوئی کام ہوسکتا ہے تاہم وہ میری ایمان داری اور دیانت داری کی معترف تھیں۔ اس طرح میں نے کئی عورتوں پر احسان کیا۔ ان میں ٹی وی اداکارائیں، ماڈلز، بیوٹی پارلر والیاں، پرائیوٹ اسکولوں کی مالکان اور سیاست دان بھی شامل تھیں۔ وہ سب مجھ سے قریب ہونے کے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ مجھے شہر میں ہونے والی بیشتر تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ میری میز پر ہر روز چار چھ دعوت نامے پڑے ہوتے۔ میں کسی بہت ہی خاص جگہ پر جاتی ورنہ عام طور پر مصروفیت کا بہانہ کرکے ٹال دیا کرتی۔

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ اب میں ایک کامیاب جرنلسٹ بن چکی تھی۔ میری تنخواہ میں بھی معقول اضافہ ہوگیا تھا اور میں نے اپنی حلال کی کمائی سے ایک چھوٹی سی کار بھی خرید لی تھی۔ ایک روز رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک مانوس سی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز کو تو میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ ارشد تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی لیکن میں نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میرے ذہن میں ایک نئے اندیشے نے سر اٹھایا اور مجھے یہ سمجھنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ ارشد نے کیوں فون کیا تھا۔ یقیناً وہ مُنّے کے سلسلے میں کوئی بات کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ کہیں وہ اس کی حوالگی کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کیا کروں گی۔ مُنّے کے بغیر تو جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ اس خیال کے آتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی اور میرا پورا بدن پسینے سے شرابور ہوگیا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی پھر مجھے مسز کاظمی کا خیال آیا۔ وہ شہر کی نامور وکیل تھیں اور زیادہ تر عائلی مقدمات کی پیروی کیا کرتی۔ میں دو مرتبہ ان کا انٹرویو چھاپ چکی تھی اور اس حوالے سے وہ میری کافی احسان مند تھیں۔ میں نے ڈائری دیکھ کر ان کا نمبر ڈائل کیا اور سلسلہ ملنے پر بولی۔

''مسز کاظمی، میں آپ سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتی ہوں۔''

''خیریت تو ہے، ایسی کیا بات ہوگئی؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

''فون پر نہیں بتاسکتی۔ بس میں آپ کے پاس آرہی ہوں۔''

''شوق سے آؤ، میں تمہیں منع نہیں کروں گی لیکن رات بہت ہوچکی ہے۔ اس وقت تمہارا گھر سے نکلنا ٹھیک نہیں۔ اگر تم کسی سلسلے میں پریشان ہو تو سمجھ لو کہ مجھے فون کرنے کے بعد تمہاری پریشانی دور ہوگئی۔ اب یہ میرا مسئلہ ہے اور اس پر ہم صبح بات کریں گے۔''

''لیکن مسز کاظمی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''صبح تک تو بہت دیر ہوجائے گی۔''

''اگر تمہیں کسی سے کوئی خطرہ ہے تو میں علاقہ ایس ایچ او کو فون کرکے تمہاری سیکورٹی کا بندوبست بھی کرسکتی ہوں اور جس سے تمہیں خطرہ ہے اس کا نام اور پتا بتادو پولیس والے ایسے مہمانوں کی تواضع کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مسز کاظمی کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ ان کے .... ایک ٹیلی فون پر پولیس موبائل میرے دروازے پر آکر کھڑی

ہو جاتی۔ ''میں کل لنچ ٹائم میں آپ کے پاس آؤں گی۔''

''گڈ گرل۔'' وہ شفقت آمیز لہجے میں بولیں۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

دوسری صبح ناشتے پر ابو نے مجھے بتایا کہ رات ارشد نے انہیں بھی فون کیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی میں ناشتا چھوڑ کر غصے سے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''آپ کو ان سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ فون بند کر دیا ہوتا۔ اب وہ کس رشتے سے بات کرنا چاہ رہے ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ مُنّے سے ملنا چاہتا ہے۔''

''میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ ویسے تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکی لیکن ان سے انتقام تو لے سکتی ہوں اور میرا انتقام یہی ہے کہ وہ ساری عمر اپنے بچے کی صورت دیکھنے سے محروم رہیں۔''

''تم اسے بچے سے ملنے سے نہیں روک سکتیں۔ یہ اس کا قانونی حق ہے۔''

''جب بات قانون اور عدالت تک پہنچے گی تو میں بھی دیکھ لوں گی۔ فی الحال تو میری طرف سے کہہ دیں کہ یہ ممکن نہیں ہے۔''

اس کے بعد میں نے جیسے تیسے اپنا ناشتا ختم کیا اور دفتر کے لیے روانہ ہو گئی۔ ارشد کے آجانے سے میری پُرسکون زندگی میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے طلاق دینے کے بعد بھی ان کا دل نہیں بھرا تھا اور وہ ایک نیا ستم کرنے کے لیے کسی عذاب کی مانند مجھ پر نازل ہو گئے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اگر ارشد نے فون کر کے مجھے یا ابو کو پریشان کرنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف پولیس میں درخواست دے دوں گی۔

مسز کاظمی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ ''پہلے کھانا کھا لو پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مسز کاظمی کا خیال کر کے ان کا ساتھ دینے کے لیے بیٹھ گئی۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے چیمبر میں لے گئیں اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟''

میں نے تفصیل سے انہیں سارا قصہ سنا دیا تو وہ بولیں۔ ''تمہیں ارشد سے ایک دفعہ مل لینا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔''

''اب ہمارے درمیان باقی کیا رہ گیا ہے جو وہ مجھ سے کوئی بات کریں گے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے مجھے پریشان کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے جبکہ میں کسی قیمت پر بھی انہیں بچے سے نہیں ملنے دوں گی اور نہ ہی ان کے حوالے کروں گی۔ اگر انہوں نے زیادہ تنگ کیا تو بچے کو لے کر ایسی جگہ چلی جاؤں گی کہ وہ ساری عمر مجھے ڈھونڈتے ہی رہیں گے لیکن انہیں بیٹے کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔''

''اس وقت تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہو جبکہ تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ارشد بچے سے ملنا چاہتا ہے تو اسے مت روکو ورنہ وہ قانونی راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ تم نے جو حالات بتائے ہیں ان سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ بچے سے ملنے کے بعد خاموشی سے چلا جائے گا کیونکہ ابھی تمہارا بیٹا بہت چھوٹا ہے اور وہ اس کی کسٹڈی کے لیے مطالبہ نہیں کر سکتا۔''

''میں تو آپ کے پاس بہت امید لے کر آئی تھی لیکن مایوس ہو کر جا رہی ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔ ''تم ایک دفعہ ارشد سے مل کر یہ تو معلوم کرو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کے کہنے پر یہ کڑوا گھونٹ پینے کے لیے تیار ہوں لیکن اگر انہوں نے بچے کے سلسلے میں مجھے مجبور کیا تو آپ کو پوری طرح میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

شام کو گھر پہنچی تو ایک نئی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ارشد خود تو نہیں آئے لیکن انہوں نے نجمہ اور سعیدہ کو میرے پاس بھیج دیا۔ سعیدہ کے لیے تو میں نرم رویّہ اختیار کر سکتی تھی لیکن نجمہ کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ جی میں آیا کہ ان دونوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں لیکن ابو کی شکل دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آئے اور بولے۔ ''گھر آئے مہمان کا تھوڑا بہت لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ پہلے ان کی بات سن لو پھر تم جو فیصلہ کرو گی وہ مجھے منظور ہوگا۔''

میں بادلِ ناخواستہ ان کے ساتھ باہر چلی آئی۔ نجمہ اور سعیدہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سعیدہ مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے بڑھی لیکن میں نے

ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور رکھائی سے بولی۔ ''زیادہ چوچلے بگھارنے کی ضرورت نہیں۔ جو کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''آسیہ بھابی! میں جانتی ہوں کہ آپ ہم لوگوں سے بہت ناراض ہیں۔'' نجمہ بولی۔ ''آپ کا غصہ بجا لیکن جو کچھ ہم کہنے آئے ہیں اسے ایک مرتبہ ٹھنڈے دل سے سن لیجیے۔ ممکن ہے کہ بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''دو سال بعد تم لوگوں کو میری بہتری کی فکر کیوں ہونے لگی؟'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''تمہارے بھائی نے میری زندگی کو دوزخ بنا دیا۔ اب تم کس بہتری کی بات کرنے آئی ہو؟''

''ارشد بھائی اپنے کیے پر بہت پشیمان ہیں۔'' سعیدہ بولی۔ ''انہیں احساس ہو گیا ہے کہ اشتعال میں آکر انہوں نے انتہائی قدم اٹھایا تھا لیکن اب وہ اس کا مداوا چاہتے ہیں۔''

''سعیدہ، تم بھول رہی ہو کہ وہ مجھے طلاق دے چکے ہیں اور اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ارشد بھائی ہر قیمت پر اپنا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ اب ان سے یہ دوری برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ بیوی اور بچے کی یاد انہیں ہر وقت بے کل کیے رکھتی ہے۔ فرید بھی آپ سے بہت شرمندہ ہیں اور بار بار یہی کہتے ہیں کہ کاش اس روز وہ اپنی سسرال نہ گئے ہوئے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔''

فرید کا ذکر آتے ہی میری کنپٹیاں غصے سے سلگنے لگیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارے شوہر ہیں۔ اس لیے ان کی شان میں گستاخی کر کے اپنی زبان خراب نہیں کرنا چاہتی۔ بہتر ہوگا کہ تم کام کی بات کرو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔''

''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔'' نجمہ تن کر بولی۔ ''وہ بے چارے تو آپ کی بھلائی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے ہی ایک مولوی سے مل کر ایک راستہ تجویز کیا ہے جس کے ذریعے آپ اپنے گھر واپس آسکتی ہیں۔''

شاید یہ میرے دل کا چور تھا یا تنہائی کی گھٹن جس نے مجھے لمحے بھر کے لیے اپنی جگہ سے ہلا دیا اور میں اس کمزور لمحے کی گرفت میں آتے ہوئے بولی۔ ''بھلا میں بھی تو سنوں کہ وہ کون سا راستہ ہے کیونکہ میرے خیال میں تو تین طلاق کے بعد عورت، شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔''

''اگر آپ حلالہ کر لیں تو اس کے بعد ارشد بھائی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔''

یوں لگا جیسے کسی نے مجھے گالی دے دی ہو۔ اب میں کچھ کچھ اس سازش کو سمجھ رہی تھی لہٰذا اس کی تہ تک پہنچنے کے لیے میں نے کہا۔ ''اگر میں بھی تمہارے بھائی کے لیے تڑپ رہی ہوتی تو شاید اس تجویز پر غور کر لیتی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے اور تمہارے پورے خاندان سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ایسا کون سا شخص ہوگا جو صرف حلالہ کے لیے مجھ سے نکاح کرے اور اس کے بعد آزاد کر دے؟''

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا گھر آباد ہو جائے اور مُنّا بھی باپ کی شفقت سے محروم نہ رہے۔ اس کے لیے آپ کو یہ کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔ میں بھی تو اپنے بھائی کی خوشی کے لیے اتنی بڑی قربانی دے رہی ہوں ورنہ کون عورت اپنے سہاگ میں شراکت برداشت کر سکتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے فرید......'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں بھابی، وہی ایسے شخص ہیں جن پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ کسی دوسرے کا کیا بھروسا، بعد میں طلاق دینے سے انکار کر دے۔''

''نجمہ...!'' میں پوری قوت سے چلّائی۔ ''اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے اور میں تم دونوں کو دھکے دے کر باہر نکال دوں، خود ہی شرافت سے چلی جاؤ اور آئندہ کبھی یہاں کا رخ نہ کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ تم لوگوں نے مجھے کھلونا سمجھ لیا ہے۔ جب چاہا کھیل لیے جب چاہا توڑ دیا۔''

''سوچ لیں بھابی۔'' نجمہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اس انکار کی آپ کو بہت بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی۔ ہم عدالت کے ذریعے بھی مُنّے کو لے جا سکتے ہیں۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' میں نے چلّاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتی۔''

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے ٹھنڈے دل سے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ پہلا خیال تو ذہن میں یہی آیا کہ شاید ارشد کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ بیوی اور بچے سے دوری برداشت نہیں کر پا رہے لیکن بہت بعد میں معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ انہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان کی نظر میری کمائی پر تھی کیونکہ ان کی جاب ختم ہو چکی تھی اور وہ کافی عرصے سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے...... ایسی

صورت میں انہیں میری یاد ستانے لگی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حلالہ کے بعد وہ مجھے دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں تو فرید سے مشورہ کیا گیا اور اس خبیث انسان نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خدمات پیش کردیں تاکہ اس طرح وہ وقتی طور پر میرے جسم کا مالک بن سکے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد وہ مجھے آزاد کردے گا۔

ان لوگوں نے بہت شاندار منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ اب میں پہلے جیسی ڈرپوک اور بزدل لڑکی نہیں تھی جو اُن کے ہر حکم پر بلا چون وچرا عمل کرلیتی بلکہ ایک آزاد، خود مختار اور معاشی طور پر مضبوط عورت بن چکی تھی۔ معاشرے میں میرا ایک مقام تھا اور تعلقات کے بل پر بہت کچھ کرسکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارشد نے میری زندگی میں جو زہر گھولا تھا اس کے اثرات بہت گہرے تھے اور ان سب لوگوں نے مل کر مجھے برباد کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا اس کے بدلے میں انہیں نفرت اور انتقام کے سوا کچھ نہیں دے سکتی تھی لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے کسی کو کوئی بد دعا نہیں دی۔ کوئی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے سامنے روئی پیٹی البتہ ہر نماز کے بعد میں ایک ہی دعا مانگتی اور رب کے حضور دامن پھیلا کر گڑگڑاتی۔ ”تو نیتوں کا حال جانتا ہے اگر میں قصوروار ہوں تو اس زندگی میں ہی مجھے سزا مل جائے ورنہ میں تجھ سے انصاف مانگتی ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں۔“

انصاف کے تقاضے پورے ہوئے اور میری بربادی کے سبھی ذمے دار ایک ایک کرکے اپنے انجام کو پہنچتے گئے۔ ارشد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ان کی بیرونِ ملک ملازمت ختم ہوچکی تھی اور لاکھ کوشش کے باوجود انہیں دوبارہ ویزا نہیں مل سکا چنانچہ وہ یہیں ایک معمولی ملازمت کرنے پر مجبور ہوگئے، تنگ دستی نے گھر میں ڈیرے ڈال لیے۔ ساسو ماں کے گھٹنوں کی تکلیف اتنی بڑھی کہ وہ وہیل چیئر تک محدود ہوگئیں۔ ان کا واحد علاج آپریشن تھا جس کے لیے پانچ لاکھ روپوں کی ضرورت تھی اور ارشد کے مالی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ یہ خرچ برداشت کرسکتے۔ سعیدہ کی شادی کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہوتا جارہا تھا شروع شروع میں تو کچھ رشتے آئے لیکن ساس صاحبہ نے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال لیا۔ اب رشتے آنا بند ہوگئے تھے اور سعیدہ نے وقت گزاری کے لیے محلے کے ایک اسکول میں ملازمت کرلی تھی۔ سب سے برا نجمہ اور فرید کے ساتھ ہوا۔ نجمہ کی شادی کو کافی عرصہ ہوگیا تھا لیکن وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی جبکہ فرید کو شدت سے بچے کی آرزو تھی۔ نجمہ نے اپنا معائنہ کروایا تو معلوم ہوا کہ اندرونی نظام میں کسی پیچیدگی کے سبب وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہے جبکہ فرید میں کوئی خرابی نہیں تھی لہٰذا اس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کرلی۔ نجمہ اپنی فطرت سے مجبور ہوکر سوتن کا وجود برداشت نہ کرسکی اور لڑ جھگڑ کر میکے چلی آئی۔ فرید نے ابتدا میں اسے منانے کی کوشش کی لیکن تھک ہار کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

مجھے یہ سب باتیں اس لیے معلوم ہوتی رہیں کہ جب نجمہ نے عدالت کے ذریعے بچہ واپس لینے کی دھمکی دی تو میں محتاط ہوگئی تھی اور میں نے کچھ ایسا بندوبست کرایا جس کے ذریعے مجھے وہاں کی خبریں ملتی رہیں۔ اس کے بعد ارشد کے حالات اتنے خراب ہوگئے کہ انہوں نے بھول کر بھی میرے یا بیٹے کے بارے میں نہیں سوچا پھر ایک روز ایسی اندوہناک خبر ملی جس نے میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ فرید کی کار کو حادثہ پیش آیا جس کے نتیجے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ دوسری بیوی اس کا ساتھ نہ دے سکی اور اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک ایک کرکے اس کی تمام جمع پونجی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد مکان بیچنے کی نوبت آگئی۔ نجمہ ترس کھا کر اسے اپنے ہمراہ لے آئی۔ اب وہ سسرال کا کتا بن کر بھکاریوں کی سی زندگی گزار رہا ہے۔

سچ پوچھیں تو مجھے ارشد کی حالت پر بہت ترس آتا ہے۔ اس تنگ دستی میں بھی انہیں ماں، دو بہنوں اور بہنوئی کی کفالت کرنا پڑ رہی ہے۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھلا سکتی جب انہوں نے یہ کہہ کر مجھے اپنے پاس بلانے سے انکار کردیا تھا کہ اس طرح انہیں دو گھروں کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا اور وہ اپنے مستقبل کے لیے کچھ بھی پس انداز نہیں کرسکیں گے۔ کاش وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے تو فرید کی نیت بھی خراب نہ ہوتی اور اس کی وجہ سے میری زندگی میں جو طوفان آیا اس سے بھی محفوظ رہتی۔

میری پردیس جانے والوں سے یہی گزارش ہے کہ وہ اپنا مستقبل بہتر بنانے کی جدوجہد ضرور کریں لیکن ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیں کہ باہر جانے کے بعد ان کے اہلِ خانہ پر کیا گزرے گی۔ اس معاشرے میں جوان عورت کا تنہا رہنا کسی عذاب سے کم نہیں اور فرید جیسے بھیڑیے ہر وقت ان کی تاک میں رہتے ہیں۔



انتظار لاحاصل

محترمہ مدیرہ اعلیٰ
سلام شوق

میں سرگزشت کی پرانی قاری ہوں، آج سوچا کہ میں بھی آپ کے قلمکاروں کی صف میں شامل ہوجاؤں اس خیال سے میں نے خود اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ اس کوشش میں کتنا کامیاب ٹھہری اس کا فیصلہ آپ کریں۔ اگر یہ کہانی آپ کو پسند آگئی تو اپنی ایک اور سہیلی کی کہانی لکھوں گی۔

شہانہ شانی
(حیدر آباد)

میری کہانی میں آپ کو کوئی نئی بات ملے گی، نہ آج کل کی فلموں اور ڈراموں کی طرح کا کوئی گلیمر! ہاں، اس میں عبرت ضرور موجود ہے۔ ان تمام نوخیز لڑکیوں کے لیے جو کچی عمروں میں اپنی آنکھوں میں خواب سجالیتی ہیں، خواب دیکھنا کوئی ایسی غلط بات نہیں ہے کہ خوابوں پر تو کسی کو بھی اختیار نہیں ہے لیکن ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنا ہر لڑکی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

میں نے بھی بہت کچی عمر میں اپنی آنکھوں میں کچھ خواب سجائے تھے لیکن ان کی تعبیر اتنی بھیانک نکلی کہ آج تک پچھتاوے میرا مقدر ہیں اور نہ جانے کب تک یہ ہولناک خواب میرا پیچھا کریں گے؟

ہمارا گھرانا درمیانے درجے کا ایک گھرانا تھا۔ مجھ

سے بڑا ایک بھائی تھا جو اس وقت بی اے فائنل میں پڑھتا تھا اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جو اُن دنوں چھٹی اور ساتویں جماعت میں پڑھ رہی تھیں۔ ابو ایک مقامی بینک میں کیشیئر تھے۔

ہم ان دنوں فیڈرل بی ایریا میں رہتے تھے۔ میں میٹرک میں تھی اور اپنی کلاس کی پڑھاکو لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ دونوں چھوٹی بہنیں شائستہ اور نسرین بھی پڑھائی میں اچھی تھیں اور وقار بھائی بھی بہت ذہین تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ بی اے کے بعد وہ مقابلے کے امتحان میں حصہ لیں گے جس کے لیے انہوں نے بی اے کے ساتھ ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری بھی شروع کردی تھی۔

اس دن میں گھر سے نکلی تو موسم خاصا خوشگوار تھا۔ مجھے اسکول عموماً بس میں جانا پڑتا تھا۔ ایوب منزل کا بس اسٹاپ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا، صرف پانچ منٹ کا راستہ تھا۔ راستہ میں کبھی اکیلی اور کبھی نجمہ کے ساتھ ہنستے بولتے طے کرلیتی تھی۔ نجمہ اکثر اسکول سے چھٹی کرتی تھی اس لیے اب میں نے اس کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسکول جاتی بھی تھی تو کبھی وقت پر گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی دیر ہوتی تھی۔

اس دن بھی میں تیار ہوکر حسبِ معمول گھر سے ساڑھے سات بجے نکلی۔ وہاں سے بس بھی آسانی سے مل جاتی تھی اور اس میں جگہ بھی ہوتی تھی اس لیے مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

میں گھر سے نکلی تو مجھے ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ اپنی بائیک کو ککیں لگا رہا تھا اور وہ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

نوجوان نے بائیک کو زمین پر لٹانے کی کوشش کی۔ بائیک میں پیٹرول ختم ہوجائے تو لوگ عموماً بائیک کو زمین پر لٹا کر اس کی ٹنکی کا پیٹرول دوسری طرف منتقل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

ہنسی مجھے اس وقت آئی جب بائیک کو زمین پر لٹانے کی کوشش میں اس نوجوان کا پیر پھسلا یا پھر وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور بائیک کے ساتھ ساتھ خود بھی زمین پر لیٹ گیا۔

اسے اس حال میں دیکھ کر بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ جہاں گرا تھا، وہاں زمین کچی تھی اور کچھ کیچڑ بھی تھی۔ زمین پر گرنے سے اس کے اجلے اور بہترین استری شدہ کپڑے کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔

میری ہنسی کی آواز سن کر اس نے جھنجلا کر میری طرف دیکھا، پھر اٹھنے کی بجائے مجھے دیکھتا ہی رہا۔

میں ہنسی ضبط کرتی ہوئی اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔

اس لڑکے کی کالی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور کشش تھی، رنگ گورا تھا اور مجموعی طور پر وہ خاصا خوب رُو لڑکا تھا لیکن ایسے لڑکے روز ہی میری نظر سے گزرتے تھے اس لیے بس اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے میں اسے بھول گئی۔

دوسرے دن جب میں تیار ہوکر گھر سے نکلی تو وہ لڑکا اپنی بائیک سمیت پھر موجود تھا اور بائیک کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا تو مجھے گزشتہ دن کا واقعہ یاد کرکے پھر ہنسی آگئی۔

اس نے گویا مجھے جتانے کے لیے بائیک... کو کک لگائی اور اسے پہلی ہی کک میں اسٹارٹ کرلیا، پھر وہ بہت سست رفتاری سے بائیک چلانے لگا۔ اس کے باوجود وہ کبھی مجھ سے آگے نکل جاتا تو بائیک روک کر میرا انتظار کرتا۔

مجھے اس کی یہ حرکت بری بھی لگ رہی تھی لیکن اس پر ہنسی بھی آرہی تھی کہ موصوف بائیک چلا کر مجھے یہ جتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ انہیں بائیک چلانا آتی ہے۔

میں بس اسٹاپ پر پہنچی تو وہ بائیک روک کر سامنے والی پان کی دکان پر چلا گیا اور وہاں سے کچھ ٹافیاں اور سونف سپاری لے کر واپس بائیک تک آگیا۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بہت غیر محسوس انداز میں مجھے سونف سپاری کی آفر کی۔ میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

اسی وقت بس آگئی اور میں اس بس میں سوار ہوگئی۔

میں اسکول کے اسٹاپ پر اتری تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ موصوف پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ گویا وہ بس کے ساتھ ساتھ وہاں تک پہنچے تھے۔

اب مجھے باقاعدہ اس پر غصہ آگیا کہ یہ مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہا ہے۔ مجھے خود پر افسوس بھی ہوا کہ ناحق میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مسکرایا لیکن میں اب اس سے یکسر انجان بن گئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر اسکول میں داخل ہوگئی۔

مجھے یہی پریشانی تھی کہ کہیں چھٹی کے وقت بھی وہ لڑکا موجود نہ ہو۔ اس دن پڑھائی میں میرا دل بھی نہیں لگا۔

میری اس پریشانی کو میری ایک نزدیکی دوست نزہت نے بھانپ لیا اور اس نے موقع دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے شبانہ! تم صبح سے کچھ پریشان ہو، گھر میں تو سب خیریت ہے؟“

”ہاں، گھر میں سب خیریت ہے۔“ میں نے بھی کہہ دیا۔

”پھر کیا بات ہے شاہانہ“ نزہت نے پوچھا۔

اس کے بہت زیادہ اصرار پر میں نے اسے آج کا واقعہ بتادیا۔

میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ”تم ابھی تک پرائمری کی بچی ہو شاہانہ! اتنی سی بات سے پریشان ہوگئیں۔ ارے! یہ تو روز کا معمول ہے پگلی!“

”روز کا معمول؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، اس قسم کے چھچھورے لڑکے گلی گلی ملتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کو بہلانے پھسلانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ لعنت بھیجو ان پر۔ وہ لوگ اس سے زیادہ کر بھی نہیں سکتے۔ دور دور سے دیکھیں گے، اشارے کریں گے، پھر مایوس ہوکر کسی اور لڑکی کی طرف چلے جائیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ایسا اتفاق تمہارے ساتھ بھی ہوچکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے تم اتنے اعتماد سے یہ بات کہہ رہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، میرے ساتھ بھی دو تین دفعہ ایسا ہوچکا ہے۔“ نزہت نے کہا۔ ”مجھے تو حیرت تھی کہ تم اتنی حسین، جاذبِ نظر اور متناسب جسم کی مالک ہو، کسی لڑکے کی نظر اب تک تم پر کیوں نہیں پڑی؟“

”اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”بے وقوف لڑکی! ایسے لڑکے تو پہلے خوب صورت لڑکیوں ہی کو تاکتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ان کے ہتھے چڑھ گئی تو چڑھ گئی۔ عموماً خوب صورت لڑکیوں کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے۔ وہ اگر ان ہی لڑکوں کی طرح چھچھوری ہوتی ہیں تو ہزار نخروں کے بعد ان سے میل جول بڑھا لیتی ہیں۔ ان سے تحفے وصول کرتی ہیں، پھر مطلب نکل جانے کے بعد انہیں دھتکار دیتی ہیں۔“

”تم بھی تو خوب صورت ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اب تک تمہیں کوئی ایسا لڑکا نہیں ملا جو تمہیں بھی پسند آیا ہو؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”مجھے اس کے لیے باہر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایسا لڑکا میرے خاندان ہی میں موجود ہے اور میرے قریب بھی ہے۔“ نزہت نے ہنس کر کہا۔

”تم تو بہت چھپی رستم ہو۔“ میں نے کہا۔ ”گویا خاموشی سے منگنی کرلی اور مجھے بتایا تک نہیں۔“

”ارے منگنی کس کم بخت کی ہوئی ہے۔“ نزہت نے کہا۔ ”نزدیک ہونے کا مطلب منگنی تو نہیں ہے۔ ابھی تو اعجاز سے تعلقات بڑھا رہی ہوں، اعجاز میرا ماموں زاد ہے۔ انتہائی ہینڈسم اور پُرکشش! موصوف کو پچھلے دو تین مہینوں سے جم جانے کا شوق چڑھ آیا ہے اور اب اچھی خاصی باڈی بنالی ہے۔ اور سلیولیس ٹی شرٹ پہن کر اپنے مسل دکھاتے پھرتے ہیں۔“

”خاندان میں اور لڑکیاں بھی تو ہوں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، ہمارے خاندان میں اور بھی لڑکیاں ہیں لیکن مجھے فائزہ سے خطرہ ہے۔ وہ بھی ہماری ماموں زاد ہے لیکن بہت آزاد خیال ہے اور فیشن کی دلدادہ! مجھے بس یہی خدشہ ہے کہ اعجاز کہیں اس کے حسن کے جال میں نہ الجھ جائے۔“

”تم تو خیر اس معاملے میں خود کفیل ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اس لڑکے سے کیسے نمٹوں؟“

”ایک بات کہوں؟“ نزہت کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ ”اگر وہ لڑکا واقعی خوب رُو اور ڈیشنگ ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں کیا برائی ہے؟“

”تم پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ مجھے الٹی پٹی پڑھا رہی ہو۔ وقار بھائی کو معلوم ہوگیا تو وہ مجھے جان سے ماردیں گے۔“

”ارے کوئی کسی کو جان سے نہیں مارتا۔ تم اندرون سندھ یا علاقہ غیر میں نہیں رہتیں کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑکیوں کو قتل کردیا جائے۔ یہاں لوگ مہذب ہیں۔“

میں اسکول سے باہر نکلی تو نزہت کی باتیں میرے ذہن میں گردش کررہی تھیں۔ اس کے خیال میں، میں حسین تھی، خوب صورت جسم کی مالک تھی، پھر کوئی لڑکا میری طرف متوجہ ہوا تو یہ حیرت کی بات نہ تھی۔

اس کے باوجود مجھے اس کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں اس لڑکے کی حوصلہ افزائی کروں۔

اسکول سے باہر نکل کر میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ لڑکا وہاں موجود نہیں تھا۔

دوسرے دن میں اسکول کے لیے نکلی تو وہ لڑکا پھر اپنی بائیک سمیت موجود تھا۔ آج اس نے ہاف آستین کی ٹی

شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے مسلز جھانک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک! اس کی آنکھوں میں وہ ہوس نہیں تھی جو عموماً مجھے اسٹاپ پر کھڑے ہوئے دوسرے لڑکوں کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتی تھی جب ان کی نظر مجھ پر پڑتی تھی۔

پہلے کی طرح اس نے میرے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے مجھ سے پہلے ہی اسٹاپ کا رخ کرلیا اور جا کر اس پان کی دکان پر کھڑا ہو گیا جہاں سے گزشتہ روز اس نے ٹافیاں اور سونف سپاری لی تھی۔

وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک مرتبہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں مایوسی دکھائی دی۔

اسی وقت بس آگئی اور میں اس میں سوار ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکا مجھ سے پہلے اسکول کے اسٹاپ پر موجود ہوگا۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور تیز تیز قدموں سے اسکول کا گیٹ پار کرگئی۔

ہاف ٹائم میں نزہت نے مجھ سے پوچھا۔ ''سناؤ شاہانہ! تمہارے اس مجنوں کے کیا حال ہیں؟''

''کون مجنوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے، وہی بائیک والا لڑکا؟'' نزہت نے مسکرا کر کہا۔

''آج صبح وہ مجھے نظر آیا تھا لیکن میں نے اسے بالکل نظر انداز کردیا۔ ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اس لیے وہ مایوس ہو گیا۔''

''کیا مطلب؟'' نزہت نے پوچھا۔ وہ اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔

''مطلب یہ کہ جب میں نے اسے لفٹ نہیں کرائی تو اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔'' میں نے کہا۔ ''کل وہ اسکول تک میری بس کے ساتھ ساتھ آیا تھا اور یہاں کھڑا ہو کر میرا انتظار کررہا تھا۔ آج وہ یہاں آنے کی بجائے سیدھا نکل گیا۔''

''چل، یہ تو بہت اچھا ہوا؟'' نزہت نے کہا۔ ''تیری جان اس پریشانی سے چھوٹی۔''

''تم سناؤ، تمہارے باڈی بلڈر کا کیا حال ہے؟'' باڈی بلڈر پر مجھے ایک دفعہ پھر وہ لڑکا یاد آگیا۔ اس کا جسم دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے بھی جم جانے کا شوق ہے۔

''میرا باڈی بلڈر کل شام آیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے چائے بنائی، پکوڑے بنائے لیکن موصوف اتنی جلدی میں تھے کہ امی سے چند باتیں کر کے اور چائے کا آدھا کپ پی کر چلے گئے۔ وہ شاید امی کو کمیٹی دینے آئے تھے۔ امی نے ایک کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ اس میں ممانی جان بھی شریک ہیں۔''

''اس طرح تو کام نہیں چلے گا نزہت۔'' میں نے اسے چھیڑا۔ ''تو تو کہہ رہی تھی کہ میں اس سے تعلقات بڑھا رہی ہوں لیکن اس کے طور طریقوں سے ایسا نہیں لگتا۔''

''اسے اپنی پُرکشش شخصیت پر ناز ہے۔'' نزہت نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا نہ میرے، نہ فائزہ کے۔''

ہاف ٹائم ختم ہوا تو ہم کلاس میں چلے گئے۔

پھر دو تین دن گزر گئے۔ مجھے وہ بائیک والا لڑکا نظر نہیں آیا، نہ جانے کیوں مجھے اس کے نظر نہ آنے سے بے چینی سی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کوئی چیز کھو گئی ہو۔ میں اپنی اس کیفیت سے نزہت کو آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔

یوں ہی ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے واضح محسوس ہونے لگا کہ میں بھی اس لڑکے کو پسند کرنے لگی ہوں۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی اور وہ موصوف تھے کہ سرے سے غائب ہی ہوگئے تھے۔

نزہت بھی ان دنوں کچھ پریشان تھی۔ اس کا باڈی بلڈر بیمار تھا اور کئی دنوں سے اس کے گھر نہیں آیا تھا۔ ایک دن وہ ماموں جان سے ملنے کا بہانہ بنا کر اس کے گھر گئی بھی تھی تو اس نے اس سے بات نہیں کی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ممانی جان نے کہا کہ اعجاز بیماری کی وجہ سے بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کی بات کا برا مت ماننا۔ وہ برا تو جب مانتی جب وہ کوئی بات کرتا۔

اسی وقت اتفاق سے فائزہ بھی وہاں آگئی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے پرفیوم کی پوری بوتل اپنے کپڑوں پر الٹ لی ہو۔

اس نے اعجاز کا حال پوچھا تو اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا ''اتنے تیز پرفیوم سے مجھے الرجی ہے۔ ابھی مجھے چھینکیں آنا شروع ہو جائیں گی۔''

ممانی جان نے فائزہ کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''یار، میرا تو دل باغ باغ ہو گیا۔'' نزہت پوری بات بتا کر ہنسی۔ ''اس نے فائزہ کی کیا بے عزتی کردی۔''

''عزت تو خیر تمہاری بھی نہیں کی۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''کرے گا، ایک دن وہ میری عزت ضرور کرے گا بلکہ میری تو وہ خوشامد کرے گا۔'' نزہت نے کہا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

میں ہر صبح تیار ہو کر اسکول کے لیے نکلتی تو غیر شعوری طور پر اس بائیک والے کو تلاش کرتی لیکن وہ تو یوں غائب ہو گیا تھا جیسے اس کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔

وہ شاید پیر کا دن تھا، اور امتحان سر پر تھے۔ امتحان کی تیاری کے لیے اسکول میں دوسرے دن سے بیس دن کی چھٹی ہونے والی تھی۔ مجھے امتحان کی تو فکر نہیں تھی کہ میری تیاری بھرپور تھی۔ پھر بھی میں اسکول کے لیے تیار ہو کر نکلی۔ مجھے فکر تو اس بات کی تھی کہ اب مزید بیس دن تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے وہ لڑکا اس کے بعد بھی نظر نہ آئے۔

میں نے ابھی ایک گلی پار کی ہی تھی کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ بائیک پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے پر پژمردگی تھی اور وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

میں لمحے بھر کو ساکت سی ہو کر رہ گئی۔

وہ بھی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چہرے پر اداسیوں کے ڈیرے تھے۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تو بے اختیار میں بھی مسکرا دی۔

اسی وقت گلی میں دو عورتیں داخل ہوئیں تو میں جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ بائیک بہت آہستگی سے چلاتا ہوا میرے پیچھے آیا اور مجھ سے آگے نکلتے ہوئے اس نے ایک پرچہ اپنے ہاتھ سے پھینک کر پھر مجھے اشارہ کیا کہ اسے اٹھالو۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں جلدی سے آگے بڑھی اور جھک کر وہ پرچہ اٹھالیا۔

میں بس اسٹاپ پر پہنچی تو بائیک والا اس پان کی دکان پر موجود تھا اور حسبِ معمول وہاں سے ٹافیاں اور سونف سپاری لے رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔ اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ بہت جاندار تھی۔ جواب میں میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور نہ جانے کیوں میں بری طرح شرما گئی۔

اسی وقت بس آگئی اور میں اس میں سوار ہوگئی۔ وہ پرچہ ابھی تک میری مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ میں نے پڑھے بغیر اسے اپنے اسکول بیگ میں رکھ لیا کہ اسکول جا کر اطمینان سے پڑھوں گی۔

اسکول میں وہ پرچہ پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کلاس میں بھی وہ پرچہ نکالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہاف ٹائم میں نزہت اور ایک دو دوسری لڑکیاں موجود تھیں اس لیے میں ہاف ٹائم میں بھی وہ پرچہ نہ پڑھ سکی۔

نزہت نے اچانک کہا۔ ''شاہانہ! کیا بات ہے آج پھر کوئی پریشانی ہے۔ کیا آج پھر کوئی مل گیا؟''

''نہیں...... تو......'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''بس صبح سے سر میں درد ہے۔''

''یار، کل سے اسکول بند ہو رہا ہے۔ میری تو بالکل بھی تیاری نہیں ہوئی ہے۔'' نزہت نے کہا۔ ''کیا میں تمہارے گھر آ کر امتحان کی تیاری کرلوں؟''

''میرے گھر میں اتنی جگہ کہاں ہے نزہت۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے گھر میں صرف چار ہی تو کمرے ہیں۔ ایک کمرا وقار بھائی کا ہے، دوسرا امی ابو کا۔ تیسرے کمرے میں شائستہ اور نسرین میرے ساتھ رہتی ہیں۔ چوتھا کمرا ڈرائنگ روم ہے اور......''

''اچھا بابا اچھا۔'' نزہت منہ بنا کر بولی۔ ''میں امتحان کی تیاری خود ہی کرلوں گی۔ تم نے تو پوری تقریر جھاڑ دی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''کیا تم میرے گھر آسکتی ہو؟''

''یہ بھی ممکن نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''بھائی جان یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ میں گھر سے غائب رہوں۔''

نزہت منہ بنا کر اٹھ گئی۔ ہاف ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ گھنٹی بجی اور ہم اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔

میں اس انتظار میں تھی کہ جلدی سے چھٹی ہو اور میں گھر پہنچ کر وہ پرچہ دیکھوں کہ موصوف نے کیا لکھا ہے۔

خدا خدا کر کے چھٹی کی گھنٹی بجی۔ میں اسکول سے نکل کر بس اسٹاپ پر آئی تو غیر ارادی طور پر ارد گرد نظریں دوڑانے لگی کہ شاید وہ بائیک والا مجھے نظر آجائے لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لڑکا یا تو کسی کالج میں پڑھتا ہے یا پھر کہیں جاب کرتا ہے۔ اس لیے اسے دوپہر کے وقت وہاں آنے کا موقع نہیں ملتا ورنہ میں نے اکثر اسکول کے

باہر بہت سے چھچھورے لڑکوں کو موٹر سائیکلوں پر اور پیدل کھڑے دیکھا تھا۔ وہ لڑکیوں کو چھیڑتے، ان پر آوازے کستے اور آپس میں بلند آواز میں ذومعنی باتیں کرتے۔

امی بتاتی تھیں کہ ایسا اگر آج سے پچیس تیس سال پہلے ہوتا تو لوگ ان چھچھورے لڑکوں کی دھنائی کر دیتے۔ اس وقت لوگ اتنے بے حس نہیں ہوتے تھے۔ اب تو لڑکے کھلے عام لڑکیوں کو چھیڑتے تھے، ان سے فحش مذاق کرتے تھے لیکن کوئی انہیں روکنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ لوگ یہ سوچ کر خاموش رہتے تھے کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ لڑکے جواب میں لڑنے والے سے اتنی بدتمیزی کرتے تھے کہ وہ بے چارہ خود شرمندہ ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات تو اس قسم کے لڑکے اسلحہ نکالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اب کسے مرنے کا شوق تھا کہ وہ ان لڑکوں کو ٹوکتا۔

میں گھر پہنچی تو امی حسبِ معمول کچن میں تھیں۔ شائستہ اور نسرین بھی اسکول سے گھر آ چکی تھیں اور برآمدے میں بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ کھیل کیا رہی تھیں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔

میں سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور اپنا اسکول بیگ کھول لیا۔ پھر میں نے ایک کتاب نکالی اور اس کے ساتھ ہی کانپتے ہاتھوں سے وہ مڑا تڑا پرچہ نکال لیا اور دھڑکتے دل سے اسے کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا

انجانی لڑکی! تم نے میرا سکون چھین لیا ہے۔ تمہاری ہنسی اتنی خوب صورت ہے کہ میں اسے یاد کرتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی ہے۔ میں بہت سچائی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ اگر تمہارے دل میں بھی میرے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے تو مجھے میرے سیل نمبر پر کال کر لینا۔ اگر دو دن تک تمہاری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو میں سمجھوں گا کہ میری قسمت ہی خراب ہے جو تم جیسی لڑکی مجھے اچھا نہیں سمجھتی۔ اعجاز!

اس کے نیچے اعجاز کا سیل نمبر لکھا تھا۔

میں اس کا خط پڑھ کر بیٹھی بیٹھی خود ہی ہنستی رہی، شرماتی رہی۔

امی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”شانی! کیا بات ہے بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اسکول سے آ کر تم نے کپڑے بدلے، نہ کتابیں رکھیں۔ کیا بات ہے بیٹا؟“

”کچھ نہیں امی!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کل سے امتحان کی تیاری کے لیے اسکول میں چھٹیاں ہو رہی ہیں۔“

”تو کیا تمہاری تیاری پوری نہیں ہے؟“ امی نے پوچھا۔

”امی تیاری تو پوری ہے لیکن میری ایک دو کتابیں نزہت کے پاس ہیں۔ سوچ رہی تھی کہ وہ کتابیں کیسے واپس لاؤں؟“ میں نے بہانہ بنایا۔

”بیٹا! تمہیں نزہت کا گھر تو معلوم ہے۔“ امی نے کہا۔ ”وقار کے ساتھ جا کر کتابیں لے آنا۔“

”وقار بھائی مجھے کب وہاں لے کر جائیں گے؟“

”میں کہوں گی تو چلا جائے گا، تم فکر مت کرو۔ کپڑے بدلو اور کھانا کھاؤ، میں کھانا نکال رہی ہوں۔“

امی کے جانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے، اعجاز کا سیل نمبر اپنی ایک کاپی میں نوٹ کیا اور اس پرچے کو چبالیا۔

مجھے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ میرے پاس سیل فون نہیں تھا۔ سیل فون ان دنوں عام تو تھا لیکن ابو اور وقار بھائی نے ابھی تک مجھے سیل فون لینے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ابو نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میٹرک میں میرے نمبر اچھے آئے تو وہ مجھے بہت اچھا سیل فون لے کر دیں گے۔ ابو اور وقار بھائی کے پاس البتہ سیل فون موجود تھا۔ وقار بھائی کا سیل فون استعمال کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، ابو کے سیل فون سے میں رات کو کال کر سکتی تھی۔ وہ اپنا سیل فون ہمیشہ ٹیبل پر رکھتے تھے۔ میں رات کے وقت بہت آسانی سے سیل فون وہاں سے اٹھا سکتی تھی۔ پھر میں نے یہ ہی فیصلہ کیا کہ آج رات جب ابو کھانا کھا رہے ہوں گے تو میں سیل فون اٹھا لوں گی۔

رات کا کھانا سب لوگ برآمدے میں کھایا کرتے تھے۔ اس موقع پر کبھی وقار بھائی موجود ہوتے تھے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ ابو اور دوسرے لوگوں کے کھانے کے بعد میں کھانا کھایا کرتی تھی۔ کبھی امی زیادہ مہربان ہوتیں تو وہ مجھے کھانے کے لیے بٹھا دیتیں اور خود کھانا نکالنے لگتیں۔

اس دن ابو کو کھانا دینے کے بعد میں خاموشی سے ان کے کمرے میں چلی گئی۔ ان کا سیل فون سامنے ہی میز پر رکھا تھا۔ رات کے وقت ان کی کال کبھی کبھی ہی آیا کرتی تھی۔ پھر مجھے کون سا رات بھر وہ سیل فون اپنے پاس رکھنا تھا۔ میں نے جلدی سے سیل فون اٹھا کر اپنی مٹھی میں چھپایا اور اس کے اوپر سے اپنا دوپٹا ڈال دیا تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ پھر میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی اور سیل فون کو اپنے

کپڑوں کے پیچھے رکھ دیا۔

میں اب ابو اور امی کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی لیکن مجھے ایک لفظ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میرا دھیان سیل فون کی طرف تھا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں کسی کی کال نہ آ جائے اور سیل فون بجنے لگے یا ابو کو سیل فون کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سیل فون استعمال نہیں کیا تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے آف کیسے کیا جاتا ہے۔ البتہ نزہت کے سیل فون سے میں نمبر ملانا ضرور سیکھ گئی تھی۔

جب وقار بھائی بھی اپنے کمرے میں چلے گئے اور گھر میں سناٹا چھا گیا تو میں اپنے بستر سے اٹھی، شائستہ اور نسرین گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں کمرے سے باہر نکلی۔ امی اور ابو کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔ البتہ وقار بھائی کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ پڑھائی میں مصروف ہوں گے اور اب کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔

میں نے الماری کھول کر سیل فون نکالا اور اسے چھپا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں چھت پر جا کے بات کروں گی۔ زینے میں ایک بلب لگا ہوا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ چھت پر صرف ایک کمرا تھا جس میں پرانا کاٹ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

میں نے زینے پہ بیٹھ کر اعجاز کا نمبر ملایا اور سیل فون لے کر چھت پر چلی گئی۔

عام دنوں میں رات کے اس پہر چھت پر جاتے ہوئے ڈر کے مارے میرا دم نکلتا تھا لیکن آج اللہ جانے کیسے ہمت کر کے چھت پر چلی آئی تھی۔

میں چند لمحے تک سوچتی رہی، پھر میں نے کال ملا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف دو گھنٹیاں بجیں، پھر تیسری ہی گھنٹی پر کسی نے کال ریسیو کر لی اور میرے کانوں میں کسی کی آواز آئی۔ ”ہیلو، اعجاز اسپیکنگ......“

میں کانوں سے فون لگائے کھڑی رہی۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ پھر بولا۔ ”ہیلو......؟ کون ہے بھئی، آپ بولتے کیوں نہیں؟“ اس کا لہجہ مہذب اور آواز بھی بہت اچھی تھی لیکن اس وقت اس میں کچھ جھنجلاہٹ تھی۔ میں پھر بھی خاموش رہی تو وہ ہنس کر بولا۔ ”اوہو، میں سمجھ گیا...... آپ ہیں انجانی لڑکی!...... آپ ہی ہیں نا؟“

”جی...... وہ...... میں......“

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا۔ ”یا میں انجانی لڑکی ہی کہتا رہوں۔“

”میرا نام شا...... ہانہ...... ہے۔“ میں نے رک رک کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میں اتنا بدبخت نہیں

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہوں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کے دل میں بھی میرے لیے پسندیدگی کے جذبات ہیں؟''

''وہ...... میں...... آپ کو......''

''آپ کچھ مت بتائیں۔'' وہ شوخی سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ پہلی مرتبہ کال کی ہے اس لیے گھبرائی ہوئی ہوں گی۔ پہلی دفعہ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''میں آپ کو بار بار کال نہیں کر سکتی۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''آپ کی آواز آپ ہی کی طرح خوب صورت ہے۔ ویسے آپ مجھے دوبارہ کال کیوں نہیں کریں گی؟''

''اعجاز صاحب! بات یہ ہے کہ...... میرے پاس ......سیل فون...... نہیں ہے۔''

''سیل فون نہیں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''آج کل تو بچّے بچّے کے پاس سیل فون ہے۔''

''ہاں، لیکن میرے پاس نہیں ہے۔ یہ کال بھی میں آپ کو ابو کے سیل فون سے کر رہی ہوں۔''

''شکر ہے آپ نے بتا دیا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''میں یہ سمجھ کر کال کرتا کہ یہ آپ کا نمبر ہے اور فون پر بات آپ کے ابو سے ہوتی۔''

''ایسا غضب بھی مت کیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟'' اس نے موضوع بدل دیا۔

''میں میٹرک میں ہوں اور دو مہینے بعد امتحان ہو جائیں گے، پھر میں کالج میں چلی جاؤں گی۔''

''اچھا یہ بتایئے کہ میں آپ کو دیکھوں گا کیسے؟ اسکول کی تو بیس دن کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔''

''میں...... میں...... کیا بتا سکتی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بیس دن تک آپ کو دیکھے اور سنے بغیر صرف آپ کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے سیل فون آج کل اتنا مہنگا تو نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کیا سیل فون نہیں خرید سکتیں۔''

''بات مہنگے یا سستے کی نہیں ہے۔ سیل فون تو میں بہت پہلے لے لیتی لیکن ابو کی اجازت نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ میٹرک سے پہلے سیل فون لینا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ لڑکیاں عموماً گھنٹوں ایس ایم ایس پر لگی رہتی ہیں۔ میری بہت سی دوست تو ایسی ہیں جنہوں نے اپنے سیل فونز پر پیکج کرار کھے ہیں اور ساری رات بات کرتی ہیں۔'' پھر میں چونک کر بولی۔ ''اچھا اب میں سیل فون بند کر رہی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ابو اٹھ گئے تو میرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ پھر میرے بھائی ابھی تک جاگ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے شانی!'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ قیامت کے بیس دن بھی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیں گے ویسے اگر موقع ملے تو مجھے پھر کال کر لینا۔ تمہارے گھر کے نزدیک کوئی پی سی او نہیں ہے۔'' وہ اچانک آپ سے تم پر آ گیا۔

''اب پی سی او کون استعمال کرتا ہے۔ پی سی او والوں نے بھی اب موبائل فون کا کاروبار شروع کر دیا ہے یا پھر وہاں ایزی لوڈ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو اگر کبھی کسی دوست کا سیل فون مل جائے تو کوشش کر لینا۔ تم سے اس دوران میں ملاقات نہیں ہوگی ورنہ ایک سیل فون تو میں بھی تمہیں گفٹ کر سکتا ہوں۔''

''امتحان کے بعد ابو مجھے سیل فون دلوا دیں گے...... ویسے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟''

''فی الحال تو ایک انجانی لڑکی سے محبت کرتا ہوں...... سوری اس کا نام شانی ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میرا پیار کا نام شانی ہے، امی اور ابو مجھے شانی ہی کہتے ہیں۔''

''بھئی پیار کا نام ہے تو پیار ہی سے پکارا جائے گا نا؟'' وہ شوخی سے بولا۔ ''ویسے مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ تمہیں گھر میں بھی شانی کہا جاتا ہے۔''

''اچھا اب بہت دیر ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''موقع ملا تو پھر آپ کو کال کر لوں گی۔ اب اجازت دیں، خدا حافظ!''

''خدا حافظ اور شب بخیر!'' اس نے کہا۔

میں نے جلدی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں چاہتی تھی کہ اس سیل سے اعجاز کا نمبر مٹا دوں۔ ورنہ ابو نے ریسیو کر لیا تو فضول میں... شک میں پڑ جائیں گے۔ لیکن مجھے نمبر مٹانا بھی تو نہیں آتا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ ابو کا سیل فون لاک نہیں تھا ورنہ مجھ سے تو لاک بھی نہیں کھلتا۔ پھر میں نے سوچا کہ ابو کون سا اس پر دھیان دیں گے ان کے سیل فون سے کال کی گئی ہے۔ میں نے سیل فون کو دوبارہ خاموشی سے ابو کے کمرے میں رکھا اور دبے قدموں اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

اچانک پیچھے سے وقار بھائی کی آواز آئی ''شانی!''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''جی...... وقار بھائی!''

''ڈر گئی؟'' وقار بھائی ہنس کر بولے۔ ''میں جانتا تھا کہ تو امتحان کی تیاری کے لیے جاگ رہی ہوگی۔ پلیز، مجھے ایک کپ چائے بنا دے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا اور کچن میں چلی گئی۔ ان دنوں موسم خاصا گرم تھا اس لیے مجھے چھت پر جا کر کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے چائے بنا کر وقار بھائی کو دی اور ایک کپ اپنے لیے بھی بنا لی۔

وقار بھائی اپنا کپ لے کر چھت کی طرف بڑھ گئے اور بولے۔ ''کچھ دیر ٹھنڈی ہوا میں بیٹھ کر ذہن کو بڑا سکون ملتا ہے۔''

میں کانپ کر رہ گئی۔ اگر وقار بھائی دو منٹ پہلے چھت پر آ جاتے تو کیا ہوتا؟

دو تین روز بعد امی نے کہا ''شانی! تمہاری کتابیں تمہاری دوست نزہت کے پاس تھیں۔ آج تم وقار کے ساتھ جا کر وہ لے آؤ۔''

''لیکن امی وقار بھائی......''

''میں نے وقار سے کہہ دیا ہے۔'' امی نے کہا۔ ''آج وہ گھر پر ہی ہے، تم ابھی تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ چلی جاؤ۔''

مجھے نزہت سے کوئی کتابیں تو لینا تھیں نہیں۔ میں نے تو اس دن امی سے بہانہ بنایا تھا۔ میں نے سوچا کہ چپ لو اسی بہانے نزہت سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔

چلتے وقت میں نے ایک شاپر میں اپنی دو تین کتابیں ڈال لیں اور امی سے کہا کہ یہ کتابیں نزہت کی ہیں، میں اسے واپس کر کے اپنی کتابیں لے آؤں گی۔

نزہت نصیر آباد کے علاقے میں رہتی تھی جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بائیک پر تو صرف دس منٹ کا فاصلہ تھا۔

میں وقار بھائی کے ساتھ نزہت کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ وقار بھائی نے اس کے دروازے پر پہنچ کر مجھ سے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے میں واپس آ کر تمہیں یہاں سے لے لوں گا بلکہ میں تمہیں سیل فون پر......'' پھر وہ خود ہی خاموش ہو گئے اور بولے۔ ''تمہارے پاس تو موبائل ہے

ابدال

اصطلاح تصوف میں اولیاء کا پانچواں درجہ۔ پہلا درجہ قطب کا ہے، دوسرا معاون کا، تیسرا اوتار کا اور چوتھا افراد کا، ابدال پوشیدہ ولی ہوتے ہیں جو دنیا کے انتظام و انصرام کے لیے مامور کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: کائنات فاطمہ، شادی پور

ہی نہیں ورنہ میں تمہیں اس پر کال کر دیتا اور تم باہر آ جاتیں۔ اب تمہیں بھی موبائل دلوانا ہی پڑے گا۔''

وہ مجھے نزہت کے دروازے پر چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ نزہت کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ ان کا گھر ہمارے گھر کے مقابلے میں زیادہ بڑا تھا اور گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی تھی لیکن وہاں اس وقت کوئی گاڑی نہیں تھی بلکہ ایک بائیک موجود تھی۔ بائیک دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے یہ بائیک میں نے پہلے بھی دیکھی ہو وہ مجھے اعجاز کی بائیک لگ رہی تھی۔ پھر مجھے خود ہی ہنسی آ گئی کہ شہر میں لاکھوں موٹر سائیکلیں ہیں، ہر بائیک اعجاز کی بائیک تو نہیں ہو سکتی ہے۔

''کیا سوچنے لگیں شاہانہ باجی!'' نزہت کے بھائی نے کہا۔ ''آیئے باجی اندر ہیں۔''

میں اس کے ساتھ اندر پہنچی تو اپنی جگہ جم کر رہ گئی، ڈرائنگ روم میں نزہت کی امی کے ساتھ اعجاز بیٹھا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔

میں نے آنٹی کو سلام کیا تو وہ مسکرا کر بولیں۔ ''جیتی رہو بیٹا! تم نزہت کے کمرے میں چلو، میں اسے بھیجتی ہوں۔ وہ اس وقت شاید کچن میں ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔ اعجاز نے آہستہ سے کہا۔ ''شانی! تم...... یہاں؟''

''ہاں، وہ...... نزہت میری اسکول کی دوست ہے۔ اس سے ملنے آئی تھی۔''

''اچھا ایسا کرو، یہ سیل فون تم رکھ لو، میں دوسرا لے لوں گا۔'' اعجاز نے اپنا سیل فون میری طرف بڑھایا۔

''نہیں...... میں یہ نہیں لے سکتی...... اور پھر اسے میں کہاں چھپاتی پھروں گی۔ کسی نے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گی۔''

اسی وقت باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو میں اندر

کی طرف بڑھ گئی۔

آنے والی نزہت تھی۔ وہ بے اختیار میرے گلے لگ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے برسوں بعد ملی ہو۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

وہ خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاہانہ! تم میرے کمرے میں چلو۔ تم سے تو بہت سی باتیں کرنا ہیں۔''

''یہ ڈرائنگ روم میں کون صاحب بیٹھے ہیں؟'' میں نے اعجاز کا پوچھا۔

''اچھا تو تم نے دیکھ لیا، بھئی، وہی تو ہے میرا باڈی بلڈر!''

''تمہارا باڈی بلڈر؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ارے بھئی، اعجاز!'' نزہت نے ہنس کر کہا۔ ''یار اس نے آج مجھ سے سیدھے منہ بات بھی کی ہے...... تو کمرے میں چل، میں ابھی آئی۔''

وہ مجھے کمرے کی طرف دھکیل کر خود ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ''میں اس عجیب اتفاق پر حیران تھی۔

وہ تقریباً دس منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئی اور بولی۔ ''تو آپ نے آج میرے باڈی بلڈر کو دیکھ ہی لیا، کیسا لگا تجھے؟''

''بہت ہینڈسم، ڈیشنگ اور وغیرہ وغیرہ۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بتا آج اس نے تجھ سے ایسی کیا خاص بات کہہ دی؟''

''بھئی خاص بات کا تو وہ موقع ہی نہیں دیتا۔ لگتا ہے عشق اور محبت کے معاملات میں بالکل کورا ہے۔ میں نے اتنی خوب صورت شرٹ پہن رکھی ہے۔ بندہ جھوٹے منہ ہی تعریف کر دیتا ہے لیکن تعریف کا لفظ تو شاید جیسے اس کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسکول کب کھلیں گے، امتحان کب ہوں گے۔ تم لوگوں کا سینٹر کہاں پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔ اور اب تو وہ تیرے بارے میں بہت کرید رہا تھا کہ یہ تمہاری کون سی دوست ہے، کہاں رہتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

تھوڑی دیر بعد وقار بھائی آ گئے۔ میں اس وقت چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھی۔ میں جانے لگی تو نزہت نے کہا کہ اب دوبارہ کب آؤ گی؟۔

''بھئی اس دفعہ بھی میں اسی سے بہانہ بنا کر آئی ہوں کہ مجھے تم سے اپنی کچھ کتابیں لینا ہیں۔ اب ایسا کرو کہ تم آجانا۔''

پھر میں واقعی امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ تیاری تو میری پہلے ہی بھرپور تھی لیکن مجھے زیادہ سے زیادہ نمبر لانے تھے اس لیے میں نے سب کچھ بھلا دیا، صرف اور صرف پڑھنے میں دل لگا لیا۔

بیس دن کے بعد اسکول کھل گئے۔ میں دوبارہ اسکول کے لیے نکلی تو اعجاز اپنی بائیک سمیت اس مخصوص جگہ پر موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا تو میں بھی بے اختیار مسکرانے لگی۔ وہ بائیک وہیں چھوڑ کر میرے نزدیک آ گیا اور بولا۔ ''شانی! یہ بیس دن تمہارے بغیر مجھ پہ جیسے صدیاں بن کر گزرے ہیں۔''

میں بوکھلا گئی۔ میں خود بھی اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ میرا محلّہ تھا، میں نے گھبرا کر اس سے کہا۔ ''اعجاز! خدا کے لیے اس وقت تو جاؤ، یہ میرا محلّہ ہے، ہمیں یہاں کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔''

اس نے جیب سے ایک سیل فون نکالا اور میری طرف بڑھا کر بولا۔ ''یہ سیل فون رکھ لو۔ میں تمہیں روزانہ رات کو گیارہ بجے...... فون کروں گا۔ میں نے اسے سائلنس پر لگا دیا ہے، جب میری کال آئے گی تو اس میں صرف ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوگی۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، اس کے دائیں طرف بالکل اوپر جو سرخ رنگ کا بٹن ہے اسے کچھ دیر دبا کر رکھو گی تو یہ بند ہو جائے گا۔ پھر اسی بٹن کو کچھ دیر دبا کر رکھو گی تو یہ آن ہو جائے گا۔''

میں نے جلدی سے سیل فون لے لیا۔ میں اس سے سیل فون لینا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے یہ خوف تھا کہ سیل فون دیے بغیر اعجاز جائے گا نہیں اور اس بحث مباحثے میں کوئی ہمیں دیکھ لے گا۔

میں نے سیل فون لیا تو وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اسی رات اس نے ٹیلی فون کیا۔ میں نے اس دن اس سے خوب باتیں کیں، پھر اس سے کہہ دیا کہ میرے امتحانات ہونے والے ہیں اس لیے اب میں تم سے روزانہ بات نہیں کر سکتی، تم بھی مجھے فون مت کرنا۔ جب موقع ملے گا، میں خود ہی تمہیں کال کر لوں گی۔

امتحانات کے بعد اعجاز مجھ پر زور دینے لگا کہ کہیں ملاقات کرو۔

''ہماری ملاقات سیل فون پر ہو تو جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس ملاقات میں وہ بات کہاں!'' اس نے کہا۔

''صرف ایک بار...... ایک بار مجھ سے ملاقات کر لو۔''

''اچھا، میں سوچوں گی۔'' میں نے کہا۔

اس نے باتوں باتوں میں انکشاف کیا کہ تمہاری دوست نزہت میری پھوپی زاد ہے۔ وہ بھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ جتنا میں اس سے بچنا چاہتا ہوں، اتنا ہی وہ میرے گلے پڑتی ہے۔

''اس سے نمٹنا تو تمہارا کام ہے۔'' میں نے تو سنا ہے کہ فائزہ بھی تمہاری امیدوار ہے؟''

''فائزہ؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''تم فائزہ کو کیا جانو؟''

''فائزہ بھی میری دوست ہے۔'' میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

''فائزہ سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اکثر ہوتی ہے۔'' میں نے پھر جھوٹ بولا۔

''اس نے تمہیں میرے بارے میں بھڑکانے کی کوشش کی ہوگی۔''

''اسے نہیں معلوم کہ تمہارے تعلقات مجھ سے ہیں یا میں تمہیں جانتی ہوں۔ یہ تو نزہت کو بھی نہیں معلوم کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں۔''

امتحان کا رزلٹ آیا تو میں حسبِ معمول اے ون گریڈ میں پاس ہوئی تھی۔ ابو نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے ایک بہت ہی قیمتی کیمرے والا موبائل انعام کے طور پر لے کر دیا۔ اب میں اعجاز کا موبائل فون واپس کرنا چاہتی تھی۔ اس کا سیٹ بھی بہت قیمتی تھا لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔

میرے پاس موبائل آیا تو مجھے اسے استعمال کرنے کا طریقہ بھی آ گیا۔ تصویریں کیسے کھینچتے ہیں، تصویر کیسے اتارتے ہیں، کسی کی آواز کیسے ریکارڈ کرتے ہیں۔ کوئی نمبر کیسے اس میں شامل کرتے ہیں اور کوئی نمبر کیسے مٹاتے ہیں۔ ایس ایم ایس کیسے کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن میں گھر میں اکیلی تھی۔ شائستہ اور نسرین اسکول گئی ہوئی تھیں۔ وقار بھائی اور ابو بھی گھر میں نہیں تھے۔

میں نے اعجاز کا سیل فون سیٹ اٹھا کر اس کا پیغامات والا حصہ کھول لیا۔ اس میں بے شمار پیغامات تھے۔ ان میں سے کچھ بے ہودہ اور فحش تھے کہ انہیں پڑھ کر مجھے پسینا آ گیا اور اعجاز یکایک میری نظروں سے گر گیا۔ وہ ایسے بے ہودہ ایس ایم ایس بھی ریسیو کرتا ہے۔ اس نے ایسے بہت سے پیغامات لوگوں کو بھیجے بھی تھے۔

ایک پیغام پڑھ کر میں چونک اٹھی۔ اس نے اپنے کسی دوست سعید کو ایس ایم ایس کیا تھا کہ چڑیا جال میں پھنس گئی

آصف علی

(1888-1952ء)

دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ بعد میں لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ قومی تحریکوں میں شروع ہی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ کئی دفعہ گرفتار اور سزایاب ہوئے۔ اسیرانِ آزاد ہند فوج کی وکالت کر کے شہرت حاصل کی۔ کانگرس کی مرکزی پارلیمانی پارٹی کے سیکریٹری اور مرکزی اسمبلی کے رکن رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پہلے بھارتی سفیر کی حیثیت سے امریکا گئے۔ مئی 1948ء میں امریکا سے واپس آ گئے۔ اڑیسہ کے گورنر رہے اور پھر مرکزی حکومت کے وزیرِ خوراک مقرر ہوئے۔ بعد ازاں سوئٹزرلینڈ میں سفارت کے فرائض انجام دیے۔ وہیں انتقال کیا، مدفن دہلی میں ہے۔

مرسلہ: نصیر الدین، حیدر آباد

ہے، بس اب کچھ ہی دن میں وہ میرے بس میں ہوگی۔''

میں نے تجسس میں دوسرے پیغامات دیکھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اس نے کچھ دوستوں کو میرے ہی بارے میں بتایا ہے۔

ایک پیغام فائزہ کے لیے تھا۔ ''فائزہ! میں آج رات بارہ بجے کے قریب تمہارے گھر آؤں گا تم اپنی پچھلی گلی کا دروازہ کھول دینا۔''

وہ پیغام پڑھ کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ گویا وہ فائزہ سے بھی محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔

میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ اب میں اعجاز سے نہیں ملوں گی اور اس کا سیل فون مستقل طور پر بند کر دیا۔

کالج میں داخلے کا موقع آیا تو مجھے شہر کے ایک بہترین کالج میں ایڈمیشن مل گیا۔ وہ کالج بھی میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اتنا نزدیک بھی نہیں تھا جتنا اسکول۔

میں اس دن کالج جانے کو نکلی تو اعجاز کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر بائیک سمیت موجود تھا۔ وہ بائیک چھوڑ کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔

میں نے جلدی سے اس کا موبائل نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا کہ اب میرے پاس بھی موبائل ہے اس لیے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے موبائل مجھ سے لے لیا اور بولا۔ ''اچھا اپنا نمبر تو بتاؤ۔''

''اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش بھی مت کرنا گھٹیا

انسان! تم کیا سمجھتے ہو کہ موبائل استعمال کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے اس میں تمہارے ایس ایم ایس بھی پڑھ لیے ہیں اور تصویریں بھی دیکھ لی ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے گھٹیا ہو سکتے ہو۔''

''شاہانہ!...... میری بات تو سنو۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''میں اتنی آسانی سے تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

''میرا ہاتھ چھوڑو اعجاز۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''ورنہ میں شور مچا دوں گی۔''

''مچا دو'' اس نے کہا۔ ''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

اسی وقت اچانک وقار بھائی اپنی بائیک پر وہاں پہنچے۔ وہ منظر دیکھ کر وہ دیوانوں کی طرح موٹر سائیکل سے اترے، اس کوشش میں ان کی بائیک بھی گر گئی۔ وہ اعجاز پر جھپٹے اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

میں وہاں کھڑی بری طرح لرز رہی تھی۔ وقار بھائی چیخ رہے تھے۔ ''بے غیرت! بے حیا، گھٹیا آدمی، تو میری بہن کا ہاتھ پکڑے گا۔ تیری جرأت کیسے ہوئی؟''

''تجھے اپنی بہن کا اتنا ہی خیال ہے تو اسے گھر میں باندھ کر رکھ، یہ خود مجھ سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔''

اس کے اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وقار بھائی نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہاں کئی لوگ جمع ہو گئے اور بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔

اعجاز نے اچانک پستول نکال لیا اور بولا۔ ''مجھے چھوڑ دے ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔''

پستول دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ وہاں کھڑا ہوا مجمع بھی چھٹ گیا۔ لوگ اب دور دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

جب وقار بھائی نے اس کی گردن نہ چھوڑی تو اس نے وقار بھائی پر فائر کر دیا، وقار بھائی کی گرفت ڈھیلی پڑی تو اس نے دوسرا فائر وقار بھائی کے سینے پر کیا۔ وقار بھائی زمین پر گر گئے۔ اسی وقت ہمارے محلے کے چند لڑکے وہاں آگئے۔ وہ سب وقار بھائی کے دوست تھے۔ ان میں سے دو نے پستول کی پروا کیے بغیر اعجاز کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اعجاز ان سے بھی بھڑ گیا۔ وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے، اچانک پستول پھر چل گیا۔ میں نے اعجاز کو زمین پر گرتے دیکھا، اعجاز اپنے ہی پستول کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ تو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ گولی اس کی گردن میں لگی تھی۔

وہ سب لڑکے یہ دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ صرف میں وقار بھائی اور اعجاز کی لاشوں کے ساتھ وہاں رہ گئی۔ گلی میں جگہ جگہ دونوں کا خون بکھرا ہوا تھا اور میں جذباتی انداز میں چیخ رہی تھی۔

پھر پولیس آئی، مجھے بھی ان کے ساتھ تھانے جانا پڑا۔ میں نے بیان دیا کہ اعجاز نے اچانک میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت وقار بھائی آگئے اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اعجاز نے پستول نکال لیا اور وقار بھائی پر فائر کر دیا۔ وقار بھائی نے گولی لگنے کے باوجود اعجاز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی کشمکش میں پھر گولی چل گئی اور اعجاز اپنے ہی پستول کا شکار ہو گیا۔

میرے اس بیان کو پولیس نے تسلیم کر لیا۔ میں نے ان لڑکوں کو بچا لیا جو وقار بھائی کی مدد کو آئے تھے۔

وقار بھائی کے بعد ابو تو گویا زندہ درگور ہو گئے۔ ان کے دل پر وقار بھائی کی موت کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بھی ایک ماہ بعد ہی ہارٹ فیل سے انتقال کر گئے۔

میری ایک ذرا سی لغزش نے مجھ سے باپ بھی چھین لیا اور بھائی بھی! ہمارے سر سے ابو کی محبت کا سایہ کیا اٹھا ہم تو بالکل بے آسرا ہو کر رہ گئے۔ امی نے سلائی اور میں نے ایک اسکول میں جاب کر لی۔ پیٹ کا ایندھن بھی تو کسی طور بھرنا ہی تھا۔

یہ بات محلے میں جانے کیسے مشہور ہو گئی کہ اعجاز میرا آشنا تھا۔ وقار نے مجھے اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اس چکر میں دونوں مارے گئے۔ اسی وجہ سے میرے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں آتا اور آتا بھی ہے تو ان لوگوں کو نہ جانے کیسے خبر مل جاتی ہے کہ میرے عشق کی وجہ سے میرا آشنا بھی مارا گیا اور بھائی بھی! ایسی منحوس اور بدچلن لڑکی سے شادی کون کرے گا؟

میری بہنیں بھی اب بہت تیزی سے جوان ہو رہی ہیں۔ امی انہیں دیکھ دیکھ کر ہولتی رہتی ہیں۔ ان کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت گر گئی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ اکثر ان کی نگاہوں میں بھی میرے لیے ملامت ہوتی ہے۔ میں اپنا مقدمہ لے کر کہاں جاؤں؟

اس مقدمے کا فیصلہ اللہ کے گھر تو ہوگا ہی۔ اس کی سزا مجھے بھی ملے گی کہ میں نے بھی تو اعجاز کی حوصلہ افزائی کی تھی، خواہ... نادانستگی میں ہی سہی، قصور تو بہر حال میرا ہی تھا۔

محبوبہ

محترم ایڈیٹر صاحب
سلامِ تہنیت!
آپ نے لاتعداد قسم کی محبوبائیں دیکھی ہوں گی۔ ایک قسم کی محبوبہ کا احوال ارسال کررہا ہوں، یہ واقعہ میرے ایک دوست کا ہے۔ آپ بھی لطف لیں کہ اس محبوبہ سے اس کی بیوی کس طرح پریشان ہوا ٹھی تھی۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

بیگم شکیلہ فاروقی ...... پینتیس سال کی بڑی نازک اندام اور خوبصورت خاتون تھیں۔ ان کا سرخ وسپید چہرہ ہمیشہ تروتازہ اور شگفتہ رہتا تھا۔ وہ عام عورتوں کی طرح ٹھگنے قد کی نہ تھیں بلکہ قدرت نے ان کے ساتھ فیاضی سے کام لے کر ان کا نام حسین اور دراز قد خواتین کی فہرست میں شامل



آلھا اودل

یہ دونوں بھائی مہوبہ ضلع ہمیر پور کے راجا تھے۔ بہادری کے باعث مشہور ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے کالکا دیوی کی مدد سے مسلمانوں پر فتح پائی تھی۔ ان کی داستانِ شجاعت برج بھاشا نظم میں بیان کی گئی ہے، جسے ہندو عوام متبرک سمجھ کر گاتے ہیں۔ اسی طرز پر جنگ ستمبر میں ایک مشہور گیت لکھا گیا ''پاکستانی بڑے لڑیّا سہی نہ جائے ان کی مار۔''

مرسلہ: شائستہ بشیر، خانیوال

کر دیا تھا۔ وہ اپنے لباس، میک اپ و دیگر کے..... انتخاب کے سلسلے میں خاصی شہرت رکھتی تھیں۔ مگر وہ دوست بنانے کے معاملے میں بہت ہی کنجوس تھیں۔ وہ باتیں اتنی کم اور آہستگی سے کرتی تھیں جیسے کوئی سمجھ دار۔ خانہ دار خاتون اپنے پرس میں موجود پیسوں کو خرچ کرتے ہوئے ''کفایت'' کے اصول کو مدِنظر رکھتی ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل اور خوددار خاتون تھیں۔ ان کا کردار ایک مثالی عورت کا کردار تھا۔ وہ دوسروں کے لیے ایک بہترین نمونہ تھیں مگر ایسا نمونہ نہیں جیسا شوکیسوں میں رکھے ہوئے خوبصورت عورتوں کے ماڈل کا ہوتا ہے بلکہ ایسا نمونہ جس میں سنجیدگی، قناعت اور زندگی کے تجربے جیسے اجزا شامل کیے گئے ہیں۔

ان کا سارا وجود ایک خاموش اور پُرسکون جھیل کی مانند تھا سوائے ان کی آنکھوں کے۔ ان کی آنکھیں کبھی خاموش نہیں رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں ایسی زبان میں باتیں کرنا جانتی تھیں جو دوسروں کو چند لمحوں میں اپنا گرویدہ بنالیا کرتی ہیں۔ آنکھوں سے باتیں کرنے کا فن جس شخص کو آتا ہو۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں خاصا مقبول ہوتا ہے..... مگر کیا، کیا جائے کہ مسز فاروقی کا کوئی حلقۂ احباب تھا ہی نہیں۔ ان کی آنکھوں کی زبان کا لطف تو بس میں ہی اُٹھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ مسز فاروقی کوئی اور نہیں میری بیگم صاحبہ ہیں، جی ہاں میری شریکِ حیات ہی شکیلہ فاروقی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

☆☆☆

مجھ سے ان کی ملاقات بڑے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ چار برس قبل وہ اس دن ریس کورس میں حسبِ عادت موجود تھیں حالانکہ ان دنوں ان کی مالی حالت بہت کمزور ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اپنی خاندانی روایات کو نبھانے اور اس فخر کو سربلند رکھنے کے لیے ریس ضرور کھیلتی تھیں جیسے بڑے بڑے نواب قلاش ہو جانے پر بھی بٹیر لڑانا نہیں چھوڑتے۔ بہرحال وہ وہاں موجود تھیں۔ تین گھوڑوں، پرنس، کنگ اور کیپری پر لگی ہوئی رقمیں ہار بیٹھی تھیں کیونکہ تینوں گھوڑے پانچویں، چھٹے اور ساتویں نمبر پر آئے تھے۔ وہ رقم ہار جانے کے غم اور خاندانی روایات پر فخر کرنے کی خوشی کو ساتھ ساتھ لیے ریس کورس کے قریب ایک شاندار ریستوران میں چلی آئیں۔ شاید ان کے پرس میں اب بھی اتنے روپے موجود تھے کہ وہ کافی کے دو کپ پی سکتی تھیں اور گھر جانے کے لیے ٹیکسی کر سکتی تھیں۔ جب وہ کونے کی میز پر بیٹھ چکیں تو میں اپنی ٹیبل سے اُٹھا اور ان کے قریب پہنچ کر ان سے ان کے پاس بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ اس وقت میں سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ سر پر بال بھی اچھی طرح سے جمے ہوئے تھے۔ اجازت ملنے پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے میں نے کہا ''ریس کورس میں آنا بھی عجیب چیز ہے۔ یہاں آکر کوئی بھی شخص اپنے امیرانہ ٹھاٹ باٹ کی بہت اچھی نمائش کر سکتا ہے مگر میں کوئی امیر آدمی نہیں اور نہ ہی ریس کا رسیا ہوں۔ آج تو مجھے میرا ایک دوست یہاں کھینچ لایا تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ تینوں گھوڑوں پر لگائی ہوئی میری رقم نہ صرف بچ گئی بلکہ اس وقت میری جیب میں پچاس ہزار روپے سے زائد موجود ہیں کیونکہ وہ تینوں گھوڑے جیت گئے تھے حالانکہ ماہرین کے مطابق یہ تینوں اس قابل ہی نہ تھے کہ ریس میں حصہ لے سکیں۔ تیز گام کو پیر میں کچھ تکلیف تھی۔ آسمانی بجلی کے پھیپھڑے ہی کمزور تھے اور نوجوان چارلس کو صبح سے پیچش کی شکایت تھی۔ اب بتائیں، ایسے حالات میں کون یہ یقین کرے گا کہ یہ تینوں گھوڑے..... معاف کیجیے گا، میں نے ابھی تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔''

''میرا نام شکیلہ ہے مگر اس وقت تو میرا نام بدنصیبی ہونا چاہیے۔'' وہ بولیں۔

''شاید آپ اپنی تمام رقم ہار چکی ہیں۔'' میں نے کہا ''اٹ از ویری سیڈ! مگر گھبرائیے نہیں، جوئے میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ میرا تو بہرحال یہ پہلا اور آخری جوا ہے۔ میں دراصل ایسی لغویات کو دل سے پسند نہیں کرتا اور پھر میں اپنی کمائی ہوئی دولت یوں بھی نہیں اُڑا سکتا۔'' کافی کا پیالہ ختم کرنے کے بعد میں نے بات کو آگے بڑھایا ''میرا نام فصیح فاروقی ہے۔ میری پیدائش سے قبل ہی میرا خاندان پہاڑی علاقے سے اُتر کر اس شہر میں بس گیا تھا۔ میں خاندانی طور پر نچلے طبقے

کا آدمی ہوں۔ میرے دادا کی کریانے کی دکان تھی جس سے انہیں بڑی کم آمدنی ہوتی تھی۔ میرے باپ نے ایک چھوٹا سا چائے کا کھوکھا لاری اڈے پر بنا رکھا تھا۔ وہ میرے دادا سے کچھ زیادہ کما لیتے تھے۔ انہوں نے کچھ رقم پس انداز بھی کر لی تھی۔ مگر جب وہ فوت ہو گئے تو معلوم ہوا کہ جمع کی ہوئی رقم ان کی قرض لی ہوئی رقم سے کچھ کم تھی۔ وہ رقم بعد میں، میں نے ادا کی تھی۔ میں کوئی امیر آدمی نہیں لیکن محنتی ضرور ہوں۔ میرا باس مجھ سے بہت خوش ہے۔ میں صبح آفس میں نو بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک کام کرتا ہوں۔ مجھے ہر ماہ بیس ہزار روپے ملتے ہیں۔ میرا ایک ذاتی فلیٹ بھی ہے جو مرکزی شاہراہ پر شور و غل سے لبالب بھرے علاقے میں واقع ہے۔ بہت سی باتیں ہمارے درمیان ہوئیں اور پھر ہم اُٹھ گئے۔

اس ملاقات کے ٹھیک چھ ہفتے بعد میں اور شکیلہ ایک شاندار دکان میں کھڑے اپنے لیے شادی کے ملبوسات خرید رہے تھے۔ پھر اگلے ہفتے ہی ہماری شادی ہو گئی۔ یوں ریس کی روایت سے چمٹی رہنے والی شکیلہ اس وعدے کے ساتھ کہ اب وہ کبھی ریس نہیں کھیلے گی، شکیلہ سے مسز فاروقی بن گئیں۔ صرف اس لیے کہ میں انہیں ایک اچھا ہمسفر نظر آیا تھا جسے ان کی دولت نہیں ان کا ساتھ پسند تھا۔

☆☆☆

لوگ کہتے ہیں کہ میں چالیس سال کی عمر کے باوجود خوبصورت اور وجیہہ نظر آتا ہوں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے گرد عورتیں .... منڈلاتی رہتی تھیں اور مر مٹنے کو بھی تیار رہتیں۔ ان سب باتوں کے باوجود شکیلہ بڑی مطمئن اور پُرلطف زندگی گزار رہی تھی کیونکہ اس کی نظروں میں، میں بڑے پختہ کردار اور بڑی اچھی عادات کا مالک تھا اور میں اس سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی کرتا تھا۔ اس کی جرابوں سے لے کر میک اپ کے سامان اور ناشتے کی میز پر پڑے تازہ پھولوں تک میں خوب دلچسپی لیتا تھا۔ لوگ ہمیں دیکھ کر عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں والا مقولہ بالکل صحیح مانتے تھے۔

مگر پچھلے کئی مہینوں سے یہ مقولہ کسی قدر دھندلا اور بھدّا سا ہو چلا تھا۔ یہ اس وقت سے ہوا جب میں ہر ہفتے کی صبح کو ''ڈارلنگ، میں جا رہا ہوں۔ پیر کی صبح تک کے لیے خدا حافظ!'' کہہ کر جانے لگتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان دنوں شکیلہ بہت پریشان اور فکرمند رہنے لگی تھی۔ وہ ایسے حالات کی توقع ہرگز نہ رکھتی تھی حالانکہ وہ پڑھی لکھی خاتون تھی مگر اب وہ اجڈ، جاہل اور شکی مزاج عورتوں کی طرح ہر پیر کی صبح میرے گھر آنے پر میرے لباس کو سونگھ کر کسی اجنبی عورت کے جسم کی خوشبو تلاش کیا کرتی تھی۔ مگر کوئی اجنبی خوشبو اس کی ناک سے نہ ٹکراتی اور نہ ہی کسی عورت کا لمبا بال اسے میرے لباس سے چمٹا ملتا۔ میرے کوٹ اور پتلون کی تلاشی لینے پر بھی کبھی کوئی رقعہ یا پیغام برآمد نہ ہوتا جس سے میری محبوبہ کا پتا چل سکتا۔

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا اور لطف لے رہا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ جب حقیقت عیاں ہوگی تو وہ حیران رہ جائے گی۔

☆☆☆

بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی کہ اس دن شکیلہ صبح ہی سے بڑا سادہ لباس پہنے اور بالوں کو اُلجھائے ہوئے ایزی چیئر میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں کھیل رہی تھی۔ اس کی ہر دم بولنے والی آنکھیں خاموش تھیں کیونکہ وہ تنہا اور اداس تھی۔ باہر سڑک پر لوگوں کی

SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر اس کے فلیٹ میں گہری خاموشی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور وہ کچھ سوچ رہی تھی جیسے عموماً سائنس داں کسی مرکب کے صحیح اجزا نہ ملنے پر سوچوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔ بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ وہ سوچ رہی تھی کہ ''آخر میرا شوہر پچھلے دو سال سے ہر ہفتے کی صبح کو کہاں جاتا ہے؟''

اس سوال کا جواب اس کے اپنے ہی جسم کی دیواروں سے بار بار اپنا سر ٹکرا رہا تھا بلکہ چاروں طرف گھوم رہا تھا اور اس کو اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

گہری فکر کی سلوٹیں اس کے خوبصورت چہرے کو کسی قدر بھدا بنا رہی تھیں اور وہ کسی حد تک بوڑھی لگ رہی تھی۔ شکیلہ نے بے دلی سے اُٹھ کر باہر سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ پردہ سرکا کر جب وہ واپس مڑی تو فرش پر اسے ایک کاغذ پڑا ملا۔ اس نے فوراً وہ کاغذ اُٹھا کر دیکھا، لکھا تھا۔

''6 اگست، ہفتہ...... بہادر آباد!'' 6 اگست یعنی آج، وہ بڑبڑائی، بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا اور اس نے صرف دو منٹ میں فیصلہ کرلیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے عازمِ سفر ہوگئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھل نہیں پایا تھا۔ اس کچے راستے میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ میٹھی سی مہک اور خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ مٹی کی خوشبو تھی۔ کھیتوں میں لہلہاتے پودے شکیلہ کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں، چڑ چوں، چڑ چوں کر کے انہیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ کہیں دور کوئل سریلی آواز میں کوک رہی تھی۔ نزدیک ہی ایک درخت پر بلبل کا جوڑا بیٹھا راز و نیاز میں مصروف تھا۔ جب شکیلہ گاؤں کے پہلے مکان کی منڈیر کے قریب پہنچی تو مٹی میں لتھڑے ہوئے چند بچے اس کی طرف حیرانی سے تکنے لگے۔ جلد ہی ایک بوڑھا آدمی مکان سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں حقّہ تھا۔ اس نے حقّہ گڑگڑاتے ہوئے ایک فیشن ایبل شہری عورت کو اپنے قریب پایا تو حقّے کو زمین پر رکھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔

''تم یہاں کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو، جو شہر سے ہر ہفتے کی صبح یہاں آتا ہے اور......''

سوال اُدھورا چھوڑ کر شکیلہ سوچنے لگی، کہیں میں احمق تو نہیں جو فاروقی کی کھوج میں یہاں تک پہنچ گئی ہوں۔ فاروقی جیسا نفاست پسند اور خوش اخلاق شخص کب یہاں آنا گوارا کرتا ہوگا۔ تف ہے مجھ پر...... اپنے شک کی بنا پر میں اس وقت کہاں بھٹک رہی ہوں۔

وہ بوڑھا حیرت و استعجاب سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کہیں آپ فصیح فاروقی کی بات تو نہیں کر رہیں؟ وہ ایک اچھا اور شریف آدمی ہے جو یہاں ہر ہفتے......''

شکیلہ نے اپنے دل کی خوشی چھپاتے ہوئے بوڑھے کی بات کاٹ کر کہا ''وہ اس وقت کہاں ہیں؟ تم مجھے ان کے پاس لے چلو، میں ان کی مسز ہوں، بیوی ہوں ان کی۔''

بوڑھے نے نزدیکی کچے مکان تک رہنمائی کی اور انہیں مکان کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ مسز فاروقی چند لمحے ہچکچاتی رہیں۔ پھر ان کے قدم اندر کی طرف اُٹھ گئے۔ مکان کے صحن میں ایک گائے بندھی تھی اور ایک نحیف و کمزور آدمی جھکا ہوا ناند میں چارا ڈال رہا تھا۔ اس نے اجنبی عورت کو اپنے قریب دیکھا تو کندھے پر پڑے ہوئے صافے سے ہاتھ صاف کر کے کھڑا ہوگیا۔

''معاف کرنا، میں بغیر اجازت اندر چلی آئی۔'' وہ بولی ''میں فاروقی سے ملنے آئی ہوں۔''

وہ شخص بولا ''آپ شاید صاحب جی کی بیگم ہیں۔ آیئے آیئے، یہاں بیٹھیے۔''

شکیلہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ جب وہ کمزور آدمی دودھ کا بڑا گلاس انہیں پیش کر چکا تو شکیلہ نے اس سے پوچھا ''فاروقی کہاں ہیں؟''

''جی وہ میرے بیٹے بیرو اور اپنی محبوبہ کے ہمراہ کھیتوں اور جنگل کی طرف گئے ہیں۔ بس تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔ میرے بیٹے بیرو کے ساتھ وہ پرائمری اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ بیرو اور محبوبہ کے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں اور وہ متواتر ہر ہفتے آتے ہیں اور محبوبہ کو ساتھ لے کر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔ شکار کھیلتے ہیں، اپنا کھانا خود پکاتے ہیں۔ بیرو کے ساتھ مل کر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں۔ محبوبہ بھی ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور بیگم صاحبہ، وہ بیرو کے ساتھ مل کر 'ماہیا' بھی گاتے ہیں۔''

بوڑھا آدمی بے تکان بولے جا رہا تھا اور مسز فاروقی کے دل و دماغ میں زلزلہ بپا تھا۔ اس نے بوڑھے کی بات کاٹی اور غصے سے دہاڑی۔ ''یہ محبوبہ کون ہے؟ آج فاروقی کی حقیقت معلوم ہوگئی۔''

بوڑھا آدمی شاید شکیلہ کے غصے کی وجہ جان گیا تھا اس لیے جب وہ غصے کے عالم میں اُٹھ کر جانے لگی تو بوڑھے نے اسے روکتے ہوئے کہا ''بیگم صاحبہ! غصہ مت کریں اور بیٹھ جائیں، صاحب جی آتے ہی ہوں گے۔''

''اب کیا فائدہ بیٹھنے کا...... میں اب اس شخص کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔'' شکیلہ کا غصے کے مارے بُرا حال تھا، جونہی وہ دروازے تک پہنچی، تو میں اور بیرو گھر کے اندر داخل ہوئے، میں نے اپنے سامنے اپنی بیوی کو دیکھ تو حیران ہوگیا۔ اتنا جتنا کوئی بہت ہی غریب آدمی لاٹری کا پہلا انعام ملنے کی خبر سن کر ہوتا ہے...... میں دیوانہ وار آگے بڑھا تو شکیلہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی اور بولی ''خبردار، مجھے ہاتھ مت لگانا...... ڈارلنگ! ...... ہنہ...... ڈارلنگ مجھے کہتے ہو اور محبوبہ کسی اور کو بنا رکھا ہے۔ میں واپس جا رہی ہوں۔ تم سے دور...... زندگی سے بھی دور۔''

میں نے ایک قہقہہ لگایا اور بیگم کو بازو سے پکڑ کر بولا ''پہلے میری محبوبہ سے مل تو لو...... پھر جہاں جی چاہے چلی جانا۔''

میں نے بیرو کے ساتھ کھڑی ہوئی ایک خوبصورت سی بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس سے ملو، یہ ہے میری محبوبہ......''

شکیلہ نے بکری کی طرف دیکھا۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور بولی ''فاروقی، یہ کیا ڈراما ہے...... میں تو کچھ اور سمجھ رہی تھی۔ تمہارا یہ کہنا...... ڈارلنگ، میں جا رہا ہوں، پیر کی صبح تک کے لیے، خدا حافظ! اور میرا یہ کہنا کہ مجھے پتا تو چلے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ مگر تمہارا جواب نہ دینا...... تم تو بس مسکرا کر رہ جاتے اور لکڑی کی خوبصورت سیڑھیوں سے اُتر کے بڑی شاہراہ پر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو جاتے تھے۔ پچھلے دو ماہ سے ہمارے درمیان یہ مکالمہ جاری ہے مگر بے سود...... کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں۔ میرا سوال ابھی تک اپنی جگہ پر ویسے کا ویسا پتھر بنا پڑا تھا۔ میری یہ خواہش ہی رہی ...... کاش! تم میرے سوال کا جواب دیتے مگر افسوس، ایسا نہ ہوا تھا...... آج میں اسی لیے یہاں چلی آئی کہ حقیقت جان سکوں مگر یہ بکری تو ایک جانور ہے، یہ تمہاری محبوبہ کیسے بن گئی؟''

''آؤ، اندر چلو...... کمرے میں بیٹھو، میں تمہیں حقیقت بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

شکیلہ کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا لٰہذا وہ میرے ہمراہ کمرے میں آگئی۔ بکری بھی پیچھے پیچھے کمرے میں آگئی۔ میں نے اس کے سر اور کمر پر ہاتھ پھیرا اور بیرو کو آواز دی کہ اس کو لے جاؤ۔ بیرو آیا اور بکری کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں شکیلہ کو بتانے لگا۔

''میں نے جس دن جنم لیا، اسی دن میری ماں چل بسی تھی۔ میری پرورش میری نانی نے کی۔ انہوں نے ہی مجھے ماں بن کر پالا۔ ماں کا پیار دیا اور یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ اصل مسئلہ میرے دودھ پینے کا تھا۔ میری نانی نے گھر میں بکری پال رکھی تھی جو خوب دودھ دیتی تھی۔ نانی اماں نے مجھے اس کا دودھ پلانا شروع کیا۔ میں اسی بکری کا دودھ پی کر بڑا ہوا۔ جب میں کچھ سمجھ دار ہوا تب مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے اور میں بکری کا دودھ پی کر بڑا ہوا ہوں۔ بس اس دن سے مجھے بکری سے محبت ہوگئی۔ میں اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہوگئے کہ میں کبھی کبھی مستی میں آ کر اس کے تھنوں سے منہ لگا کر اس کا دودھ پی لیتا۔ وہ تازہ اور گرم گرم دودھ مجھے بہت مزہ دیتا۔ میں ان دنوں بارہ برس کا تھا کہ وہ بکری فوت ہوگئی۔ میں اس روز بہت رویا تھا پھر جلد ہی میں بہل گیا کہ اس بکری کے بچے پیدا ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک مادہ بکری ہمارے گھر میں موجود تھی۔ میں نے اس کی پرورش شروع کردی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب یہ بکری جو گھر میں موجود ہے، یہ اسی بکری کی اولاد کی اولاد ہے جس کا میں دودھ پیا کرتا تھا۔ یہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہے کیونکہ میں اس کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ میں اس کو محبوبہ کے نام سے پکارتا ہوں۔ تو یہ دوڑی ہوئی میری طرف آتی ہے۔ میں ہفتہ میں ایک بار اس کو دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آتا۔''

شکیلہ کا سارا غصہ ہرن ہوگیا اور وہ مسکرا پڑی۔ میں اُٹھ کر بیگم کی طرف بڑھا تو اس پر ایک دم شرمندگی اور خجالت کا حملہ ہوا اور وہ شرم سے دُہری ہوگئی۔ اس کی نظریں میری نظروں کی تاب نہ لا رہی تھیں۔ پھر میں نے ملائمت سے کہا۔

''مجھے معاف کردو ڈارلنگ! میں تمہیں یہاں آنے کے متعلق کافی عرصے سے بے خبر رکھتا رہا ہوں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ محبت کرنے والے میاں بیوی کے درمیان کوئی بھید اور پُراسراریت نہیں ہونی چاہیے لیکن میں مجبور تھا ڈارلنگ! میں خود کو پینڈو کہلوانا پسند نہیں کرتا تھا اسی لیے یہ بات چھپائے ہوئے تھا۔''

چند گھنٹوں بعد ہم واپسی کے سفر پر رواں دواں تھے اور شکیلہ کے چہرے پر طمانیت بھرا سکون دیکھ میں خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کوئی بھی بات جو اُلجھن کا باعث بن رہی ہو اس کی وضاحت میں معمولی سی تاخیر بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

واپسی

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
ایک دلچسپ واقعہ ارسال کررہا ہوں جس نے میری زندگی پر بہت اثر ڈالا ہے، آپ پڑھ کرتو دیکھیں۔ بہت مزہ آئے گا کہ ایک لڑکی نے میرے دل میں کیسے ہلچل مچائی تھی جس نے مجھے اس کہن سالی میں بدل دیا۔

خواجہ احمر
(کراچی)



میں چونکہ اس قسم کی بے شمار کہانیاں پڑھ چکا تھا یا فلمیں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اس لڑکی پر کوئی دھیان نہیں دیا، بلکہ میں بھی اس سے دل لگی ہی کرتا رہا تھا۔

وہ شادی کی تقریب تھی جس میں وہ لڑکی مجھ سے ملی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھا شادی میں شرکت کرنے والوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس نے

بڑے سلیقے سے مجھے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے حیرت ہوئی تھی۔ پھر میں نے بتایا۔ ''بیٹا، میرا نام خواجہ احمر ہے۔''

''پلیز، مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب نہ کریں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا نام یاسمین ہے، مجھے یاسمین کہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں مسکرادیا۔ ''میں بیٹا نہیں کہتا۔ لیکن یاسمین میں شاید تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''میں بھی آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اس شادی میں آئی ہوں۔ آپ پر نظر پڑی تو میں ان کو چھوڑ کر آپ کے پاس آگئی۔''

''لیکن کیوں؟''

''بس یوں ہی۔ آپ مجھے اچھے لگے۔ دل چاہا کہ آپ سے ملوں۔ آپ سے باتیں کروں۔ اس لیے آپ کے پاس آگئی۔''

''چلو، یہ تو بہت اچھا ہے۔'' میں اس کی باتیں سن کر مسکرادیا۔ ''اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرتی ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ تمہارے والد صاحب کا نام کیا ہے۔''

''میں مکرم علی کی بیٹی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ایک سرکاری محکمے میں آفیسر ہیں۔ اور میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہی ہوں۔''

''اور تمہارے بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''دو بھائی ہیں، مجھ سے بڑے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تیسرے نمبر پر ہوں۔ میرے بعد میری ایک اور بہن ہے۔ وہ سب پڑھ رہے ہیں۔''

چونکہ وہ ایک مخلوط تقریب تھی۔ اس لیے کسی نے ہماری طرف دھیان بھی نہیں دیا۔ اور دھیان دیتا بھی تو کیا ہوتا۔ میری اور اس بچی کی عمر میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ میں پچاس کو بھی کراس کرچکا تھا اور وہ ابھی صرف بیس اکیس برس کی تھی۔

اس دوران میری بیوی ہماری طرف آگئی۔ وہ بہت حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ ''قدسیہ، یہ یاسمین ہے۔'' میں نے تعارف کروایا۔ ''یہ مجھ سے باتیں کرنے میرے پاس آگئی تھی۔''

قدسیہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ یاسمین نے بھی بڑی سعادت مندی سے اپنی گردن جھکادی تھی۔

میں قدسیہ کے اس پیار کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ ان دنوں وہ ارمان کے لیے کسی مناسب لڑکی کی تلاش میں تھی۔ ارمان ہمارے بڑے بیٹے کا نام ہے۔

وہ یاسمین سے باتیں کرنے لگی۔ میں ان دونوں کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر دوسری طرف آگیا۔ جہاں میری عمر کے کچھ پرانے جان پہچان والے کھڑے ہوئے تھے۔

ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اچانک کسی نے پیچھے سے آکر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی لڑکی یاسمین کھڑی شکایت کررہی تھی۔ ''یہ کیا بات ہوئی جناب۔ آپ مجھے اکیلے چھوڑ کر کیوں آگئے؟''

''اکیلا کہاں، میں نے تو تمہیں قدسیہ کے ساتھ بٹھادیا تھا۔''

''اب میں آنٹی سے کتنی باتیں کرتی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تو آپ کی ضرورت ہے۔''

اس وقت میں ذرا جھینپ کر رہ گیا تھا۔ اگر کوئی ہماری بات سن لیتا تو نہ جانے کیا سوچنے لگتا۔ لیکن اس لڑکی کو تو جیسے ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر میزوں کی طرف کھینچنے لگی۔ ''آئیں نا، کھانا لگ گیا ہے۔ ورنہ بھوکے رہ جائیں گے۔''

میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑالیا تھا۔ وہ بچوں جیسی حرکتیں کیے جارہی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔

بہرحال کھانے کی میزوں کی طرف آتے ہوئے درمیان میں بہت سے لوگ حائل ہوگئے اور وہ ان میں کہیں اِدھر اُدھر ہوگئی۔

گھر واپس آئے تو قدسیہ نے وہی بات کہہ دی جو میں نے سمجھی تھی۔ اسے وہ لڑکی ارمان کے لیے پسند آگئی تھی۔ ''ماشا اللہ! بہت اچھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ ذرا اپنے دوست مکرم علی سے بات تو کریں۔''

''ارے بھائی، میں اس کے باپ کو نہیں جانتا۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ خود مجھ سے ملنے میرے پاس آگئی تھی۔''

''تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا پتا تو دیا ہے۔'' قدسیہ نے کہا۔ ''اور مجھ سے پتا لے گئی ہے۔''

اب میں نے اس لڑکی کو ارمان کے نقطہ نظر سے سوچنا شروع کردیا۔ وہ واقعی ہمارے ارمان کے لیے بہت اچھی ثابت ہوسکتی تھی۔ ذہین، خوبصورت اور چنچل سی لڑکی۔ ایسی لڑکیاں دل کی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ان کے اندر کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔

خیر، ابھی ہم اس لڑکی کی طرف جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک شام وہ خود ہمارے گھر آگئی۔ وہ اپنے ساتھ کیک بھی لائی تھی۔

''ارے؟'' میں اسے دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ ''تم کیسے آگئیں۔''

''آنٹی نے بتایا ہوگا۔ میں نے ان سے ایڈریس لے لیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، قدسیہ نے کہا تو تھا۔'' میں اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ''بیٹھو، میں قدسیہ کو بلا کر لاتا ہوں۔''

''ارے، آپ کہاں چل دیے۔'' اس نے کہا۔ ''میں کسی اور سے ملنے نہیں آئی۔ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''دیکھو یاسمین، گھر میں دوسرے لوگ بھی ہیں۔''

''ہوا کریں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔'' وہ اٹھلاتی ہوئی بولی۔ ''آپ سے ملنا ہے اور آپ سے مل کر چلی جاؤں گی۔''

''تم عجیب لڑکی ہو۔''

''ہاں، میں شروع ہی سے ایسی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ بتاؤ، آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سے دوستی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب یہ مت کہیے گا کہ چلو ہم دونوں دوست ہوگئے۔ بچوں سے بھی دوستی تو ہو ہی جاتی ہے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے درمیان وہ دوستی ہوگی جو عورت اور مرد کے درمیان ہوا کرتی ہے۔''

''کیا؟'' میں بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان کتنا فرق ہے۔ میں تمہارے باپ کی عمر کا ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ ''میں آپ سے دوستی کی خواہش پر قابو نہیں پاسکتی۔ اور جب کوئی اچھا لگ رہا ہو تو منافقت سے کیوں کام لوں، صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں۔''

''لڑکی! تم شاید پاگل ہوگئی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم تمہیں اپنی بہو بنانے کا سوچ رہے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا ہے۔''

''ایسی غلطی بھی مت کیجیے گا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں نے جب آپ کو سب کچھ سمجھ لیا ہے تو پھر آپ کے بیٹے سے شادی کیسے کرسکتی ہوں۔''

''بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، چلی جاؤں گی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''لیکن اتنا یاد رکھیں کہ میں آپ کو کسی بھی حال میں نہیں چھوڑ سکتی۔''

اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی، جبکہ میں ایک سکتے کے عالم میں وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد قدسیہ کمرے میں آئی تو اس نے حیران ہوکر پوچھا۔ ''ارے کیا ہوا، میں نے سنا ہے وہ لڑکی آئی تھی؟''

''ہاں، آئی تو تھی۔''

''تو پھر کہاں چلی گئی۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بلوالیا تھا۔''

اب میں قدسیہ کو کیا بتاتا کہ وہ لڑکی تم لوگوں سے نہیں بلکہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ بہت ہی حماقت انگیز صورتِ حال تھی۔ اس لڑکی نے تو پاگل ہی بنا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے قدسیہ سے بہانہ کردیا کہ وہ اپنا موبائل راستے میں کہیں گرا آئی تھی۔ اس لیے وہ اسے تلاش کرنے چلی گئی۔ اس وقت یہی بہانہ میری سمجھ میں آیا تھا۔

چند دنوں کے بعد میرے موبائل پر اس کا فون آگیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ نے مجھے پہچانا، میں وہی یاسمین ہوں۔''

''خدایا، تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ نمبر تو میں نے پہلی ملاقات ہی میں آنٹی سے لے لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''خدا کی بندی! کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔ آخر تمہیں کیا سوجھی ہے۔ تم کیوں اس طرح میرے پیچھے پڑگئی ہو۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''محبت کو تو پاگل پن ہی کہا جاتا ہے۔''

''ہوش کی دوا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیوں اس عمر میں مجھے بدنام کروانا چاہتی ہو۔''

''جناب، بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔''

''خاموش۔'' میں نے موبائل آف کردیا۔

اس نے کئی بار فون کیا۔ لیکن میں نے اس کی کال ہی نہیں سنی۔ پاگل پن کی حد ہوتی ہے۔ کیسی بدنامی کی بات تھی۔ لوگ کیا کہتے کہ بڑے میاں دیوانے ہوگئے ہیں۔ پاگل ہوگئے ہیں۔ سٹھیا گئے ہیں کہ اپنی بیٹی سے بھی کم عمر کی لڑکی کے ساتھ عشق کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

لاحول ولا! کیسی عجیب بات تھی۔ جبکہ ان تمام معاملات میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ خدا نہ کرے اگر قدسیہ یا بچوں یا کسی اور کو پتا چل جاتا تو

میری عزت تو دو کوڑی کی ہو جاتی۔
ایک بار پھر میں نے بھول کر اس کی کال اٹینڈ کر لی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔
''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''آپ میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کر تے۔''
''لڑکی! تم خدا کے لیے ہوش کے ناخن لو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا تمہیں بے وقوف بنانے کے لیے کوئی نوجوان نہیں ملا تھا جو تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔''
''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو بے وقوف بنا رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''خدا کے لیے یہ خیال دل سے نکال دیں۔ میں تو آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔''
''یہ کیسے ممکن ہے بے وقوف لڑکی۔''
''کیوں، اس میں کون سا انوکھا پن ہو گیا۔ میں آپ کو ہزاروں مثالیں دے سکتی ہوں کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو آسمان اور زمین کا فرق رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اگر میں بھی ان میں ایک ہو گئی تو اس میں کیا برائی ہے۔''
''لڑکی، تم نے تو مجھے پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔''
''چلیں چھوڑیں، آپ زندگی کی طرف واپس آئیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں کل شام ریوالٹو میں آپ کا انتظار کروں گی۔ ہم وہاں خوب انجوائے کریں گے۔''
''کیا میری عمر ایسی ہے کہ میں تمہارے ساتھ کسی ہوٹل میں انجوائے کر سکوں؟''
''بالکل ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔'' اس نے کہا۔ ''انسان جب تک زندہ ہے اسے زندگی سے لطف اٹھاتے رہنا چاہیے۔ دیکھیں، آپ کل شام کو ضرور آئیے گا۔''
''اور اگر نہ آؤں تو۔''
''کوئی بات نہیں، میں خود آپ کے گھر پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو اب تک میرے جنون کا اندازہ تو ہو ہی چکا ہو گا۔''
''اچھا اچھا، میں تمہیں اس پاگل پن سے باز رکھنے کے لیے تمہیں سمجھانے کے لیے آجاؤں گا۔''
''او کے۔ آئی لو یو۔'' اس نے دوسری طرف سے سلسلہ ختم کر دیا تھا۔
اس سے باتیں کرنے کے بعد میری پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ ایسی صورتِ حال پہلے تو کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی جوانی میں کسی سے محبت کی تھی۔ اس کے بعد قدسیہ سے میری شادی ہو گئی۔ پھر ایسا کوئی چانس ہی نہیں ملا، نہ ایسا کوئی اتفاق ہوا۔ لیکن اس لڑکی نے تو آ کر ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔
اب کیا کرنا چاہیے تھا۔ اب تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں اگر نہیں پہنچتا تو وہ واقعی گھر آجاتی۔ اس قسم کا پاگل پن ایسے ہی گل کھلایا کرتا ہے۔
غیر ارادی طور پر بلکہ لاشعوری طور پر میں نے گھر والوں سے اپنے جذبات کو چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ میں خود کو تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا۔
میں اس شام دفتر سے گھر آنے کی بجائے ریوالٹو پہنچ گیا۔ یہ میرا جانا پہچانا ہوٹل تھا اور اس لحاظ سے شہرت یافتہ تھا کہ اس ہوٹل میں محبت کرنے والے جوڑے آیا کرتے تھے اور آج ایک بے تکا جوڑا اس ہوٹل میں ایک دوسرے سے ملنے والا تھا۔
یاسمین وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے بہت ہی خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے یہ خیال آیا کہ کاش یہ پاگل لڑکی میری بہو بننا قبول کر لے۔ لیکن وہ تو نہ جانے کیا سوچے ہوئے تھی۔
اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔ ''میں جانتی تھی کہ آپ ضرور آئیں گے۔ کیونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔''
میں بہت سے لوگوں کے درمیان شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن لوگ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ دونوں باپ بیٹی ہوں گے یا اسی قسم کا کوئی اور رشتہ ہو گا اس لیے کسی نے ہماری طرف دھیان نہیں دیا۔
میرا خیال ہے کہ اگر وہ سن لیتے کہ یہ لڑکی ایک تقریباً بوڑھے شخص سے پیار بھری باتیں کر رہی ہے تو وہ حیرت سے بے ہوش ہو جاتے۔
یاسمین میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک میز کی طرف لے آئی۔ وہ اس وقت بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی اور میں اس کے پاگل پن کو دیکھ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔
اس نے کھانے کا آرڈر اپنی مرضی سے دیا تھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں تو آپ کو کیسا لگے گا۔''
''پھر وہی بات کی تم نے۔''
''اوہو، آخر کب تک آپ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ایمانداری سے

بتائیں۔ سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ کیا مجھ سے ملنے کے بعد آپ کو زندگی میں کوئی خوبصورت تبدیلی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ کیا آپ کو اپنی زندگی پہلے سے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ کیا آپ کو پھر سے جینے کا حوصلہ نہیں ملا ہے۔ سوچیں، اچھی طرح سوچیں۔ پھر سچ سچ بتا دیں۔''

میں نے جب غور کیا تو احساس ہونے لگا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ واقعی میں اپنے آپ میں ایک خوش گوار تبدیلی سی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ بہت معیوب سی بات تھی۔ اس کے باوجود یہ سوچنے لگا تھا کہ کاش یہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے۔ جیسے میری جوانی لوٹ آئی تھی۔ بیتے ہوئے دن اور بھی خوبصورت اور طرح دار بن کر میرے پاس آ گئے تھے۔

''بتائیں نا خاموش کیوں ہو گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''یاسمین... یہ سب تو ہے لیکن......''

''اب لیکن ویکن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جب زندگی کی طرف آ ہی گئے ہیں تو پھر کیا مڑ کر دیکھنا۔''

میرے لیے بہت بڑی پرابلم تھی کہ میں اس سے کیسے رومان بھری باتیں کرتا۔ اس کے دعوئے نے تو مجھے مسخرہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں سوائے خواب دیکھنے کے اور کر ہی کیا سکتا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم ساحل کی طرف آ گئے۔ اس دن مجھے پتا چلا کہ اس کے پاس ایک چھوٹی سی اپنی گاڑی بھی ہے جس کو وہ خود ہی ڈرائیو کیا کرتی ہے۔ یعنی وہ ہر طرح سے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ جس نے مجھ سے محبت کرنی شروع کر دی تھی۔ ویسے میں یہ کہتے ہوئے بھی خود کو چغد محسوس کر رہا ہوں۔

اس قسم کے رشتے وڈیرانہ اور جاگیردارانہ ماحول میں زبردستی تو ہوا کرتے ہیں لیکن اپنی مرضی سے کبھی نہیں ہوتے۔ ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے اچانک مجھے میری جان پہچان کے ایک صاحب مل گئے۔ وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس آ گئے۔ ''ارے بھائی خواجہ، بہت دنوں کے بعد دکھائی دے رہے ہو۔''

میں اس لڑکی کے خوف سے ان کو ایک طرف لے آیا۔

''پوتی کے ساتھ آئے ہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

میں شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ واقعی یاسمین میری پوتی کی طرح تو تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان صاحب کی فیملی نے انہیں اپنی طرف بلا لیا اور وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنی فیملی کی طرف چلے گئے۔ اس طرح میں ان کے ایک بہت الجھے ہوئے سوال کا جواب دینے سے بچ گیا تھا۔

''کیا بات ہے، آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔'' یاسمین نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ''وہ آدمی آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے اسے بتا دیا کہ اس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔

وہ یہ سن کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ ''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے۔ آپ صاف صاف بتا دیں کہ میں آپ کی گرل فرینڈ ہوں۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''ارے تو اس میں پرابلم کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کی دوست ہوں یا نہیں؟''

''ہاں، دوست تو ہو۔''

''اور گرل بھی ہوں۔ لہٰذا سیدھی سیدھی گرل فرینڈ ہو گئی۔''

اب ایسی لڑکی کے لیے کیا کہا جا سکتا تھا۔ اس کی تو نیچر ہی الگ تھی۔ بے باک، بولڈ، اور نہ جانے کیا۔ میں اس کو ابھی تک سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ میں اس سے اس لحاظ سے باتیں کرتا۔

ایک بات اور بھی تھی کہ وہ مجھے کردار کی بھی خراب نہیں دکھائی دی تھی۔ اس لیے وہ جو کچھ بھی کر رہی تھی... وہ اس کے ذہن کی سنک کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

ہم بہت دیر تک ساحل پر گھومنے کے بعد واپس آ گئے۔ اس رات میں بہت دیر تک الماری کے آئینے کے سامنے کھڑا خود کو دیکھتا رہا تھا۔

کیا مجھ میں کوئی خاص بات تھی؟ کیا میرے چہرے پر یا میری آنکھوں میں کوئی کشش تھی؟ نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو ایک ڈوبتے ہوئے انسان کا چہرہ تھا۔ مرجھایا ہوا۔ زندگی کی ڈور جس کے ہاتھ سے پھسلی جا رہی تھی۔ تو پھر اس لڑکی کو مجھ میں ایسی کون سی بات نظر آ گئی تھی۔ کیا چاہتی تھی وہ؟

اس رات میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں اس کے گھر جا کر اس کے گھر والوں سے مل کر یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان کی بیٹی کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کر رہی ہے۔

حالانکہ شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس کے باپ سے کیا جا کر کہتا کہ اس کی بیٹی مجھ جیسے بوڑھے سے

محبت کرنے لگی ہے۔ ذرا اس کو سمجھانے کی کوشش کریں۔

کیسی عجیب بات ہوتی۔ وہ سب الٹا مجھ ہی پر چڑھ دوڑتے کہ بڑے میاں، کم از کم تم تو عقل مند ہو۔ تم تو سمجھا سکتے ہو اس کو۔ تمہیں تو خود سختی کے ساتھ اس کو جھڑک دینا چاہیے تھا۔ الٹا تم اس کی فریاد لے کر ہمارے پاس آ گئے ہو۔ بس یہ سب سوچ کر میں نے اس کے گھر جانے کا ارادہ ختم کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب اس سے الگ ہو جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اتنی خوشی ملی تھی۔ جینے کا لطف آنے لگا تھا۔ میں ایسی صورت میں ایک بہت بڑی خوشی سے محروم ہو جاتا۔ اس سے ملنے سے پہلے زندگی بہت بجھی بجھی سی تھی۔ کسی چیز میں بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن اب پورے بدن میں، پورے وجود میں ایک امنگ سی جاگ اٹھی تھی۔ اس لیے میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ضرورت کیا تھی بتانے کی۔ خدا جانتا ہے کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اسے راغب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ تو خود میرے پاس آئی تھی۔

دوسرے یا شاید تیسرے دن اس نے پھر بلا لیا۔ اس بار اس نے فون پر کہا تھا۔ ''خواجہ صاحب، جانتے ہیں کل میں آپ کو کس لیے بلا رہی ہوں۔''

''نہیں، اس کا جواب تم ہی دو گی۔''

''چلیں، ایک کام کریں۔ آتے ہوئے گلاب کا ایک پھول لیتے آئیے گا۔'' اس نے کہا۔

''گلاب کا پھول!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''آپ لائیں تو سہی، پھر بتاؤں گی۔''

اس نے اس بار ایک دوسرے ہوٹل میں آنے کے لیے کہا تھا۔ میں دوسرے دن دفتر ہی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے راستے سے گلاب کا پھول لے لیا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ تم نے یہ گلاب کا پھول کیوں منگوایا ہے۔''

''اب آپ اسے میرے بالوں میں لگا دیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا...!'' جیسے میری سانسیں پھولنے لگی ہوں۔ ''یاسمین، کیا کہہ رہی ہو؟''

''آج میری برتھ ڈے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں چونکہ آپ کو اپنے گھر نہیں بلا سکتی تھی۔ اس لیے میں نے آپ سے اس ہوٹل میں ملاقات کر لی ہے۔''

''پہلے سے بتا دیا ہوتا تو تمہارے لیے کچھ لے آتا۔'' میں نے کہا۔

''گلاب لے تو آئے ہیں۔ اب اس سے خوبصورت تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ چلیں، میرے بالوں میں لگا دیں۔''

''کیوں مجھے تماشا بنواؤ گی۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔''

''اچھا چلیں، سامنے والے پارک میں چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں کسی بینچ پر بیٹھ کر آپ میرے بالوں میں یہ پھول لگا دیجیے گا۔''

اس کے بالوں میں پھول لگاتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''خود کو قابو میں رکھیں خواجہ صاحب، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' اس کا لہجہ بہت شوخ اور حوصلہ افزا تھا۔

میں نے کسی نہ کسی طرح اس کے بالوں میں پھول لگا ہی دیا تھا۔

اس رات میں بہت سرشار ہو کر گھر واپس آیا تھا۔ ایک عجب طرح کی بے خودی اور سرشاری کی کیفیت تھی۔ سب کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ پھولوں کے رنگ بہت گہرے ہو گئے تھے..... اڑتے ہوئے پرندوں کی اڑانوں میں بہت معنویت آ گئی تھی۔ اور شاید پہلی بار قدسیہ سے بے زاری محسوس ہوئی تھی۔ کہاں یہ مرجھایا ہوا پھول اور کہاں وہ کھلتی ہوئی کلی۔ اس لڑکی نے تو مجھے بدل کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر کی دنیا کتنی شاداب اور پُر بہار کر دی تھی۔

اب میں اپنے آپ پر زیادہ دھیان دینے لگا تھا۔

ایک دن میں اپنے بال ڈائی کروا کے جب گھر پہنچا تو قدسیہ اور بچے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''ارے یہ کیا! یہ کیا کروا کے آ گئے۔'' قدسیہ نے پوچھا۔

''بال ڈائی کروائے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''کیسے لگ رہے ہیں؟''

''اب کیا بتاؤں۔ کیا سوجھی تھی آپ کو؟ لوگ کیا کہیں گے۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔''

میں بھنا کر رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے قدسیہ کے لیے اور گھر والوں کے لیے تو میں ایک مذاق ہی بن گیا تھا۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

جس کو جو کہنا ہو وہ کہتا رہے۔ مجھے تو اپنی خوشی دیکھنی تھی۔ اپنی زندگی دیکھنی تھی۔ اپنے خواب دیکھنے تھے۔ اپنے ادھورے ارمانوں کی تکمیل کرنی تھی۔

میں نے زندگی کا ایک نیا مفہوم حاصل کر لیا تھا۔ بہت

بڑی دولت ہاتھ آ گئی تھی۔

لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہتا۔ اس کا انجام تو ہونا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ میں اس سے شادی تو نہیں کر سکتا تھا۔ پورے سماج میں تماشا بن کر رہ جاتا۔

شاید وہ بھی نہیں کرتی۔ کیونکہ میں تو ایک بوڑھا انسان تھا۔ تو پھر کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔ صرف ایک بات ہو سکتی تھی کہ میں اس کے جسمانی طور پر قریب ہو جاؤں۔ اس سے کچھ خوشی حاصل کرلوں۔ اس کو خود سے قریب کرلوں۔

میں نے ایک شام موقع پا کر بہت ہمت کی اور اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ بہت دیر تک کسی نازک سی فاختہ کی طرح میرے سینے سے لگی رہی تھی۔

دوسری صبح ہی اس کا پھر فون آ گیا۔ اس کا فون سنتے ہی میں نہال ہو جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے پھر ایک ہوٹل میں آنے کو کہا تھا۔

''یہ تم مجھے ہوٹل میں کیوں بلاتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کیا کروں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور ہم کہاں مل سکتے ہیں۔ یہ بھی تو ایک مجبوری ہے نا۔''

اس کا بھی کہنا ٹھیک ہی تھا۔ ہم کہاں مل سکتے تھے۔

اس شام میں اور بھی اہتمام کے ساتھ اس ہوٹل میں پہنچا تھا جہاں اس نے بلایا تھا۔ وہ ہوٹل کے ایک کونے والی میز پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔

اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک میز پر ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کے سربراہ کے قہقہے پورے ہوٹل میں گونج رہے تھے۔ وہ سب کے سب بہت ہی خوش اور اس طرح مطمئن دکھائی دے رہے تھے جیسے انہوں نے زندگی سے بہت کچھ حاصل کرلیا ہو۔

''خواجہ صاحب۔'' یاسمین نے مجھے مخاطب کیا۔ ''وہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ رہے ہیں۔''

''ہاں، دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ماشاء اللہ بہت ہی خوش باش قسم کے انسان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ان کا نام امجد حسین ہے۔'' یاسمین نے بتایا۔

''کیا تم ان کو جانتی ہو۔''

''بہت اچھی طرح۔ یہ پہلے ایسے نہیں تھے۔ یہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ہر وقت ڈپریشن کا شکار رہتے۔ جب دیکھو کسی ڈاکٹر کے پاس بیٹھے ہوتے۔''

''بظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دے رہا۔''

''ہاں، اس وقت ایسا نہیں لگ رہا۔ لیکن یہ ایسے ہی تھے۔ یہ اپنی زندگی کی خوشیوں سے دور جا چکے تھے۔ جانتے ہیں انہیں کون سی طاقت زندگی کی طرف واپس لائی ہے۔''

''نہیں، میں یہ نہیں جانتا'' میں نے کہا۔

''محبت کی طاقت۔'' یاسمین نے بتایا۔ ''ایک جوان لڑکی کی جوان محبت کی طاقت۔ اور وہ جوان لڑکی میں ہوں۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یاسمین، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں خواجہ صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''اسی طرح کی محبت جس طرح کی محبت میں نے آپ سے کی ہے۔''

''یاسمین، میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔''

''میرا کام ہی یہی ہے خواجہ صاحب۔'' وہ بولے جا رہی تھی۔ ''آپ اسے میری عبادت سمجھ لیں۔ میرا شوق۔ میں اسی طرح ڈپریسڈ لوگوں کو زندگی کا حوصلہ دیتی ہوں۔ انہیں یہ بتاتی ہوں کہ جیتے رہنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ زندگی مرجھانے کا نہیں بلکہ کھل اٹھنے کا نام ہے۔ خوش رہنے کا نام ہے۔''

وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہی۔ لیکن اب میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میں جیسے سکتے کے عالم میں تھا۔ ایک خواب بکھر جائے تو ایسا ہی دکھ ہوا کرتا ہے جیسا دکھ مجھے ہو رہا تھا۔

وہ شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن میں اٹھ کر ہوٹل سے باہر آ گیا تھا۔ عجب قسم کی الجھن، بے چینی اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ خواب اس طرح ٹوٹ جائے تو ایسا ہی احساس ہوا کرتا ہے۔

اور اب۔۔۔ اب اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ اور وہ لڑکی، میں شاید زندگی بھر اس کے احسان کا بدلہ نہ اتار سکوں۔ میں اس کے بعد اس سے تو نہیں ملا لیکن یقین جانیں اس کا مشن مکمل اور کامیاب ہو چکا ہے۔ میں اب پوری طرح زندگی کی طرف واپس آ گیا ہوں۔

میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ خوش ہوں۔ خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔ اس نے مرجھائے ہونٹوں کو مسکرانے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔

✷

غلطی

محترمہ مدیرہ اعلیٰ

السلام علیکم!

امید قوی ہے کہ بخیریت ہوں گی۔ زندگی میں پہلی بار ایک کہانی لکھی ہے۔ یہ میری اپنی کہانی ہے۔ مجھ پر جو گزری ہے اسے میں نے قلم بند کیا ہے۔ میری کہانی میں دوسروں کے لیے بھی سبق ہے اس لیے میں نے اسے کاغذ پر اتارا ہے۔ اگر یہ شائع ہوگئی تو بہت سے لوگ سبق حاصل کریں گے۔

سحرش
(کراچی)



وہ مجھے پہلی نظر میں بہت اچھا لگا تھا۔

اُلجھے ہوئے بال۔ ہلکی ہلکی شیو۔ سوچتی ہوئی آنکھیں۔ لباس گرچہ صاف ستھرا، لیکن بے پروائی سے استعمال کیا ہوا۔ اس کی باتوں میں گہرائی تھی۔ اس کی انگلیاں کینوس پر جادو جگا دیتی تھیں۔ وہ ایک مصور تھا۔

نورنگ نام تھا اس کا۔ میں نے جب اس کی تصویریں دیکھیں تو پاگل سی ہوگئی۔ کیا خوبصورت تصویریں تھیں۔ اور اس نے یہ تصویریں ایک عام سے اتوار بازار میں فروخت کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے اس سے کہا۔ ''آپ کیوں اپنی تصویروں کی ناقدری کر رہے ہیں۔ یہ تصویریں اس بازار کے لیے نہیں ہیں۔''

میں اتوار بازار میں سبزیاں وغیرہ خریدنے گئی ہوئی تھی۔ وہیں میں نے اس کی تصویروں کا اسٹال دیکھا تھا۔ اسٹال کیا تھا۔ اس نے کرائے پر دو میزیں لگا کر ان پر اپنی تصویریں سجا رکھی تھیں۔

''میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ میری کوئی لابی نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں بڑی بڑی ایگزیبیشن کروا سکوں۔''

''تو کیا یہاں تصویریں فروخت ہو جاتی ہیں۔''

''خاک فروخت ہوں گی۔ لوگوں کو ان تصویروں کی اہمیت ہی نہیں معلوم۔ انہیں بھی آلو گاجر سمجھتے ہیں۔''

''دو سو لے لیں۔ تین سو لے لیں۔ اس سے زیادہ نہیں بڑھتے۔'' اس کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔

''یہ تو آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔''

''آپ پہلی ہیں جس نے میری تصویروں کو سمجھ کر بات کی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے بہت اچھا لگا۔ کیا آپ کا تعلق آرٹ سے ہے۔''

''ایسا کوئی تعلق تو نہیں ہے۔ لیکن تصویریں دیکھتی رہی ہوں۔ ان کی قیمت اور اہمیت سے بھی واقف ہوں۔''

''نام کیا ہے آپ کا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا نام بتانا ضروری ہے۔'' میں بھی مسکرادی تھی۔

''ہاں' تا کہ یاد رکھ سکوں کہ اس نام کی کوئی قدر دان ملی تھیں۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر میرا نام سحرش ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور آپ نورنگ ہیں۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم۔''

''اس لیے کہ ہر تصویر کے نیچے آپ نے اپنا نام لکھ رکھا ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''جی ہاں میرا نام نورنگ ہی ہے۔''

نورنگ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ صرف پہلی۔ ابھی تو ہم نے ملاقات کی ابتدا کی تھی۔ اس کے بعد میں باقاعدگی سے اتوار بازار جاتی رہی۔

میرے گھر والے میرے اس شوق کو دیکھ کر حیران ہوتے رہتے تھے۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ میں اتوار بازار جانے سے کترایا کرتی۔ گھر والے کہتے بھی کہ جاؤ وہاں ذرا سستی چیزیں مل جاتی ہیں تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا کرتی۔ لیکن اب نورنگ کی وجہ سے شوق سے جایا کرتی۔

وہ ہر اتوار کو اپنی تصویروں کے ساتھ وہاں ہوا کرتا۔

میں نے اس کی دو تصویریں بھی خرید لی تھیں۔ جن کی قیمت کچھ بھی ہو لیکن اس نے مجھ سے کچھ نہیں لیا تھا۔

بہت آہستہ آہستہ لیکن بہت مضبوط انداز سے نورنگ میرے دل کے قریب ہوتا چلا گیا۔ پھر ہماری ملاقاتیں اتوار بازار کے علاوہ بھی ہونے لگیں۔ میں اس کے سحر میں گرفتار ہوگئی تھی۔

ایک وقت آیا کہ اس کے علاوہ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میرے لیے وہ سب کچھ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک بار وہ مجھے اپنے فلیٹ میں لے گیا۔

تین کمروں کا ایک فلیٹ۔ جس کو اس نے خوبصورت آرٹسٹک انداز میں سجایا ہوا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ ''بس زندگی میں مجھ سے یہی عقل مندی ہوئی کہ میں نے یہ فلیٹ خرید لیا تھا۔ ورنہ ان حالات میں تو دھکے ہی نصیب ہوتے۔''

''سب ٹھیک ہوجائے گا نورنگ۔'' میں نے تسلی دی۔ ''اب میں تمہاری زندگی میں شامل ہوگئی ہوں۔ دونوں مل کر حالات کو بہتر بنالیں گے۔''

''لیکن یہ کیسے ہوگا۔ میں ایک غریب آرٹسٹ ہوں۔ تمہارا گھرانا کھاتا پیتا ہے۔ وہ ہمیں کس طرح قبول کریں گے۔''

''کیونکہ میں نے تمہیں قبول کرلیا ہے۔'' میں نے کہا ''مجھے کسی اور کی پرواہ نہیں ہے۔''

ایک بار اس نے کہا۔ ''سحرش، میں تمہارا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کی اجازت دو گی۔''

میں بتا چکی ہوں کہ نورنگ میں بے حد نفاست بھی تھی اور وہ بے انتہا خوبصورت بھی تھا۔ اس لیے میں نے فوراً کہا۔ ''نورنگ' جب میں خود ہی تمہاری ہو چکی ہوں تو پھر مجھ سے اجازت کیا لینا۔''

''شکریہ۔ تو پھر ہفتے میں دو دن تمہیں جم کر میرے سامنے بیٹھنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں بہت ہی سکون اور اپنی پوری مہارت کے ساتھ تمہاری تصویر بنانا چاہتا ہوں۔''

ہم نے وقت مقرر کرلیا۔ ایک ہفتے میں صرف دو دن بیٹھنا پڑا تھا۔ لیکن اس نے واقعی میری تصویر بنانے میں اپنا کمالِ فن دکھا دیا تھا۔ بے انتہا خوبصورت تصویر بنائی تھی اس نے۔ میں نے جذبات میں آکر اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

ایک دن میرے گھر پر میرے لیے ایک رشتہ آگیا۔ لڑکا بہت اچھا تھا۔ کہیں باہر ملازمت تھی اُس کی۔ گھر والے ان لوگوں کو پہلے سے جانتے تھے۔ لیکن میرے لیے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ میرے دھیان میں تو صرف نورنگ تھا۔ صرف نورنگ۔

میں نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ گھر والے یہ سن کر حیران رہ گئے تھے۔

''آخر کیوں؟'' میری بڑی بہن نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم نے انکار کیوں کیا؟''

''آپا' سچی بات یہ ہے کہ میں کسی اور کو پسند کرنے لگی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا! کون ہے وہ؟''

''نورنگ نام ہے اس کا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائی ہیں۔''

''وہ کرتا کیا ہے؟''

''آرٹسٹ ہے۔ تصویریں بناتا ہے۔''

''کیا پاگل ہوگئی ہو۔ اس ملک میں آرٹسٹ کی ویلیو ہی کیا ہے۔'' آپا غصے سے بول رہی تھیں۔ ''کیا آمدنی ہوگی

اس کی، وہ کہاں سے تمہیں ٹکرا گیا۔''

''اتوار بازار سے۔'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''وہ اتوار بازار میں اسٹال لگاتا ہے۔'' یہ ایک اور دھماکا تھا۔

پورا گھر مجھ پر چڑھ دوڑا کہ میں نے ایک ایسے شخص کو پسند کیا ہے جو اتوار بازار میں اسٹال لگاتا ہے۔ سب ہی مجھ سے بے پناہ ناراض تھے۔ میں ان سب کی ناراضی دیکھ کر بولی۔ ''آپ لوگ تو اس طرح بھڑک رہے ہیں جیسے وہ اتوار بازار میں سبزی اور فروٹ کا اسٹال لگاتا ہے۔''

''وہ لگاتا تو پھر بھی اچھا تھا کیونکہ اس میں کمائی ہوجاتی ہے۔'' میرے بڑے بھائی نے کہا۔ ''اس آرٹسٹ کو کیا ملتا ہوگا۔''

''میں نے اس کی انکم نہیں دیکھی۔ بس، میں اسے پسند کرتی ہوں۔ اس کو حاصل کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' ابو بھی شور کرنے لگے۔ ''اس انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سحرش جس آرٹسٹ کی بات کر رہی ہے' میں اسے اتوار بازار میں دیکھ چکا ہوں۔ کیا خاص بات ہے اس میں؟''

غرضیکہ میرے اس اعلان کے بعد گھر میں ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ لیکن میں بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یا تو میری شادی نورنگ سے ہوگی ورنہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔

میں شاید ایک جنونی کیفیت میں تھی۔ سوائے نورنگ کے مجھے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بالآخر گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فوری طور پر مجھے ماموں کے یہاں اسلام آباد شفٹ کر دیں گے۔ تا کہ وہاں جا کر وہاں کے ماحول میں میری یہ کیفیت کم ہوجائے۔

جب مجھے اس اسکیم کا پتا چلا تو میں نے پھر طوفان کھڑا کر دیا۔

رونا دھونا۔ بھوک ہڑتال۔ میں دراصل اپنی محبت کے محاذ پر ڈٹ گئی تھی۔ پھر یہی ہوا کہ ایک اتوار کو میرے بڑے بھائی مجبور ہو کر نورنگ سے بات کرنے اتوار بازار پہنچ گئے۔

انہوں نے واپس آکر مجھ پر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔ ''تو تو پاگل ہوگئی ہے۔ تو اس آدمی کے لیے دیوانی ہو رہی ہے جسے تیری پروا ہی نہیں ہے۔''

''یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں بھائی۔''

روس نیٹو مشترکہ کونسل

اس کونسل کا قیام نیٹو کے 19 ممالک اور روس کے مابین ایک سمجھوتے کے تحت 2002ء میں عمل میں آیا۔ اس کونسل نے 1997ء میں قائم ہونے والی اس کونسل کی جگہ لی، جس میں روس نے 1999ء میں کوسوو کے مسئلے پر یوگوسلاویہ کے ساتھ نیٹو کی لڑائی کے خلاف بطور احتجاج ایک سال تک اپنی رکنیت کو معطل رکھا۔

نئے سمجھوتے کے تحت نیٹو تنظیم کسی مسئلے کو اس وقت تک حتمی شکل نہیں دے سکے گی، جب تک اسے روس کی منظوری حاصل نہ ہوگی، تاہم روس ان فیصلوں پر اپنا حقِ استرداد استعمال نہیں کر سکے گا، جو نیٹو نے اپنے طور پر کیے ہوں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ سفیروں کی سطح کا اجلاس ایک ماہ میں کم از کم لازمی طور پر برسلز (بلجیم) میں ہوا کرے گا، علاوہ ازیں ہر سال وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع کے دو اجلاس بھی منعقد ہوا کریں گے۔

مرسلہ: خان شہباز خان، ایبٹ آباد

''اس لیے کہ میں اس سے مل کر آرہا ہوں۔'' بھائی نے بتایا۔ ''اس نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر سحرش میرے لیے پاگل ہو رہی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ لوگ سمجھانا چاہتے ہیں تو سحرش کو سمجھائیں۔ میرے پاس کیوں چلے آئے ہیں۔''

''اس نے غلط تو نہیں کہا۔ پاگل تو میں ہو رہی ہوں۔ وہ میری پسند ہے۔ میں اس کی پسند نہیں ہوں۔''

''تو پھر تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں نورنگ کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ گھر والوں نے اس سے شادی کرنا منظور کرلیا۔ حالانکہ وہ بار بار مجھے سمجھاتے رہے تھے کہ دیکھو وہ ایک اکیلا انسان ہے۔ اور جس کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہ ہو اس پر بھروسا نہیں کیا جاتا۔ پھر وہ کہیں کام بھی نہیں کرتا۔ اس کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

''کچھ بھی ہو مجھے اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اور جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو خود میں پڑھی لکھی ہوں۔ میں شادی کے بعد کہیں جاب کرلوں گی۔''

''جہنم میں جاؤ۔ جب تم نے خود ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

اس کے بعد نورنگ کو بلا کر اس سے شادی کی بات کرلی گئی۔ اور بہت ہی بے دلی کے ساتھ انہوں نے نورنگ سے میری شادی بھی کردی۔

بہت ہی خاموشی کے ساتھ یہ شادی ہوئی تھی۔ نہ مہندی، نہ مایوں، کچھ بھی نہیں۔ بس نکاح پڑھا کر مجھے رخصت کردیا گیا تھا۔ یہ ایک طرح کی کورٹ میرج جیسی تھی۔

بہت کم رشتے دار اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔

گھر والوں کے احساسات چاہے جیسے بھی رہے ہوں۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ میں بے پناہ خوش تھی.... میں نے نورنگ کو پا کر جیسے سب کچھ حاصل کرلیا تھا۔

لڑکی کو اور کیا چاہیے۔ ایک پیار کرنے والا شوہر۔ ایک خوبصورت سا اپنا فلیٹ۔ اور جہاں تک گھر والوں کی بات تھی تو وہ مان ہی جاتے۔ میں خود کئی بار دیکھ چکی ہوں۔ لڑکی نے اپنی پسند سے شادی کرلی۔ گھر والے کچھ دنوں تک ناراض رہے۔ پھر بعد میں بیٹی اور داماد کو گلے سے لگالیا۔

میں جانتی تھی کہ ہمارے معاملے میں بھی یہی ہوگا۔

نورنگ نے ولیمہ بھی کیا تھا۔ بہت عام سا۔ اس میں گھر کی طرف سے صرف امی اور آپا شریک ہوئی تھیں۔ اور کوئی نہیں آیا تھا۔ جبکہ نورنگ کے دو چار دوست تھے۔

میری ساری خواہشیں دم توڑتی جارہی تھیں۔ لڑکی کو دلہن بننے، مہندی، مایوں، شادی ولیمے وغیرہ کا کتنا انتظار رہتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں خوش تھی۔ کیونکہ نورنگ میرا تھا۔

مجھ پر ایک نشہ سا تھا۔ لیکن یہ نشہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اترتا چلا گیا۔ کیونکہ ہمارے یہاں انکم کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ نورنگ کے پاس جو پیسے تھے وہ ختم ہوتے جارہے تھے۔ اور اس کی تصویریں بکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اتوار بازار سے کچھ بھی حاصل نہیں ہورہا تھا۔

ہاں، نورنگ کے پاس آکر پتا چلا کہ نورنگ شراب بھی پیتا تھا۔ یہ انکشاف گھر میں رکھی ہوئی بوتلوں سے ہوا تھا۔

''ہاں یار۔'' وہ خجالت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تم تو جانتی ہو کہ تخلیقی کاموں کے لیے اس قسم کے سہاروں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔''

''لیکن نورنگ... ایک تو یہ بہت خراب عادت ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔''

''بس کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جاتا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

میں خاموش ہوکر رہ گئی۔ میں نے اس کے بعد اپنی ملازمت کی کوششیں شروع کردیں اور ایک جگہ سے آفر آبھی گئی۔ میں نے جب نورنگ کو بتایا تو وہ مسکرا کر بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، اس طرح گھر کے اخراجات کسی حد تک پورے ہوجائیں گے۔''

اس دن مجھے پہلی دفعہ نورنگ کی طرف سے دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی تھی۔ کاش وہ یہ کہتا، نہیں جان، تمہیں محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا۔ میں تمہارے لیے رات دن کام کروں گا۔ تم گھر میں رہو۔''

لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ ایک طرح سے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔

میں کسی کو کیا بتاتی۔ میں نے ملازمت شروع کردی۔ صبح آٹھ بجے نورنگ کے لیے ناشتا وغیرہ تیار کرکے جاتی اور چار بجے واپس آکر کچن میں مصروف ہوجاتی۔

نورنگ اس دوران گھر ہی میں یا تو ٹی وی دیکھ رہا ہوتا یا پھر سویا ہوا ہوتا۔ اب اسے دیکھ دیکھ کر کوفت ہونے لگی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہہ دیا۔ ''نورنگ، جب میں جاب کرنے لگی ہوں تو پھر تم کیوں نہیں کرسکتے۔''

''کیا پاگل ہوگئی ہو۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں، تم کیا چاہتی ہو کہ میں عام آدمیوں کی طرح جاکر دفتروں میں کام کروں۔ اگر مجھے ترقی کرنی ہوگی تو اسی فیلڈ میں کروں گا۔''

''نورنگ میں اور کئی فنکاروں کو جانتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک طرف تو اپنے فن کی بھی حفاظت کرتے ہیں اور دوسری طرف دفتروں میں کام بھی کرتے ہیں۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنادیا۔ ''اگر میں نے دفتر میں کام شروع کیا تو پھر وہیں کا ہوکر رہ جاؤں گا۔ میرا مزاج ہی ایسا ہے۔ پھر میری فنکاری ختم ہوجائے گی۔''

''تو پھر اس طرح کیسے کام چلے گا۔''

''سب ہوجائے گا۔ میں اب خاص قسم کی تصویریں بناؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ اتوار بازار کے علاوہ بھی اپنا اسٹال وغیرہ لگاؤں۔''

لیکن کچھ نہیں ہوسکا۔ اس کے یہی انداز رہے۔ حالانکہ وہ پڑھا لکھا تھا۔ وہ چاہتا تو کہیں ملازمت کرسکتا تھا۔

لیکن اس نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

نوبت یہاں تک آگئی کہ اپنی شراب کے لیے وہ مجھ سے پیسے لینے لگا.... میں نے دفتر سے ایڈوانس لینا شروع کردیا.... اس دوران راستے میں ایک دوبار آپا سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ شادی کے بعد گھر والوں نے ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ انہوں نے مجھے چھوڑ ہی دیا تھا۔

آپا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ ''سحرش، کیسی ہے تو؟''

''بالکل ٹھیک ہوں آپا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''نورنگ کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟''

''بہت اچھی، وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور ہاں میں نے جاب بھی شروع کررکھی ہے۔''

''ارے، کیا گھر میں تنگی ہوگئی ہے۔''

''نہیں تو، سب ٹھیک ہے۔ نورنگ کی تصویریں فروخت ہورہی ہیں۔ ان سے اچھے خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں دن بھر گھر میں بور ہوتی رہتی تھی۔ نورنگ تو اپنی تصویروں کے چکر میں اسٹوڈیو چلے جاتے ہیں۔ میں گھر میں اکیلی رہتی تھی اس لیے میں نے یہ جاب کرلی۔''

''نورنگ کا اسٹوڈیو کہاں ہے؟''

''کارساز روڈ پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا بڑا اسٹوڈیو ہے۔''

''چلو، اصل بات تو یہ ہے کہ تم خوش ہو۔''

اس وقت میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں یہ کیسے کہتی کہ آپا یہ سب جھوٹ ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ نورنگ شرابی ہے۔ اس کا کوئی اسٹوڈیو نہیں ہے۔ کوئی آمدنی نہیں ہے۔ لیکن میں یہ سب کچھ نہیں کہہ سکی۔ میں نے تو خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اب جو کچھ برداشت کرنا تھا، وہ مجھ ہی کو کرنا تھا۔

آہستہ آہستہ میرے سر سے عشق کا بھوت اترنے لگا تھا۔

زندگی کی کڑوی حقیقتیں سامنے آنے لگی تھیں۔

اب پتا چلا تھا کہ کسی کو ایک لمحے کے لیے دیکھ کر اس کا تاثر قائم کرلینا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ پیٹ کی سچائی کے سامنے اور کوئی سچائی نہیں ہوتی۔

اب نورنگ کی کھوئی کھوئی آنکھیں شرابی کی آنکھیں تھیں۔ اب اس کا مہذب اور نرم لہجہ مجھے خوشامدانہ لگنے لگا تھا۔ کیونکہ میں جاب کرکے اس کے کھانے اور شراب کا بندوبست کیا کرتی تھی۔

صورتِ حال روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان اب جھگڑے بھی ہونے لگے تھے۔ اس کے مزاج کی خرابیاں ایک ایک کرکے سامنے آرہی تھیں۔

وہ ایک کاہل قسم کا انسان تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ کوئی اور اس کے اخراجات پورے کرتا رہے۔ اب پتا چل رہا تھا کہ میں نے ایسے شخص سے شادی کرکے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔

وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا۔ ''سحرش، میری جان، میں تمہیں بہت دکھ دے رہا ہوں۔ تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔ تم کو میری وجہ سے کتنی پریشانیاں ہورہی ہیں۔''

اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اس کے آنسو دیکھ کر میں بھی رونے لگتی تھی۔ کچھ بھی ہو، ہم ایک دوسرے سے محبت تو کرتے ہی تھے۔

اگر اس کی کوئی تصویر فروخت ہوجاتی تو وہ ہمارے لیے بہت خوشی کا دن ہوتا۔ ہم اس رات باہر کھانا کھایا کرتے یا ساحل کی طرف نکل جاتے۔ اس دن اس کی باتیں بہت دھیمی اور خوبصورت ہوا کرتیں۔

سب کچھ اسی طرح چل رہا تھا جس طرح اونچی نیچی لہریں ہوا کرتی ہیں۔ پھر ایک دن وہ بیمار پڑگیا۔ انتہائی شدید۔ جب مقامی ڈاکٹر سے اس کا علاج ممکن نہیں ہوسکا تو اس کے مشورے پر اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروادیا گیا۔

خدا کی پناہ! وہ دن میری زندگی کے کتنے بھیانک اور کتنے سخت تھے۔ میں پاگلوں کی طرح کام کررہی تھی۔ گھر، دفتر، ہاسپٹل، میرے پاس جو دو چار زیورات تھے میں نے اس کے علاج کے لیے بیچ دیے۔

ایک سستے سے ہاسپٹل کے بستر پر لیٹ کر جب نورنگ میرا ہاتھ تھام کر رونے لگتا تو اس وقت دل چاہتا۔ کاش اس کے علاج کے لیے اپنے آپ کو بیچ دوں۔

وہ محبوب تھا میرا۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ اس کی خاطر میں گھر والوں سے لڑی تھی۔ رشتے داروں سے لڑی تھی۔ اور اسے اپنانے کے لیے رات دن ایک کردیے تھے۔ وہ کتنا خوبصورت ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ زندگی اس کے لیے تلخ اور کم ہوتی جارہی تھی۔

اس نے کہا۔ ''سحرش، میری جان، تم ایسا کرو مجھے کسی سرکاری ہاسپٹل میں بھرتی کروادو۔''

''نہیں، نورنگ نہیں، جب تک میں زندہ ہوں۔

تمہیں اس طرح بے بسی کی موت کی طرف جانے ..... نہیں دوں گی۔ مجھ سے جو ہوگا وہ کر گزروں گی۔"

لیکن میں کیا کر سکتی تھی۔ کئی بار دل چاہا کہ اپنے گھر جاؤں اور گھر والوں سے تقاضا کروں۔ ان سے بھیک مانگ لوں۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑ لوں، صرف نورنگ کے لیے۔

لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو پایا۔ دل نے گوارا نہیں کیا۔ ان کے پاس کس منہ سے جاتی، شادی کے بعد تو انہوں نے مجھے چھوڑ ہی دیا تھا.... اب وہ میرا ساتھ کیوں دینے لگے۔

ایک شام میں نورنگ کے پاس پہنچی تو...... میری پریشانی اپنے عروج پر تھی۔ ہاسپٹل والوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بیس ہزار روپے ہاسپٹل میں جمع کروا دوں۔

یہ بیس ہزار میرے لیے پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کہاں سے لاتی بیس ہزار، کون دیتا مجھے، بیچنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ دفتر والوں سے مانگ مانگ کر تھک چکی تھی۔

بہر حال جب میں نورنگ کے پاس پہنچی تو اس کے بستر کے پاس ایک آدمی کھڑا ہوا تھا' جو میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ قیمتی کپڑے، انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں، وہ دیکھنے ہی سے خوش حال دکھائی دے رہا تھا۔

اس دن نورنگ کی حالت اور ابتر ہو رہی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اس پر بار بار غنودگی یا غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ بہر حال اس وقت وہ ہوش میں تھا۔

مجھے دیکھ کر نورنگ دھیرے سے بولا۔ "سحرش، یہ میری تصویروں کے قدر دان ہیں۔ عظیم صاحب۔ مجھے دیکھنے آئے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" میں نے کہا۔

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ تو میرا فرض تھا۔ میں ان کے لیے اتوار بازار گیا تھا۔ وہاں پتا چلا کہ یہ ہاسپٹل میں ہیں، بس ان کو دیکھنے کے لیے آ گیا ہوں۔"

"ہاں، میں نے آس پاس کے اسٹال والوں کو بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ شاید نورنگ صاحب کی مسز ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔ اس وقت مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دھیان بیس ہزار پر اٹکا ہوا تھا۔ بیس ہزار۔ ایک پیار کی قیمت، زندگی کی قیمت۔

"یہ لیں، میرا یہ کارڈ رکھ لیں۔" عظیم نے میری طرف کارڈ بڑھا دیا۔ "اگر میری ضرورت ہو تو یاد کر لیجیے گا۔"

میں نے اس سے کارڈ لے لیا۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد نورنگ نے میری طرف دیکھا۔ "سحرش، کیا ہوا۔ بندوبست تو نہیں ہوا ہوگا؟"

نہ جانے کتنی حسرت تھی اس کے لہجے میں، کتنی مایوسی تھی۔ میں نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ "پریشان نہ ہو' کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا۔"

"نہیں جان' میں نے تمہارے لہجے سے اندازہ لگا لیا ہے۔ کچھ نہیں ہونے والا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ میں اسی طرح سسک سسک کر مر جاؤں گا۔"

"ایسا مت کہو۔ میں اپنی جان دے کر تمہارا علاج کرواؤں گی۔"

پھر اچانک کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "سنو، ایسا کر سکتی ہو، عظیم سے رابطہ کرو، ہو سکتا ہے وہ اس وقت ہمارے کام آ جائے۔"

"ہاں، میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم اپنے موبائل سے بات کر لو۔"

"موبائل کہاں رہا۔"

"کیوں، کیا وہ بھی بک گیا۔"

میں نے گردن جھکا لی۔ کچھ دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تم پریشان نہ ہو' میں باہر کال آفس سے فون پر بات کر لیتی ہوں۔"

میں نے جب عظیم کو اپنا نام بتایا اور نورنگ کا حوالہ دیا تو وہ فوراً پہچان گیا تھا۔ "ہاں ہاں، میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ فرمائیں میرے لائق کیا خدمت ہے۔"

"کیا میں اس وقت آپ سے مل سکتی ہوں۔" میں نے پوچھا۔ "بہت ایمرجنسی ہے۔"

"اچھا تو پھر ایسا کریں، ہاسپٹل کے پاس ہی کیفے دل کش ہے، وہاں آ جائیں۔" اس نے کہا۔ "اطمینان سے بات ہوگی۔"

کیفے دل کش میرا دیکھا ہوا تھا۔ یہ ایک صاف ستھرا کیفے تھا۔ عظیم دس منٹ کے بعد پہنچ گیا تھا۔ میرے انکار کے باوجود اس نے کھانے پینے کی چیزیں منگوا لی تھیں۔ "جی اب فرمائیں، مجھے کیسے یاد کر لیا۔"

"عظیم صاحب' اس وقت بیس ہزار کی اشد ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاسپٹل کا بل، اس کے بعد مزید علاج، جبکہ ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔"

"اوہ! یہ تو افسوسناک صورتِ حال ہے۔ بہر حال میں

ایک کاروباری قسم کا انسان ہوں۔ صاف بات کہتا ہوں اور صاف بات سننا پسند کرتا ہوں۔"

"جی ہاں، یہ اچھی بات ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ بیس ہزار اگر دے دوں تو پھر میرا کیا فائدہ ہوگا۔"

"دیکھیں، ہمارے پاس نورنگ کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں، وہ آپ لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں وہ تصویریں لے کر کیا کروں گا۔"

"تو پھر......" میں اب کسی حد تک اس کی بات سمجھنے لگی تھی۔ "پھر کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔ "پہلی بار بیس ہزار اس لیے دوں گا کہ اس وقت آپ لوگوں کو فوری ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہر بار پانچ ہزار۔ میں نے بغیر لگی لپٹی کے ...... صاف صاف بتا دیا ہے۔ آپ تیار ہوں تو پھر فون کر لیجیے گا۔"

اس نے چائے اور لوازمات کے روپے میز پر رکھے اور اٹھ کر چلا گیا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکی۔ اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ میں اس کا چہرہ ہی نوچ لیتی۔ گالیاں ہی دیتی اس کو۔ گرم چائے اس پر پھینک دیتی۔ کچھ بھی نہیں کیا میں نے۔ صرف میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔

میں بہت ٹوٹی ہوئی ہاسپٹل واپس آ گئی تھی۔ نورنگ بہت حسرت بھری سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کہا اس نے۔"

"وہ بیس ہزار دینے کو تیار ہے۔" میں نے بتایا۔ "لیکن تمہارے لیے نہیں، میرے لیے، اب تم اس سے اندازہ لگا لو کہ اس نے مجھ سے کیا کہا ہوگا۔"

نورنگ تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس کم بخت کا جا کر گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن اس کی بے پناہ بے بسی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ہم دونوں خاموش رہے۔ ہمارے پاس کہنے اور سننے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اور وہ بیس ہزار کسی اژدھے کی طرح ہمارے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔

اسی وقت ہاسپٹل کی نرس نے ایک بل لا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مجھے کہاں ہوش تھا۔ میں تو سکتے کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت پیسے کی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اور یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجبوری کیا ہوتی ہے۔ انسان کتنا بے بس ہے۔

میں نورنگ کو اسی حال میں چھوڑ کر ہاسپٹل سے باہر آ گئی۔

اس وقت میری کیفیت وہی جان سکتے ہیں جو خود اس کرب سے گزرے ہوں۔ میں نے ایک بار پھر سوچا کہ اپنے گھر جاؤں۔ آخر وہ میرے ماں باپ تھے۔ میرے بھائی بہن تھے۔ میرا خیال ضرور کرتے اور ..... یہ موقع ایسا تھا کہ انہیں خیال کرنا ہی تھا۔ پھر میں ہمت کر کے اپنے گھر پہنچ ہی گئی۔

گھر میں سب ہی موجود تھے۔ سب اپنی اپنی دنیا اور اپنی زندگی میں مگن تھے۔ ہر طرف ایک خوشی کا تاثر تھا۔ اور ایک میں تھی کہ ہر طرف ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔

بہت ہی سرد مہری سے میرا استقبال ہوا تھا۔ "ہاں بھئی، کیسے آنا ہوا۔" میرے بڑے بھائی نے پوچھا۔

"بھائی' میں اس وقت بہت مجبور ہو کر آئی ہوں۔" میں نے کہا۔ "نورنگ ہاسپٹل میں ہے۔ مجھے ہاسپٹل کا بل ادا کرنا ہے۔ بیس ہزار روپے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس امید پر یہاں آ گئی ہو۔" امی بھی بول پڑیں۔

"اپنا گھر سمجھ کر آئی ہوں۔"

"لیکن اب تمہارا گھر نہیں رہا۔" امی نے کہا۔ "تم اپنی ضد سے یہاں سے گئی تھیں۔ اب وہیں رہو... اور سارے دکھ سکھ وہیں برداشت کرو۔ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں دنگ رہ گئی۔ یہ میرے اپنے رشتے تھے۔ اپنے لوگ تھے۔ اپنا خون تھا اور انہوں نے مجھے کیسا جواب دیا تھا۔ ہمدردی کے کچھ بول ہی بول دیتے ہیں۔ لیکن یہاں تو انتہائی دکھ دینے والی اجنبیت تھی۔

میرا دل اتنا خراب ہوا کہ میں روتی ہوئی اس گھر سے باہر آ گئی۔ کسی نے مجھے روکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ سب کچھ ہی بدل چکا تھا۔ میں پھر ہاسپٹل پہنچ گئی۔ اب رات ہو چلی تھی۔ اور نورنگ کی امید بھری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ میں ہر جگہ سے ناکام ہو کر واپس آ گئی ہوں۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "سحرش، اب، اب بس ایک ہی راستہ ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔" ایک ہی راستہ۔" اس نے کچھ نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ دیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کس راستے کی بات کر رہا ہے۔ "نورنگ...!" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم یہ برداشت کرسکو گے؟"

"تو پھر. پھر کیا کروں، کیا کروں،" وہ رونے لگا تھا۔

اور میں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ فیصلہ جس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے باہر آکر عظیم کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ وہ دس منٹ کے اندر ہی پہنچ گیا۔ جیسے اب تک میرے ہی انتظار میں ہو۔ وہ مجھے بڑی تہذیب اور اخلاق کے ساتھ اپنے خوبصورت اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔

وہ ایک سوداگر تھا اور اس قسم کے لوگ تجارت کرتے وقت خوش اخلاقی کا اظہار تو کرتے ہی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی خوش اخلاق بنا ہوا تھا۔ اس نے میری خاطر تو اضع بھی کی اور دوسری صبح جب میں اس کے اپارٹمنٹ سے باہر نکلی تو میرے پاس بیس ہزار روپے تھے اور میں بیس ہزار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

میں نے وہ روپے نورنگ کے پاس رکھ دیے اور بیٹھ کر رونے لگی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ جاتے تھے۔

اور خود میرے پاس بھی کہنے کے لیے کیا رہا تھا۔ بہرحال ہاسپٹل کا بل ادا ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نورنگ کا اچھی طرح علاج بھی ہونے لگا۔ کیونکہ ہر تیسرے یا چوتھے دن مجھے پانچ ہزار روپے مل جاتے تھے۔ عظیم اپنی بات پر قائم تھا اور میں اپنی بات پر۔

نورنگ کی صحت بھی اب بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے لیے مہنگی دوائیں آرہی تھیں۔ اچھی غذائیں مل رہی تھیں۔ اس لیے وہ ایک مہینے بعد بالکل ٹھیک ہو گیا۔ وہ ہاسپٹل سے فلیٹ واپس آگیا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چراتے رہتے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ شرمندہ تھے۔ میں نے عظیم سے کہہ دیا تھا کہ میرا اور اس کا سلسلہ صرف اس وقت تک ہے، جب تک نورنگ صحت یاب نہیں ہو جاتا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ اسی مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں۔ یہ سب کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی دکان سے سودا خریدا جائے۔ گاہک کی مرضی ہے کہ وہ اس دکان سے سودا لے یا نہ لے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

میں اگرچہ یہ سب بھولنے کی کوشش کرتی تھی لیکن بھول نہیں پاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی بھی عورت دکان کی چیز بننا پسند نہیں کرتی۔

نورنگ پھر سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ وہ خاموش رہنے لگا تھا اور اس میں چڑچڑا پن بھی آگیا تھا۔

کبھی کبھی وہ معمولی سی بات پر بری طرح ناراض ہو جاتا۔ پھر خود ہی کچھ دیر کے بعد معذرت کرنے لگتا۔ شاید وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

جبکہ میرا حال اس سے بھی برا تھا۔ میری راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی تو اپنے آپ سے گھن محسوس ہونے لگتی تھی۔ میں کیسی عورت تھی۔ میں نے زندگی میں صرف ایک سے محبت کی اور اس سے شادی کرلی۔ نورنگ کے علاوہ کوئی اور مرد میرے قریب نہیں آیا تھا اور جب آیا بھی تو...

نورنگ کی یہ خاموشی شاید جنون کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح تصویریں بنانے میں لگ گیا تھا۔ ایک بات اور بھی ہوئی۔

اس نے میرے قریب آنا ترک کر دیا تھا۔ اس نے اپنا بستر ڈرائنگ روم میں بچھا لیا تھا۔ وہ وہیں سویا کرتا۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔ "نورنگ، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم مجھ سے الگ کیوں رہنے لگے ہو؟"

"نہیں تو... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو۔"

"نہیں نورنگ یہ میرا وہم نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "عورت پیار اور بے رخی دونوں کو بہت جلدی بھانپ لیتی ہے۔ تم مجھ سے بے رخی برتنے لگے ہو۔ بتاؤ، ایسی کیا بات ہے۔"

"میں نے بتایا نا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ "کیا ضروری ہے کہ میں ہر وقت تم سے چپکا رہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پہلی بار ایسی بات کی تھی۔ پریشان کر دینے والی۔ اکھڑا ہوا جملہ، تکلیف پہنچاتا ہوا۔ میں نے اس کے بعد اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

لیکن اس کی یہ کیفیت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اب باقاعدہ مجھ سے کترانے لگا تھا۔ میں اگر ڈرائنگ روم میں ہوتی تو وہ کمرے میں چلا جاتا۔ اگر کمرے میں ہوتی تو وہ

ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ جاتا۔

مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ایک صبح میں اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ''نورنگ صاف صاف بتاؤ' کیا بات ہے۔ تم نے یہ کیا تماشا شروع کر دیا ہے۔''

''بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

''کیا اچھا نہیں لگتا۔''

''یہی کہ میں ایک ایسی عورت کو ہاتھ لگاؤں جس کو کوئی اور مرد چھو چکا ہو۔'' اس نے کہا۔

''کیا!'' یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ شاید میں نے کچھ اور سن لیا ہوگا۔ نورنگ نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ اس کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ایسی بات کہہ دے جس کا وہ خود ذمّے دار ہے۔ اس کی بیماری نے مجھے اس مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے کہنے پر میں کسی اور کے پاس گئی تھی۔ پھر وہ ایسی بات کس طرح کہہ سکتا تھا۔

''نورنگ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جو تم نے سنا ہے۔'' اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

''کمینے انسان۔ میں نے یہ سب کس کے لیے کیا۔ کس کے کہنے پر کیا۔ کیا تم بھول گئے کہ تم مر رہے تھے۔ میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے اپنے آپ کو قربان کیا تھا۔ اپنی عزت نیلام کی تھی۔ اپنے ضمیر کا سود کیا تھا۔ اپنا جسم بیچا تھا۔ بتاؤ یہ سب میں نے کس کے لیے کیا تھا۔''

''کیا ضروری تھا کہ میرے لیے اپنی عزت برباد کرتیں۔ مر جانے دیا ہوتا مجھے۔''

میرا دل چاہا کہ اس شخص کو مار کر میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں۔ اس نے کیسی عجیب بات کہہ دی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ خود نورنگ مجھ سے ایسی بات کرے گا۔ میرے خدا! میں نے اس کے لیے جو قربانی دے دی تھی تو کیا فائدہ ہوا تھا اس سے، کیا یہی بات سننے کے لیے میں نے یہ سب کیا تھا۔

نورنگ تو یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ لیکن میں اپنی جگہ پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھی رہ گئی تھی۔ میرا ذہن اس وقت سن ہو رہا تھا۔ کوئی خیال نہیں، کوئی سوچ نہیں، کوئی ارادہ نہیں۔

اس جگہ بیٹھے بیٹھے مجھے کئی گھنٹے گزر گئے۔ شام اتر آئی، پھر رات ہوگئی۔ لیکن میں وہیں بیٹھی رہی تھی۔ رات ہونے کا احساس بھی اس طرح ہوا جب خود نورنگ نے آ کر لائٹ جلائی تھی۔ ''سحرش، اب کب تک اس طرح بیٹھی رہو گی۔'' اس نے میرے پاس آ کر کہا۔

''دور ہٹو یہاں سے، میرے قریب مت آنا۔'' میں ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ ''میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں ایک ایسی عورت ہوں جس کو دوسرا آدمی ہاتھ لگا تا رہا ہے۔ جاؤ، خدا کے لیے چلے جاؤ یہاں سے۔''

''سحرش، مجھے معاف کر دو یار۔ میں بھی پاگل ہو گیا تھا۔'' نورنگ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں نہ جانے کس جھونک میں یہ سب کہہ گیا تھا۔ معاف کر دو مجھے۔ ورنہ میں خود اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ مر جاؤں گا میں۔ خودکشی کر لوں گا۔''

اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور خود میں بھی رو رہی تھی۔ ہمارے ساتھ یہ کیسی مجبوریاں تھیں۔ مفلسی نے ہمیں کہاں پہنچا دیا تھا۔

میں نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ نورنگ کی وہ بات کانٹا بن کر میرے سینے میں اتر چکی تھی۔

میں تو کہیں کی بھی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف تو عزت گئی۔ پھر ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا۔ لیکن دوسری طرف جب میں نورنگ کے پوائنٹ آف ویو سے سوچتی تو مجھے اس پر افسوس ہونے لگتا۔ وہ ایک شوہر تھا اور نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی، چاہے اس کا سبب کچھ بھی ہو۔

اس دن کے بعد ہم پھر ایک دوسرے کے قریب آ تو گئے تھے لیکن بہت بے دلی کے ساتھ۔ دلوں میں جو پھانس تھی وہ برقرار ہی رہی تھی۔

ہم دونوں ہی چپ رہنے لگے تھے۔ نورنگ کا رویّہ گرچہ اب کچھ نارمل ہونے لگا تھا۔ اس کے باوجود میری وحشت میں کمی نہیں ہو رہی تھی۔ سچ یہ ہے کہ خود مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔

ایک دن ایک تماشا اور ہو گیا۔ یہ تماشا بھی خون کے آنسو رلا دینے والا تھا۔ ایک دن آپا کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ ''سحرش، تم گھر آؤ، تمہاری یہاں بہت ضرورت ہے۔''

''کیوں بھئی، اب میری کیا ضرورت پڑ گئی۔'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''ابو بہت بیمار ہیں۔ انہوں نے بتایا۔ ''وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، یہ سمجھو کہ شاید یہ ان کے آخری دن ہیں۔''

''ٹھیک ہے' سوچوں گی میں۔'' میں نے فون بند کر دیا تھا۔

میں نے نورنگ سے ذکر کیا، وہ بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''سحرش، تمہاری مرضی ہے۔ نہ تو میں تمہیں جانے سے روکوں گا اور نہ ہی جانے کے لیے کہوں گا۔ اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو چلی جاؤ۔''

''دل تو نہیں چاہ رہا۔ لیکن ابو بیمار ہیں، اور آپا یہ بتا رہی تھیں کہ شاید وہ زندہ نہیں بچیں گے۔''

''تو پھر چلی جاؤ۔''

پھر بہت دنوں کے بعد میں پھر اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

اس بار گھر میں میرا استقبال تو نہیں ہوا تھا لیکن پہلے جیسی سرد مہری بھی نہیں تھی۔ بس ایک خاموشی سی طاری تھی۔ مجھے ابا کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ابو واقعی بہت بیمار تھے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے اپنے بازو کھول دیے۔

میں ان میں سما گئی۔ برسوں کے بعد باپ کا محبت بھرا لمس حاصل ہو رہا تھا۔ ہم کچھ دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ پھر ابو نے کہا۔ ''بیٹا اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری امانت تمہارے حوالے کر دوں۔ تم نے جو کیا وہ تمہاری مرضی لیکن مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے نا۔''

''میں نہیں سمجھی ابو۔ آپ کیسی امانت میرے حوالے کر رہے ہیں۔''

''بیٹا' میں نے تمہارے لیے پانچ لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے۔'' ابو نے کہا۔

''کیا؟'' میں تڑپ اٹھی تھی۔ پانچ لاکھ روپے۔ ان میں نہ جانے کتنے بیس ہزار روپے نکل آتے۔ وہ پہلا بیس ہزار جس نے مجھ سے میری انا اور میری عزت چھین لی تھی۔ کیا یہ تماشا پہلے نہیں ہو سکتا تھا؟ قدرت کی کیا مصلحت تھی اس میں۔ وہ کیوں چاہتی تھی کہ میری عزت برباد ہو۔

اگر یہ پہلے مل جاتے تو کیا ہو جاتا۔ اور اب یہ میرے کس کام آنے والے تھے۔ سب کچھ تو ختم ہو چکا تھا۔ نہیں، یہ پیسے میری کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں لا سکتے تھے۔ یہ اس قابل ہی نہیں تھے۔

پھر وہ لوگ مجھے روکتے رہ گئے۔ ابو نے آوازیں دیں لیکن میں اس گھر سے باہر آ گئی۔ فلیٹ آ کر میں بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ میں نے نورنگ کو صرف اتنا بتایا کہ ابو کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا ہے اس لیے میں رو رہی ہوں۔

اس کے بعد میں نے پھر اپنے گھر کی طرف نہیں دیکھا۔ ہاں اس وقت گئی جب یہ پتا چلا کہ ابو اس دنیا میں نہیں رہے۔ گھر والوں نے وہ پانچ لاکھ دینے چاہے لیکن میں نے نہیں لیے تھے۔

شاید میری قسمت میں سکھ نام کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔ صرف چار مہینوں کے بعد نورنگ پھر اپنی جون میں واپس آ گیا اور اکھڑا اکھڑا رہنے لگا۔ اس کا وہی رویّہ ہو گیا جو ہاسپٹل سے واپسی کے بعد تھا۔

میرے خدا! وہ کیسا آدمی تھا۔ اب تو وہ باتوں باتوں میں ایسی باتیں کر جاتا کہ میں بلک کر رہ جاتی تھی۔ ایک رات اس نے میرے قریب آنا چاہا تو میں نے انکار کر دیا۔ اس رات مجھے تیز بخار تھا اور پورا بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ پھر اس نے انتہائی تلخ ہو کر کہا۔ ''ظاہر ہے کہ میں تمہیں بیس ہزار نہیں دے سکتا، اس لیے۔''

میرا دل چاہا کہ میں اسی وقت زہر کھا کر مر جاؤں۔ اس شخص نے کتنی گندی اور گھناؤنی بات کر دی تھی۔ کتنا مکروہ انسان تھا۔ کیا دنیا کے سارے مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے لیے جذبات اور احساسات کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ اور یہ ذلیل شخص! یہ جانتا تھا کہ میں نے یہ سب کس کے لیے کیا تھا۔ اس پر بھی ایسی باتیں۔ کیا فطرت تھی اس کی؟

اس کے بعد بھی اس نے کئی بار اسی قسم کی باتیں کیں، مجھے خاموش دیکھ کر کہا کرتا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں عظیم یاد آ رہا ہے، اس لیے تم اتنا خاموش ہو گئی ہو۔''

''نورنگ، آخر کیوں، تم ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟''

''معاف کرنا۔'' وہ دوسرے ہی لمحے پینترا بدل لیتا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں شاید اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔''

اس شخص نے مجھے نفسیاتی مریضہ بنا دیا تھا۔ پہلے تو کبھی کبھی ایسی باتیں کرتا' پھر معافی مانگ لیتا، لیکن اب اس نے معذرت بھی ختم کر دی تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر جاتا جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔

میں نے والدین کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی

تھی۔ کیا ملا تھا مجھے سوائے ذلتوں کے۔ ہر طرف سے ذلت، ایک بار میں نے تنگ آ کر نورنگ سے کہا۔ ''نورنگ، اگر تمہیں مجھ سے گھن محسوس ہوتی ہے تم اپنے ذہن سے ان واقعات کو بھلا نہیں سکتے تو پلیز آزاد کر دو مجھے، جانے دو، طلاق دے دو۔''

''نہیں سحرش' میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔''

''پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیوں، تم مجھے ذہنی اذیت کیوں دیتے ہو۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس گناہ کے تم بھی شریک ہو۔ بلکہ یہ گناہ تم نے کروایا ہے۔ اگر تم مر جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔''

''ہاں، میں تمہاری اس خواہش کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں اور تم عظیم کے پاس چلی جاؤ۔''

''خاموش رہو ذلیل انسان۔'' میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا تھا۔

اور وہ بھی ایسا بے غیرت تھا کہ وہ صرف ہنستا رہا، انتہائی زہریلی ہنسی اور مجھے اسی طرح بے بس دیکھتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی۔ میں نے ایسا سوچا تو نہیں تھا، لیکن ایسا ہی ہو گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد خبر آئی کہ نورنگ کا انتہائی شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، میں بوکھلا کر رہ گئی۔ کسی نہ کسی طرح ہاسپٹل پہنچی تو تفصیل معلوم ہوئی۔ اس کا رکشا الٹ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ نورنگ اور رکشا ڈرائیور سنبھل پاتے پیچھے سے آنے والی ایک کوچ نے انہیں ہٹ کر دیا تھا۔

ڈرائیور تو اسی وقت جاں بحق ہو گیا تھا لیکن نورنگ بہت بری طرح زخمی تھا۔ اس کی حالت تشویشناک تھی۔ ایک بار پھر مجھ پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ شکر ہے کہ وہ ایک سرکاری ہاسپٹل تھا۔ اس کے باوجود اخراجات تو ہونے تھے۔ دوا' آنا جانا اور بھی بہت کچھ، پہلی فکر تو یہی تھی کہ اس کی جان بچ جائے۔

میرے پاس والدین اور بھائی بہن کا سہارا بھی نہیں تھا۔ اچھا یا برا نورنگ ہی تھا اور اس کا یہ حال ہو رہا تھا۔ اس کو انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا، اس کا آپریشن کیا جا رہا تھا۔

میں گھر واپس آئی۔ تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے' وہ لے کر دوبارہ ہاسپٹل پہنچ گئی۔ خدا کی پناہ کیسی تنہائی تھی میرے ساتھ۔ کوئی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ سارے دکھ مجھے خود ہی برداشت کرنے تھے۔

ڈاکٹر ایک مہربان قسم کا آدمی تھا۔ اس نے آ کر بتایا ''ہم نے آپریٹ تو کر دیا ہے ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی بچ جائے لیکن۔''

''لیکن کیا۔''

''ان کے مفلوج ہونے کا خطرہ ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''ریڑھ کی ہڈی کے مہرے Damage ہو گئے ہیں۔'' میں سکتے میں رہ گئی۔

یہ ایک نئی افتاد تھی... اور انتہائی بھیانک، میں نے نورنگ کو مفلوج دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا، پہاڑ جیسی زندگی سامنے تھی... اور نورنگ کے مفلوج ہونے کا اندیشہ تھا۔ اب یہ زندگی کس طرح گزرتی۔ میں اس کے لیے کیا کرتی اور کیا نہیں کرتی۔

بہرحال چند ہی دنوں کے بعد نورنگ ہاسپٹل سے واپس آ گیا اور اس حال میں کہ اسے اسٹریچر پر لایا گیا تھا۔ وہ مفلوج ہو چکا تھا۔

وہ صرف دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا، بول سکتا تھا، لیکن اپنے آپ کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک لوتھڑے کی طرح ہو گیا تھا۔ یوں سمجھیں کہ اس کی زندگی جیسے ختم ہی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود میں بھی زندہ درگور ہو چکی تھی۔

کیا زندگی تھی میری، پہلے ہی کیا کم پریشانیاں تھیں کہ اب یہ ایک نئی پریشانی سامنے آ گئی تھی۔ وہ اب کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود میں مشرقی بیوی ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض نبھاتی رہی۔

میں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔ شام کو واپس آ کر خود اس کی دل جوئی میں مصروف ہو جاتی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اسے دن بھر کی خبریں سناتی۔ اس کے لیے کتابیں لے کر آتی۔ اس کے سامنے ہی دیوار پر ٹی وی لگا دیا تھا تاکہ وہ دن بھر خود کو بہلائے رکھے۔

میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھی۔ میرے بس میں جو کچھ بھی تھا، وہ میں کیے جا رہی تھی۔ اب ایک سوال اور سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

گزارہ کیسے ہو۔ نورنگ تو اب تصویریں بنانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ورنہ کبھی کبھی اس کی تصویریں فروخت ہو ہی جاتی تھیں۔

پھر میں نے ایک جگہ پارٹ ٹائم ملازمت کر لی۔ یہ شام کے چار گھنٹوں کی ملازمت تھی۔ میں دفتر سے براہِ راست وہیں چلی جاتی۔ نورنگ کو جب میری اس پارٹ ٹائم جاب کا پتا چلا تو وہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ ''سحرش، تمہیں میری وجہ سے کتنی پریشانیاں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔''

''تو کیا ہو گیا۔ یہ تو کرنا ہی ہے نا۔ میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔''

''سحرش، میں نے زندگی میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دی۔ الٹا تم پر بوجھ بن گیا ہوں۔''

''اب ختم کرو یہ سب۔ جو کچھ ہے وہ خدا کی مرضی ہے کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

ہم نے ایسی زندگی گزارنی شروع کر دی جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ ایک عورت اور بلکتی ہوئی زندگی۔ میں صبح آٹھ بجے دفتر جاتی۔ اس دوران نورنگ کو سنبھالنے والا بھی آ جاتا۔ واپسی رات نو بجے ہوا کرتی۔ آنے کے بعد نورنگ کی تسلی کے لیے بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔

سب کچھ جیسے ایک تکلیف دہ روٹین میں آنے لگا تھا کہ اچانک نورنگ کی ذہنی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ اب وہ میرے دیر سے آنے پر شک بھی کرنے لگا تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اس کو۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ پھر عظیم کے بارے میں باتیں کرنے لگا تھا۔ ''سحرش، عظیم سے ملاقات تو ہوتی ہوگی۔''

''کیوں، اس سے کیوں ملاقات ہوگی۔''

''بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ شاید کبھی راستے میں ملتا ہوگا۔''

''نورنگ، اپنے آپ کو سنبھالو۔ ورنہ پاگل ہو کر رہ جاؤ گے۔'' میں کہا کرتی۔ ''اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم اب تک اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہو۔''

''سوری یار، نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ تم تو سمجھتی ہو کہ میری ذہنی حالت کیا ہے۔''

''میں تو سمجھتی ہوں، لیکن تم مجھے نہیں سمجھتے۔''

پھر ایک دن اس نے تو انتہا ہی کر دی۔ میں رات دیر سے واپس آئی تو وہ غصے سے بھڑک رہا تھا۔ ''کیوں، عظیم کو بھی ساتھ لے آتیں۔ اکیلی کیوں آئی ہو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ بھی تمہارے ساتھ آ جاتا تو میں تم دونوں کا کیا بگاڑ لیتا۔''

''بکواس مت کرو نورنگ، شرم کرو۔''

ڈاکٹر آغا افتخار حسین
(1921-1984ء)

نقاد اور محقق۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا، 1968ء میں سوربون یونیورسٹی (فرانس) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور فرانس میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ پھر پاکستان آ کر فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں خدمات انجام دیں اور ڈائریکٹر ریسرچ سینٹر اور جوائنٹ سیکریٹری کے عہدوں پر کام کیا۔ اس دوران تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا، تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں:

1۔ فکر فرنگ۔ 2 جہاں نما۔ 3۔ نکتہ چیں ہے غم دل۔ 4۔ یورپ میں اردو۔ 5۔ یورپ میں تحقیقی مقالے۔ 6۔ مخطوطاتِ پیرس۔ 7۔ قوموں کی شکست و زوال کے اسباب۔ 8۔ عالیہ۔ 9۔ رباب۔

مرسلہ: احمد رضا، رکن۔ پھالیہ

''شرم ہی تو آ رہی ہے مجھے کہ تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھانے لگی ہو۔''

اور اس وقت... اس وقت پہلی بار مجھے اس پر اتنا شدید غصہ آیا کہ میں نے ایک انتہائی اذیت ناک فیصلہ کر لیا۔ نورنگ جیسے شخص کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

میں نے اسی وقت دوسرے کمرے میں آ کر عظیم کو فون کیا۔ اس نے بہت دنوں کے بعد میری آواز سنی تھی۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ ''ہاں بھئی، کیسی ہو تم۔ بہت دنوں کے بعد یاد کیا۔ ایک دو بار اتوار بازار کی طرف جانا ہوا تھا۔ لیکن نورنگ دکھائی نہیں دیے۔''

میں نے بتایا کہ نورنگ کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ اس وقت کس پوزیشن میں ہے۔ ''اوہ، مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسا حادثہ ہو چکا ہے۔ بہت افسوس ہوا سن کر، بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''مجھے آپ سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ آپ کو میں نے اپنا فلیٹ دکھا دیا تھا۔ آپ فلیٹ پر آ جائیں۔''

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔''

وہ کچھ دیر بعد پہنچ گیا تھا۔ میں اسے ڈرائنگ روم لے

آئی تھی۔ ''عظیم صاحب، آپ میرا ایک کام کریں گے، پلیز انکار مت کیجیے گا۔''

''دیکھو، میں تو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''آپ پہلے کام سن لیں، میں آپ سے کوئی کاروبار نہیں کررہی۔''

''تو پھر کیا ہے۔''

''میں آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کو اپنے شوہر یعنی نورنگ کے سامنے لے جاؤں گی۔'' میں نے بتایا۔ ''وہاں آپ مجھے اس کے سامنے پانچ ہزار روپے دیں گے' پھر کمرے سے باہر آجائیں گے۔ کچھ دیر بعد میں بھی باہر آکر آپ کو آپ کے پانچ ہزار واپس کردوں گی۔ بس آپ کو میرے لیے اتنا سا کام کرنا ہے۔''

''ارے، اس سے کیا ہوگا۔''

''یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے عظیم صاحب، بتائیں، آپ یہ کرسکتے ہیں یا نہیں۔''

''چلو بھئی' اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی، لے چلو مجھے۔''

اور میں اس کا ہاتھ تھام کر دوسرے کمرے میں لے آئی۔ نورنگ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اس کو دکھانے کی خاطر میں عظیم سے چپک کر چل رہی تھی۔

نورنگ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہم دونوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''نورنگ صاحب آپ کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہوگیا۔ لیکن مجھے پتا ہی نہیں چلا۔'' عظیم نے کہا۔ ''وہ تو آج آپ کی مسز سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ آج بھی معلوم نہیں ہوتا۔''

لیکن نورنگ جواب دینے کے قابل ہی کہاں تھا۔ وہ تو بس سکتے کے عالم میں ہم دونوں کو دیکھے جارہا تھا۔ پھر عظیم نے میری طرف دیکھا۔ ''اچھا ڈیئر، میں تو چلتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میری فیس۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھادیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھادیے۔ نورنگ اس وقت بھی بے حس سا رہا تھا۔ نہ جانے کتنا کرب، کتنا غصہ اور کتنی بے بسی کے احساسات اس کے چہرے پر منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ عظیم مجھ سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اور میں نے نوٹ گن کر اپنے گریبان میں ٹھونس لیے۔

اس وقت بھی نورنگ کو شدید حیرت تھی' اس کا سکتہ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دھیان دیے بغیر کمرے سے باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم میں عظیم میرے انتظار ہی میں تھا۔

''یہ لیں اپنے پانچ ہزار۔'' میں نے اس کے نوٹ اس کی طرف بڑھادیے۔

''سحرش، اگر تمہیں ضرورت ہو تو رکھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''یہ میں کسی سودے کے بغیر بات کررہا ہوں۔''

''جی نہیں، بہت بہت شکریہ۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''یہ آپ لے لیں، آپ کی مہربانی کہ آپ نے میری بات مان لی۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور صوفے پر نڈھال ہوکر گر پڑی۔ اس وقت ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ میں روتی رہی۔ روتی رہی، میری آنکھوں سے اتنے آنسو شاید کبھی نہیں بہے ہوں گے۔ وہیں صوفے پر سوگئی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ گھنٹی کی آوز سے آنکھ کھلی تھی۔ نورنگ کو سنبھالنے والا ملازم آگیا تھا۔ اسے لے کر جب نورنگ کے کمرے میں پہنچی تو جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔

پورے بستر پر خون ہی خون تھا۔ نورنگ کا ایک ہاتھ اپنے پیٹ پر تھا اور اس کی مٹھی میں دبا ہوا بڑا سا چاقو اس کے پیٹ میں اترا ہوا تھا۔ اس نے پھل کاٹنے والے بڑے چاقو سے خودکشی کرلی تھی۔

وہ مر چکا تھا۔ خدا جانے رات بھر کس طرح تڑپتا رہا ہوگا۔ اس کے جسم کا جیسے سارا خون ہی نکل گیا تھا۔ بظاہر تو یہی تھا کہ ایک مفلوج اور زندگی سے تنگ آئے ہوئے شخص نے مزید دکھ برداشت کرنے کی بجائے اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں ختم کردی ہے۔

لیکن یہ صرف میں جانتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔

وہ دن ہے۔ اور آج کا دن میرے پاس سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نورنگ کے فلیٹ میں ہی ہوں۔ جاب کررہی ہوں۔ میرے بالوں میں اب چاندی اتر آئی ہے۔

دن بھر تو میں ہنگاموں میں گم رہتی ہوں۔ لیکن رات کو فلیٹ کی تنہائی میں نورنگ کی حیرت زدہ اور بے بس آنکھیں چاروں طرف دکھائی دیتی ہیں، چاروں طرف......!

مجرم کون

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!

آداب!

ہم میں سے مجرم کون ہے، کون قاتل ہے، یہ سوال میرے ذہن میں متواتر کچوکے لگاتا رہتا ہے اسی لیے ضمیر کی چبھن کو آپ اور قارئین کے سامنے پیش کررہی ہوں کہ آپ سب فیصلہ کریں، یہ بھی بتادوں کہ میں نے اپنا فرضی نام لکھا ہے۔

رخسانہ

(فیصل آباد)



ایک الجھی ہوئی داستان کو دہراتے ہوئے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔

ہم دونوں ہی اپنے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ہوئے یادوں کو کریدنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کہانی کی خاص بات یہ ہے کہ یادیں گرچہ دونوں کے پاس ہیں۔ لیکن ہم دونوں ہی اسے دہراتے ہوئے خوفزدہ ہوجاتے ہیں۔ یہ خوف اپنے آپ سے ہے۔ اس کہانی کے تین اہم کردار ہیں، میں، راشدہ اور تنویر۔

پتا نہیں.. میں مجرم ہوں یا راشدہ مجرم ہے.. یا دونوں ہی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

اس کہانی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب محلے کی ایک عورت نے مجھے بتایا۔ ''رخسانہ، تم نے تو اپنے میاں کی طرف سے آنکھیں ہی بند کر رکھی ہیں۔''

''نہیں آپا، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اپنے میاں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔''

''لیکن یہ تو دیکھو کہ تمہارا میاں آج کل کس کا خیال رکھنے لگا ہے۔''

''ظاہر ہے میرا۔ اور کس کا خیال رکھیں گے۔''

''رخسانہ یا تو تم واقعی بہت بھولی ہو یا...... یا جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو۔'' اس عورت نے کہا۔

''آپا، میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکی۔''

''تمہارا میاں آج کل کسی اور عورت کے چکر میں ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیسی بات کر رہی ہو آپا! تنویر ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''ہم عورتوں کی یہی تو بے وقوفی ہے۔ ہم اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم اپنے میاؤں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ جبکہ مردوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ کس وقت پینترا بدل دیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آپا، تنویر ایسے نہیں ہیں۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''میرا کام بتانا تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' عورت نے کہا۔ ''میں نے خود کئی بار تمہارے میاں کو اس عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔''

''لیکن وہ ہے کون؟''

''اب یہ تو میں نہیں جانتی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ تم سے زیادہ جوان اور خوبصورت ہے۔ تم خود ہی کسی طرح پتا لگا لو۔ میرا کہا ہوا سامنے آ جائے گا۔''

وہ میرے دل میں آگ لگا کر چلی گئی تھی۔ اب تک تو میں نے اس کے سامنے اپنی کمزوری یا پریشانی کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میں بکھر کر رہ گئی تھی۔

مجھے بھی کئی دنوں سے تنویر پر کچھ شک سا ہونے لگا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں کسی نہ کسی حد تک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ تنویر کی حرکتیں کچھ الٹی سیدھی ہونے لگی تھیں۔

پہلے تو وہ دفتر سے فارغ ہوتے ہی سیدھے گھر آ جایا کرتے۔ لیکن اب نہ جانے کہاں کہاں سے بھٹکتے ہوئے آیا کرتے ہیں۔ عورت کی حس ایسے معاملے میں بہت تیز ہوا کرتی ہے۔ مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا لیکن میں نے پڑوس کی عورت کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس عورت کے جانے کے بعد میں سوچتی رہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں نے تنویر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے اس مقام تک لانے میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ جس وقت ہماری شادی ہوئی اس وقت وہ اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ میں نے اس کی تعلیم مکمل کروانے کے لیے خود جاب کر لی۔ ان دنوں وہ بہت پریشان تھا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے کہا۔ ''میرا ماسٹر بھی مکمل نہیں ہے۔ اور جب تک ماسٹر نہ ہو ترقی نہیں ہو گی۔''

''کوئی بات نہیں، تم اپنی تعلیم جاری رکھو۔'' میں نے کہا۔

''کیسے جاری رکھوں، ماسٹر کے لیے ریگولر ہونا پڑے گا۔ اور جو نوکری کر رہا ہوں، وہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔''

''تم فکر مت کرو، تمہاری تعلیم کے لیے میں جاب کر لوں گی۔''

اور میں نے اس کے لیے جاب کی۔ اب میں سوچتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کیسے کر لیتی تھی۔ صبح جاب پر جانا۔ شام کو واپسی۔ اس کے بعد گھر کا سارا کام، کھانا بنانا اور تنویر کو وقت بھی دینا۔ لیکن میں سب اس کی محبت میں کیے جا رہی تھی۔ اور یہ امید تھی کہ ایک دن حالات ضرور بدلیں گے۔

اس نے ماسٹر کر لیا۔ ایک اچھی سی جاب بھی ہو گئی۔ تنویر کی رہائش میرے ہی گھر میں تھی۔ میرے والد کا ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔

ابو کی موت کے بعد امی نے...... باپ بن میری پرورش کی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی اسی کوارٹر میں رہا کرتے۔ یہ ہمارا بہت ہی پرانا محلہ تھا۔ سب لوگ ہمیں جانتے تھے۔ میں ایک اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔

اسی زمانے میں تنویر سے میری ملاقات ہوئی... پھر یہ ملاقات محبت میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ایک بے سہارا نوجوان ہے۔

والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے ماموں کے یہاں پرورش پائی تھی اور اب کوئی معمولی سی ملازمت کر رہا تھا۔

ماموں اور ممانی اب اسے اپنے گھر میں زیادہ برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔

ایسے میں تنویر سے میری ملاقات ہوئی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ مختصر یہ کہ بہت سادہ انداز میں ہماری شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد تنویر ہمارے ہی کوارٹر میں آ کر رہنے لگا۔ کیونکہ اس کے پاس اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یعنی وہ گھر داماد ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں وہ بہت فرمانبردار اور وفادار ہوا کرتا تھا۔ شاید اس نے اپنا اصل کہیں چھپا لیا تھا۔ لیکن امی کی موت کے بعد ہی اس نے آنکھیں بدل لی تھیں۔

اور اب یہ سننے کو مل رہا تھا کہ اس نے کسی اور سے شناسائی کر لی ہے۔ یعنی میری وفاؤں اور میری بے پناہ محبت کا مجھے یہ بدلہ دیا جا رہا تھا۔

یہ تھا میرا اور تنویر کا مختصر سا بیک گراؤنڈ۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب سن کر میرے دل کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میں پاگل ہو رہی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون ہے جس نے تنویر کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔

میں نے تنویر سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ شوہروں سے جب اس قسم کی باتیں کی جائیں تو وہ بھڑک جاتے ہیں، وہ ضدی ہو جاتے ہیں۔

اس لیے میں نے اپنے طور پر اس عورت کا پتا چلانے کی کوشش کی۔

ہمارے ہی محلے میں ایک بہت تیز و طرار قسم کا لڑکا تھا، ریاض۔ وہ پیسوں کے عوض کوئی بھی کام کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

ایک دن میں نے اسے بلا کر اس سے بات کی۔ ''دیکھ ریاض، تجھے ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔ تجھے میں پانچ سو روپے دوں گی۔''

''تم فکر مت کرو آپا۔ میں ایک نمبر کا جاسوس ہوں۔ اس عورت کی تو سات پشتوں کو بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔''

''شاباش! لیکن یہ کام بہت خاموشی سے ہونا چاہیے۔ محلے میں بھی کسی کو پتا نہ چلے۔''

لوگ وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی ہمدردی اور امداد پر یقین رکھتے تھے کہ بیماروں کو داخلہ دلانے وزیراعظم کی کوٹھی پر لاتے۔ بارش ہوتی تو لوگ خراب اور بوسیدہ جھونپڑیوں کی مرمت کے لیے چٹائی، بانس اور ٹین کی چادریں مانگنے آتے۔ ان کے دروازے سے ہر حالت میں لوگوں کی حاجت روائی کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک برقع پوش خاتون ایک تپ دق کے مریض کو جو غالباً ان کے شوہر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں چند لوگوں کی مدد سے ٹھیلے پر ڈال کر لے آئیں۔ انہیں وزیراعظم کی طرف سے فوراً سینی ٹوریم میں داخل کرایا گیا۔ ایک بہن کو زچہ خانے میں داخلہ نہیں ملا تھا ان کو لوگ لے کر آئے۔ چند ہی منٹوں میں ایک ایمبولینس کار کے آنے سے پہلے پہلے گیٹ کے باہر وکٹوریہ روڈ پر بغیر کسی قسم کی طبی امداد کے ایک ننھے پاکستانی نے بخیریت جنم لیا۔ واہ کیا شانِ حکومت اور لیڈری تھی اور رعایا کی کیا کیا توقعات پوری ہوتی تھیں۔ کہیں ملازمت تو کہیں اسکولوں، کالجوں میں داخلے دلوائے جا رہے ہیں۔ کہیں شادی بیاہ کے لیے مالی امداد کی جا رہی ہے۔ الحاصل جو کوئی اس دربار میں آیا، فیض یاب ہو کر گیا۔ کسی کی زبان سے اپنے وزیراعظم کے متعلق حرفِ شکایت نہیں سنا گیا۔ اس زمانے میں لوگ اتنے قانع اور صابر تھے کہ وہ اپنے نوشتۂ تقدیر کو سکون اور صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپا، تم میری کلائنٹ ہو اور کلائنٹ کا راز ظاہر نہیں کیا جاتا۔''

میں نے ریاض کو تنویر کے پیچھے لگوا دیا۔۔۔ تیسرے ہی دن ریاض پوری معلومات حاصل کر کے آ گیا تھا۔

''آپا، راشدہ نام ہے اس عورت کا۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''کسی این جی او میں کام کرتی ہے۔ بہت چلتا پرزہ ہے۔ پڑوس کے محلے میں نہ جانے کہاں سے آ کر آباد ہو گئی ہے۔''

''تم نے تنویر کو اس کے گھر آتے جاتے دیکھا؟''

''کئی بار آپا۔'' اس نے بتایا۔ ''دونوں مارکیٹ جاتے ہیں، ہوٹل جاتے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے دونوں ایک

دوسرے پر جان چھڑکتے ہوں۔"
"اس کا گھر بتاؤ گے مجھے۔"
"کیوں نہیں آپا، میرے ساتھ چلنا، میں اس کا گھر دکھادوں گا۔"
میں نے ریاض کو پانچ سو روپے دے دیے۔ مجھے دکھ تھا شدید دکھ۔ کیا صلہ مل رہا تھا مجھے؟ میں نے اس آدمی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔
وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضا میں ڈولتا پھر رہا تھا۔
میں نے اس سے شادی کی۔ اس کو اپنے گھر میں رکھا۔ اس کی تعلیم اور ترقی کے لیے خود جاب کرتی رہی۔ اپنا نوالہ تک اس کے منہ میں دے دیا اور اس کا بدلہ کیا مل رہا تھا۔
دوسری شام کو ریاض نے مجھے اس عورت راشدہ کا گھر بھی دکھادیا تھا۔ وہ بھی میرے ہی گھر کی طرح ایک چھوٹا سا گھر تھا۔
اب میرا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیے تھا۔
اس وقت بہت سی فلمیں اور کہانیاں یاد آرہی تھیں کہ جب شوہر بے وفائی کرتا ہے تو ایسی صورت میں بیوی کیا کرتی ہے۔ وہ دوسری عورت کے پاس جا کر اس سے اپنے سہاگ کی بھیک مانگتی ہے یا راستے میں اسے گولی ماردیتی ہے یا خود زہر کھا کر مرجاتی ہے، یا شوہر سے علیحدہ ہوجاتی ہے۔
لیکن مجھے یہ سب تو نہیں کرنا تھا۔ مجھے کوئی اور راستہ تلاش کرنا تھا۔
میں نے ابھی تک تنویر کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہوں۔
ایک دن تنویر نے مجھ سے کہا۔ "رخسانہ، میں اپنی جاب چھوڑ رہا ہوں۔"
"جاب چھوڑ رہے ہو۔ وہ کیوں؟"
"جاب میں کچھ نہیں رکھا۔ وہی لگی بندھی آمدنی ہوتی ہے۔ ماسٹر کرلینے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوسکا ہے۔"
"تو پھر کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"
"اپنا کاروبار۔" اس نے بتایا۔
"کاروبار کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔" میں نے پوچھا۔
"میں نے اپنے ایک دوست سے بات کرلی ہے۔ وہ مجھے دس لاکھ قرض دے رہا ہے۔ دس لاکھ میں چھوٹا سا کاروبار شروع کیا جاسکتا ہے۔"
"دیکھ لو، یہ بہت خطرے والی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ نقصان ہوجائے پھر دس لاکھ کی ذمے داری بھی سر پر آجائے گی۔"
"نہیں، میں جو کروں گا بہت سوچ سمجھ کر اور مارکیٹ کو دیکھ کر کروں گا۔" اس نے بتایا۔ "میں بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنا پیسا یوں ہی جھونک دوں۔"
"تمہاری مرضی۔"
میں تو اس بات سے خوش تھی کہ بہت دنوں کے بعد تنویر نے مجھ سے اتنی دیر ڈھنگ کی باتیں کی تھیں۔ ورنہ وہ تو اکھڑا اکھڑا ہی رہتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت اس وقت سے ہوئی تھی جب سے اس عورت سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ عالم تھا کہ ہم چھت پر جا کر بیٹھ جاتے اور چاند کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے رہتے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے بتایا کہ دوست نے اس کو دس لاکھ روپے دے دیے ہیں۔ اور اس نے جنرل اسٹور کے لیے ایک دکان بھی دیکھ لی ہے۔
میں نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کام اس کے بس کا بھی ہے یا نہیں ہے۔ لیکن میں خاموش رہتی تھی۔ ایک دن ایسا آیا کہ اس نے ایک دکان بھی کھول لی۔
اس دن وہ بہت خوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جائے گا۔ اس کے پاس ڈھیر سے پیسے ہوں گے۔
"تم دیکھ لینا۔ میں بہت جلد اپنا مکان لے لوں گا۔ کسی اچھے علاقے میں۔"
"فی الحال تو دکان پر دھیان دیتے رہو۔" میں نے سمجھایا۔ "فی الحال اس مکان میں ہمارا گزارہ تو ہو ہی رہا ہے۔ بعد میں دیکھی جائے گی۔"
میں اس خوش فہمی میں تھی کہ دکان وغیرہ کے چکر میں آکر وہ اس عورت کو چھوڑ چکا ہوگا۔ اس کی طرف اس کا دھیان کم ہوگیا ہوگا۔
لیکن ایک دن ریاض نے آکر جب ایک بھیانک خبر سنائی تو میں بلبلا کر رہ گئی۔ "آپا، میں تمہیں ایک خبر سنا رہا ہوں۔ لیکن تم اطمینان رکھو، میں تم سے اس خبر کا ایک روپیا بھی نہیں لوں گا۔ کیونکہ یہ بہت دکھ کی بات ہے۔"
"ایسی کون سی خبر آگئی ہے تمہارے پاس۔"
"خبر یہ ہے کہ تمہارے شوہر مسٹر تنویر اور اس عورت کی شادی ہونے والی ہے۔" ریاض نے جیسے مجھے گرادیا تھا۔
"کیا۔۔!" میں ریاض کی طرف دیکھتے رہ گئی تھی۔ "یہ کیا بکواس کررہے ہو؟"
"ہاں آپا! یقین نہ آئے تو خود ہی جا کر معلوم کرلو۔" اس نے کہا۔ "آج ہی دونوں کی شادی ہے۔"
مجھے کیا پتا تھا کہ تنویر نے جو خاموشی اختیار کررکھی ہے وہ کتنے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس وقت میری کیفیت عجب ہورہی تھی۔
جنونی، وحشت سوار تھی مجھ پر۔ میں اس بے وفا اور ذلیل شخص کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گی۔
اور میں یہ شادی ہونے نہیں دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔
میں یہ سمجھ رہی تھی کہ تنویر آج گھر ہی نہیں آئے گا۔ کوئی بہانہ کردے گا۔ کیونکہ اگر ریاض کی اطلاع سچ ہے تو وہ ....آج دکان ہی نہیں کھولے گا یا دکان جلدی بند کرکے وہیں سے شادی کرنے چلا جائے گا۔
لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ دوپہر کے وقت گھر واپس آگیا تھا۔
وہ کچھ بیمار سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ اس کا ضمیر ہے جس نے اسے کمزور کردیا تھا۔
احساسِ شرمندگی ہے اسے۔ وہ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ میں کچھ دیر بعد جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔
میرے لیے یہ شاندار موقع تھا۔ اس بے وفا کو انجام تک پہنچانے کا۔
میں آگے بڑھی وہ بے خبر تھا۔
میں نے برابر رکھا ہوا تکیہ اٹھایا اور اس کے چہرے پر رکھ دیا۔ میں نے کسی فلم میں یہ طریقہ دیکھا تھا۔ تکیہ رکھ کر میں اس کے اوپر ہی بیٹھ گئی تھی۔
وہ ذرا سی دیر کے لیے کسمسایا پھر ڈھیلا ہوگیا۔ وہ مرچکا تھا۔ میں نے اپنے بے وفا شوہر کو مار دیا تھا۔ اس کے بعد بے شمار خدشات تھے۔
پکڑے جانے کا خوف، پولیس، سزا، اور نہ جانے کیا کیا لیکن اتفاق دیکھیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کی موت اتفاقیہ سمجھ لی گئی تھی۔
محلے اور خاندان میں سے بھی کسی نے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ اچانک اموات تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ تو اس کی موت بھی اتفاق سے ہوگئی۔
میں بیوہ ہوگئی۔
کئی برس ہوگئے۔ کئی برسوں کے بعد ایک دن مجھے وہی عورت مل گئی، راشدہ۔ ہم دونوں مارکیٹ میں اتفاقاً ملے تھے۔
میں نے اسے پہچان لیا تھا۔
"کہو،" میں نے خود ہی آگے بڑھ کے اسے مخاطب کیا۔ "پہچان لیا مجھے؟"
"نہیں۔"
"میں تنویر کی بیوی ہوں۔" میں نے بتایا۔ "وہی تنویر جس سے تم شادی کرنے والی تھیں۔"
"ہاں۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "کیسی ہو تم؟"
"تم اپنی سناؤ۔ تم نے... تنویر کی موت کے بعد شادی تو کر ہی لی ہوگی۔"
"نہیں، میں شادی نہیں کرسکتی۔"
"وہ کیوں؟"
"بس یوں ہی۔"
"سمجھ گئی۔ شاید اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔"
"محبت نہیں نفرت۔" اب وہ بھڑک اٹھی تھی۔ "وہ ایک نمبر کا بے وفا تھا۔ پہلے اس نے تم سے بے وفائی کی۔ مجھے محبت کے خواب دکھا کر مجھ سے کاروبار کے لیے دس لاکھ روپے لیے، پھر مجھے پتا چلا کہ وہ شاہین نام کی کسی لڑکی سے شادی کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔"
"کیا!"
"ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اور آج بھی یہ اعتراف کررہی ہوں کہ جس دن اسے مجھ سے شادی کرنی تھی اسی دن میں نے اسے گھر بلا کر زہر دے دیا تھا۔"
میرے خدا! مجھے یاد آگیا کہ وہ اس دن بیمار کیوں دکھائی دے رہا تھا.... وہ بستر پر جا کر سویا نہیں تھا بلکہ مرچکا تھا۔
میں نے راشدہ کو کچھ نہیں بتایا۔
میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ اس تنویر کو ہم دونوں نے ہی مارا تھا۔ میں نے بھی اور راشدہ نے بھی۔ ہم دونوں اس کے مجرم تھے۔ لیکن شاید سب سے بڑا مجرم تو خود تنویر ہی تھا۔



جعلساز

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم!
اس بار جو سرگزشت ارسال کررہی ہوں یہ میری اپنی نہیں ہے میری ایک سہیلی کے بھائی کے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے لیکن لوگوں کو اس واقعہ سے سبق ملے گا کہ کیسے کیسے عجیب انداز میں جعلسازی ہورہی ہے۔ امید ہے یہ روداد پسند آئے گی۔

غزالہ شاہین، عبدالقیوم
(حیدرآباد)

یہ کہانی میری سہیلی کے بھائی کی ہے۔آیئے اسی کی زبانی سنیئے توزیادہ لطف دے گی۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایم ایس سی فزکس میں کرنے کے باوجود میں جاب حاصل نہیں کرسکا تھا۔ میں نے لیکچررشپ کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا لیکن مسلسل ناکامی کے بعد جیسے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں ایک ذہین طالب علم تھا۔ میں ایم ایس سی میں پوزیشن کے باوجود ناکام رہا تھا۔ میری قسمت دیکھیے کہ مجھے کسی پرائیویٹ کالج میں بھی جاب

نہیں ملی تھی...... جبکہ اکثر پرائیویٹ کالجز میں جاب مل جایا کرتی ہیں۔مگر جب قسمت کے ستارے ڈوبنے لگیں تو جیسے زندگی بھی اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔گھر میں امی جان کی منتظر نظریں، میں جب روز شام کو ناکام ونامراد گھر لوٹتا تو مجھ سے سوال کرتی نظر آتیں۔میری جھکی شرمندہ نظریں اور اداسی میں ڈوبا ہوا چہرہ امی جان کو سب کچھ سمجھا دیتا تھا۔ وہ تسلی دیتے ہوئے کہتیں۔

''بابر اتنا پریشان نہیں ہوا کرتے۔ اللہ سب بہتر کردے گا۔''

اور میں گیلی آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں سے جواب دیتا۔''امی اللہ پر تو یقین تھا اور ہے۔''

امی مسکرا کے کہتیں۔''شکر ہے کہ تم مایوس نہیں ہوئے ہو...... دیکھنا کتنا اچھا صلہ ملے گا تمہیں اللہ پر یقین رکھنے کا۔''میں امی کی بات سن کر مسکرا دیتا تھا، لیکن امی کی آنکھوں کی تھکن مجھے مضطرب کردیتی تھی۔وہ مسلسل ایک عرصے سے سلائیاں کرکر کے گھر کا بار اٹھائے ہوئے تھیں۔ابا میاں تو کئی سال پہلے ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ میں اور بہن صفیہ اور بھائی طلحہ کی پرورش امی جان کررہی تھیں۔ ہمارے مستقبل کے لیے انہوں نے خود کو وقف کردیا تھا۔

☆☆☆

جمال میرا بہت اچھا دوست تھا اس نے بی ایس سی کے بعد کمپیوٹر کورسز کرلیے تھے اور اب اچھی جاب بھی حاصل کرچکا تھا۔ جمال کے بڑے بھائی کمال احمد کی کراچی کے مشہور علاقے طارق روڈ پر فینسی ڈریسز کی بڑی اچھی سی شاپ تھی جہاں سیلز مین کی ضرورت تھی۔ کمال احمد کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھے۔وہ شام پانچ بجے شاپ پر آتے تھے۔ بازار صبح تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک کھل جاتا تھا اور رات گئے تک خوب گہما گہمی رہتی تھی۔ جمال نے مجھ سے کہا کہ جب تک میں بے روزگار ہوں شاپ پر بطور سیلز مین کام کرلوں۔ میں بے روزگاری سے اتنا تنگ آچکا تھا کہ میں نے اس پیشکش کو قبول کرلیا۔گھر جا کر امی جان کو بھی بتادیا ''امی جان کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا...... میں اس دوران لیکچررشپ کے لیے بھی کوشاں رہوں گا...... آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

امی جان خود بڑھتی ہوئی مہنگائی سے تنگ تھیں لہٰذا کچھ سوچ کر راضی ہوگئیں...... چھوٹی بہن صفیہ جو کالج میں تھی اور چھوٹے بھائی طلحہ جو اس وقت انٹر میں تھا سب کا خرچہ مل ملا کے خاصا ہوجاتا تھا...... ابو کی پنشن تھی اور امی جان سلائی کرتی تھیں جس سے گھر کی گاڑی بڑی مشکل سے کھینچ رہی تھی۔ میں اگلے ہی روز سے طارق روڈ پر کمال بھائی کی شاپ پر آگیا۔ جمال نے انہیں پہلے ہی سب کچھ سمجھا دیا تھا وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے...... میں نے شاپ پر نظر ڈالی۔ خواتین کے فینسی ڈریسز کی ایک خوبصورت شاپ تھی۔ایک سے ایک فینسی لباس رکھے تھے۔کمال بھائی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ خریدار خواتین کو ابتدائی پرائز کم سے کم آٹھ ہزار یا نوہزار بتاتی ہیں اس طرح کم از کم وہ پانچ ہزار کا تو ضرور خریدیں گی۔ پھر انہوں نے ڈریسز پر لگے ہوئے خاص نمبر کے ساتھ خاص قیمت بتانے والی بھی سمجھائی۔تقریباً آدھے گھنٹے میں، میں کافی حد تک سمجھ گیا۔

خواتین شاپ پر آتیں...... خریداری کرتیں اور چلی جاتیں۔ کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔اس جاب کے دوران میں نے لیکچررشپ کے لیے بھی انٹرویو دیا تھا۔ میں بڑی دلجمعی سے کام کررہا تھا۔کمال بھائی بھی مجھ سے بڑے خوش تھے اور گھر والے بھی کچھ مطمئن تھے۔ مجھے کام کرتے ہوئے چند دن گزرے تھے کہ وہ واقعہ پیش آیا۔

اس شام تقریباً سات بجے کا وقت ہوگا جب کمال بھائی کا فون آیا کہ آج ان کو اپنی بیگم کے ساتھ اپنی سسرال جانا ہے اور آج وہ شام کے بجائے رات کو ہی شاپ پر آئیں گے۔میں نے ''اوکے'' کہہ کر فون بند کردیا۔ میں ابھی سنبھل کے بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ لڑکی عبایا پہنے ہوئے شاپ میں داخل ہوگئی۔وہ Display پر لگے ہوئے ڈریسز دیکھتی رہی پھر پوری شاپ میں موجود ڈریسز پر تنقیدی نظر دوڑاتی رہی پھر مجھے کچھ ڈریسز دکھانے کو کہا۔ میں نے مختلف ورائٹی کے ڈریسز دکھائے لیکن اسے کچھ بھی پسند نہیں آیا۔صاف لگ رہا تھا کہ وہ بلاوجہ ناپسند کررہی ہے جبکہ ڈریسز بہت خوبصورت تھے۔ جب اس نے کہا کہ ''اس شاپ کا سب سے قیمتی ورائٹی والا سوٹ دکھایئے۔''

میں نے اعلیٰ کوالٹی کے چند ڈریس اس کے سامنے رکھ دیے۔ڈریس دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی۔ کچھ لمحے بعد وہ بولی''اگر آپ اجازت دیں تو میں چینج کرکے دیکھ لوں کہ مجھ پر یہ ڈریس فٹ ہے۔''

''وائے ناٹ...... آپ دیکھ لیں۔'' کہتے ہوئے میں نے ڈریسنگ روم جو شاپ کے ایک کونے پر بنا ہوا تھا جہاں ڈریسنگ ٹیبل وغیرہ بھی موجود تھی، میں نے اشارے سے

اسے بتادیا ’’آپ اُدھر چلی جائیں‘‘ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ وہ دوڈریس لے کر اندر گئی تھی‘ ایک پنک کلر کا اور دوسرا بلوکلر کا...... وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئی اس کے ہاتھ میں بلوسوٹ موجود تھا۔

’’اس کی فٹنگ کچھ ٹھیک نہیں ہے اسے رکھ لیں۔‘‘ وہ بولی۔

’’لیکن آپ تو دوسوٹ لے کر گئی تھیں ایک تو یہ بلو اور دوسرا پنک۔‘‘ میں نے اطمینان سے کہا۔

’’آپ بھول گئے ہیں شاید...... میں یہ بلوسوٹ لے کر گئی تھی اور یہی واپس رکھ کے جارہی ہوں۔‘‘ اب کے اس نے تھوڑا غصے سے کہا۔ مجھے اس کے جھوٹ پر تاؤ آگیا اور ذرا تیز لہجے میں بولا۔

’’محترمہ اپنا اور میرا وقت ضائع کیے بغیر پنک سوٹ جو زیادہ قیمتی ہے واپس کریں۔‘‘ اب کے وہ لڑکی بڑے اطمینان سے بولی۔

’’دیکھیے صاحب میں آپ کے سامنے ڈریسنگ روم میں گئی ہوں اور واپس بھی آگئی ہوں بھلا میں کہاں لے جاؤں گی...... اگر آپ کو کوئی شک ہے تو ڈریسنگ روم جا کر چیک کرلیں۔‘‘

میں شش و پنج میں پڑ گیا، پھر نرمی سے کہا۔

’’ٹھیک ہے...... میں ڈریسنگ روم کی چیکنگ کے لیے عارف کو بھیجتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے میں نے شاپ پر موجود عارف سے آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈریسنگ روم چیک کرنے کو کہا۔ عارف سامنے والی شاپ پر ملازم تھا۔ اس کی شاپ پر فی الوقت کوئی خریدار نہیں تھا تو وہ میرے پاس آگیا تھا۔ عارف میری بات سن کر اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا ’’وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

عارف کی بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پنک سوٹ کی خرید ہی صرف آٹھ ہزار روپے تھی۔ انتہائی نفیس کامدار سوٹ تھا۔ اسٹائلش سلائی کے ساتھ منفرد بھی تھا اور دیدہ زیب بھی...... سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینا آگیا تھا...... لیکن میں اس مکار لڑکی کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھا، نہ مجھے یقین تھا کہ یہ سچ بول رہی ہے۔ پھر میں نے اس لڑکی کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے لیڈی پولیس کو فون کردیا۔

تھوڑی دیر بعد لیڈی پولیس آگئی۔ میں نے معاملے کی نوعیت اس سے گوش گزار کی۔ عبایا والی لڑکی جس نے چہرہ بھی ڈھانپا ہوا تھا صرف آنکھیں ہی تھیں جو اس کے تاثرات کو ظاہر کررہی تھیں۔ لیڈی پولیس کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں سے مارے غصے کے چنگاریاں نکل پڑیں۔

’’اوہ...... تم مجھے جیل میں بند کرواؤ گے۔‘‘ وہ تقریباً چیخی۔

’’نو میڈم...... آپ صرف ڈریسنگ روم میں جا کر لیڈی پولیس کو تلاشی دے دیں...... ہوسکتا ہے کہ آپ کے عبایا میں کوئی خفیہ جیب ہو‘‘ میں نے تحمل سے کہا۔

’’اوکے...... یہ شوق بھی پورا کرلیں۔‘‘ لڑکی بڑبڑ کرتی لیڈی پولیس کے ہمراہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد جب دونوں باہر آئیں تو لیڈی پولیس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

’’ان کے پاس کوئی ڈریس نہیں ہے۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہے۔‘‘

لیڈی پولیس کی بات سن کر میں حیران رہ گیا لیڈی پولیس نے مجھے ڈپٹ کر کہا۔

’’وقت تمہارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا...... تم نے اپنا، ہمارا اور اس لڑکی کا وقت بھی ضائع کیا ہے اور اس لڑکی پر جھوٹ اور چوری کا الزام بھی لگایا ہے۔ اب اگر یہ لڑکی چاہے تو تم پر مقدمہ بھی کرسکتی ہے۔ معافی مانگو اس سے۔‘‘

’’لیڈی پولیس کی بات سن کر میں نے شرمندگی سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ گردن اکڑائے فاتحانہ شان سے کھڑی تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوری کہا۔ پھر لیڈی پولیس چلی گئی۔ لڑکی بھی اونچی ہیل۔ ٹھک ٹھک کرتی شاپ سے نکل گئی۔ مجھے یاد ہے کل ہی تو فینسی ڈریسز کے سوٹ آئے تھے اور یہ کُل دس سوٹ تھے اب نو رہ گئے تھے...... میں سخت پریشان تھا۔ کمال بھائی آئیں گے تو انہیں کیا جواب دوں گا۔ نہ جانے لڑکی کوئی جادو ٹوٹا جانتی تھی کہ پنک سوٹ ہی غائب ہوگیا تھا۔ مجھ سے اب دلجمعی سے کام نہیں ہورہا تھا۔ بار بار دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کمال بھائی سے الگ خوف آرہا تھا کہ کیا جواب دوں گا۔ حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں...... میں جو سب کو ایمانداری کا درس دیتا تھا۔ آج لوگ مجھے بے ایمان، چور اور جھوٹا سمجھیں گے۔ دل پر اضطراب کی کیفیت بڑھنے لگی تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ تھمنے والا ریلا بہہ نکلا۔ عارف بھی کب کا جا چکا تھا۔ جب میں بے بسی سے خوب رو چکا تو فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا اور چونک پڑا، اسی لڑکی کا فون آیا تھا اس نے تیز ہنسی کے ساتھ

بات شروع کی۔

’’پہچانا...... میں صنم بول رہی ہوں...... ابھی آپ کی شاپ سے پنک سوٹ لے کر آنے والی عبایا پہنے لڑکی۔‘‘

’’یہ نمبر آپ کو کہاں سے ملا۔‘‘ میں نے بہ مشکل کہا۔

’’آپ کی شاپ کے فرنٹ بورڈ سے نوٹ کیا تھا۔ آپ بڑے ہوشیار بنتے تھے ناں...... تب ہی تو لیڈی پولیس کو بھی بلالیا۔ اور ہاں بھولے بادشاہ وہ پنک سوٹ میں لے آئی ہوں...... پوچھو کیسے۔‘‘ انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

’’کیسے؟‘‘ میں ضبط سے پوچھ رہا تھا۔

’’سنو بھولے بادشاہ...... میں عبایا نہیں پہنتی ہوں پر کیا کروں اس قیمتی سوٹ کی خاطر عبایا لینا پڑا...... ہاں میں جب تمہاری شاپ پر آئی تھی تو برہنہ تھی صرف عبایا ہی پہنا ہوا تھا۔ پھر دو قیمتی سوٹ تم سے لے کر ایک زیادہ قیمتی پہن لیا اور دوسرا تمہیں واپس کردیا۔ اس طرح لیڈی پولیس بھی نہ پہچان سکی۔‘‘ لڑکی کی تیز ہنسی پھر گونجنے لگی۔ میں محوِ حیرت تھا۔

’’اوکے بھولے بادشاہ۔‘‘ لڑکی نے طنزیہ کہا اور فون بند ہوگیا۔ اب معاملہ میری سمجھ میں آیا کہ لڑکی سوٹ پہن کر گئی تھی، اسی لیے پکڑی نہ گئی۔ جرم کا یہ انوکھا انداز تھا۔ میں نے جلدی سے سی ایل آئی پہ کمنگ کال چیک کرنے کے بعد نمبر ڈائل کردیا تاکہ لڑکی کو خوب کھری کھری سناؤں۔ مگر ہائے افسوس وہ پی سی او کا نمبر تھا۔ وہ لڑکی مجھے تقریباً آٹھ ہزار کی جو خرید دام تھی، میرے ذمّے واجب الادا کی صورت چھوڑ گئی تھی۔ ابھی تو پہلی تنخواہ بھی نہیں ملی تھی کہ آزمائش شروع ہوگئی تھی۔ ’’یہ دنیا بڑی جعل ساز ہے۔‘‘ دل کے کسی کونے سے آواز آئی تھی۔ میں نم آنکھیں لیے بیٹھا رہا۔ کمال بھائی رات خاصی دیر سے آئے۔ میں نے مغموم اور اداس چہرہ لیے جو آج کی روداد سنائی تو سوچ کی کئی لکیریں ان کے چہرے پر ابھر آئیں۔ پھر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ کہنے لگے۔

’’یار ایک سوٹ کی ضرورت تھی تو بتادیتے اتنا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

’’کمال بھائی......‘‘ میں بہ مشکل ہی بول پایا تھا۔ ’’آپ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

کمال بھائی نے غصے سے مجھے گھورا۔ ’’آج میں شاپ سے چلا گیا تو تم نے اتنا بڑا چکر چلادیا۔ سنو مجھے تم جیسے سیل مین کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اب تنخواہ کے

آزادیٔ صحافت

آزادی کے لغوی معنی بیرونی مداخلت کا فقدان ہے اور آزادیٔ صحافت سے مراد اخبارات ورسائل کو اس امر کی آزادی دینا ہے کہ اگر وہ حکومت کے کسی فعل کو ناپسند کریں تو اس پر تنقید کر کے رائے عامہ کو اس کی خرابیوں سے آگاہ کرسکیں۔ اخبارات ورسائل کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جو چاہیں چھاپیں، بشرطیکہ ان کا ایسا کرنا کسی تعزیری قانون کے خلاف نہ ہو۔ ہر مہذب ملک میں اخبارات کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی مسئلے پر اپنی دیانت دارانہ رائے کا پوری آزادی کے ساتھ اظہار کریں، اگر ایسا نہ ہو تو کوئی قوم سیاسی، اخلاقی یا ذہنی ترقی نہیں کرسکتی۔

مرسلہ: نازیہ وحید، حاصل پور

نام پر ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا۔ بلکہ میرا نقصان بھرنا پڑے گا۔‘‘ کمال بھائی جس بے رخی اور رکھائی سے بات کررہے تھے اس نے میرے دکھ کو اور بڑھادیا تھا۔

’’آپ میرا یقین کریں کمال بھائی۔‘‘ میں منمنایا۔

’’مت کہو مجھے بھائی اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ گیٹ آؤٹ......‘‘ انہوں نے تیز لہجہ اختیار کیا۔

’’آپ اس طرح نہیں کرسکتے۔‘‘ میں نے روہانسا ہو کر کہنا چاہا۔

’’تو کیا کروں...... تمہیں سر پر بٹھاؤں...... الٹی سیدھی کہانیاں سنا کر تم مجھے بے وقوف بنارہے ہو۔‘‘

’’آپ قریبی شاپ کیپرز سے معلوم کرلیں۔‘‘ میں نے آنسو پی کر کہا۔

’’نہیں معلوم کرنا مجھے...... بس تم یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘ کمال بھائی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی شاپ سے باہر نکال دیا۔ میں آبدیدہ ہو کر شاپ سے باہر آگیا۔ ذلت کے احساس سے میرا چہرہ تپ اٹھا تھا۔ گھر جا کر امی جان کو کیا بتاتا یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہورہا تھا۔ دل کی تڑپ بڑھ رہی تھی اور دل میں اس لڑکی کے خلاف انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں جانے کیسے گھر آیا تھا میں نہیں جانتا۔ صبح

الٹا سیدھا ناشتا کر کے گھر سے نکل پڑا۔ امی جان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ صفیہ نے ہی ناشتا دے دیا تھا۔ میں جمال سے مل کر کمال بھائی کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا۔ جمال مجھے گھر پر نہ ملا تو میں اس کے آفس چلا گیا۔ جمال نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات ابھر آئے۔

''جمال پلیز' میری بات سنو۔'' میں نے ملتجی انداز میں کہا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ تم نے کمال بھائی کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا ہے اور تمہاری یہ ہمت کہ اب یہاں چلے آئے۔'' جمال نے سختی سے کہا۔

''جمال میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اب کے میں نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

''اوہ' ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری...... تمہیں نوکری اسی لیے تو ملتی نہیں ہے کہ تم بے ایمان اور چور ہو۔ جاتے ہو یا بلاؤں پیون فضل دین کو۔'' جمال کے رویے اور لہجے نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیا۔

''دیکھو جمال میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی' تم بات سمجھو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ جمال نے کڑے تیوروں سے مجھے گھورا اور کہا۔

''یار بس اب یہاں سے جاؤ...... اب ہماری دوستی ختم سمجھو۔''

میں مرے مرے قدموں سے اس کے آفس سے نکل آیا۔ میں اس گناہ کی سزا پا رہا تھا جو میں نے کیا ہی نہیں تھا اور یہ میرے دوست نے کیا کہہ دیا کہ میں بے ایمان اور چور ہوں اسی لیے مجھے نوکری نہیں ملتی۔ میں آسمان کی طرف دیکھ کر بے تحاشا رونے لگا۔ پھر سر جھکا کر صرف اتنا کہا۔

''مالک...... دوستی میں دراڑ ایک عورت نے ڈال دی ہے لیکن تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ اور اسی بے قصوری اور بے گناہی کے بدلے مجھے ملازمت عطا فرما دے......'' میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا...... مجھ سے ضبط اور صبر کا دامن چھوٹتا جا رہا تھا۔ احساسِ توہین نے میری شخصیت کو جھلسا دیا تھا۔ میرے دوست نے مجھ پر بھروسا نہیں کیا تھا۔ میں سارا دن خزاں کے زرد پتے کی طرح بھٹکتا رہا تھا۔ روتا رہا تھا، تڑپتا رہا تھا۔ میرے اندر حبس کا گھٹا ہوا موسم اتر چکا تھا، اتنا کہ سانس لینا محال ہو چکا تھا۔ دن گزر گیا اور سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے مجھے رات ہو گئی۔ رات کا اندھیرا بھی خوب ہوتا ہے جو اپنے آنچل میں ہر دکھ چھپا لیتا ہے۔ روح کتنی ہی چھلنی ہو رات سب کو اپنے حصار میں لے کر وقتی سہی، آسودگی بخش دیتی ہے۔ رات کے دو بجے تو میں نے گھر کا رخ کیا۔ گھر میں قدم رکھا تو ہر ایک کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی صفیہ مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔

''بھائی جان کہاں رہ گئے تھے آپ، کب سے ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''صفو...... وہ ذرا...... میں...... باہر تھا۔'' میں دل کا کرب دبا کے بولا۔

''ہم نے جمال اور کمال بھائی کو فون کیے مگر دونوں کے فون بند جا رہے ہیں۔'' وہ بولی۔

''خیریت تو ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ اتنے میں امی جان اور طلحہ بھی ادھر ہی آ گئے تھے۔

''بیٹا مبارک ہو...... اللہ نے ہماری سن لی۔'' امی جان مسکرا کے بولیں۔

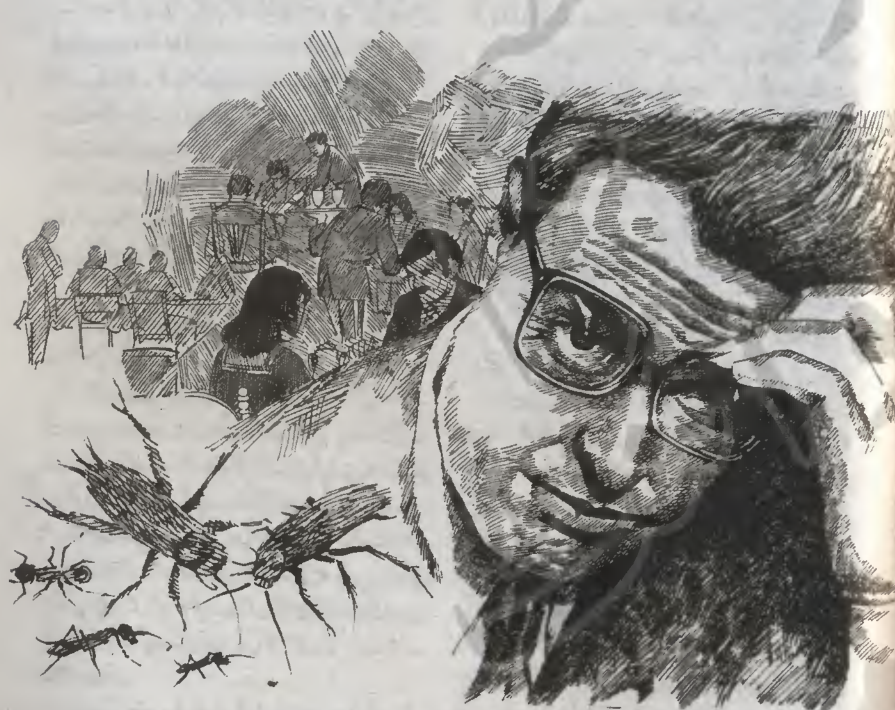
''کیا ہوا؟'' میں بے دلی سے بولا۔

''تمہیں نوکری مل گئی ہے اور خیر سے تم سترہ گریڈ میں لیکچرار ہو گئے ہو۔'' امی جان نے بہت محبت سے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے کہہ کر تینوں کو دیکھا۔ طلحہ نے جلدی سے گلاب جامن پوری میرے منہ میں ڈال دی۔ صفیہ اور امی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔ میں دیر تک سرشاری کی کیفیت میں رہا۔ آج میں نے کتنی بار خودکشی کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہر بار ناکام رہا تھا۔ میرا رب کتنا مہربان اور رحمان ہے۔ وہ کیسے کیسے نوازتا ہے۔ انسان کو اس کی سوچ سے بڑھ کر عطا کرتا ہے۔ میں نے فوراً وضو کیا۔ نماز ادا کی' شکرانے کے نوافل بھی پڑھے اور اشکبار آنکھوں سے رب کا شکر ادا کرتا رہا۔ میرے رب نے مجھے جمال کے طعنے سے بچا لیا تھا کہ مجھے بے ایمانی کی وجہ سے نوکری نہیں ملتی۔ میں کس قدر مسرور تھا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ رات بڑی بے چینی سے گزری تھی۔ صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کر میں جوائننگ کے لیے کالج چلا گیا۔ اتفاق سے یہ کالج میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ یہ بھی انسان کی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ اس کی روزی اس کے گھر سے قریب ہو۔

انوکھا بزنس

جناب معراج رسول
سلام مسنون!
میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ارسال کر رہا ہوں۔ گوکہ یہ واقعہ مسکراہٹ کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن دلچسپ اور سبق بھرا ہے اور آپ لوگ سبق آموز واقعات کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے میں بھیج رہا ہوں کہ ہوٹلوں میں جو کینڈل لائٹ ڈنر کا چلن ہے اس کے پیچھے راز کیا ہے۔
نذیر ملک
(لندن)



میں پورے پانچ برس کے بعد اس محلے میں آیا تو وہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی اور جگہ غلطی سے آ گیا ہوں۔ اب کسی پرانی چیز کا وجود ہی نہیں تھا۔ صرف دکانیں ہی نہیں ہوٹل بھی نئے روپ اور نئے قالب میں نظر آ رہے تھے۔ چار چار منزلہ خوبصورت، پُرشکوہ اور جدید ترین عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ کمرشل ایریا تھا اس لیے ان عمارتوں میں اپارٹمنٹس کی بجائے دفاتر تھے۔

میں اسی جگہ آ گیا جہاں کبھی چوہدری کا ہوٹل ہوا کرتا

تھا۔ یہ فوڈ اسٹریٹ تھی۔ اس لیے ہر طرح اور ہر قسم کے ہوٹل، ریسٹورنٹ اور بار بی کیو تھے۔ یہاں صرف دوپہر کے وقت ہی ہوٹل اور ریسٹورنٹ بھرے نہیں ہوتے تھے بلکہ سہ پہر سے رات دو بجے تک بھی گاہک آتے تھے۔ یہ ہوٹل اور ریسٹورنٹ باہر سے بہت خوبصورت اور شاندار قسم کے دکھائی دیتے تھے۔ اس لیے بھی کہ ان کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ اس میں جو منافع اور آمدنی تھی وہ کسی بزنس میں نہیں تھی۔ لوگ مہنگائی کا رونا روتے ہیں لیکن آپ جب ہوٹلوں میں گاہکوں کا رش دیکھیں گے تو یہ بات غلط نکلے گی۔ چوہدری کے ہوٹل کا نام انوکھا ہوٹل تھا۔ یہاں کسی ہوٹل پر انوکھا ہوٹل کا نیون سائن نہیں تھا۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا اس کے سامنے ایک بہت ہی جدید قسم کا ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ نظر آیا۔ اس جگہ چوہدری کا انوکھا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس ہوٹل کے مالک کا پتا شاید سامنے والے ریسٹورنٹ پر جو دربان کھڑا ہوا ہے اس سے معلوم ہوجائے، میں نے اس کے پاس جاکر پوچھا۔

"یہاں پانچ برس پہلے ایک انوکھا ہوٹل ہوتا تھا۔ اس کے مالک کا نام چوہدری خدا بخش تھا لیکن وہ چوہدری کے نام سے مشہور تھا۔ کیا......"

"سر! چوہدری خدا بخش صاحب کا ہی یہ ڈائمنڈ ریسٹورنٹ ہے۔ آپ اندر جاکر ان کے بارے میں کسی ویٹر سے معلوم کرلیں۔"

میں حیرت اور خوشی کے عالم میں اندر داخل ہوگیا۔ مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چوہدری ترقی کرکے ایک بڑے ریسٹورنٹ کا مالک بن گیا ہے۔ اس کے دن پھر گئے ہیں...... شب و روز کی محنت رنگ لائی ہے۔

جب میں اندر داخل ہوا تو اندر کی ائرکنڈیشنڈ ہوا نے میری ساری تھکن اور گرمی کو فرحت میں بدل دیا۔ وسیع و عریض ہال میں مدھم سُروں میں دھن بج رہی تھی۔ یہ کیسٹ تھا جو ڈیک میں تھا۔ ہال کا منظر بڑا خواب ناک اور معطر سا تھا۔

ایک مستعد ویٹر میری طرف بڑھا۔ وہ مجھے اپنی رہنمائی میں ایک ایسی میز پر لے گیا جس کے گرد دو کرسیاں تھیں۔ یہ میز ایک کونے میں تھی۔

ویٹر نے میرے سامنے مینو رکھا تو میں نے اس سے کہا۔ "پہلے میرے لیے سیون اپ لے آؤ، پھر میں کھانے کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے جائزہ لینے کے لیے نگاہ دوڑائی۔ مدھم مدھم روشنیوں کے فانوسوں سے ریسٹورنٹ کو بڑے سلیقے اور خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کی تزئین و آرائش پر نہ صرف پیسا پانی کی طرح بہایا گیا تھا بلکہ اعلیٰ ذوق کا بھی ثبوت دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگوں کے پاس پیسا تو ہوتا ہے لیکن ذوق ناپید ہوتا ہے۔ دو بڑے ...... اسکرین کے ٹی وی بھی تھے۔ عریاں اور فحش رقص کی فلم چل رہی تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ پُراسرار اور نیم تاریکی میں کسی طلسماتی دنیا کے لوگ لگ رہے تھے۔ وہ ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں پانچ برس پہلے کے دور میں پہنچ گیا... جب میں نے اور چوہدری نے مل کر یہاں انوکھا ہوٹل شروع کیا تھا۔ وہ چھ سات جماعتوں سے زیادہ اس لیے نہیں پڑھ سکا تھا کہ اس کے والد ایک غریب آدمی تھے اور کلفٹن کے علاقے کے ایک ہوٹل میں ویٹر تھے۔ اسے شروع سے ہی کھانے پکانے کا شوق...... بلکہ ایک طرح سے جنون تھا۔ پھر ایک دن وہ اور اس کا باپ لاہور چلے گئے۔ ہم بہت دنوں تک اسے یاد کرتے رہے تھے۔ پھر زندگی کی دوسری مصروفیات میں اس کی یاد گم ہوگئی۔ لیکن وہ امی کو بہت دنوں تک اس لیے یاد آتا رہا تھا کہ اسکول کے دنوں میں وہ اسکول سے سیدھا ہمارے ہاں آکر ماں کو کچن سے اٹھا دیتا اور بڑے لذیذ اور ذائقے دار کھانے پکا کر ہمیں کھلاتا۔

جب میں نے ایم اے کرلیا تو والد صاحب لندن میں دفتر کھولنا چاہتے تھے۔ ان کا امپورٹ اور ایکسپورٹ کا کام تھا۔ وہ مجھے وہاں بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں وطن چھوڑ کر وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ دوسروں کی طرح مجھے لندن یا امریکا جانے کا کوئی جنون نہیں تھا۔

ان ہی دنوں میری ملاقات چوہدری سے پھر ہوگئی۔ اتنی مدت کے بعد جب وہ ہمارے گھر آیا تو میں اسے بالکل ہی پہچان نہ سکا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ گنجا بھی ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت عرصہ بیمار رہا۔ ٹائی فائیڈ نے اسے گنجا کردیا اور اس بیماری کی وجہ سے اس کی بینائی بھی متاثر ہوگئی۔ آج کل وہ بے کار تھا۔ بے کار تو میں بھی تھا لیکن روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لیے بے کاری بوجھ نہ تھی۔ رنگین مجھی تھی۔ میں تفریحات پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔

ایک روز اس نے چکن کڑاہی اس قدر شاندار بنائی

کہ میں نے انگلیاں چاٹ لیں، میں نے اس سے کہا۔

"چوہدری یار! اتنا اچھا کھانا نہ تو گھروں میں پکتا ہے اور نہ ہی ہوٹلوں میں...... کیوں نہ ایک ہوٹل کھول لیا جائے؟"

"ضرور......" چوہدری نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "نذیر بھائی....! میں تو ایسے زبردست کھانے پکاؤں گا کہ سارے شہر میں دھوم مچ جائے گی۔"

میں نے اسی وقت اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہوٹل کھولنے کا پروگرام بنایا۔ اس میں کوئی شک اور مبالغہ نہیں کہ وہ واقعی بہت اچھے کھانے پکاتا تھا۔ جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اپنی بیماری سے پہلے وہ لاہور کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں باورچی کی نوکری کرتا رہا تھا۔ چنانچہ اس جگہ جہاں میں آج بیٹھا ہوں ہم نے یہ جگہ لے کر ایک ہوٹل کھول لیا۔ امی سے میں نے پچاس ہزار کی رقم قرض لی۔ کچھ رقم چوہدری کے پاس تھی۔ ہم دونوں نے شراکت میں یہ ہوٹل کھول لیا۔ اس کا نام انوکھا ہوٹل چوہدری نے ہی تجویز کیا تھا۔ سائن بورڈ پر ہوٹل کے نام کے نیچے لکھ دیا تھا، انوکھے اور ایسے لذیذ کھانے جو آپ نے اپنی زندگی میں کہیں کھائے نہ ہوں گے۔

چند ہی دنوں میں چوہدری کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کی وجہ سے ہوٹل چل نکلا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں ایسا ذائقہ دیا تھا کہ اس کے بنائے کھانے کھا کر گاہک انگلیاں چاٹنے لگتے...... اور اگر کسی روز وہ کسی کو کچن کی ذمے داری سونپ دیتا تو کھانے میں ذائقہ نہ ہوتا۔ اصل میں ذائقہ ہی بکتا ہے، پسند کیا جاتا ہے۔ ذائقہ نہ ہو تو کھانا بدمزہ بن جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی نے چوہدری کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چوہدری کی نظر چونکہ بے حد کمزور تھی اس لیے کھانا بناتے وقت آس پاس کیڑے مکوڑوں کا خیال رکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ کھانا کھاتے وقت گاہکوں کے کھانے میں کاکروچ اور دوسرے چھوٹے موٹے کیڑے نکل آتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ کاروبار ٹھپ ہونے لگا۔ ایک بار کھانا کھاتے وقت ایک آدمی کے مرغ مسلم کی ڈش میں کچی پکائی چھپکلی نکل آئی۔ غصے میں آکر اس نے میز کرسیوں کو توڑ دیا۔ ان ہی دنوں ہماری پوری فیملی کو لندن جانا پڑا تو میں نے بھی لندن جانے کا پروگرام بنالیا۔ پھر میں نے تمام کاروبار چوہدری کو سونپ دیا اور گھر والوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔

میں نے ماضی کے بارے میں سوچتے سوچتے کولڈ ڈرنک کی بوتل خالی کردی۔ جب میں نے بوتل ختم کی تو ویٹر آرڈر لینے آگیا۔ میں نے بریانی کا آرڈر دیا تو ایک خیال آیا کہ کہیں اس ہوٹل کا مالک کوئی اور چوہدری تو نہیں ہے۔ میں تصدیق تو کرلوں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اس ہوٹل کے مالک کا کیا نام ہے؟"

"ان کا نام چوہدری خدا بخش ہے۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"یہاں اس جگہ پہلے یعنی پانچ برس قبل ایک ہوٹل تھا...... انوکھا ہوٹل کے نام سے...... تمہیں یاد ہے؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں...... یہ وہی جگہ ہے...... ایک نذیر ملک صاحب تھے۔ چوہدری خدا بخش اور نذیر ملک صاحب نے مل کر انوکھا ہوٹل کھولا تھا۔" اس نے بتایا۔ "ان دنوں میں بھی اس ہوٹل میں برتن دھویا کرتا تھا۔"

"اچھا تو مسٹر خدا بخش صاحب اس وقت کہاں ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ "کیا وہ گھر پر ہوں گے؟"

ویٹر نے جواب دینے سے قبل اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا۔ "وہ کچن کے انچارج بھی ہیں۔ کھانے انہی کی نگرانی میں تیار ہوتے ہیں۔ کچن میں ہوں گے۔"

"اچھا تو ان سے جاکر کہو کہ ان کے ایک.... دیرینہ دوست نذیر ملک لندن سے آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

صرف دو منٹ کے اندر ہی چوہدری میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ شیف کے لباس میں تھا۔ میں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ اسے اپنی وردی کا خیال آیا تو وہ ابھی آیا کہہ کر چلا گیا۔ پھر وہ آیا تو سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی ناک سنہری فریم کی عینک کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو گھر چلتے ہیں۔"

باہر آکر اس نے باوردی دربان سے کہا کہ وہ گاڑی لے آئے۔ چند لمحوں کے بعد نئی ماڈل کی ٹویوٹا کرولا سامنے کھڑی تھی۔ اندر سے باوردی ڈرائیور نے نکل کر دروازہ کھولا تو ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے تحکمانہ لہجے میں کہا "گھر چلو......"

گاڑی چل پڑی تو اس نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

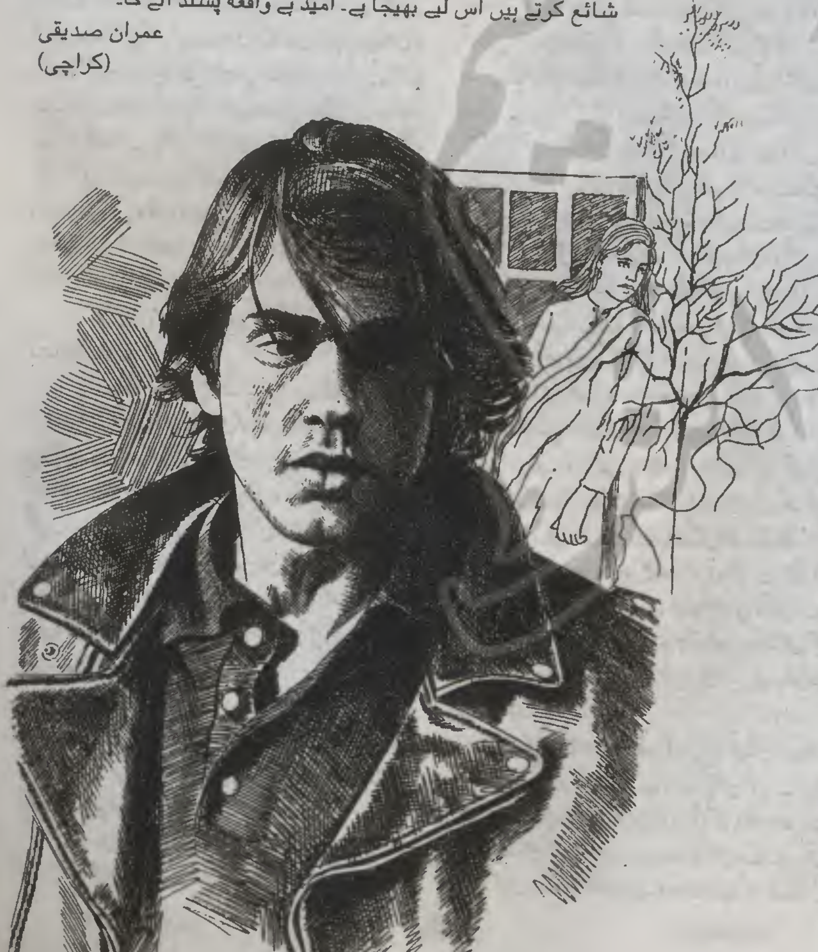
"کیسے ہو!.... آپ نے لندن جاکر میری خبر ہی نہیں لی اور

نہ ہی اپنا پتا ہی چھوڑ گئے اور ... پتا دینے والا کوئی نہ تھا......''
میں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ یہ رسمی بات تھی۔ اس کی زندگی قابلِ رشک بن گئی تھی۔ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔
''تمہیں ترقی کی اس منزل پر دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تم نے ناکامی کا بھی مقابلہ کیا...... لیکن سچ سچ بتانا...... ان اچھے دنوں میں کبھی میری یاد بھولے سے بھی آئی......؟''
اس نے درمیان میں میری بات کاٹتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ بھی کیسی پرایوں جیسی باتیں کر رہے ہیں...... آپ ہی نے تو میری اس سنہری زندگی کی بنیاد ڈالی...... بھلا میں اپنے محسن کو کبھی بھول سکتا ہوں؟''
کلفٹن میں اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے اس پوش علاقے میں لگژری اپارٹمنٹ لیا ہوا تھا۔ لمحے کے لیے یقین نہ آیا۔ اس عمارت میں جتنے بھی اپارٹمنٹ تھے اس کے رہائشی امیر و کبیر تھے۔ اس کا اندازہ نہ صرف اس پر شکوہ عمارت بلکہ ان میں کھڑی گاڑیوں سے ہوتا تھا۔ اس نے گاڑی سے اترنے کے بعد کہا۔ ''میرا اپارٹمنٹ چوتھی منزل پر ہے۔ میں نے چالیس لاکھ میں دو برس پہلے خریدا تھا۔ اب اس کی مالیت ایک کروڑ کی ہے۔''
ہم لفٹ کے ذریعے اوپر آئے۔ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دوسرے لمحے دروازہ کھل گیا۔ اس نے مجھے اپنی حسین اور نوجوان بیوی سے ملوایا۔ وہ اس عورت کا جوڑ نہ تھا۔ دولت ہو تو جوڑ بن جاتا ہے۔ اس نے مجھے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھایا۔ اس کا گھر نہایت آراستہ تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش پر اس نے جیسے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔
''آپ بیٹھیں۔ میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔''
چند لمحوں کے بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک قدرے پھولا ہوا لفافہ تھا۔ اس نے میری طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ لیں آپ کی امانت جو بہت دن سے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔''
میں نے لفافہ چاک کر کے دیکھا تو اس میں پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ پچاس ہزار کی رقم تھی۔ میں حیران رہ گیا۔
''چوہدری...... میں نہ تو اس کے لیے آیا اور نہ ہی میرے ذہن میں ایسی کوئی بات تھی۔ مجھے تو اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔''
''میں جانتا ہوں......! اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' پھر اس نے میری زندگی کے متعلق سوالات کر کے موضوع بدل دیا۔
کچھ دیر بعد اس کی بیوی رخسانہ نے میز پر کھانا چن دیا۔
''چوہدری......'' میں نے کہا۔ ''یار وہاں سب ٹھیک ہیں اب...... لیکن جب لندن گیا تھا اس وقت...... اس وقت تو......''
چوہدری ہنسنے لگا...... ''بھیا آپ یہ جاننا چاہتے ہیں نا کہ میں نے یہ ترقی کس طرح کی......؟ لیکن یہ سب تو نذیر ملک کے روشن دماغ اور کاروباری ذہن کا نتیجہ ہے......''
''لیکن کھانا تو اب بھی تم ہی بناتے ہو...... تم ایک بہت ہی ماہر شیف اور اعلیٰ درجے کے باورچی ہو۔''
''ہاں...... بالکل میں ہی بناتا ہوں...... میرے علاوہ اتنا لذیذ کھانا کون بنا سکتا ہے۔''
''لیکن وہ کاکروچ...... چھپکلی اور......''
وہ قہقہہ لگا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔
''تمہیں...... اسی لیے تو گھر لے آیا ہوں...... کھانا تو میں بھی اپنے ہی گھر میں کھاتا ہوں۔''
''اور...... وہاں...... وہاں اب بھی......''
چوہدری پھر ایک بار زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔
''یہ انوکھا اور دنیا کا سب سے بہترین بزنس ہے...... مدھم مدھم سُروں کی موسیقی اور چالیس انچ کے ٹی وی میں انڈین فلموں کے رقص اور محبت کے جذباتی اور رومانی مناظر...... بڑے اسکرین پر کس قدر ہیجان خیز بن جاتے ہیں۔ ان کی رنگینیوں میں کھانے کی طرف دیکھنے کا خیال نہیں رہتا ہے۔ تھوڑا بہت خیال آتا تو ہوگا...... لیکن مدھم مدھم روشنیوں میں میری نظریں کیا کھانا کھانے والوں کی نظروں کو بھی دھند کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ بس ایک ذائقہ ہے...... ایک لذت ہے...... خدا کا شکر ہے کہ انسان دیکھ نہیں سکتا...... اس لیے ریسٹورنٹ چلتا ہی نہیں بلکہ دوڑتا ہے...... یہ بات دیگر ہے کہ ایک کمپنی کو کاکروچ کلنگ کا ٹھیکا دے دیا ہے۔''
ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

جب میں رومی کے سحر میں گرفتار ہوا تو میں بہت چھوٹا تھا۔ گیارہ سال کا تھا یا شاید بارہ سال کا۔ وہ تھی بھی ایسی کہ اسے دیکھنے والا اور اس کے پاس جانے والا اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ سرتاپا حُسن تھی۔ اس کا وجود ارمانوں سے بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اپنے وجود کے ایک ایک انگ میں خوب صورتی اور دل کشی سمیٹے ہوئے تھی۔ جب مجھے اس سے محبت ہوئی تو مجھے اس لفظ کے معنی بھی نہیں آتے تھے۔

محبت

محترم مدیر اعلیٰ
آداب و نیاز،
محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کبھی بھی کسی بھی عمر میں کسی کے بھی دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ میری سرگزشت پڑھ کر آپ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اتنی چھوٹی عمر میں محبت کا جذبہ کیسے پیدا ہوگیا تو جناب یہ اختیاری جذبہ نہیں ہے، خداداد جذبہ ہے اور انوکھا ہے اسی لیے اسے لکھ کر بھیج رہا ہوں، آپ لوگ انوکھے واقعات شائع کرتے ہیں اس لیے بھیجا ہے۔ امید ہے واقعہ پسند آئے گا۔
عمران صدیقی
(کراچی)



رومی ان دنوں ہمارے محلے میں نئی آئی تھی۔ وہ شادی کر کے یہاں آئی تھی اور بہت کم عمر تھی۔ شاید سولہ سترہ برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی تھی اور اس کے شوہر نوشاد بھائی اس سے عمر میں خاصے بڑے تھے۔ وہ اس وقت پینتیس برس کے تھے اور دیکھنے میں بھی عمر رسیدہ ہی لگتے تھے۔

مجھے اس وقت یہ تو نہیں پتا تھا کہ کم سن اور عمر رسیدہ کیا ہوتا ہے مگر امی اور دوسری محلے والیوں کی باتیں سن کر مجھے لگا کہ رومی کے ساتھ کوئی ظلم ہوا ہے۔ اس کا نام بھی اس کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ نوشاد بھائی ہمارے محلے میں رہتے تھے اور وہ کسی اسکول میں استاد تھے ساتھ ہی گھروں میں ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے۔ رومی بھی ان کی شاگرد تھی مگر پھر اس نے استاد پر ایسا سحر کیا کہ وہ اس کے شاگرد بن گئے اور انہوں نے کتنے ہی جتن کر کے رومی کے ماں باپ سے اس کا رشتہ حاصل کر لیا۔ سنا ہے کہ انہوں نے رومی کے غریب ماں باپ کو ایک بڑی رقم دی تھی جب وہ اس رشتے پر رضا مند ہوئے تھے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ رومی کی رضامندی شامل تھی یا نہیں۔ جب وہ بیاہ کر ہمارے محلے میں آئی تو میں اس وقت پانچ سال کا تھا اور وہ آتے ہی مجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ کچھ دن بعد جب اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہوا تو اس نے ایک دن امی سے کہا۔

''کاش میں عمران کو پہلے دیکھ لیتی تو نوشاد سے شادی سے انکار کر دیتی۔''

''ارے تو کیا اس چھوٹے سے بچے سے شادی کرتی۔'' امی نے ہنس کر کہا۔ اس نے امی کو باجی بنا لیا تھا اور ان سے بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی۔ محلے میں کسی اور گھر میں اس کا اتنا آنا جانا نہیں تھا۔ ہمارے ہاں بھی وہ میری وجہ سے آتی تھی۔ ایک دن جب کہ وہ نئی نئی آئی تھی تو میں گلی میں کھیل رہا تھا میری بال اچھل کر اس کے گھر میں چلی گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ بجایا۔ رومی نے دروازہ کھولا اور میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا جیسے وہ مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے گڈے؟''

''میری بال آئی ہے۔''

''آؤ آ کر لے لو۔'' اس نے دعوت دی تو میں بلا جھجک اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے میری بال دکھائی۔ ''یہ ہے نا تمہاری بال؟''

اس دن کے بعد سے اس نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کیا تھا اور مجھ سے اس کا رویّہ شروع سے والہانہ تھا۔ جب اس نے امی سے شادی کی بات کی تو امی کے سوال پر بولی۔ ''میں انتظار کرتی جب تک یہ شادی کے قابل نہیں ہو جاتا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''ارے تو کیا ضروری ہے تجھ سے ہی شادی کرتا۔''

''کیوں کیا میں اس قابل نہیں ہوں؟''

''نہیں صورت شکل کی تو تو بہت پیاری ہے کوئی بھی مرد تجھے دیکھ کر ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔''

''تب یہ بھی نہیں کرے گا بس اسے بڑا ہونے دیں۔'' اس نے میری طرف دیکھا اس وقت اس کی نظروں میں ایک شوخی آمیز چمک تھی۔ اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

''پر تو تو میاں والی ہے۔'' امی نے اسے چھیڑا۔

''تو کیا ہوا میں خدا نہ خواستہ اس سے بے وفائی تھوڑی کر رہی ہوں اگر یہ مجھے پسند کرے گا تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ میں اس کی ہو جاؤں گی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے تو اس سے محبت ہو گئی ہے۔''

''تم تو پاگل ہو گئی ہو۔'' امی بے پروائی سے بولیں۔

''باجی آپ نہیں جانتیں آپ کا یہ بیٹا میرے لیے کیا ہے۔ اگر یہ میری جان بھی مانگے تو جان بھی دے دوں۔''

''تم تو واقعی پاگل ہو گئی ہو۔'' امی اس بار ہنس دی تھیں۔

محلے میں اور لڑکیاں اور عورتیں بھی میری دیوانی تھیں مگر ان میں سب سے زیادہ جنونی رومی ہی تھی۔ اس کو جب موقع ملتا وہ مجھے یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تھی جیسے مجھے اپنی جان کا ایک حصہ بنا رہی ہو۔ مزے کی بات ہے کہ میرے ساتھ یہی سلوک کوئی اور عورت یا لڑکی کرتی تھی تو چڑ جاتا تھا مگر جب رومی میرے ساتھ ایسا کرتی تھی تو مجھے اچھا لگتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد شام کو میں اس کے گھر کھیلنے چلا جاتا تھا۔ محلے کے بچے مجھے ساتھ نہیں کھلاتے تھے۔ ان میں سے اکثر مجھ سے بڑے تھے اور پھر وہ مجھ سے جلتے بھی تھے۔ اس لیے جب میں ان کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتا تو مجھے دھتکار دیا جاتا تھا یا کھلایا بھی جاتا تو مجھے زیادہ تر تختہ مشق بنایا جاتا تھا۔ چوٹوں کے ڈر سے میں نے ان کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔

رومی کا پورا نام رومانہ تھا۔ وہ اسم بامسمّیٰ تھی۔ رومان سے بھری اور چھلکنے کے لیے بے تاب۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ کوئی عامیانہ مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ بہت لیے دیے رہنے والی تھی۔ صرف میرے لیے اس کے وجود میں ایک بھونچال سا آ جاتا تھا۔ جب وہ مجھے اپنے گھر لے جاتی

اور مجھ سے کھیلتی تھی تو اس وقت اس کی شخصیت بالکل بدل جاتی تھی۔ پورے جسم میں جیسے پارا بھر جاتا تھا اور وہ کسی بچے جتنی شوخ و شنگ ہو جاتی۔

میں پہلی کلاس میں تھا اور مجھے پڑھنے کے نام سے بخار چڑھنے لگتا تھا۔ امی گھر میں زبردستی مجھ سے ہوم ورک کرواتی تھیں۔ ایک دن میری جبراً پڑھائی کا سلسلہ جاری تھا کہ رومی آ گئی اس نے امی سے کہا۔ ''اللہ باجی بچے کو اس طرح پڑھاتے ہیں، آپ نے اس کی جان نکال رکھی ہے۔''

''تو پھر کیسے پڑھاتے ہیں؟''

''ایسا کریں آپ اسے پڑھنے کے لیے میرے پاس بھیج دیا کریں۔ میں گھر میں فارغ ہی ہوتی ہوں۔''

''بھئی یہ بہت مشکل بچہ ہے۔ پڑھ کر نہیں دیتا ہے۔''

''میں پڑھا لوں گی۔ شرط لگاتی ہوں کہ اگر یہ کلاس میں فرسٹ نہ آیا تو آپ جو سزا دیں گی مجھے قبول ہو گی۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''اچھا بی بی دیکھتے ہیں۔'' امی نے رضا مندی دے دی۔ یوں میں رومی کے پاس جانے لگا۔ شام کو کچھ دیر کھیل کر وہ مجھے پڑھانے میں لگ جاتی تھی۔ گھر میں وہ اکیلی ہوتی تھی۔ نوشاد بھائی اسکول جاتے تھے۔ پھر وہاں سے گھروں میں ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے تو شام کے بعد ہی ان کی واپسی ہوتی تھی۔ گھر میں کام بھی خاص نہیں تھا۔ کل تین کمرے اور ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ جس کی صفائی سے وہ صبح سویرے فارغ ہو جاتی تھی۔ دوپہر تک کھانا بھی بن جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ وہ آرام کرتی، کتابیں اور رسالے پڑھتی تھی یا کبھی کبھی ہمارے ہاں آ جاتی تھی۔ شام کو وہ نہا دھو کر تیار ہو جاتی تھی اور اسی وقت میں اس کے پاس پڑھنے جاتا تھا۔ میں عام طور سے چار بجے جاتا تھا اور سات بجے گھر آ جاتا۔

پہلے وہ میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلتی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ مجھے کچھ بنا کر یا دکان سے منگوا کر کھلاتی اور پھر مجھے پڑھانے بیٹھ جاتی۔ میں مارے باندھے اسکول جاتا تھا۔ اور مجھے تعلیم کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ مجھے صیح معنوں میں اچھا طالب علم رومی نے بنایا تھا۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے پڑھاتی تھی کہ مجھے پتا بھی نہیں چلتا تھا اور میں سب سیکھتا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں نے پہلی کا امتحان دیا تو میں پورے اسکول میں فرسٹ آیا تھا۔ اس طرح رومی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔

امی بہت خوش تھیں کہ میں پورے اسکول میں پہلے نمبر پر آیا تھا اور اس کا کریڈٹ وہ رومی کو دیتی تھیں۔ یہ بات دوسرے محلے والیوں کو پسند نہیں آئی تھی۔ خاص طور سے ان کو جو اس پر بھی خار کھاتی تھیں کہ میں ان کے گھر نہیں جاتا تھا اور رومی کے گھر بڑے شوق سے چلا جاتا تھا۔ اس سے پہلے وہ امی کو بہکاتی تھیں کہ رومی مجھے بلا کر اپنی تنہائی دور کرتی ہے اور میں اس کے پاس جاتا رہا تو خراب ہو جاؤں گا۔ مگر امی کو ان عورتوں کی باتوں پر کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھے رومی کے ہاں جانے سے کبھی نہیں روکا تھا۔ پھر جب اس کی محنت کی وجہ سے میں پورے اسکول میں فرسٹ آیا تو ان عورتوں کے الزامات کی حقیقت خود ہی کھل گئی تھی اور امی نے ان کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ رومی کے خلاف ان سے کوئی بات نہ کریں۔

میں اس کے گھر جاتا رہا۔ اگرچہ سات آٹھ سال کی عمر میں مجھے کھیلنے کے لیے گلی میں بہت سارے دوست مل گئے تھے اور میں نے رومی کے ساتھ کھیلنا بند کر دیا تھا مگر میں کھیل سے فارغ ہوتے ہی سیدھا اس کے گھر کا رخ کرتا تھا اور مغرب کے بعد ہی گھر آتا تھا۔ وہ مجھے پڑھاتی تھی اور میرے لیے کچھ نہ کچھ بناتی بھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا اور خاص طور سے تلی جانے والی چیزیں وہ بہت اچھی اور مزے کی بناتی تھی۔

نوشاد بھائی سے میرا تعلق ڈر اور خوف کا تھا حالانکہ وہ مجھ سے پیار سے پیش آتے تھے مگر وہ جیسے ہی گھر میں آتے تھے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی اور میری کوشش ہوتی کہ میں جلد از جلد یہاں سے گھر چلا جاؤں۔ رومی نے میری یہ کیفیت بھانپ لی تھی اس لیے اپنے شوہر کے آتے ہی وہ مجھے خود جانے کی اجازت دے دیا کرتی تھی۔ اتوار والے دن چھٹی ہوتی تھی اور نوشاد بھائی گھر پر ہوتے تھے اس لیے میں ان کے گھر جانے سے گریز کرتا تھا۔ کوئی مجبوری ہوتی تھی تو چلا جاتا تھا، جیسے امی کچھ منگواتی تھیں یا کچھ ان کے ہاں بھیجتی تھیں۔ مگر چیز لے یا دے کر میں فوراً آ جاتا تھا۔

جب میں آٹھ نو برس کا ہوا تو رومی مجھے لے کر بازار وغیرہ بھی چلی جاتی تھی۔ کیونکہ وہ اکیلی ہوتی تھی اور کسی کے بغیر بازار نہیں جاتی تھی اس لیے مجھے ساتھ لے جاتی۔ اس بات سے محلے والیوں کو اور بھی تکلیف ہوئی تھی۔ کیونکہ امی مجھے اب نہ تو کسی کے گھر جانے دیتی تھیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ جانے کی اجازت تھی۔ ایک دن میں رومی کے پاس

بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا کہ محلے کی ایک عورت آئی۔ اب مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے۔ مگر اس نے جو باتیں کیں وہ بہت تکلیف دہ تھیں۔ اس نے آتے ہی معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور سناؤ رومانہ کیا ہو رہا ہے۔؟''

''کچھ نہیں باجی عمران کو پڑھا رہی ہوں۔''

''اچھا کیا سکھا پڑھا رہی ہو بچے کو؟'' انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' رومی نے ان کی بات پر غور کیا۔

''اب بنو مت بنو سارا محلہ جانتا ہے کہ تم اس بچے کو کیوں گھر میں بٹھائے رکھتی ہو۔''

''کیا بکواس ہے۔'' رومی نے غصے سے کہا۔ ''کون کہہ رہا ہے، مجھے بتائیں میں ان کا دماغ درست کرتی ہوں۔''

پڑوسن نے میٹھے طنز کے ساتھ کہا۔ ''بی بی کس کس کا دماغ درست کرو گی یہاں تو ہر زبان پر یہ بات ہے۔''

رومی کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اس نے مشکل سے کہا۔ ''لوگ بکتے ہیں اور جو کہتے ہیں ان کی ذہنیت گندی ہے۔ یہ میرے لیے ایک بچہ ہے۔''

پڑوسن نے رومی کو اور بھی بہت کچھ کہا تھا جواب میں رومی نے بھی اسے ایسی رکھ رکھ کر سنائیں کہ وہ اپنا سامنہ لے کر چلی گئی تھی۔ میں سب سن رہا تھا اور میں نے گھر آ کر امی کو حسبِ معمول سب بتا دیا۔ امی کو سن کر غصہ آ گیا تھا اور وہ اسی وقت چادر لے کر گھر سے نکل گئی تھیں۔ انہوں نے جا کر اس پڑوسن کو پکڑا کہ میرے ساتھ چلو اور بتاؤ کہ کون کون میرے بچے اور رومی کے بارے میں بکواس کر رہا ہے۔ وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی مگر امی بھی اسے گھسیٹ کر لے گئیں اور ایک ایک محلے والی سے پوچھا کہ کس نے یہ بات کی ہے۔ سب قسمیں کھانے لگیں اور اس پڑوسن کو لعن طعن ہونے لگی تھی۔ اسے اچھی طرح ذلیل کرا کے اور کر کے امی گھر آ گئی تھیں۔ اگلے دن رومی آئی تو امی نے اس کو بتایا وہ خوش ہو گئی تھی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کیا باجی! ان لوگوں کی زبان بہت کھلنے لگی ہے۔ اگر عمران مجھے پیارا ہے اور میں اسے شوق سے پڑھاتی ہوں تو ان لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔''

''میں جانتی ہوں تجھے بھی اور اپنے بیٹے کو بھی۔ اصل میں اسے ساری آگ یہ لگی ہے کہ تم نے اس کے بچے کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''باجی اللہ رکھے مجھے کوئی کمی تھوڑی ہے، میرا شوہر مجھے کیا لا کر نہیں دیتا ہے۔ عمران کو میں اپنے شوق سے پڑھاتی ہوں۔ اس کی وجہ سے میرے گھر میں کچھ دیر کو رونق ہو جاتی ہے۔ میرا کوئی بچہ ہوتا تو میں اتنی تنہائی بھی نہ محسوس کرتی۔'' اس نے حسرت سے کہا۔ امی نے اسے تسلی دی۔

''اللہ کے در سے مایوس نہ ہوا بھی تو تمہاری شادی کو صرف پانچ سال ہوئے ہیں۔ میں نے تو شادی کے پندرہ سولہ سال بعد بھی بچے ہوتے دیکھے ہیں اور تمہاری عمر بھی کیا ہے۔ نوشاد کی عمر ذرا زیادہ ہے مگر مرد تو ساٹھا سو پاٹھا ہوتا ہے۔ ستر سال کی عمر میں بھی باپ بن جاتے ہیں۔''

امی کی ایسی باتوں پر رومی شرما جاتی تھی اور جب وہ شرماتی تو مجھے بہت اچھی لگتی۔ اس روز جب رومی چلی گئی تو میری دادی نے امی سے کہا تھا۔ ''بہو ان کے حوالے سے ایک بات محلے میں گھوم چکی ہے اس لیے بہتر ہے اسے جانے سے روک دو۔ اب یہ بھی ماشاء اللہ گیارہ برس کا ہو رہا ہے اور اس عمر میں لڑکے ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ وہ بہت ساری باتیں سمجھ جاتے ہیں۔''

''امی میرا عمران ابھی معصوم ہے۔'' امی نے احتجاج کیا۔

''میں کب کہتی ہوں کہ یہ چالاک ہے۔ مگر بہو یاد رکھو مرد اور عورت آگ اور پیٹرول کی طرح ہوتے ہیں۔ ساتھ رہیں تو آگ لگنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ عمران ابھی بچہ ہے اور یہی وقت اسے روک لینے کا ہے کل کو تم روکنا بھی چاہو گی تو یہ نہیں رکے گا۔''

''نہیں یہ ایسا نہیں ہے۔'' امی نے یقین سے کہا۔

''بہو ہوتا کوئی بھی ایسا نہیں ہے مگر یہ انسان ہے اور انسان کو بھٹکتے ہوئے زیادہ دیر نہیں لگتی ہے۔''

اتفاق سے میں نے دادی اور امی کے درمیان ہونے والی یہ بات سن لی تھی۔ اس سے پہلے جب پڑوسن نے رومی پر الزام لگایا تھا تب بھی مجھے تجسس ہوا تھا کہ اس نے ایسی بات کیوں کی تھی۔ پھر امی اور دادی کی باتیں سن کر یہ تجسس اور بھی بڑھ گیا تھا اور یہ سوال میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا کہ میں کس طرح بگڑ سکتا تھا۔ رومی کے پاس جانا میرے لیے کس طرح سے درست نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے یہی سوال اس سے کر لیا اور امی اور دادی کی گفتگو کا حوالہ بھی دے دیا۔ یہ سن کر وہ زرد ہو گئی تھی۔

''تم ان باتوں پر توجہ مت دو۔'' اس نے کسی قدر سختی سے کہا۔ ''ابھی تمہاری عمران باتوں میں پڑنے کی نہیں ہے۔''

''میری عمر کب اتنی ہو گی؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ مسکرانے لگی تھی۔ ''لگتا ہے تم کو تجسس ہے۔''
''رومی کیا یہ بری بات ہے؟''
''بہت بری بات ہے، بس اب اس بارے میں کوئی بات مت کرنا اور نہ ہی سوچنا۔''
اس نے منع کیا تھا اس لیے میں نے کوشش کی کہ اس بارے میں سوچنے سے بھی گریز کروں مگر سوچ ایسی چیز ہے کہ آدمی اس سے جتنا بچنا چاہتا ہے یہ آدمی کو اتنا ہی گھیرتی ہے۔ کچھ دن کے بعد میں محلے میں دکان سے دہی لینے گیا۔ وہاں نکڑ پر محلے کے چند نوجوان لڑکے بیٹھے تھے۔ میں ان کے پاس سے گزرا تو میرے کانوں میں رومی کا نام آیا میں رک گیا۔ کیونکہ اپنی گلی میں آگیا تھا اس لیے لڑکوں کو خبر نہیں ہوئی کہ میں نے ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ وہ رومی کے بارے میں بہت عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں بچہ تھا اور ان بڑے لڑکوں سے نہیں بھڑ سکتا تھا اس لیے وہاں سے چلا آیا۔
اس روز ان لڑکوں کی باتیں میرے ذہن میں گونجتی رہی تھیں مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور تجسس بھی ہو رہا تھا۔ شام کو میں پڑھنے کے لیے رومی کے ہاں گیا تو میں نے غور سے اسے دیکھا۔ میں اس کے لیے بچہ تھا اور وہ میرے سامنے دوپٹے کا تکلف نہیں کرتی تھی۔ پھر گھر میں وہ ذرا کھلا سا لباس پہنتی تھی جن میں چھوٹی آستین اور کھلے گلے ہوتے تھے۔ میں اس کے جسم میں وہ خصوصیات تلاش کرنے لگا جن کا ذکر لڑکے کر رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے پہلے یہ سب کیوں نظر نہیں آئی تھیں جب کہ میں اس کے بہت قریب رہتا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ ''کیا بات ہے، بہت غور سے دیکھ رہے ہو؟''
پہلے میں جھینپ گیا تھا۔ پھر اعتراف کیا۔ ''تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔''
''سچ۔'' وہ کھل اٹھی تھی۔ ''میں کیسے اچھی لگ رہی ہوں۔''
میں نے غور کیا۔ میں اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے کس طرح اچھی لگ رہی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس لیے میں نے کہہ دیا۔ ''بس تم اچھی لگ رہی ہو۔''
میرے ان چند الفاظ سے وہ بہت خوش ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی تعجب ہوا کہ کیا میری تعریف کی اتنی اہمیت تھی۔ اس دن کے بعد سے جب مجھے موقع ملتا تھا میں اسے غور سے دیکھتا تھا۔ اس کے میدے کی طرح سفید بازو، گلابی دمکتا ہوا چہرہ اور کہیں کہیں سے جھلکتا جسم مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

جب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوتی تو میں اسے دیکھتا اور جب وہ میری طرف دیکھتی تو میں نظریں چرا لیا کرتا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کو اس کی خبر نہیں ہے کہ میں اسے دیکھتا ہوں۔ لیکن اسے پتا تھا۔ ایک دن جب میں اسکول کا کام مکمل کر کے جانے والا تھا تو اس نے اچانک پوچھ لیا۔ ''عمران تو مجھے اس طرح کیوں دیکھتا ہے؟''
میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ رومی نے میری چوری پکڑ لی تھی۔ لیکن میں انجان بن کر بولا۔ ''کس طرح؟''
''انجان مت بن۔'' وہ بولی۔ ''کیا تو مجھے چوری چوری نہیں دیکھتا ہے جب میں کوئی کام کر رہی ہوتی ہوں۔''
میں شرمندہ ہونے لگا تھا لیکن پھر میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''تم کو کیسے پتا چلا؟''
''بس پتا چل گیا اور اب تو مجھے اس طرح نہیں دیکھے گا۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔
''لیکن میں جان بوجھ کر کب دیکھتا ہوں۔''
اس نے مجھے گھورا۔ ''یعنی تو دیکھنا بند نہیں کرے گا؟''
سچی بات تھی کہ جب اس کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا تب بھی بے اختیار دیکھنے لگتا تھا اور جب مجھے احساس ہوتا تھا تو میں نظریں ہٹا لیتا تھا مگر کچھ دیر بعد پھر دیکھنے لگتا تھا۔ میں مجبور تھا۔ رومی نے مجھے دھمکی دی۔ ''اگر تو نے دیکھنا نہیں چھوڑا تو میں تجھے پڑھانا چھوڑ دوں گی۔''
''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اب میں آپ کو نہیں دیکھوں گا۔''
''تو مجھے دیکھ سکتا ہے مگر اس طرح نہیں۔''
''کس طرح؟'' میں نے معصومیت سوال کیا۔
''اس طرح، چوری چوری اور خاص طور سے۔'' وہ وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔ اگر وہ وضاحت کر بھی دیتی تو میں سمجھ نہیں سکتا تھا کیونکہ ابھی میری سمجھنے کی عمر ہی نہیں آئی تھی مگر میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ مجھے پڑھانا چھوڑ دے اور میں جو اس کے پاس آتا تھا یہ آنا چھوٹ جائے۔ اس روز میں اتنا ڈر گیا تھا کہ دل پر جبر کر کے میں نے اس کی طرف دیکھنا بند کر دیا تھا۔ میں ساری توجہ اپنی کاپی یا کتاب پر لگا کر رکھتا تھا۔ مگر کچھ دن بعد مجھے پتا چلا کہ میری توجہ کہیں بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کی طرف نہیں دیکھتا تھا مگر میری ساری توجہ اس کی طرف ہی ہوتی تھی اور میں کتاب یا کاپی پر لکھا ایک لفظ بھی نہیں دیکھ رہا ہوتا تھا۔

''عمران تجھے کیا ہو گیا؟'' ایک دن رومی نے اچانک پوچھا۔
''کچھ نہیں ہوا رومی۔'' میں نے جواب دیا میں اسے پہلے دن سے اسی طرح مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کبھی اسے باجی یا آپی جیسے کسی لفظ سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ امی نے کئی بار مجھے ڈانٹا تھا لیکن رومی میری حمایت پر اتر آئی اور اس نے امی سے کہا تھا کہ اسے میرا رومی کہنا اچھا لگتا ہے۔
''نہیں تجھے کچھ ہوا ہے۔ تو تین چار دن سے بالکل بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ رہا ہے۔''
میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں کوشش تو کرتا ہوں۔''
''کیا بات ہے، مجھے نہیں بتائے گا۔'' اس نے اتنی محبت سے کہا کہ میں رہ نہ سکا اور میں نے صاف صاف کہہ دیا۔
''تم نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہاری طرف نہ دیکھوں۔ میں تمہاری طرف نہیں دیکھتا ہوں لیکن پھر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا ہے۔''
اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''عمران تیرے لیے اتنا اہم ہے مجھے دیکھنا؟''
''میں نہیں جانتا لیکن میں تم کو نہ دیکھوں تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔'' میں نے سچائی سے کہا۔
وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ میں سر جھکائے اپنی کاپی پر لکیریں کھینچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ''عمران تو مجھے دیکھ لیا کر لیکن مجھ سے ایک وعدہ کر جب تو کام کر رہا ہو گا یا کوئی سبق یاد کر رہا ہو گا تب مجھے نہیں دیکھے گا۔''
میں خوش ہو گیا تھا۔ ''تم مجھے اجازت دے رہی ہو؟''
رومی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اجازت دے رہی ہوں۔''
اس روز سے طے ہو گیا تھا کہ جب میں پڑھ رہا ہوں گا تو میں اس کو نہیں دیکھوں گا اور جب میں کام سے فارغ ہو جاؤں گا تو اس کو جتنا چاہے دیکھوں گا وہ مجھے نہیں ٹوکے گی۔ اس نے مجھے اجازت کے ساتھ ایک کام اور بھی کیا۔ جب وہ مجھے پڑھا رہی ہوتی تھی یا اس دوران میں میرے آس پاس ہوتی تو خود کو ایک بڑی سی چادر میں چھپا لیا کرتی۔ اور جب میں پڑھ لیتا تو اس کی چادر اتر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے لباس میں بھی کچھ تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ لمبی آستین اور بند گلے والی قمیصیں پہننے لگی۔ ایک روز رومی نے ایسی ہی قمیص پہنی تھی۔ اچانک اس نے پوچھ لیا۔

''عمران، تجھے میری یہ شرٹ کیسی لگ رہی ہے؟''
''بالکل بھی اچھی نہیں ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔
''کیوں اچھی نہیں ہے؟'' اس نے غور سے مجھے دیکھا۔
''بس اچھی نہیں ہے۔'' میں اس کو سمجھا نہیں سکتا تھا کہ مجھے اس کی یہ شرٹ بلکہ اسی طرح کی اور شرٹس کیوں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس سے اگلے روز جب میں اس کے پاس پڑھنے آیا تو میں نے دیکھا اس نے چھوٹی آستین اور کھلے گلے والی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں خوش ہو گیا کیونکہ مجھے اس کو اسی قسم کی قمیص میں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ جب میں پڑھنے کے بعد چھٹی کر کے جانے لگا تو اس نے پوچھ لیا۔ ''اب تو میں تجھے اچھی لگ رہی ہوں؟''
میں نے جھینپ کر سر ہلایا۔ ''ہاں اب تم اچھی لگ رہی ہو۔''
مجھے پڑھانے کے بعد وہ اپنی چادر اتار دیتی تھی اور پھر میں جب تک اس کے ہاں رہتا تھا میری نظریں اس کے وجود کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ شرما جاتی، جھینپ جاتی اور کبھی کبھی غصے سے مجھے کہتی۔ ''عمران مجھے ایسے کیوں دیکھتا ہے؟''
میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ میں اس کو ایسے کیوں دیکھتا ہوں۔ مجھے خود پتا نہیں تھا کہ میں اسے اس طرح کیوں دیکھتا تھا۔ وہ مجھے سمجھاتی۔ ''تو مجھے اس طرح مت دیکھا کر۔''
''مگر کیوں رومی؟'' میں کہتا۔
اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ مجھے کس طرح سمجھائے اس لیے وہ زچ ہو کر کہتی ''بس میں نے کہہ دیا نا۔''
سچی بات ہے میں بچہ ہی تھا اگرچہ مرد بھی تھا مگر اصل میں بچہ تھا تب ہی تو میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے وجود میں میرے لیے ایسی کون سی کشش ہے جو میں اس کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی وہ اچھے موڈ میں ہوتی تو میرے دیکھنے کو انجوائے کرتی تھی، مجھ سے اپنے بارے میں سوال بھی کرتی تھی۔ ایک روز وہ ایسی موڈ میں تھی۔ اس نے میرے لیے سموسے بنائے تھے۔ مجھے اس کے ہاتھ کے بنے سموسے اچھے لگتے تھے۔ اس روز گرمی بہت تھی اور رومی نے باریک ململ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔
اچانک اس نے سوال کیا۔ ''عمران تجھے مجھ میں کیا چیز اچھی لگتی ہے؟''
اس کا سوال غیر متوقع تھا اس لیے میں سوچ میں پڑ

گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ وہ میری الجھن بھانپ گئی تھی ۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی پھر مجھ سے کہا۔ ''اگر سمجھ میں نہیں آرہا تو مجھے دیکھ کر بتا۔''

میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک اچھی لگتی تھی، اس کے لمبے گھنے بال، اس کا خوب صورت جسم، اس کا دمکتا رنگ اور اس کے دل کش نقوش سب ہی مجھے اچھے لگتے تھے۔ میں نے اس کا اعتراف کر لیا۔ ''رومی تم مجھے پوری کی پوری اچھی لگتی ہو۔''

''اونہوں...!'' اس نے مچل کر کہا۔ ''آدمی کو کوئی ایک چیز زیادہ اچھی لگتی ہے۔ بتانا مجھ میں کیا اچھا لگتا ہے ؟''

میں نے پھر غور کیا اور میں جان گیا کہ مجھے اس کے جسم میں کیا اچھا لگتا ہے۔ میں نے اس سے بے تکلفی سے کہہ بھی دیا۔ پہلے تو وہ دنگ رہ گئی پھر اس نے اچانک مجھے تھپڑ مار دیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھے پیار سے بھی نہیں مارا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے گال پر ہاتھ رکھا۔ ''تم نے مجھے مارا۔''

وہ بھی تھپڑ مار کر حیران سی کھڑی تھی جیسے اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ میں سسک سسک کر رونے لگا تو وہ بے چین ہوگئی۔ ''عمران مت رو۔''

''تم نے مجھے مارا ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے معاف کر دے۔'' اس نے بھی رونا شروع کر دیا تھا پھر اچانک ہی مجھے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کئی سال سے اس نے مجھے بھینچنا اور پیار کرنا چھوڑ دیا تھا اس لیے میں اس کا لمس بھول گیا تھا اور اس روز جب رومی نے میرا سر اپنے وجود سے لگایا تو مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میں سنسنی اور ایک قسم کی بے چینی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ چند لمحے میں میں بھول گیا کہ ابھی میں صدمے اور دکھ سے رو رہا تھا۔ شاید اس نے بھی میری اس کیفیت کو محسوس کر لیا اور اس نے جلدی سے مجھے خود سے دور کر دیا۔ وہ جھینپ گئی تھی۔ میرے آنسو تھم گئے تھے۔

''عمران مجھے معاف کر دے میں نے تجھے مارا لیکن تو نے بھی تو اچھی بات نہیں کی ہے۔''

''میں نے غلط کہا ہے؟''

''ہاں تجھے میرے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے۔''

''مگر تم نے خود پوچھا تھا تو میں نے بتا دیا۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''ہاں یہ میری غلطی بھی ہے۔'' اس نے جیسے خود سے کہا۔ ''میں شاید غلطی کی طرف جا رہی ہوں۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''عمران آیندہ تو ایسی بات نہیں کہے گا۔''

''نہیں کہوں گا۔''

میں نے خود بھی سوچ لیا تھا کہ جو بات رومی کو اچھی نہیں لگی ہے وہ پھر منہ سے نہیں نکالوں گا۔ اس کے تھپڑ سے زیادہ اس کی ناراضی کے خوف نے مجھے سہما دیا تھا۔ اگر اس نے مجھے اپنے گھر آنے سے روک دیا تو؟ میں اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ ہم واپس صحن میں آئے تو وہ مجھے کام دے کر اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اب اس نے موٹے کپڑے کا پوری آستین کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اور دوپٹا بھی ٹھیک سے لیا ہوا تھا۔ اس روز کے بعد سے وہ لباس کے معاملے میں محتاط ہوگئی تھی۔

پہلے میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے پڑھانے سے انکار نہ کر دے اور شاید اپنے گھر آنے سے بھی منع کر دے۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے اس سے کوئی اچھی بات نہیں کی تھی۔ اس لیے میرے دل میں چور تھا لیکن جب اس نے دوبارہ مجھ سے اس موضوع پر کچھ نہیں کہا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس کا ڈھکا چھپا رہنا بھی گوارا کر لیا کہ اسی طرح سہی وہ میرے سامنے تو تھی اور میں اسے روز دیکھ تو سکتا تھا۔

نوشاد بھائی کے گھر آنے کا وقت ہو گیا۔ رومی نے مجھ سے کہا۔ ''آج تو نے مجھ سے جو کہا تھا وعدہ کر کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرے گا۔''

''نہیں کروں گا۔'' میں نے وعدہ کیا۔

نوشاد بھائی آئے تو انہوں نے حیرت سے رومی کو دیکھا۔ ''آج گرمی ہے اور تم نے اتنا موٹا کرتہ پہن رکھا ہے؟''

''بس ایسے ہی۔'' اس نے نوشاد بھائی سے نظریں چرا کر کہا پھر مجھ سے بولی۔ ''عمران اب تو جا میں نے جو کام دیا ہے وہ کل کر کے لانا۔''

اس وقت میری عمر بارہ سال بھی نہیں تھی لیکن میں نے قد کاٹھ اچھا خاصا نکال لیا تھا۔ جب میں کتابیں سمیٹ کر جانے لگا تو نوشاد بھائی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''عمران لمبا ہو گیا ہے پورا لڑکا لگنے لگا ہے۔''

''بے چارہ ابھی بارہ سال کا بھی نہیں ہے۔'' رومی نے جلدی سے میری حمایت کی۔ ''آپ کو پورا لڑکا لگنے لگا ہے۔''

میں گھر آیا تو مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا اور خوف یہ تھا کہ کہیں نوشاد بھائی نے رومی کو منع کر دیا کہ مجھے نہ پڑھائے تب کیا ہوگا۔ پھر امی مجھے رومی کے گھر جانے نہیں دیں گی۔ ویسے بھی دادی جان کئی بار امی سے کہہ چکی تھیں کہ اب میرا رومی کے گھر آنا جانا بند کر دیں کیونکہ میں بڑا ہو رہا تھا اور اس عمر کے لڑکوں کو جوان عورتوں سے میل جول نہیں رکھنا چاہیے خاص طور سے ان کو اکیلے میں ملنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ لیکن امی کو رومی پر پورا اعتماد تھا۔ انہوں نے دادی سے کہا تھا۔

''اماں رومی بہت اچھے کردار کی لڑکی ہے۔ ہمارے محلے میں آج تک کسی نے اس کے کردار کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا ہے اور عمران سے تو وہ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی ہے۔''

امی کے اس اعتماد کے باوجود مجھے خطرہ نظر آرہا تھا کہ کہیں مجھ پر پابندی نہ لگ جائے اور میں رومی سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے خیال میں اس خطرے کا ایک ہی حل تھا۔ رومی کی کشش اور اس کے پاس رہنے کی شدید خواہش نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بہت اچھا طالب علم بن جاؤں تاکہ رومی کی واہ واہ ہو سکے اور میں اس کے پاس رہ سکوں اور ایسا ہی ہوا۔ ساتویں کے امتحان میں میں نے ایک بار پھر پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اور سب نے اس کا کریڈٹ رومی کو دیا تھا جو مجھے اتنی جانفشانی سے پڑھاتی تھی۔

دوسری طرف رومی کو بھی شاید نوشاد بھائی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کہیں وہ اسے مجھے پڑھانے سے منع نہ کر دیں۔ شاید انہوں نے رومی سے ایسی کوئی بات کی بھی تھی کہ میں اب بڑا ہوتا لڑکا تھا اور وہ میرے سامنے کھلے حلیے میں نہ آیا کرے کیونکہ اس دن کے بعد سے رومی مجھے پڑھاتے وقت ڈھکے چھپے انداز میں رہا کرتی تھی۔ اگرچہ مجھے لاشعوری طور پر یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں اسے پہلے کی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ میرے سامنے تو ہوتی تھی۔ ایک احتیاط اس نے اور کی تھی کہ مجھے مغرب سے پہلے چھٹی دے دیا کرتی تھی۔ اس سے پہلے میں مغرب کے بعد بھی اس کے پاس رہتا تھا اور اکثر نوشاد بھائی کے گھر آنے پر ہی وہاں سے روانہ ہوتا تھا۔

ان دنوں میرا قد حیرت انگیز تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اپنی تیرھویں سالگرہ سے پہلے ہی میں میرا قد اپنے والد کے جتنا ہو گیا تھا۔ رومی نے بھی کئی بار مجھ سے کہا۔ ''عمران

آکرہ

صوبہ سرحد میں مرکز آثار قدیمہ۔ ان آثار کی تفتیش پاکستان مجلس باقیاتی تفتیش نے جس کے سربراہ پروفیسر فرید خان ہیں انہوں نے جے آرنا کس (برطانوی عجائب گھر) اور ڈاکٹر کے ڈی تھامس (لندن یونیورسٹی) کے تعاون سے شروع کی ... یہ تفتیش کئی مرحلوں پر محیط ہے۔ 1996ء میں اس وسیع پروگرام کا نقطہ آغاز ہوا۔ کھنڈرات کے سطحی جائزے سے پتا چلتا ہے کہ وادیِ بنوں میں آکرہ سب سے زیادہ قدیم اور عظیم الشان شہر تھا جو 200 ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ آکرہ کے کھنڈرات مختلف ٹیلوں کی شکل میں بنوں شہر سے 12 کلو میٹر دور جنوب مغرب کی طرف واقع ہیں۔ بھرت گاؤں ان کھنڈرات کے قرب میں موجودہ دور کا گاؤں ہے۔ آکرہ نام غالباً یونانی لفظ آکروپلس (Acroplis) کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب بلند مقام یا دارالحکومت ہے۔ آکرہ کے ٹیلے لوہڑہ نالا کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ یہ ٹیلہ لوہڑہ نالا کے بائیں کنارے پر ہے اور یہاں سے کشن دور کے آخری دنوں کے آثار بھی ملے ہیں۔ 1996ء میں کھدائی کو لوہڑہ نالا کے دائیں جانب تک محدود رکھا گیا تھا۔ یہاں سے دریافت شدہ مٹی کے برتنوں کی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ یہ ثقافتی آثار تقریباً 900 ق م پرانے ہیں۔ اس طرح کے برتن وادیِ بنوں میں کئی اور جگہوں پر بھی ملے ہیں۔ ان برتنوں میں زیادہ دلچسپی کے حامل وہ برتن ہیں جنہیں پانی جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کی ایک جانب ٹونٹی اور دوسری جانب دستہ لگا ہوا ہے ۔ یہ برتن وادی بنوں سے باہر کہیں بھی نہیں ملتے اس لحاظ سے نہایت ہی دلچسپ تھے۔ آکرہ شہر یونانی دور سے لے کر ہندوستانی زمانے تک تقریباً ایک ہزار سال تک آباد تھا۔ آکرہ کی کھدائی دراصل وادی بنوں میں جاری گزشتہ دس سالوں سے 1986-1996ء) تحقیقات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مرسلہ: نادر مرزا، کراچی

کیا کھاتا ہے جو تاڑ کی طرح بڑھتا چلا جا رہا ہے۔''
رومی میری اس بڑھوتری پر خوش نہیں تھی اس کا خیال تھا کہ اگر میں اسی رفتار سے اونچا ہوتا رہا تو جلد میری امی مجھے اس کے پاس آنے سے منع کر دیں گی۔ میں خود بھی سوچ کر پریشان تھا۔ اس پریشانی کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے تعلیم پر توجہ بھی نہیں دے سکا تھا اور آٹھویں کے امتحان میں مجھے پہلے جیسی کامیابی نہیں ملی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنی کلاس میں پہلے نمبر پر ضرور آیا تھا۔ اب میں نویں کلاس میں تھا۔ رومی خود بھی صرف میٹرک پاس تھی۔ لیکن وہ پڑھنے کے معاملے میں بہت تیز تھی اس کی خواہش تھی کہ وہ مزید پڑھتی مگر اس کی شادی کر دی گئی۔ پھر اس کا دل مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کے شوہر نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ جب میں نویں میں آیا اور میں نے سائنس لی تو مجھے یہ خدشہ ستانے لگا تھا کہ اب شاید گھر والوں کی طرف سے مجھے اس کے پاس جانے سے روک دیا جائے گا۔ میں نے اس سے کہا۔
''کہیں ایسا نہ ہو مجھے تمہارے پاس آنے سے روک دیا جائے۔''
''وہ کیوں؟''
''تم بھی صرف میٹرک پاس ہو۔ اب تم مجھے کس طرح پڑھاؤ گی؟''
''تم فکر مت کرو میں تم کو پڑھا سکتی ہوں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''میں نے بھی سائنس سے میٹرک کیا تھا۔ اب میں تمہارے لیے کورس پھر سے پڑھ لوں گی۔''
''سچ! تم میری خاطر یہ کام کرو گی؟'' میں خوش ہو گیا تھا۔ ''رومی میں تم سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔''
میری اس بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''میں خود کون سا تیرے بغیر رہ سکتی ہوں لیکن....'' اس نے سرد آہ بھری۔
''لیکن کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' وہ سوچ کر بولی۔ ''تو فکر مت کر میں تجھے پڑھا لوں گی اور تیری امی سے اجازت بھی لے لوں گی۔''
میں نویں کلاس میں آیا تو ابو نے مجھ سے کہا۔ ''تم کسی ٹیوشن سینٹر میں داخلہ بھی لے لو۔ اچھے نمبروں کے لیے ٹیوشن پڑھنا لازمی ہے۔''
''جی ابو۔'' میں نے دبے انداز میں کہا۔ میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں رومی سے ہی پڑھنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ بات امی سے کہہ سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا امی انکار کر دیں گی۔ میں چاہتا تھا کہ امی سے رومی ہی بات کرے۔ امی اس کی بات مان سکتی تھیں۔ ان دنوں میرا اس کے پاس آنا جانا نہیں تھا۔ وہی ہمارے گھر آ جاتی تھی اور اس وقت میں اس کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ کبھی وہ نہیں آتی تھی تو میں بے چین ہو کر اس کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس کی صورت دیکھے بغیر مجھے چین نہیں آتا تھا۔ میں نے رومی سے کہا۔ ''ابو نے مجھے کسی ٹیوشن سینٹر میں داخلہ لینے کو کہہ دیا ہے۔''
وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ''اب تو میرے پاس نہیں آئے گا؟''
میں روہانسا ہو گیا تھا۔ ''ہاں پھر.... امی مجھے کہاں آنے دیں گی۔ رومی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''
میری اس بات پر رومی نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ یہ بات میں پہلے بھی کئی بار اس سے کہہ چکا تھا۔ لیکن اس روز میں نے شاید کسی اور لہجے میں کہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چونک گئی تھی۔ اس نے سوچ کر کہا۔ ''تو فکر مت کر میں باجی سے بات کروں گی۔''
''تو پھر جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ ابو مجھے لے جا کر خود کسی کوچنگ سینٹر میں داخل کرا دیں۔''
''میں آج ہی بات کروں گی۔''
شام کے وقت رومی گھر آئی تو میں کمرے میں تھا۔ اس کی آواز سن کر میری ساری توجہ باہر ہی تھی۔ وہ دادی جان کو سلام کر کے امی کے پاس جا بیٹھی تھی۔ پھر وہ امی سے آہستہ آہستہ بات کرنے لگی۔ مجھے کوشش کے باوجود سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسی طرح امی بھی اس سے دھیرے دھیرے بات کر رہی تھیں۔ کچھ دیر میں صبر کرتا رہا پھر بے تاب ہو کر باہر نکل آیا۔ وہ صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ کر گئیں۔ دونوں کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ بات سنجیدہ تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا شاید امی نے رومی کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن رومی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تو کل سے میرے پاس پڑھنے آئے گا۔''
''سچ...!'' میں نے خوشی سے کہا پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''لیکن تم تو خود میٹرک ہی ہو؟''
''تو فکر مت کر میں تجھے پڑھا سکتی ہوں۔ پھر نوشاد بھی ہیں وہ بھی مدد کر دیا کریں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ لیکن اس کا سنجیدہ انداز نہیں بدلا تھا اسی طرح امی بھی پہلے کی طرح چپ تھیں۔ کچھ دیر بعد رومی چلی گئی تھی۔ میں نے امی سے

کہا۔ ’’امی ابو مجھے سینٹر میں پڑھنے کو کہہ رہے ہیں۔‘‘

امی نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولیں۔

’’ان کی فکر مت کرو میں ان کو سمجھا لوں گی۔ تم اپنی فکر کرو۔‘‘

میں ہنسا۔ ’’میں اپنی فکر کیا کروں، آپ لوگ ہیں نا میری فکر کرنے کے لیے۔‘‘

’’نہیں میرے بچے بعض اوقات انسان کو اپنی فکر خود کرنا پڑتی ہے ورنہ وہ پھر پچھتاتا ہے۔‘‘

امی مجھے اشاروں کنائیوں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں اور میں شاید سمجھ نہیں رہا تھا یا شاید انجان بن رہا تھا۔ میرے لیے فی الحال یہی بہت تھا کہ امی نے مجھے رومی سے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اگلے دن سے میں نے اس کے پاس جانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ابھی گرمیوں کی چھٹیاں بھی ختم نہیں ہوئی تھیں اور اسکول نہیں کھلے تھے۔ دو تین دن بعد ایک بار پڑھنے کے دوران مجھے خیال آیا اور میں نے رومی سے پوچھا۔ ’’اس دن تم اور امی اتنا سنجیدہ کیوں ہو رہے تھے؟‘‘

’’کس دن؟‘‘

’’جس دن تم نے امی سے مجھے پڑھانے کی اجازت لی تھی؟‘‘

’’وہ کوئی خاص بات نہیں تھی، باجی اور میرا ہنسنے بولنے کا موڈ نہیں تھا اس لیے ہم خاموش بیٹھے تھے۔‘‘

میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہ مجھ سے نظریں چرانے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ ’’رومی مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ میں تمہیں اور امی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔‘‘

’’ارے پاگل کوئی بات نہیں تھی۔‘‘ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ آخر اس نے تسلیم کر لیا۔

’’ایک بات تھی۔‘‘

’’یہی تو میں کہہ رہا ہوں ایک بات تھی لیکن وہ بات کیا تھی تم مجھے بتاؤ گی۔‘‘ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

’’عمران بات تجھ سے متعلق ہے لیکن ابھی تیرا جاننا بہتر نہیں ہے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ میں نے بے چینی سے کہا۔

’’بس ہے نا ایک وجہ۔‘‘ وہ بولی۔

’’رومی مجھے بتا دو۔‘‘

’’عمران یہ بتا کہ تو مجھ پر کتنا اعتماد کرتا ہے؟‘‘ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

’’میں تم پر خود سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔‘‘

’’بس تو پھر مجھ سے ابھی مت پوچھ، جب وقت آئے گا تو میں خود تجھے بتا دوں گی یہ میرا وعدہ ہے۔‘‘

اس کے بعد میں مجبور ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود میٹرک پاس تھی اور مجھے اتنے اچھے طریقے سے نہیں پڑھا سکے گی۔ مگر اس نے مجھے اتنی مہارت سے پڑھایا کہ میں بھی حیران رہ گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے نوشاد بھائی سے کتابیں منگوا کر ان سے پڑھی تھیں اور اتنی محنت کی تھی کہ رات کو دیر تک پڑھتی تھی۔ اس نے اپنی کوشش سے میٹرک کے کورس پر استاد جیسا عبور حاصل کر لیا تھا۔ محض اس لیے کہ مجھے پڑھا سکے۔ اس نے جس طرح مجھے پڑھایا اس طرح تو میں کوچنگ میں بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

گھر میں جب ابو کو پتا چلا کہ میں بدستور رومی سے پڑھ رہا ہوں تو وہ ناراض ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بلا لیا۔ ’’برخوردار میں نے تم کو کوچنگ میں داخلہ لینے کو کہا تھا اور تم اس سے پڑھ رہے ہو جس نے خود میٹرک کیا ہوا ہے۔‘‘

’’جی ابو لیکن رومی مجھے بہت اچھا پڑھا رہی ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’آٹھویں تک تو سمجھ میں آتا لیکن میٹرک کے مضامین بہت مشکل ہوتے ہیں۔‘‘

’’نہیں ابو اسے میٹرک کا پورا کورس آتا ہے اس نے مجھے اتنے اچھے انداز میں پڑھایا ہے۔ آپ چاہیں تو میرا ٹیسٹ لے لیں۔‘‘

میری بات نے ابو کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے میرا ٹیسٹ لیا تو واقعی حیران ہوئے تھے۔ ’’واقعی تم اچھا پڑھ رہے ہو، لیکن اگر کوئی مشکل ہو تو تم کوچنگ میں داخلہ لے لینا۔‘‘

ابو کو اس بات پر اعتراض نہیں تھا کہ میں جوان ہو رہا تھا اور ایک جوان اور بہت حسین عورت سے پڑھنے جاتا تھا جب کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ مرد اس قسم کی باتوں پر زیادہ غور نہیں کرتے ہیں۔ دادی کو اس بات کا خدشہ تھا لیکن امی کو رومی پر اعتماد تھا۔ پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ عرصے سے باتوں باتوں میں مجھے ایسے جملے کہہ جاتی تھیں جو میرے اور رومی سے متعلق ہوتے تھے۔ شاید ان کے ذہن میں بھی خدشات سر سرانے لگے تھے۔ لیکن مجھے اس وقت ان باتوں کا خیال نہیں تھا۔ اس وقت تو میرے لیے یہی بہت تھا کہ مجھے رومی کے گھر جانے

کی اجازت مل گئی تھی اور میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس اجازت کو برقرار رکھنے کے لیے جتنی محنت رومی کر رہی تھی اتنی ہی محنت میں بھی کر رہا تھا۔ میں تعلیم پر جان مار رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ نویں کے امتحان میں میرے نمبرز سب کو حیران کر دیں۔

ایک طرف تو خود مجھے رومی سے جھجک آنے لگی تھی۔ دوسری طرف اس کا رویہ بھی مجھ سے کسی قدر بدل گیا تھا۔ پہلے وہ جس طرح بے تکلفی سے مجھے ہاتھ مار دیتی تھی۔ بھینچنا اور بانہوں میں لینا تو اس نے چار پانچ سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا لیکن کبھی ہاتھ پکڑ لیتی تھی یا میرے ساتھ بیٹھ جاتی تھی تو اس نے اب میرے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ رکھ لیا تھا۔ پہلے وہ مجھے تخت پر ساتھ بیٹھ کر پڑھاتی تھی۔ اب میں تخت پر بیٹھتا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھ کر مجھے پڑھاتی تھی۔ وہ ہاتھ نہیں لگاتی تھی اور کبھی بے ساختہ پہلے کی طرح ہاتھ مار جاتی تو جھینپ جایا کرتی تھی۔ خود میں بھی اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ بلکہ جیسے میں پہلے اسے دیکھتا تھا اب دیکھتے ہوئے جھجک آتی تھی۔ شاید ہم دونوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب میں بچہ نہیں رہا تھا۔ میرا قد رومی سے اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ وہ میرے سامنے چھوٹی لگنے لگی تھی۔

مجھے پڑھانے کے دوران وہ اپنے لباس اور دوپٹے کا خاص خیال رکھنے لگی تھی۔ اس کا دوپٹا سر پر ہوتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی کہ میرے سامنے پوری آستین والا لباس پہنے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا اندر سے میرا دل چاہتا تھا کہ رومی پہلے کی طرح میرے سامنے رہے۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس سے یہ بات کہنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ میں دن میں ایک بار دو گھنٹے کے لیے اس کے پاس ہوتا تھا اور پہلے کی طرح کھل کر نہ سہی لیکن اسے دیکھ تو سکتا تھا۔

وہ مجھے مغرب کے بعد گھر جانے کے لیے کہہ دیتی تھی بلکہ مغرب کی اذان سنتے ہی میں خود کتابیں سمیٹ لیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اب رومی مجھے نوشاد بھائی کے آنے کے بعد زیادہ دیر گھر میں رکنے نہیں دیتی تھی اور اگر وہ بے وقت آ جاتے تھے تو کچھ دیر کے بعد مجھے چھٹی دے دیا کرتی تھی۔ خود مجھے نوشاد بھائی کے سامنے پہلے سے زیادہ بے سکونی ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جب آتے تھے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے کسی قیمتی چیز کا مالک دوسرے کو شک سے دیکھتا ہے کہ وہ اس کی قیمتی چیز چرا کر نہ لے جائے۔ اگرچہ انہوں نے زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا لیکن ان کا دیکھنا ہی میرے لیے بہت ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے آتے ہی میں خود بھی وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ اس لیے جب رومی نوشاد بھائی کی آمد پر مجھے چھٹی دیتی تھی تو میں سکون کا سانس لیتا تھا۔

نوشاد بھائی اور رومی کے تعلقات اچھے تھے۔ کم سے کم میں نے کبھی ان کے درمیان کوئی کھٹ پٹ محسوس نہیں کی تھی کیونکہ میں بچپن سے رومی کے گھر میں آ تا رہا تھا۔ البتہ ان کے تعلقات میں ایک دھیما پن اور خاموشی تھی، وہ عام میاں بیوی کی طرح بے تکلف نہیں تھے۔ نوشاد بھائی رومی سے بڑے دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتے تھے اسی طرح رومی بھی ان سے بہت احترام سے پیش آتی تھی۔ میں نے اسے کبھی نوشاد بھائی کے لیے بنا احترام کے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان کی ہر ممکن خدمت کرتی تھی۔ جب وہ بیاہ کر آئی تو بہت کم عمر تھی اور اسے گھر داری، خاص طور سے کھانا بنانا نہیں آتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے شوق سے سب سیکھا اور اب وہ بہت سلیقے سے گھر چلاتی تھی۔ اس کا گھر ہمہ وقت آئینے کی طرح جگمگاتا رہتا تھا۔ اس نے صحن میں بے شمار پھولوں اور رنگوں والے پودے لگا رکھے تھے۔ گیٹ کے ساتھ دیوار پر بیلیں چڑھائی تھیں۔ اس کا آنگن ہمیشہ پھولوں سے مہکتا رہتا تھا اور اس گھر کا سب سے مہک آور پھول تو وہ خود ہی تھی۔

اس نے بڑی محنت سے کھانا بنانا سیکھا اور اسی وجہ سے اس کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا تھا۔ وہ امی سے نت نئی ترکیبیں سیکھ کر جاتی تھی۔ اس نے کچھ عرصے میں بہت اچھا کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ نوشاد بھائی کو گھر آنے پر کھانے کے ساتھ دوسری چیزیں بھی تیار ملتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شادی کے بعد ان کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کمزور سے لگتے تھے۔ رومی کا میکا حیدر آباد میں ہی تھا اور وہ سال میں دو تین بار اپنے گھر جاتی تھی۔ البتہ اس کے گھر والے بہت کم آتے تھے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں اور بھی تھیں جن کی بعد میں شادی ہو گئی تھی۔ ان کی شادیوں میں نوشاد بھائی نے بہت مدد کی تھی کیونکہ رومی کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اس کا باپ کہیں چوڑی کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس سے اسے اتنا ملتا تھا کہ وہ اپنے گھر کا چولہا جلا لے۔ رومی کو اپنے گھر والوں کی غربت کا احساس تھا اس لیے وہ جب جاتی تھی ان کے لیے بے شمار چیزیں اور کپڑے

لے کر جاتی تھی۔ اس کا پتا مجھے یوں چل جاتا تھا کہ وہ ساری چیزیں میرے ساتھ جا کر ہی لاتی تھی۔ نوشاد بھائی اسے کھلا خرچ دیتے تھے بلکہ ان کی ساری آمدنی رومی کے ہاتھ میں آتی تھی اور وہ اس سے پلٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ اس کا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتی تھی نوشاد بھائی وہ لازمی لا کر دیتے تھے۔

بس ان کے گھر میں ایک کمی تھی۔ اب تک رومی کو خدا نے اولاد سے محروم رکھا تھا۔ شروع میں اس نے اولاد کے لیے بہت جتن کیے تھے ڈاکٹروں کے پاس بھی گئی تھی۔ حکیموں اور پیروں کے چکر بھی لگائے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ دونوں میاں بیوی بالکل ٹھیک تھے بس قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ اس لیے وہ اس معاملے میں صبر کر کے بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے کہتی تھی۔ ”عمران اگر تو نہ آتا تو میں اس تنہائی میں گھٹ کر مر جاتی۔ کاش اللہ ہمیں کوئی بچہ دے دے۔“

اس روز میں اس سے پڑھ رہا تھا۔ جب میں آیا تھا تب ہی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کچھ پیلا سا ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو وہ ٹال گئی کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ حسبِ معمول کرسی پر بیٹھی تھی۔ ایک بار میری نظر اس کی طرف گئی تو اس نے سر تھام رکھا تھا اور یوں ہل رہی تھی جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”رومی کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں عمران چکر آ رہے ہیں۔“

”تم اندر چل کر لیٹو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں تو جا کر باجی کو بلا لا۔“ اس نے انکار کیا۔

اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے بحث کرتا۔ میں تیزی سے گھر کی طرف بھاگا۔ امی کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ”امی جلدی سے چلیں رومی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ میں نے ان سے کہا۔

”اللہ خیر کرے کیا ہوا؟“ امی جلدی سے دوپٹا لیتے ہوئے بولیں۔

”پتا نہیں مجھے پڑھا رہی تھی کہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے چکر آنے لگے۔ اس نے کہا میں آپ کو بلا لاؤں۔“

امی میرے ساتھ آئیں تو وہ کرسی پر بے ہوش سی بیٹھی تھی۔ امی میری مدد سے اسے اٹھا کر اندر لائیں اور بستر پر لٹا کر اسے پانی پلایا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ گلوکوز کہاں رکھتی تھی میں گلوکوز بنا کر لے آیا۔ اسے پی کر اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ امی نے اس سے کیفیت پوچھی اور جب وہ بتانے لگی تو امی بھانپ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”عمران تو گھر جا۔“

میں وہاں رکنا چاہتا تھا لیکن امی کا لہجہ تحکمانہ تھا اس لیے مجھے جانا ہی پڑا تھا۔ اگلے روز جب میں جانے لگا تو امی نے مجھے روک دیا کہ ابھی میں نہ جاؤں رومی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اسے دو تین دن آرام کا کہا ہے۔ میں بادل ناخواستہ رک گیا تھا۔ تین دن بعد میں گیا تو رومی بہت خوش تھی پھر اس نے مجھے شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ اچانک ہی انکشاف ہوا تھا کہ وہ امید سے ہے۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے جب مجھے بتایا تو میں اندر سے مرجھا گیا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اب شاید میں کبھی بھی رومی کے لیے پہلے جیسی اہمیت کا حامل نہیں رہوں گا۔ اگرچہ اس کے رویے میں میرے لیے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی میری کیفیت محسوس کر لی تھی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”کیا بات ہے تو خوش نہیں ہے۔“

میں جلدی سے اور زبردستی مسکرایا۔ ”نہیں.. میں تو بہت خوش ہوں۔“

وہ کھل اٹھی تھی۔ ”عمران خدا نے اتنے عرصے بعد مہربانی کی ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔ ”اب کیا میں تمہارے پاس پڑھنے نہیں آؤں گا۔“

”کیوں نہیں آئے گا۔ مگر کبھی کبھی جب میری طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی تو چھٹی کر لینا۔“

فی الحال میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وہ مجھے بالکل منع نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس روز جب نوشاد بھائی جلدی گھر آئے اور انہوں نے مجھے پڑھتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے رومی کو آواز دی۔ وہ اندر گئی۔ مجھے لگا جیسے نوشاد بھائی غصے میں تھے اس لیے میرے کان ان کی طرف لگ گئے۔ میں نے نوشاد بھائی کی ہلکی سی آواز سنی۔

”کیا تم اسے اس حالت میں بھی پڑھاؤ گی؟“

”ابھی تو کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔“ رومی بھی آہستہ سے بولی۔ ”ویسے بھی چار مہینے بعد اس کے امتحان ہیں۔“

”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ نوشاد بھائی بولے

تو میری سانس رک گئی تھی۔ میں منتظر تھا کہ رومی کیا جواب دیتی ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ کہتے ہیں تو میں اسے منع کر دوں گی لیکن اس کی وجہ سے میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ جب اکیلی ہوتی ہوں تو بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔“

”نہیں... نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ نوشاد بھائی جلدی سے بولے۔ ”میں پڑھانے سے منع نہیں کر رہا ہوں۔ تمہارے آرام کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔“

”میں سارا دن آرام تو کرتی ہوں۔ کام ہی کتنا ہوتا ہے۔“

نوشاد بھائی خاموش ہو گئے۔ اس کے باوجود مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ رومی کو منع نہ کر دیں۔ لیکن جب آنے والے کئی دن رومی مجھے باقاعدگی سے پڑھاتی رہی تھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے نوشاد بھائی کو اس معاملے میں منا لیا تھا۔ میں روز ہی جاتا تھا البتہ جس دن رومی کی طبیعت خراب ہوتی تھی اس روز میں چھٹی کر لیا کرتا تھا۔ وہ بے چاری اس وجہ سے کہ مجھے اس کے دروازے تک آ کر نہ جانا پڑے خود گھر میں آ کر بتا جاتی تھی۔

شروع میں تو کسی کو پتا نہیں چلا تھا کیونکہ امی نے رومی کو بتانے سے منع کر دیا تھا اور خود بھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات پھیل گئی اور جب دادی جان کو پتا چلا تو وہ اچھل پڑی تھیں۔ ”دلہن تمہاری مت ماری گئی ہے جو عمران کو اب اس کے پاس بھیج رہی ہو۔“

”اماں کچھ نہیں ہوتا، عمران کو کیا پتا اور ابھی تو اس کی حالت بھی نہیں بدلی ہے۔ بس دو مہینے کی بات ہے پھر عمران کے پیپرز شروع ہو جائیں گے تو وہ خود چھوڑ دے گا۔“

”تم جانو دلہن۔“ دادی جان نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”اس کو عقل نہیں ہے جو اس حالت میں بچے کی جان نہیں چھوڑ رہی ہے۔“

پھر محلے میں بات پھیلی اور وہ پڑوسنیں جو پہلے بھی اس معاملے میں جلتی تھیں انہوں نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ ان میں سے کچھ نے براہِ راست رومی کو باتیں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا۔ مجھے بعد میں پتا چلا لیکن ان دنوں وہ بہت رنجیدہ رہنے لگی تھی۔ اس وقت اس نے مجھے اس وجہ سے بھی نہیں بتایا کہ میں پیپرز کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میری تیاری متاثر ہو۔ ان دنوں اس کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے مجھے پڑھاتی رہتی تھی۔ جب طبیعت زیادہ ہی خراب ہوتی تھی تو چھٹی دیتی تھی۔

امتحانات سے ایک مہینا پہلے میں نے رومی کے پاس ٹیوشن کے لیے جانا بند کر دیا تھا۔ ویسے کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ امتحان کے دنوں میں کسی نہ کسی طرح اس کے گھر کا ایک چکر لگا لیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کی جسمانی ہیئت بدل رہی تھی اور اس کا جسم بھاری ہونے لگا تھا۔ میں نے اس سے سادگی میں کہہ دیا۔

”رومی تم موٹی ہوتی جا رہی ہو۔“

وہ شرما گئی۔ ”پاگل اس حالت میں عورت موٹی ہی ہوتی ہے۔“

میں کھسیا گیا۔ ”اب مجھے کیا معلوم۔“

جب تک میں پیپرز سے فارغ ہوا وہ اچھی خاصی موٹی ہو چکی تھی۔ پیپرز کے دوران تو میں پھر بھی اس سے کچھ پوچھنے کے بہانے جا سکتا تھا لیکن اس کے بعد یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ امی نے مجھ پر پابندی لگا دی تھی۔ میں رومی کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ وہ آ جاتی تھی مگر کم ہی آتی تھی۔ پھر جس دن میرا رزلٹ نکلا تھا۔ اسی دن رومی نے ایک بچی کو جنم دیا تھا۔ میں اخبار لے کر آیا تو امی نے اطلاع دی۔ میں رومی کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے جاؤں...... رومی خود ہی گھر آ گئی تھی۔ پھر اس کے چند دن بعد میں ہمت کر کے اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے پہلے دیکھ لیا تھا کہ نوشاد بھائی گھر پر نہیں

جین آسٹن

انگریز خاتون ناول نگار۔ پادری کی بیٹی تھی۔ اس کے ناول خالص رومانی ہیں لیکن ان میں متنوع انسانی کردار ملتے ہیں۔ بیس سے تیس سال کی عمر میں تین ناول پرائڈ اینڈ پریجوڈس، سینس اینڈ سینسی بی لٹی اور نارتھینجر ایبے لکھے جو اس کی آخری عمر میں یا مرنے کے بعد شائع ہوئے۔ زندگی کے آخری چھ سالوں میں تین اور ناول ایما، مینسفیلڈ پارک اور پرسوایشن لکھے جو علی الترتیب 1814ء، 1816ء اور 1818ء میں چھپے۔

مرسلہ: فارغ خان، ڈی آئی خان

ہیں۔رومی مجھے دیکھ کر کِھل اٹھی تھی۔

''عمران تو کہاں غائب تھا' تجھے میری بچی کی خوشی نہیں ہوئی ہے۔''

''میں کیسے آتا' امی نے سخت پہرا لگا رکھا تھا۔''میں نے جواب دیا۔ وہ کمزور ہو رہی تھی۔اس کی بیٹی بھی اسی کی طرح پیاری سی تھی لیکن اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے رومی سے دور لے جائے گی۔میں نے بادلِ ناخواستہ اسے پیار کیا اور رومی سے بولا۔''تمہیں پتا ہے میں پاس ہو گیا ہوں۔''

''اچھا۔''وہ خوش ہو گئی۔

''رومی اب تو تمہاری اولاد بھی ہو گئی ہے کیا اب بھی تم مجھے پڑھاؤ گی؟''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔'' کیوں نہیں پڑھاؤں گی اور بچی ہونے سے میں کون سا تم سے دور ہو جاؤں گی۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے بڑے ہونے پر جیسے دوسروں کا رویہ بدل گیا تھا کہیں رومی کا رویہ بھی نہ بدل جائے۔''تو میں کب سے پڑھنے کے لیے آؤں۔''

''ابھی تو ایک مہینے تک نہیں آ سکتا.....''اس نے شرما کر کہا۔''جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تب آنا۔''

''لیکن میں تمہیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''وہ تو تم کبھی کبھی آ جانا۔ میں خود کسی کام سے بلا لیا کروں گی۔''

اس طرح میں کبھی کبھی رومی کے گھر چلا جاتا تھا۔اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔لیکن میں نوشاد بھائی کی غیر موجودگی میں ہی جاتا تھا۔گھر میں شاید امی کو شک تھا کہ میں رومی کے پاس جاتا ہوں لیکن انہوں نے کبھی کچھ کہا نہیں تھا۔آرام کرنے اور کھانے پینے سے رومی کی صحت بہتر ہونے لگی تھی اور سوا مہینا پورا ہونے پر وہ پہلے کی طرح حسین اور دل کش ہو گئی تھی۔اب مجھے پتا چل گیا تھا کہ عورت کی خوب صورتی اور دل کشی کیا ہوتی ہے۔تقریباً پندرہ سال کی عمر میں ان سب چیزوں کی سمجھ بوجھ آ جاتی ہے۔

میں نے امی سے کہا۔''میں کل سے رومی کے پاس پڑھنے کے لیے جاؤں گا۔''

''عمران وہ اپنی بچی کو سنبھالے گی یا تجھے پڑھائے گی۔''

''امی اس نے خود کہا ہے۔''

امی چونکیں۔''تو اس کے گھر جاتا رہا ہے؟''

''جی امی دو تین بار اسے کام تھا تو چلا گیا۔نوشاد بھائی نہیں تھے اور اسے باہر سے کچھ منگوانا تھا۔''

امی کچھ دیر سوچتی رہی تھیں۔'' ٹھیک ہے چلے جانا...لیکن کوشش کرنا کہ کم سے کم وہاں رکو۔اس سے پہلے اس کا شوہر کوئی اعتراض کرے تم خود محتاط رہنا۔''

''جی امی میں خیال رکھوں گا۔''میں نے خوش ہو کر کہا۔میرا اے ون گریڈ آیا تھا۔اس وجہ سے امی مجھے رومی کے پاس پڑھنے کی اجازت دینے پر مجبور ہوئی تھیں۔میں پھر سے اس کے پاس جانے لگا تھا۔ایک دن میں رومی کے پاس تھا تو میں نے اس سے پوچھا۔''تم مشورہ دو کہ مجھے کالج میں کون سا مضمون لینا چاہیے۔؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تو ڈاکٹر بنے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔''رومی قسم سے میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔''

''بس تو پری میڈیکل میں داخلہ لینا۔'' اس نے فیصلہ کر دیا۔''اور مجھ سے وعدہ کر تو دل لگا کر پڑھے گا۔''

''کہاں دل لگا کر؟''میں نے شرارت سے سوال کیا۔''دل تو میں ایک جگہ لگا چکا ہوں۔''

''بکو مت۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔''یہ تیرے مستقبل کا سوال ہے۔''

''رومی مجھے مستقبل سے زیادہ اس کی فکر ہے کہ جب میں میٹرک کر لوں گا تو پھر تمہارے پاس کس بہانے سے آؤں گا۔''

''عمران پھر تو یہاں نہیں آئے گا بلکہ تو آگے جائے گا۔تعلیم حاصل کرے گا اور ڈاکٹر بنے گا۔''

میں نے بے دلی سے کہا۔''میں ڈاکٹر بن جاؤں گا لیکن تم سے دور ہو جاؤں گا یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔''

''تو پاگل ہے ابھی تو پڑھے گا اور پھر کوئی نوکری کرے گا۔ تیرا وقت اتنا مصروف گزرے گا کہ میں تجھے یاد ہی نہیں رہوں گی۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا، میں نہ تمہیں بھول سکتا ہوں اور نہ تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔''میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔''عمران بے وقوفی کی بات مت کر، کچھ عرصے بعد تیری شادی ہو جائے گی تو تیری بیوی تجھے یہاں نہیں آنے دے گی۔''

''میں شادی ہی نہیں کروں گا۔''میں نے کہا۔

''شادی کرنا ہو گی۔''رومی آہستہ سے بولی۔

''ایک شرط پر شادی کروں گا۔اگر تم جیسی کوئی لڑکی ملی تو۔'' میں نے کہا اور اس کے گھر سے چلا آیا۔نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات پر غصہ آ گیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ جب اسے میری پروا نہیں تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں۔اب میں اس کے پاس پڑھنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔مگر جب میں اگلے دن نہیں گیا تو رومی آ گئی۔وہ سیدھی میرے پاس آئی تھی۔''پڑھنے کیوں نہیں آیا؟''

''بس اب میں تم سے نہیں پڑھوں گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''شاید تجھے میری کل کی بات بری لگی۔''وہ بولی۔''چل مجھے معاف کر دے آیندہ ایسی بات نہیں کروں گی۔''

اسے دیکھ کر میں پہلے ہی پسیج گیا تھا اس لیے اس کی بات مان گیا۔ میں روز ہی پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔رومی بچی کو سنبھالنے کے ساتھ مجھ پر بھی پوری توجہ دیتی تھی۔بلکہ وہ میرے آنے سے پہلے ہی اسے فیڈ کرا کے سلا دیا کرتی تھی۔ میں اس کی توجہ پر خوش تھا۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ میں اپنی ساری توجہ تعلیم پر دوں کیونکہ یہ سال میرے لیے اہم ترین تھا۔میٹرک میں اچھے نمبرز آئے تو مجھے کسی اچھے کالج میں داخلہ ملے گا اور اچھے کالج میں پڑھ کر ہی مجھے ایف ایس سی میں اتنے نمبرز ملیں گے کہ میں میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے کوشش کروں۔

رومی کے لیے میرے جذبات بدل رہے تھے۔اب میں اسے کسی اور انداز میں پسند کرنے لگا تھا۔اس کی قربت میں میرا دل کسی اور انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اور میری خواہش ہوتی تھی کہ میں ہمیشہ اس سے اسی طرح ملتا رہوں۔ لیکن جب مجھے خیال آتا تھا کہ یہ ممکن نہیں تھا تو میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میٹرک کے بعد میں اس کے گھر نہیں جا سکوں گا۔ایک جوان آدمی کسی غیر عورت کے گھر کس طرح جا سکتا تھا۔ میرے گھر والے ہی نہیں جانے دیتے اور ان کی طرف سے اگر اجازت مل بھی جاتی تو روی کا شوہر اسے کس طرح گوارا کرتا۔

جیسے جیسے میرے امتحان کے دن قریب آ رہے تھے میرے اور رومی کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ہم اس موضوع پر بات نہیں کرتے تھے۔اس دن میں اس سے فزکس کا آخری چیپٹر پڑھ رہا تھا۔میں نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔''رومی میں تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ' سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا،کینیڈا،آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

وہ کسمسائی۔ ''عمران میرا ہاتھ چھوڑ۔''
''کیوں کیا میرا تجھ پر کوئی حق نہیں ہے؟''
''حق ہے... تو میری جان مانگ سکتا ہے لیکن....''
''لیکن کیا؟''
''تو کیوں بھول جاتا ہے کہ میں کسی کی بیوی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے صرف وہی چھو سکتا ہے۔''
''تب میرا تجھ سے کیا تعلق ہے۔'' میرا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا۔
''عمران تو مجھے چھوڑ بس اپنے مستقبل کا سوچ۔''
''رومی میں نے تو سوچا تھا کہ میرا مستقبل تو ہے۔''
''نہیں میں کسی اور کی ہوں۔'' اس نے انکار کر دیا۔ ''میرا تجھ سے صرف محبت کا رشتہ ہے۔''
''مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے۔''

میں یہ کہہ کر اس کے گھر سے نکل آیا تھا۔ اس وقت میں بے انتہا جذباتی ہو رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اب رومی کے گھر نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے ارادے پر قائم رہا تھا دو ہفتے بعد میرے امتحانات کا آغاز ہونے والا تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک دوست کے گھر پڑھتا تھا۔ میں جان بوجھ کر دن میں گھر نہیں آتا تھا مجھے معلوم تھا کہ رومی چکر لگاتی ہوگی۔ میں مغرب کے بعد ہی گھر آتا تھا۔ پھر پیپرز شروع ہو گئے اور مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ میرا غصہ سرد ہو چلا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ پیپرز کے بعد رومی سے ملنے جاؤں گا۔

لیکن جس دن آخری پیپر دے کر آیا تو رومی کے گھر پر تالا لگا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ کہیں گئی ہوگی مگر جب گھر میں آیا تو امی نے بتایا۔ ''رومی چلی گئی۔''
''چلی گئی۔'' میں حیران ہوا تھا۔ ''مگر کہاں گئی؟''
''اپنے میاں کے ساتھ حیدرآباد چلی گئی۔''
''کیا کہہ رہی ہیں آپ، رومی کیسے جا سکتی ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ امی نے غور سے مجھے دیکھا اور بولیں۔
''لڑکے تیرا دماغ خراب ہے، یہ مجھ سے کس طرح بات کر رہا ہے۔''

مگر رومی کے جانے کی اطلاع نے میرے حواس گم کر دیے تھے۔ میں گھر سے نکل کر بھاگا۔ میں نے محلے میں پوچھا۔ تب مجھے پتا چلا کہ صبح اچانک ہی نوشاد ایک ٹرک لایا اور اس میں سامان بھر کر... بیوی بچی کے ساتھ یہاں سے چلا گیا۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے محلہ چھوڑ کر حیدرآباد چلا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اندر سے خالی ہو گیا تھا۔ میں گھر آیا تو امی نے مجھے ایک بند لفافہ تھما دیا تھا۔
''رومی جانے سے پہلے ملنے آئی تھی اور اس نے تیرے لیے یہ لفافہ دیا ہے۔''

میں نے لفافہ لیا تو مجھے اس کے اندر سے رومی کی خوشبو آتی محسوس ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے لفافہ کھولا تو اس کے اندر سے ایک رقعہ نکلا تھا۔ اس پر رومی کی خوشنما تحریر تھی۔

''جان سے عزیز عمران! سب سے پہلے تو میں بنا بتائے جانے پر معافی چاہتی ہوں۔ میں کیوں اس طرح خاموشی سے گئی۔ میرا خیال ہے اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ میرے اور تیرے درمیان دس سال پہلے جو تعلق شروع ہوا تھا وہ اب ایک ممنوعہ حد میں داخل ہو رہا تھا اور بہتر یہی تھا کہ اس تعلق کو ختم کر دیا جاتا۔ مجھے معلوم ہے تم کبھی اس تعلق کو ختم کرنا نہیں چاہو گے۔ اس لیے میں نے ہمت کر کے یہ قدم اٹھایا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم مجھے نہیں بھول سکتے۔ میں بھی تم کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ لیکن ہماری جدائی میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ مجھے امید ہے تم مجھے بھلاؤ یا نہ بھلاؤ لیکن تم اپنی تعلیم پر پوری توجہ دو گے اور ڈاکٹر بنو گے۔ تمہاری بہتری کے لیے تم سے دور جانے والی۔
تمہاری رومی۔''

خط پڑھ کر میں کچھ دیر کے لیے گم صم سا رہ گیا تھا۔ پھر میں نے خط پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔ اس وقت میں نے شاید سوچ لیا تھا کہ میں رومی کو بھول جاؤں گا.... اسے بھلانے کے لیے میں نے خود کو تعلیم میں گم کر لیا۔ میں صبح سے شام تک پڑھتا تھا۔ کالج سے آ کر بھی آرام نہیں کرتا تھا۔ کھیلنا اور تفریح کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ اسی وجہ سے ایف ایس سی میں میرے اتنے اچھے نمبرز آئے کہ مجھے آرام سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ رومی کی یاد مدھم ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی۔ یہ ختم ہونے والی چیز بھی نہیں تھی۔

میں نے کامیابی سے ایم بی بی ایس مکمل کر لیا اور ہاؤس جاب کے بعد مجھے ایک سرکاری اسپتال میں نوکری مل گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں ایک نجی کلینک میں بھی بیٹھنے لگا تھا۔ رومی کو مجھ سے بچھڑے دس سال ہو چکے تھے اور میں کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتا تھا کہ وہ کہاں ہوگی اور کیا کرتی ہوگی۔ ریحانہ کے بعد اس کی اور اولادیں بھی ہوئی

ہوں گی یا اس کی ایک ہی بچی ہوگی۔ نوشاد تو اب اور بھی بوڑھا ہو گیا ہوگا۔ رومی بھی پینتیس سال کی ہو چکی ہوگی مگر اس کے بارے میں نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اس کے حسن کی آب و تاب ایسے ہی برقرار ہوگی۔

ان دنوں حیدرآباد میں شدید بارشیں ہوئی تھیں اور وہاں پر امراض پھوٹ پڑے تھے۔ کراچی سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم وہاں کیمپ لگانے جا رہی تھی اس میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ حیدرآباد کے نام پر مجھے رومی کا خیال آیا کہ شاید میں ایک بار پھر اسے دیکھ سکوں۔ ہمارا کیمپ ایک اسکول میں لگا تھا جس کے اردگرد ابھی تک بارش کا پانی کھڑا تھا۔ اکثر مریض گیسٹرو کے آ رہے تھے۔ ہم ان کو مدد دینے لگے تھے۔

ایک دن میں صبح کے وقت کام کر رہا تھا۔ چند مریضوں کو ڈرپ لگائی اور ایک کو انجکشن دیا۔ مریضوں کو خیمہ لگا کر بستروں پر لٹایا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک عورت سیاہ چادر میں آئی تھی۔ اس نے ایک بچی کو اٹھا رکھا تھا اور بچی کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ گیسٹرو کا شکار تھی۔ عورت نے بچی کو ایک خالی بستر پر لٹایا اور وہاں موجود میل نرس سے کہنے لگی۔ ''خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ، میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا اور میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مڑی اور میں ساکت رہ گیا۔ وہ رومی تھی۔ اس نے میرے سفید کوٹ سے اندازہ لگا لیا اور میرا ہاتھ پکڑا۔ ''ڈاکٹر صاحب میری بچی کو دیکھو۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔''
''رومی...!'' میں نے کہا تو وہ بھی چونکی تھی۔ اتنے برسوں میں اس میں واقعی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ اس کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا۔
''عمران...!'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
''ایک منٹ۔'' میں نے اپنا بازو چھڑایا اور اس کی بچی کی طرف بڑھا وہ ریحانہ ہی تھی۔ مگر وہ دس سال کے بجائے مشکل سے چھ سات سال کی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم میں پانی خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے ڈرپ لگائی اور کچھ دوائیاں بھی دیں۔ نصف گھنٹے بعد جب اس کی حالت بہتر ہونا شروع ہوئی تو میں نے رومی کی طرف توجہ دی تھی۔ وہ خود بھی صبر سے میرے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

میجر آفتاب حسن
(1909-1993ء)

سائنسی کتب کے مصنف اور ماہرِ تعلیم۔
وہ بازید پور (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی۔ 1921ء سے 1923ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ فطری میلان سائنس کی طرف تھا چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی علم کیمیا میں ایم ایس سی کیا۔ تکمیل کے بعد حیدرآباد دکن میں ملازمت اختیار کر لی۔ ابتدا میں اورنگ آباد میں انسپکٹر تعلیم سائنس اور بعد ازاں مددگار ناظم تعلیمات رہے۔ 1948ء میں جب بھارت نے حیدرآباد دکن پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تو 12 ستمبر 1948ء کو سڈنی کاٹن جہاز پر سوار ہو کر پاکستان چلے آئے۔ 1949ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں اور پھر 1953ء میں اردو کالج کراچی میں پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ چھ سات سال تک اردو کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد جامعہ کراچی میں دارالترجمہ و تالیف کے شعبے کے ناظم مقرر ہوئے۔ معلومات سائنس، سائنس کی باتیں، سائنس سب کے لیے، سائنس ہمارے لیے، آئن اسٹائن اور کائنات، سائنس کی پہلی تا چوتھی کتاب، طریقۂ تعلیم سائنس اہم تصانیف ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان میں سیکریٹری اور قائم مقام چیئرمین کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

مرسلہ: امتیاز احمد، منڈی بہاء الدین

''شکر ہے اب اس کی حالت بہتر ہے۔'' میں نے رومی سے کہا اور اسے لے کر اپنے دفتر والے خیمے میں آ گیا تھا۔ رومی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ ''اب تم بتاؤ تم اتنے عرصے کہاں رہیں؟''
''یہیں اسی شہر میں۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔
میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''رومی تم پریشان لگ رہی ہو۔ تمہارا شوہر کہاں ہے اور بچے بھی ہیں؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ''نوشاد کا انتقال ہو گیا ہے، ابھی دو مہینے پہلے ہی۔ اس کو بھی گیسٹرو ہو گیا تھا۔''

میں دنگ رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر اس سے افسوس کیا۔ اس کا کوئی اور بچہ نہیں تھا۔ نوشاد کے انتقال کے بعد وہ مشکل میں تھی۔ نوشاد کے واجبات نہیں ملے تھے اور گھر چلانے کے لیے کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ نوشاد کے گھر والوں نے بھی منہ پھیر لیا تھا۔ پھر ریحانہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور رومی اسے لے کر ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتی رہی تھی مگر اس کی حالت نہیں سنبھلی تھی۔ پھر رومی کے پاس اتنی رقم بھی نہیں رہی تھی۔ کسی نے اسے اس کیمپ کے بارے میں بتایا تو وہ ریحانہ کو لے کر یہاں چلی آئی تھی۔ اپنی داستان سنانے کے بعد اس نے پہلی بار مجھے دیکھا۔

''عمران تو کتنا بڑا ہو گیا ہے اور پہلے سے زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔''

''لیکن تم ویسی ہی ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو وہ شرما گئی تھی۔

''اب کہاں...... اب تو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''تو فکر مت کر اب میں نے تجھے دیکھ لیا ہے۔ تجھے پھر سے پا لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ اب میں تجھے پھر سے غائب ہونے نہیں دوں گا۔''

''عمران وہ سب پرانی باتیں ہو گئی ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرے لیے کچھ بھی پرانا نہیں ہوا ہے۔ میں تجھ سے ملا ہوں تو ایسا لگ رہا ہے ہم کل ہی بچھڑے تھے۔'' میں نے کہا اور اس وقت مجھے لگا کہ میں نے برسوں پہلے خود سے رومی کو بھول جانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ دھوکا تھا جو میں نے خود کو دیا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔

''عمران اب تو ڈاکٹر بن گیا ہے۔ جوان ہو گیا ہے۔ تجھے ایک سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی مل سکتی ہے۔''

''اگر مجھے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی کی تلاش ہوتی تو اب تک میں اسے پا چکا ہوتا۔ امی ایک سال سے میری شادی پر زور دے رہی ہیں لیکن یہ دل مانتا ہی نہیں ہے۔''

''تو مجھے بھولا نہیں؟''

''رومی سچ کہوں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں تجھے کچھ کچھ بھول گیا ہوں لیکن آج تجھے دیکھا ہے تو پتا چلا میں اب تک خود کو دھوکا دیتا آیا تھا۔ میں مرتے دم تک تجھے نہیں بھول سکتا۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے تجھ سے صرف دلچسپی تھی لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے میں نے اصل میں تجھ سے پیار کیا ہے کیونکہ حسن والیاں تو مجھے اور بھی مل رہی تھیں لیکن ان میں کوئی رومی نہیں تھی۔''

''عمران میں جانتی تھی۔'' اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''تو مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن ... میں خود کو تیرے قابل نہیں سمجھتی ہوں۔''

''اس کا فیصلہ کرنے کا تجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''محبت میں کرتا ہوں اس لیے فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔''

رومی نے بہت انکار کیا مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھ سے بڑی تھی۔ بیوہ اور ایک بچی کی ماں تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کے نزدیک اب وہ میری حیثیت کی نہیں تھی۔ میں ایک ہفتہ حیدر آباد میں رہا تھا اور اس دوران اسے قائل کرتا رہا کہ وہ میرے ساتھ کراچی چلے۔ آخر میں نے اسے منا لیا تھا۔ میں اس سے نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس نے میری امی کی رضامندی کی شرط رکھ دی تھی۔

یہ الگ داستان ہے کہ میں نے امی اور باقی گھر والوں کو اس رشتے پر کس طرح رضامند کیا۔ میرے خاندان والے اس رشتے سے خوش نہیں تھے۔ امی مان گئی تھیں مگر خوش وہ بھی نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ شادی کے بعد رومی کو الگ رکھوں۔ آج ہماری شادی کو تین سال گزر گئے ہیں۔ ابھی ایک مہینا پہلے ہی ہمارے دوسرے بیٹے نے جنم لیا ہے۔ خدا نے رومی کو میرے مقدر میں لکھ دیا تھا اس لیے وہ مجھے مل گئی۔ یہ اس کا ایک اور احسان ہے۔ میں اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

☆

شمارہ مارچ 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: تلافی ...... امجد (راولپنڈی)

☆ دوم: بیٹی ...... امجد (سرگودھا)

☆ سوم: جرم ...... خورشید عالم (گجرات)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے